مؤلف:
آفتاب حسین جوادی

شیعہ پر اعتراضات کا علمی محاکمہ

المعروف

السیف البارق

ناشر:
مرکز مطالعات اسلامی پاکستان

شیعہ پر اعتراضات

کا علمی محاکمہ

المعروف

السیف البارق

مؤلف

آفتاب حسین جوادی

ناشر

مرکز مطالعات اسلامی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: السیف البارق

مؤلف: آفتاب حسین جوادی

بار اشاعت: دوم

سن اشاعت: جمادی الاوّل ۱۴۳۰ھ بمطابق جولائی ۲۰۰۹

ناشر: مرکز مطالعات اسلامی

ملنے کا پتہ

تمام شیعہ بک سٹال پر کتاب موجود ہے

فہرست

صفحہ نمبر	عنوانات	باب نمبر
۱۴	اظہار تشکر و امتنان	❁
۱۵	انتساب	❁
۱۶	پیش لفظ	❁
۲۰	اسلام کے خلاف یہودی یلغار	باب ۱
۲۲	عبداللہ بن سلام، کعب احبار اور وھب بن منبہ کے اسلام میں داخل ہونے کے مقاصد	
۲۸	کعب الاحبار حضرت عمرؓ کے قتل میں شریک تھا	
۳۰	شام میں اموی ملوکت کا قیام یہود کی پشت پناہی سے ہوا	
۳۳	بنوامیہ کو برسرِ اقتدار لانے میں یہودیت کارفرما ہے	
۳۵	ناصبیت یہودیت کی راہ پر	
۳۶	شیعہ دشمن عناصر کا خودساختہ افسانہ	
۳۹	عبداللہ بن سبا کے بارے میں شیعہ روایات پر اجمالی نظر	
۴۵	عربی عبارت کا غلط ترجمہ	
۴۷	مسئلۂ امامت کے بیان میں	باب ۲
۴۸	امامت کا صحیح مفہوم	
۵۰	امام کی تعریف	
۵۲	امام کے فرائض منصبی	
۵۴	امام کا تقرر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یا عوام کے انتخاب سے؟	
۶۰	امام کا نبیؐ کی مثل معصوم ہونا ضروری ہے اور کیا عصمت منافی ختم نبوت ہے؟	
۶۷	بارہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا تعین	

◈ انبیاء کرامؑ اور ائمہ اہل بیتؑ کے تکوینی و تشریعی اختیارات ۶۹
◈ مؤلف اور اس کے ہمنواؤں کی کج فہمی ۷۶
◈ مؤلف کے رکیک ایرادات اور ان کے جوابات ۷۶
(۱) زمین کا مالک اللہ یا آئمہ ۷۶
(۲) مارنا اور زندہ کرنا ۷۷
(۳) فرعون کو غرق کرنا اور موسیٰؑ کو نجات دینا ۷۹
(۴) ''قوم عاد و قوم ثمود اور اصحاب رس کو تباہ و برباد کرنا'' ۷۹
(۵) ''ہر چیز کی گنتی شمار کر رکھنا'' ۷۹
(۶) ''غیب کے خزانوں کی کنجیاں کس کے پاس ہیں؟'' ۸۰
(۷) ''روز جزا کا مالک'' ۸۴
(۸) ''اول آخر ظاہر و باطن'' ۸۴
(۹) ''کائنات کے ذرہ ذرہ کا مالک'' ۸۴
(۱۰) ''قسیم الجنة و النار'' ۸۶
◈ یا علیؑ مدد اور علیؑ مشکل کشا کہنے کا جواز ۸۷
◈ حلی جواب ۸۷
◈ الزامی جواب ۸۹
◈ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی بھی حضرت علی علیہ السلام کو مشکل کشائے دارین تسلیم کرتے ہیں ۹۰
◈ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے ۹۲
باب ۳ عقیدۂ بداء اور اس کی حقیقت ۹۴
◈ بداء میں صرف نزاع لفظی ہے ۹۵
◈ بداء کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے ۹۷
◈ مذہب شیعہ کے اصول و فروغ کتاب و سنت پر مبنی ہیں ۱۰۶

- بداء حکمت الٰہی کا شاہکار ہے ۱۰۷
- ظہور امام مہدی علیہ السلام کے وقت کا تعین کرنا ۱۰۸
- انتہائی جہالت کے ساتھ عبارت میں صریح خیانت ۱۱۱
- حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ اور مسئلہ بداء ۱۱۵
- یہودی بداء کا انکار کرتے ہیں ۱۱۶

باب ۴ امامت اور ختم نبوت کے بیان میں ۱۱۹

- کیا صحابیت مثل نبوت کے وہبی منصب ہے؟ ۱۱۹
- اولی العزم پیغمبرؑ کو خلفاء راشدین کے تعویذ کا محتاج بنا دیا ۱۲۳
- امامت اور نبوت وہبی منصب ہیں ۱۲۴
- شیعہ اور ختم نبوت ۱۲۵
- تحریکِ ختم نبوت میں شیعہ علماء کا تاریخ ساز کردار ۱۲۷
- اہل سنت کے نزدیک صحابی سے، غیر صحابی افضل ہو سکتا ہے ۱۳۰
- منصبِ امامت کا رتبہ، نبوت سے بالاتر ہے ۱۳۳
- ظالم کو عہدۂ امامت تفویض نہیں ہو سکتا ۱۳۶
- آمدن بر سر مطلب: ۱۳۶
- نبی کی نبوت افضل ہوتی ہے یا اس کی ولایت؟ ۱۳۹
- ائمہ اہل بیتؑ بعد از پیغمبرؐ ساری مخلوق سے افضل ہیں ۱۴۱
- سابقہ انبیاءؑ کو نبوت علیؑ کی ولایت کا اقرار کرنے سے ملی ۱۴۳
- ائمہ اہل بیتؑ پر ایمان فرض اور انکار کفر ہے ۱۴۴
- آئمہؑ پر نزول وحی اور فرشتوں سے ملاقات ۱۴۶
- مؤلف کا احمقانہ استدلال ۱۵۱
- ائمہ اہل بیتؑ کو تحلیل و تحریم کے اختیار کا مسئلہ ۱۵۴

ائمہ اہل بیتؑ کو معجزات حاصل ہیں ۱۵۷
❖ جہالت وغباوت کا ارتکاب ۱۶۰
❖ ''پہلی شہادت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی! ۱۶۰
❖ دوسری شہادت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی'' ۱۶۱
❖ ''تیسری شہادت شیعوں کے محدث و مجدد اعظم جناب باقر مجلسی'' ۱۶۱
❖ چوتھی شہادت شیخ مفید ۱۶۱
❖ انتہائی بددیانتی اور خیانت کا مظاہرہ ۱۶۳
❖ شیخ مفیدؒ کی گواہی مؤلف کے خود خلاف جاتی ہے ۱۶۴
باب ۵ عقیدۂ امامت اور انبیاء کرام علیہم السلام ۱۶۷
❖ کرۂ ارض میں تمام انسانوں پر اسلامی احکام نافذ نہ ہو سکے ۱۷۰
❖ مؤلف کی نبی اکرمؐ اور حضرت علیؑ کی شان میں گستاخانہ جسارت ۱۷۴
❖ حضرت علیؑ کی ولایت میں کسی کو شریک کیا تو اعمال ضائع ہو جائیں گے ۱۷۶
❖ حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں کیوں رکھا گیا؟ ۱۸۰
❖ روایت میں قارون کے دھنسائے جانے کا تذکرہ ہے نہ کہ حضرت یونسؑ کا ۱۸۱
❖ قیامت کے دن حضرت علیؑ سب سے آگے ہوں گے ۱۸۳
❖ قیامت کے دن حضرت علیؑ کی کرسی دائیں جانب ہوگی ۱۸۴
❖ قواعد ابراہیمی کے مطابق کعبہ تعمیر نہ ہو سکا ۱۸۷
باب ۶ عقیدۂ امامت دراصل عظمت اہل بیتؑ کا مظہر ہے ۱۹۱
❖ اہل بیتؑ کون ہیں؟ ۱۹۲
❖ اہل بیت رسولؐ میں ازواج داخل نہیں ہیں ۱۹۵
❖ نواصب کتے اور خنزیر کے برابر ہیں ۲۰۰
❖ ناصبی سادات کا اہل بیت اطہارؑ سے انحراف ۲۰۲

- ضعیف روایت سے ''اولاد البغایا'' پر استدلال ۲۰۴
- مؤلف کا امام حسنؑ پر زنا اور شراب نوشی کا الزام (العیاذ باللہ) ۲۰۶
- حضرت عبداللہؓ ابن عباس کے نابینا ہونے والی روایت کا جواب ۲۰۸
- امام زین العابدینؑ اور محمد حنفیہ کا امامت میں اختلاف؟؟ ۲۱۱
- حضرت امام زین العابدینؑ کی امامت پر حجر اسود کی گواہی ۲۱۲
- جناب مختار ثقفیؒ اور محمد حنفیہؒ کی امامت کا مسئلہ ۲۱۵
- مختارؒ کی مدح وقدح میں روایات اور کتاب رجال کشی پر تبصرہ ۲۱۶
- کیا زید شہیدؒ نے واقعی امامت کا دعویٰ کیا تھا؟ ۲۱۸
- حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور زید شہیدؒ کے مابین مباحثہ ۲۲۲
- علامہ مجلسیؒ کا معقول جواب ۲۲۳
- محمد نفس زکیہ کی امامت کا مسئلہ ۲۲۵
- نتیجۂ کلام ۲۲۹

باب ۷ عظمتِ قرآن اور تحریفِ قرآن کی حقیقت ۲۳۱

- سب سے پہلے جامع قرآن حضرت علی علیہ السلام ہیں ۲۳۴
- دس لاکھ ستائیس ہزار حروف والا قرآن ۲۳۸
- حضرت عبداللہؓ بن عمر کا تحریف قرآن کے متعلق اعتراف ۲۳۹
- نبی اکرمؐ کے زمانے میں سورۃ الاحزاب دو سو آیات پر مشتمل تھی ۲۴۰
- علامہ انور شاہ محدث کشمیری قرآن میں لفظی تحریف کے معترف تھے ۲۴۴
- ھکذا انزلت، نزلت وغیرہ الفاظ سے مؤلف کا احمقانہ استدلال ۲۴۶
- جری وتطبیق ۲۴۸
- قرآن کریم کی بعض آیات میں حضرت علیؑ کا نام پڑھا جاتا تھا ۲۴۸
- ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' ۲۵۰

- کیا شراب خور خلفاء کی خاطر قرآن بدل دیا گیا؟؟ ۲۵۱
- مؤلف کو اپنے کفر کا اعتراف کرنا چاہئے ۲۵۲
- مؤلف کے مغالطات اور ان کے جواب ۲۵۴
  - پہلا مغالطہ ۲۵۵
  - دوسرا مغالطہ ۲۵۷
  - تیسرا مغالطہ ۲۶۰
- خلاصۂ بحث ۲۶۱
- علماءِ اہل سنت سے شیعہ نقطہ نظر کی تائید ۲۶۲
- علمی بددیانتی اور خیانت کا ارتکاب ۲۶۵
- کتاب "اظہار الحق" کے شائع شدہ وہ نسخے جن میں حذف شدہ متن موجود ہے ۲۶۶

باب ۸ ناصبیت نے امت کو قرآن کے بدلے کیا دیا؟ ۲۷۷

- مؤلف کی بددیانتی اور کج فہمی ۲۷۸
- مؤلف کی انتہائی حیاسوز خیانت اور تحریف ۲۸۲
- صحیفہ، جفر، جامعہ اور مصحف فاطمہؑ کا تعارف ۲۸۴
- کتاب الجفر کے بارے میں علماءِ اہل سنت کی واضح تصریحات ۲۸۶
- فروع کافی کی عبارت سے اغماض "جہالت یا بددیانتی" ۲۸۹
- جناب ابو بصیرؓ کی مذمت والی روایت کا مدلل جواب ۲۹۲
- ہر سال شب قدر احکام کے اترنے پر اعتراض ۲۹۳
- الصافی کی عبارت نقل کرنے میں دجل و فریب ۲۹۴
- توضیح مرام ۲۹۶
- علماء اہل سنت کا اعتراف حق ۲۹۷
- خانوادۂ نبوت یا جوتشی گھرانہ (معاذ اللہ) ۳۰۰

باب۹ رجعت کا مفہوم اور اس کی حقیقت ۳۰۵

- مؤلف کی مغالطہ آفرینی اور خیانت ۳۰۷
- اثبات رجعت کے دلائل ۳۰۸
- محقق اہلسنت کا اقرار رجعت ۳۱۰
- امام مہدی علیہ السلام کی ولادت باسعادت اور غیبت کا انکار ۳۱۰
- حضرت امام مہدیؑ اور انبیاء کرامؑ کی ولادت میں مماثلت ۳۱۲
- حضرت امام مہدی علیہ السلام انبیاء کرام علیہم السلام کے تبرکات ساتھ لائیں گے ۳۱۹
- امام مہدیؑ کی والدہ کا امام حسن عسکریؑ کے ساتھ ازدواج کا قصہ ۳۲۱
- امام مہدی علیہ السلام کے تین سو تیرہ خصوصی نمائندے ۳۲۳
- رسول اللہؐ اور حضرت علیؑ امام مہدی کی بیعت کریں گے؟ ۳۲۴
- امام مہدیؑ ناصبی و خارجی قاریوں کو قتل کریں گے ۳۲۸
- امام مہدی کافروں سے پہلے سنیوں اور انکے عالموں سے کاروائی کرینگے؟ ۳۲۸
- شیعہ کے امام مہدی ننگے ظاہر ہوں گے؟ ۳۳۱
- نبی اکرمؐ اور فاطمہ الزہراؑ کی قبریں کھودنے والا معاویہ کا پوتا ہوگا ۳۳۴

باب۱۰ نکاح متعہ کا شرعی جواز ۳۴۰

- اسلام دین فطرت ہے ۳۴۰
- نکاح کیا ہے؟ ۳۴۰
- نکاح کے مقاصد ۳۴۱
- نکاح موقت کا اسلامی شریعت میں جواز ۳۴۲
- مہر کی مقدار پر اعتراض ۳۴۴
- نکاح متعہ میں گواہوں کا مسئلہ ۳۴۷
- نکاح متعہ سے پیدا ہونے والے قریشی ۳۴۹

❖ لمحۂ فکریہ!	۳۵۱
❖ باہم وارث نہ ہونے کا نکاح کی عدم صحت سے کوئی تعلق نہیں ہے	۳۵۲
❖ کیا نکاح متعہ آیت "اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ" سے منسوخ ہو چکا ہے؟	۳۵۴
❖ حضرت عمر کے اعلان (حرمت متعہ) پر صحابہ کرامؓ کا اختلاف	۳۵۹
❖ وہ صحابہؓ و تابعینؒ جو نکاح متعہ کے تاحیات قائل رہے	۳۶۳
❖ معاویہ اپنی ممتوعہ کو ہر سال وظیفہ دیتا تھا	۳۶۵
❖ حضرت اسما بنت ابی بکرؓ نے نکاح متعہ کیا ہے	۳۶۵
❖ نکاح متعہ کو حضرت عمر نے حرام قرار دیا	۳۷۰
❖ حضرت علیؑ نے نکاح متعہ کے بارے میں جناب عمر کی مخالفت کی ہے	۳۷۲
❖ نکاح متعہ ہزار عورتوں سے ہو سکتا ہے؟	۳۷۳
❖ ثواب متعہ پر تمسخر اور اس کا جواب	۳۷۶
❖ ممتوعہ عورت کے بارے میں تفتیش کی ضرورت ہے یا نہ؟	۳۸۰
❖ حضرت علیؑ نے حضرت عمرؓ کی بہن سے متعہ کیا؟	۳۸۲
❖ مسلمان بیوی کی موجودگی میں اہل کتاب عورت سے نکاح متعہ کا جواز	۳۸۴
❖ متعہ پر ثواب کے درجات والی روایت کا تحقیقی جواب	۳۸۶
❖ پیشہ ور زانیہ عورت سے نکاح متعہ کرنا کیسا ہے؟	۳۸۹
❖ عبارت میں خیانت کارانہ تحریف!	۳۹۰
باب ۱۱ اسلام میں تقیہ کا جواز	۳۹۲
❖ شاہ عبدالعزیز دہلوی تقیہ کی مشروعیت کے قائل ہیں	۳۹۵
❖ "کلمۂ حق عند سلطان جائر" کا صحیح مفہوم	۳۹۷
❖ زمانہ بنی امیہ میں لوگ تقیہ کیے ہوئے تھے	۳۹۹
❖ روایت نقل کرنے میں دجل و فریب	۴۰۱

- جبر و اکراہ کے وقت نبی پاکؐ کو گالی دینا جائز ہے ۴۰۳
- تارک تقیہ تارک نماز کی طرح ہے ۴۰۴
- تقیہ کر کے مخالفین کے پیچھے نماز پڑھنے کی ضرورت کیوں؟ ۴۰۵
- برسر اقتدار افراد اور خاندان نبوت میں شدید اختلاف تھا ۴۰۸
- جب حضرت علی علیہ السلام پر سب کیا گیا تو اکثریت کیوں خاموش تھی؟ ۴۱۰
- حضرت علی علیہ السلام کے مبنی بر حق الزامیہ دلائل ۴۱۲
- حضرت علی علیہ السلام نے اپنا موقف دہرایا ۴۱۴
- حضرت علی علیہ السلام چونکہ مثل ہارونؑ تھے سنت ہارونیؑ پر عمل کیا ۴۱۵
- شرعی احکام کے عدم ترویج کی وجوہات ۴۱۷
- بحالتِ تقیہ ائمہؑ کا باہم اختلاف اور اس کا معقول جواب ۴۲۱
- خنثیٰ کے ترکہ کے متعلق امام کا برجستہ جواب ۴۲۴
- امامت اور ولایت کے اہم مقاصد کا ادراک نہ کرنے کی بنا پر احمقانہ استدلال ۴۲۵
- حضرت امام جعفر صادقؑ کی امامت پر اعتراض اور اصول کافی کی عبارت میں خیانت ۴۲۷
- نماز توڑنے والی چیزیں تقیہ کی حالت میں کی جائیں تو نماز نہیں ٹوٹتی ۴۲۸
- مخالفین سے ظاہر رواداری کا معاملہ ؟ ۴۲۹
- ائمہ اہل بیتؑ کے تقیہ پر مؤلف کا بے جا اعتراض ۴۳۱
- حضرت امام زین العابدینؑ کا تقیہ اور مؤلف کی نکتہ چینی ۴۳۴
- تقیہ کے عدم جواز کے قائل صرف خارجی ہیں ۴۳۶
- حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی کے باہمی اختلافات کا اجمالی تذکرہ ۴۳۷
- مؤلف کی کج فہمی اور حق الیقین کی عبارت میں تحریف کا ارتکاب ۴۴۰

باب ۱۲ **قاتلانِ امام حسینؑ کا تعارف** ۴۴۳

- کیا شہادت ایک مصیبت ہے؟ ۴۴۵

◈ ذرا جواب دیجئے!! ۴۴۸
◈ تشکیکات وتلبیسات کا بطلان ۴۴۸
◈ حضرت امام حسینؑ کے اپنی والدہ کا دودھ نہ پینے کی اصل وجہ ۴۵۱
◈ مؤلف کی تلبیس ہی تبلیس ۴۵۴
◈ معاویہ اور حضرت امام حسن وحسین علیہ السلام کے باہمی مخاصمات ۴۵۵
◈ معاویہ نے حضرت امام حسنؑ کو زہر دلوایا نہ کہ شیعوں نے ۴۵۶
◈ اشعث بن قیس سے رشتہ داری کا پس منظر ۴۵۹
◈ ایک عجیب لطیفہ ۴۶۰
◈ معاویہ کے خلاف امام حسینؑ کے خروج نہ کرنے کی اصل وجہ ۴۶۱
◈ معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو کیا وصیت کی تھی؟ ۴۶۴
◈ معاویہ نے امام حسین علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی ۴۶۶
◈ معاویہ کے دور آمریت میں صحابہؓ وتابعینؒ کا وظائف قبول کرنا ۴۶۸
◈ قاتلان حسینؑ کون؟ ۴۷۰
◈ بعض صحابہ اور فرزندان صحابہ قتل حسینؑ میں شریک تھے ۴۷۳
◈ قاتلان حسینؑ نے ناصبی ہونے کا خود اعتراف کیا ۴۷۶
◈ فیصلہ کن بات ۴۸۱
◈ نتیجۂ بحث ۴۸۳
◈ یزید کا خصوصی مشیر مروان ناصبی تھا ۴۸۴
◈ یزید بن معاویہ ناصبی تھا ۴۸۴
◈ عبیداللہ کے باپ زیاد بن ابیہ کی ناصبیت ۴۸۶
◈ زجر بن قیس کندی ثقہ، بڑے تابعین سے تھا (معاذ اللہ) ۴۸۷
◈ قاتلانِ حسینؑ کے حامی اور پیروکار کون ہیں؟ ۴۹۰

- امام حسینؓ کو خطوط لکھنے والوں میں شبث بن ربعی تمیمی بھی تھا ۴۹۲
- امام حسینؓ کو کوفہ بلانے والے صحابہؓ اور دیگر اہم شخصیات ۴۹۴
- سلیمان بن صرد الخزاعی الکوفی الصحابیؓ کی صحابیت مسلّم ہے ۴۹۵
- خلاصۂ کلام ۵۰۰

باب ۱۳ فتنۂ تکفیر اور اس کا مدلل جواب ۵۰۱

- ایک فریق کی دوسرے کے خلاف گواہی اور فیصلہ معتبر نہیں ہے ۵۰۸
- ابو حنیفہ کے بارے میں شیخ عبد القادر جیلانی کی رائے ۵۰۹
- ابن حزم ظاہری کی تکفیر سازی ۵۱۲
- ابن تیمیہ کے بارے میں علماء کی آراء ۵۱۳
- ابن تیمیہ پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے ۵۱۵
- امام غزالی اور امام الحرمین پر کفر کا فتویٰ ۵۱۷
- حنفی، شافعی، حنبلی کی باہمی خونریزی اور ان کا ایک دوسرے کو کافر کہنا ۵۱۷
- ’’دیوبندیوں کے نزدیک تمام بریلوی سنی گمراہ اور مشرک ہیں‘‘ ۵۲۲
- ’’بریلوی سنیوں کے نزدیک دیوبندی بدترین کافر اور مرتد ہیں‘‘ ۵۲۳
- کیا یہی اسلام ہے؟ ۵۲۵

نواصب کے بارے میں شریعت کا حکم ۵۲۶

- ناصبی کی تعریف ۵۲۶
- رسول اللہ ﷺ کا نواصب کے بارے میں قطعی حکم! ۵۲۷
- رسول اللہ حضرت علیؑ اور ابن عباسؓ کا نواصب کے بارے میں حتمی فیصلہ ۵۲۷
- تمام اہل سنت کا نواصب کے بارے میں صحیح فیصلہ! ۵۲۸
- لمحۂ فکریہ! ۵۲۸
- حرف آخر ۵۲۹

اظہار تشکر و امتنان

اس پر آشوب اور کٹھن دور میں جہاں بڑے ذمے دار اور مخلص افراد بھی معاشرتی مجبوریوں کے اسیر ہیں، علمی و تحقیقی امور میں معاونت بہت جرأت کا کام ہے۔ انحطاط و تنزل کے اس ہنگام میں زندگی بسر کرنے والا ہر انسان اپنے ذاتی اور گروہی ارتقاء کی طرف میلان رکھتا ہے لیکن صد آفرین ان ہستیوں پر جو ان تمام مسائل سے نبرد آزما ہونے کے باوجود معنوی اقدار اور علمی و تحقیقی کاموں میں بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ میں ان شخصیات کا تہہ دل سے بے حد ممنون اور شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تاخیر اشاعت کو تشویش و اضطراب کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے دامے، درمے ادارے کے ساتھ تعاون کیا اور اپنے گراں بہا مشوروں سے بھی مستفیض فرما کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ بموجب **اذا راد اللہ شیئا اس اسبابہ**۔ کہ جب اللہ تعالیٰ چاہے تو اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

یہ لاجواب کتاب تیاری، جدید کمپوزنگ، تزئین اور اشاعت کے بعد جس خوبصورتی کے ہمراہ آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ سب انہی کرم فرماؤں کا احسان ہے۔ ان کے لئے راقم کا ہر موئے تن بدن پہ زبان سپاس ہے۔ خالق ارض و سماء کو اس چمن کی خود آبیاری کرنا تھی چونکہ

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

بارگاہ خدائے متعال میں دست بدعا ہیں کہ وہ ایسی شخصیات کو تا قیامت انہی صلاحیتوں سے مالا مال رکھے، ان کو دارین کی سعادت عطا فرمائے اور مسلک حق کی ترویج و معاونت میں توفیق رفیق نصیب فرمائے آمین۔

نیاز مند

ڈائریکٹر مرکز مطالعات اسلامی

انتساب

اپنی یہ تالیف مذہب حق کے دفاع اور ناصبیت کے پر فریب مکائد کو آشکار کرنے کی پاداش میں رتبہ شہادت پر فائز ہونے والے علمائے حق (بالخصوص شہید اول محمد بن مکی بن شمس الدین محمد الدمشقی العاملیؒ جنہیں ۷۸۶ ہجری کو ایک سال قید کے بعد تلوار سے شہید کر کے تختہ دار پر کھینچا گیا۔ پھر لاش مقدس نذر آتش کر کے راکھ فضائے بسیط میں اڑا دی گئی۔

شہید ثانی زین الدین علی بن احمد العاملیؒ جنہیں ۹۶۶ ہجری میں ناصبیوں نے دو اونٹوں سے باندھ کر مخالف سمتوں کی طرف چلایا تو آپ کا جسم مبارک دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ پھر ناصبیوں نے آپ کی لاش کو نذر آتش کر کے غیظ و غضب کی آگ کو مزید ٹھنڈا کیا۔

شہید ثالث قاضی القضاۃ سید نور اللہ بن شریف الحسینی الشوستریؒ جنہیں ۱۵۱۹ء میں ناصبی ملاؤں کے غلیظ فتوؤں کی بدولت شہنشاہ جہانگیر نے شہید کرنے کے بعد اتنے تازیانے مارے کہ اس سید زادے کا جسم نازنین ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

شہید رابع مجاہد کبیر حضرت علامہ مرزا محمد الدہلویؒ جنہیں نواح دہلی میں ریاست جھجر کے متعصب حکمران نے محبت اہل بیتؑ کے جرم میں خود زہر دے کر شہید کر دیا۔ یہ سانحہ ۱۸۲۰ء میں رو پذیر ہوا)۔ یہ ایسی وادی کے مسافر تھے جس کا راستہ مصائب کے خاروں سے اٹا پڑا ہے ان کی بارگاہ عظمت پناہ میں بصد عقیدت و نیاز پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جن کے فیوض و برکات سے عالم تحقیق و تدقیق میں نبض حیات تپش آمادہ ہے۔

سوئے دریا تحفہ آوردم صدف
گر قبول افتد زہے عز و شرف

ناچیز آفتاب حسین جوادی

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الواحد القہار المتفرد بالعز و الوقار و الصلاۃ و السلام علی محمد عبدہ و رسولہ و خیرتہ من الاخیار و علی آلہ الطیبین الطاہرین الابرار الذین بولائہم ینجو المؤمنون عذا من النار و بحبہم یسکن المجبون جنات تجری من تحتہا الانہار و لعنۃ اللہ علی اعدائہم الاشرار لعنۃ دائمۃ ما دام اللیل و النہار۔

ابتدائے آفرینش سے حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ ضرب کلیم سے فرعونی لشکروں، تیشہ ابراہیمؑ سے نمرودی بت کدوں اور چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی کی ستیزہ کاری ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ حق کی طرف سے باطل کی اس یورش اور طوفان بدتمیزی کو روکنے کے لئے اسلامی تاریخ کے اوراق پر انتہائی انتھک جدوجہد اور جوانمردی کی ایسی مثالیں رقم کر دی گئیں، جو رہتی دنیا تک جگمگاتی اور قافلہ اہل حق کے دلوں کو گرماتی رہیں گی ہر عہد میں اہل باطل کی گولیاں اور تلواریں موسلا دھار بارش کی طرح اہل حق کے جسم نازنین پر برستی رہیں لیکن ان کے پایۂ استقلال میں ذرا برابر بھی جنبش نہ آئی، بلکہ اپنے لہو سے اسلام کے دبستان کو سینچنے کی سعادت حاصل کی، حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور ان کی اہل بیت اطہار علیہم السلام کے عشق میں جینے اور ان کی محبت پر مرنے کے جذبے کو اپنے ایمان کی بنیاد قرار دیا۔ اور اپنے کردار و عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے نظریات اور عزائم میں کس حد تک مخلص ہیں۔ باطل طاغوتی قوتوں سے ٹکرانا تو ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ باطل کی تردید کے لئے شمشیر براں سے بڑھ کر لسان صدق، حق کے دفاع کے لئے پہاڑوں جیسا مضبوط دل، برق تپاں سے بڑھ کر تیز قوت راست، سیل جرار جیسے پیہم عمل اور عزم صمیم کی سرفرازیوں سے ہمکنار ہوئے۔

تاریخ کے دریچے سے جھانکنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اہل باطل اسلام دشمنی میں صدیوں

سے اہل حق کے خلاف صف آراء نظر آئے۔ ان کی گزشتہ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ دہشت گردی اور مسلمانوں کی خونریزی تو ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو دھوکہ وفریب میں مبتلا کر کے اپنے آپ کو "اہل سنت مسلمان" ظاہر کیا اور اسی آڑ میں اپنی مکروہ سازشوں کو عملی جامہ پہناتے رہے۔ اور ہر دور میں امت اسلامیہ میں انتشار وافتراق کو مسلسل ہوا دیتے رہے جس سے دشمنان اسلام اپنے مفادات حاصل کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اب بھی ناصبیت کے ناپاک حربوں کو کام میں لا کر اسلامی ممالک میں سادہ لوح مسلمانوں کا ایمان سلب کرنے کی کوششوں میں ان کی مصروفیت برقرار ہے۔ ناصبیت چودہ سو سال سے اہل بیتؑ کی عظمت وافضلیت کے خلاف نبرد آزما ہے۔ کعب الاحبار یہودی کی ناپاک ذریت نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسند کے حقیقی وارثان کے خلاف نہایت جسارت آمیز اور گستاخانہ کلمات اور ان ذوات مقدسہ پر ناروا الفاظ کے ذریعے اپنی سیاہ بختیوں میں اضافہ کیا۔ ان نواصب نے ہر مسلمان حکمران کے پہلو میں منافقت کی چادر کے زیر سایہ پرورش پا کر مارِ آستین کا کردار ادا کیا۔ عصر حاضر میں بھی ماضی کی طرح یہودیوں کی تائید اور پشت پناہی سے ایک بار پھر عالم اسلام بالخصوص مملکت خداداد پاکستان میں انہوں نے دہشت گردی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

وطن عزیز میں یہود کی پشت پناہی اور خفیہ تائید سے نواصب عرصہ دراز سے اپنے اسلاف کے مکروہ عزائم کو آگے بڑھاتے ہوئے امت مسلمہ میں افتراق وتشتت پیدا کرنے اور فتنہ وفساد پھیلانے کے لئے ہمہ وقت مصروف ہیں۔ مغالطوں اور کذب وفریب پر مبنی تقریر وتحریر کے ساتھ ساتھ دہشت گردی، قتل وغارت گری، لوٹ مار اور فحش کلامی کو ان لوگوں نے اپنے ناپاک مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیا۔

دیگر دجالی مغالطوں اور شبہات کے ساتھ موجودہ دور کے ان چند دریدہ دہن نواصب نے باہم مل کر شرانگیز، غلیظ اور کذب وافتراء پر مشتمل کتاب بعنوان "خطبات جیل" (جو دراصل "ہفواتِ جاہل" کہلانے کی سزاوار ہے) شائع کرنے کی جسارت کی ہے۔ یہ کتاب کوئی جدید تحقیق اور تحریر نہیں بلکہ ایک پرفریب اور سراپا تزویر ہے۔ انہوں نے کسی خفیہ طاقت کے ایماء پر

مسلمانوں کے مابین افتراق اندازی اورنفرت انگیزی کی آگ بھڑکانے کے لئے ماضی قریب کے مشہور ناصبی مولوی عبد الشکور لکھنوی کی اخبار ''النجم'' و دیگر رسائل، یوسف لدھیانوی کی کتاب ''شیعہ سنی اختلافات اور صراطِ مستقیم'' سے اکثر مواد حاصل کیا نیز مولوی منظور نعمانی ناصبی کے رسوائے زمانہ رسالہ ''ایرانی انقلاب اور امام خمینیؒ'' سے بھونڈے اعتراضات اور بے بنیاد الزامات کا چربہ اور سرقہ کر کے ابو معاویہ مولوی اعظم طارق کے نام سے از سر نو شائع کر دیا ہے۔ جو بموجب ''خوئے بد را بہانہ بسیار'' محض حقیقت ناشناس حواریوں کو خوش کرنے کا ایک ناکام بہانہ ہے۔ چونکہ یہ کتاب بظاہر مولوی اعظم طارق کے نام سے ہی منظر عام پر آئی ہے لہٰذا ہم جواب دیتے وقت صرف اسی کو ہی مؤلف کے نام سے مخاطب کریں گے۔ واضح رہے کہ اس غلیظ کتاب میں بعض ایسی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری اور اشاعت کے پیچھے پاکستان میں موجود ایک یہودی آلہ کار جماعت کا ہاتھ ہے جس سے دانائے راز خوب آگاہ ہیں۔ **الاشارة ابلغ من التصريح۔**

اس طبقہ نے ''اہل سنت'' کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں پر ایسے ایسے قیامت خیز مظالم ڈھائے کہ اسلام کی تاریخ کے صفحات پر ایسے کسی ایک ظلم کی مثال نہیں ملتی اور انہوں نے اسلام کی تاریخ پر ظلم و جبر کے جو نقوش ثبت کئے ہیں اس کے مطالعہ سے ہر انسان بخوبی جان سکتا ہے کہ ناصبیت کی بنیاد ہی اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کیلئے رکھی گئی ہے ہمارے بعض برادرانِ اہلسنت ان کے ''عظمت صحابہ''، ''دفاع صحابہ'' اور ''سپاہ صحابہ'' کے لیبل دیکھ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں حالانکہ درحقیقت اسی کے پردے میں اسلام اور ہر عہد کا مسلمان ان کی ابلہ فریبیوں اور مغالطہ آفرینیوں کے تیروں سے چھلنی ہوتا رہا۔ جب ہم تاریخ ماضی کے اوراق کی ورق گردانی کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اہل حق ہمیشہ باطل کے مظالم و شدائد کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ باطل نے حق کو دبانے کیلئے اپنی پوری قوت و توانائی صرف کر دی لیکن اہل حق کو جس قدر دبایا گیا وہ اس قدر ابھرتے گئے ؎

مصائب لاکھ بڑھ جائیں عزائم کم نہیں ہوتے
یہ وہ سر ہیں جو کٹ جاتے ہیں لیکن خم نہیں ہوتے

اسی تسلسل میں ملت اسلامیہ کو گمراہ کرنے اور فریب میں مبتلا کرنے کی غرض سے یہ کتاب شائع کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ کتاب اس قابل تو نہ تھی کہ اس کو درخور اعتنا سمجھ کر جواب لکھا جائے چونکہ اس کتاب میں خانوادۂ عصمت و طہارت کی پاک سیرت و کردار کے روشن نقوش دھندلانے اور مذہبِ اہل بیتؑ کو داغدار کرنے کی مذموم کوشش بروئے کار لائی گئی اور ان نفوس قدسیہ کی شان میں گستاخانہ اسلوب اختیار کیا گیا نیز اس گمراہ کن پروپیگنڈے سے بعض سادہ لوح مسلمانوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ تھا بنابریں مجبوری حقیقت نوائی اور باطل کی سرکوبی کے لئے قلم اٹھانا پڑا تاکہ حق پسند مسلمان اس کی شر پسندانہ فریب کاری سے محفوظ ہو جائیں اور انہیں خود بھی اپنا حدود اربعہ نظر آسکے اور ان کی طرف سے طعن و تشنیع اور تجہیل و تعلّی کا مکمل طور پر تحلیل و تجزیہ کر دیا ہے ہر زیر بحث مسئلہ کو پوری تحقیق و تفتیش اور مستند تاریخی حوالہ جات کے ساتھ تحریر کرنے کی سعی بلیغ کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے سب سے زیادہ استفادہ اپنے ذاتی کتب خانہ سے ہی کیا ہے

فله الحمد و الشكر الف الف مرةً۔

آفتاب حسین جوادی

رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ/ نومبر ۲۰۰۲ء

باب ۱

اسلام کے خلاف یہودی یلغار

کتاب ''خطبات جیل'' کے مؤلف نے مذہب حق کے خلاف انتہائی غلیظ زبان استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ کذب و افتراء اور دجل وفریب سے اپنی کتاب کی شکم پری کی ہے۔ کہیں حوالہ غلط، کہیں ترجمہ غلط، اور شیعہ کتب سے عبارات نقل کرنے میں انتہائی بد دیانتی اور خیانت کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور کسی جگہ عبارت کے سیاق وسباق کو نظر انداز کرکے درمیانی جملوں کو لے کر غلط بیانی اور ابلہ فریبی کو بروئے کار لایا گیا، اور اپنے تشدد مزاجی کی وجہ سے اکثر مقامات پر تشدد اور ہٹ دھرمی کا پہلو، تنقید نگاری میں سوقیانہ پن جابجا اپنایا ہے جسے ہم آئندہ صفحات میں سامنے لائیں گے۔ بقول اقبالؒ

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر، پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

چنانچہ عنوان ''شیعیت یہودیت و عیسائیت کی راہ پر'' کے ذیل میں یوں گوہر افشانی کرتے ہیں:

''گروہ شیعہ کا بانی چونکہ عبد اللہ بن سبا یہودی تھا اس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اولاً مسلمانوں کو حضرت علیؓ کے وصی رسول وخلیفہ اول ہونے کا سبق پڑھانے کی کوشش کی۔۔۔''

اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ایک حدیث نقل کرکے اس کا نتیجہ اس طرح اخذ کیا ہے۔

''اس حدیث کو سامنے رکھ کر جب ہم حضرت علیؓ سے بغض رکھنے والے گروہ کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں خارجی گروہ نظر آتا ہے جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ دائرہ اسلام سے خارج قرار دے کر آپ سے جنگیں تک لڑنے سے گریز نہیں کیا اور حتیٰ کہ آپ کی شہادت بھی

عبد الرحمٰن ابن ملجم خارجی ملعون کے ہاتھوں ہی ہوئی۔ اور دوسرا گروہ جس نے آپ سے محبت کا دعویٰ کر کے عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ کو الوہیت کے مقام تک جا پہنچایا تو وہ عبد اللہ بن سبا اور اس کی ذریت شیعہ کا گروہ ہے۔" (خطاب جیل، صفحہ ۲۱ تا صفحہ ۲۲)

الجواب:۔ اسلام کے ازلی دشمن یہود تھے، جن کی سابقہ تاریخ بھی اس امر پر شاہد تھی، انہوں نے بہت سے خود ساختہ نظریات کو اپنا دین بنا رکھا تھا، حتیٰ کہ ان نظریات و خیالات کے خلاف بات کرنے پر انہوں نے بہت سے انبیائے بنو اسرائیل کو ہلاک کر دیا اور بہت سے نبیوں کی تکذیب کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾۔

جب بھی کوئی رسول تمہارے پاس وہ احکام لے کر آیا جو تمہارے من گھڑت عقیدوں کے خلاف ہوتے تو تم بڑائی کرنے لگتے، ایک جماعت (انبیاء) کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کیا۔" (سورۃ البقرہ آیت ۸۷)

جب اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی تو یہ بھی ان کی خواہشات اور باطل نظریات کی نفی کرتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے مشرکین مکہ کا اسلام دشمنی میں دامے درمے سخنے ساتھ دیا لیکن یہودی قریشی اتحاد بتدریج شکست سے دوچار ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ مدینہ منورہ یہودیوں سے تقریباً پاک ہو گیا۔ صرف بنو قریظہ کی عورتیں اور نوعمر لڑکے باقی رہ گئے تھے، جنہیں غزوہ بنو قریظہ کے بعد قید کر کے غلام بنا لیا گیا تھا، یا دیگر یثربی یہودیوں میں سے وہ لوگ مدینہ میں باقی رہ گئے تھے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ باقی افراد نے اپنا مرکز خیبر کو بنایا ہوا تھا۔ جب خیبر بھی فتح ہو گیا تو یہودیوں کی خطرناک ترین مہم شروع ہوئی۔ انہوں نے اسلام کے خلاف اندرونی سازش پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری طرف ان کے قریشی اتحادی، جن کی قیادت بعض تو طوعاً اور اکثر کرہاً اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے۔ جس طرح پہلے اموی قیادت میں یہودی قریشی اتحاد تھا اسی طرح شکست کھانے اور کفر و عناد اور جحود و استکبار پر مصر رہنے کے بعد اسلام کے خلاف خفیہ منصوبے کے

لئے بھی یہ اتحاد جاری رہا۔

ان منافقین نے باہم مل کر متعدد بار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، لیکن ناکام رہے، اس منصوبے میں انہوں نے بعض اہم شخصیات کو بھی شامل کرلیا تھا۔ اب ان کا منصوبہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راستے سے ہٹا کر اپنی پسند کے کسی شخص کو مسلمانوں کی قیادت سونپ دی جائے جو دراصل ان کا کٹھ پتلی ہو، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان یثربی یہودی اور قریشی اموی منافقین کے منصوبے کے برعکس سابقہ انبیاء علیہم السلام کے طریقے پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے متعدد مواقع پر اپنے بعد مسلمانوں کی قیادت اور امامت کے لئے اپنے جانشین نامزد کردیئے تھے۔ یہودی دجالوں نے اموی قریشیوں کی مدد سے اسلام کی بیخ کنی کا پختہ ارادہ کرلیا۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے حقیقی رہنما اور امام حزب اختلاف بنادیئے گئے بلکہ ان کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کا مظاہرہ کیا گیا، اگر وہ مناسب حکمت عملی کو الٰہی ہدایات کے مطابق اختیار نہ کرتے تو یہودی قریشی (اموی) اتحادی انہیں قتل کرنے کے لئے تیار تھے۔ ایک طرف انہوں نے حقیقی اسلام کے مقابلے میں تحریفات کے ذریعے سرکاری مذہب کو رواج دیا تو دوسری طرف اصل اسلام کے نمائندے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامزد مسلمانوں کے امام کے ساتھ بھی ایک مرحلے پر ہمدردی کا اظہار کرنے کیلئے اپنے نمائندے بھیج دیئے تاکہ وہ اصلی اسلام میں بھی نقب لگا کر اسے پاش پاش کردیں۔ ان میں سے کعب احبار، عبداللہ بن سلام، وھب بن منبہ وغیرہ پر مشتمل ایک گروہ ہے جس نے اسلام کو محرف کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا۔

عبداللہ بن سلام، کعب احبار وار وھب بن منبہ کے اسلام میں داخل ہونے کے مقاصد

عبداللہ بن سلام بن حارث اسرائیلی تھے لیکن انصار میں سے ایک قبیلے کے حلیف تھے۔ ان کا تعلق یثرب کے یہودی قبیلے بنوقینقاع سے تھا۔ مشہور یہی ہے کہ جونہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے، اسی وقت عبداللہ بن سلام بظاہر حلقہ بگوش الام ہوگئے۔ ان کے قبیلے بنوقینقاع کو ان کی بدعہدی اور غداری کی بناء پر شوال ۲۰ ہجری میں مدینہ منورہ سے شام کے

علاقہ اذرعات کی طرف جلاوطن کر دیا گیا اور مسلمانوں نے ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے تقسیم کر لیا۔ لیکن عبد اللہ بن سلام حلقہ بگوش اسلام ہونے کی وجہ سے مدینہ منورہ میں ہی مقیم رہے۔ چونکہ یہ شخص ظاہری طور پر صحابی رسول بھی تھا اور عام مسلمانوں پر اپنے علم کی دھاک بٹھالی تھی۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی روایات کے لباس میں اسرائیلیات کو خوب پھیلایا۔ اس طرح اسلامی شریعت میں یہودی محرفہ و ممسوخہ شریعت کو شامل کر دیا۔ علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء ج ۲، ص ۴۲۰۔۴۲۴ میں لکھا ہے کہ قدمر موت عبد الله بن سلام فی ستة ثلاث و اربعین بالمدینة ۔ عبد اللہ بن سلام کی موت مدینہ منورہ میں ۴۳ ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ چنانچہ اتنے طویل وقت میں اس شخص نے اپنے دیگر ساتھیوں، کعب احبار، وہب بن منبہ، بنو قریظہ کے پیچھے رہ جانے والوں اور طلقاء مکہ (بالخصوص اموی منافقین) کی مدد سے اپنا منصوبہ، یعنی اسلام کا حلیہ بگاڑنا، مکمل کر لیا۔

استاذ محمود ابوریہ، جو عصر حاضر کے مصری علماء میں سے انتہائی نامور اور محقق عالم دین مانے جاتے ہیں، نے اپنی معروف کتاب ''اضواء علی السنة المحمدیه او دفاع من الحدیث'' میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس سلسلے میں عوام کی نظروں سے اوجھل بہت سے حقائق کو سامنے لائے ہیں۔ چنانچہ اپنی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۴۵ مطبوعہ دار المعارف مصر میں ''الاسرائیلیات فی الحدیث'' کے عنوان کے تحت جو حقائق پیش کئے ہیں ان میں سے ضروری اجزاء کا ترجمہ نذر قارئین کیا جاتا ہے تاکہ منصف مزاج قارئین یہ امر جان لیں کہ اسلام کو کس طرح محو کر کے اس کی جگہ اسرائیلی موضوعات و مفتریات کو اسلام کے نام پر شائع کر دیا گیا، لکھتے ہیں:

> ''جب دعوت محمدیہ کی طاقت و شوکت میں اضافہ ہوگیا اور اس کے سامنے ہر قوت پاش پاش ہوگئی تو اس کی راہ روکنے کیلئے منصوبے بنانے والوں کو اس کے خلاف مکر و حیلہ اور دغا بازی سے کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اس لئے کہ اب وہ قوت اور جنگ کے ذریعے مقابلہ کر کے اسلام کی راہ روکنے سے عاجز آ چکے تھے۔''

چونکہ یہود مسلمانوں کے شدید ترین دشمن تھے، ان کا خیال تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا منتخب گروہ ہیں۔ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کی فضیلت کا اعتراف نہ کرتے تھے نہ ہی وہ موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی نبی کی رسالت پر ایمان لاتے تھے۔ چنانچہ ان کے علماء اور درویشوں (احبار و رھبان) کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ بالخصوص اس وقت جب وہ مغلوب ہوگئے اور اپنے گھروں سے جلاوطن کر دیئے گئے۔ کہ وہ مکاری اور فریب کاری کو استعمال میں لاکر اپنے مقاصد حاصل کریں (اسلام کو ناکام و مغلوب کر دیں) چنانچہ انہیں یہودی مکاری نے یہ راستہ دکھایا کہ وہ اسلام ظاہر کریں اور اپنا دین اپنے دلوں میں چھپا کر رکھیں تاکہ ان کا یہ منصوبہ مخفی رہتے ہوئے کامیاب ہو جائے۔ اور ان کا منصوبہ مسلمانوں پر حاوی ہو جائے۔ ان یہودی کاہنوں میں سے دھوکہ بازی اور مکاری میں انتہائی قوی اور شدید تر کعب احبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام تھے۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ ان کا یہ حیلہ جھوٹ موٹ تقویٰ اور پرہیزگاری کے روپ میں رائج ہو چکا ہے اور مسلمان ان کے بارے میں مطمئن ہیں اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان پر فخر بھی کرتے ہیں تو انہوں نے اپنا اولین مقصد یہی قرار دے لیا کہ مسلمانوں کے دین پر کاری ضرب لگائیں۔ یہ کام اس طرح کریں کہ جن اصول پر ان کا دین قائم ہے، ان میں جھوٹے قصے اور جھوٹی روایات شامل کر دیں۔ اسی طرح اوھام اور باطل اشیاء کو ان میں داخل کر دیں، تاکہ یہ اصول روبہ زوال اور کمزور ہو جائیں چونکہ وہ قرآن میں کمی بیشی کرنے سے عاجز آ چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احادیث بیان کرنے کی جانب توجہ کی۔ چنانچہ انہوں نے حسب خواہش جھوٹی احادیث وضع کیں اور اطراف و اکناف میں ان کی نشر و اشاعت کی۔ انہیں اس معاملے میں اس امر سے بھی مدد ملی کہ اپنی زندگی میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا وہ لامحدود ذخیرہ تھا اور اس کے اصول محفوظ نہ ہوئے تھے۔ اس لئے کہ آپؐ کے عہد میں احادیث کی کتابت نہ ہوئی تھی۔ آپؐ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی روایات نہ لکھی تھیں۔ اس لئے ہر ہوئی پرست اور بدنیت شخص کے لئے ممکن تھا کہ دین میں مفتریات اور موضوعات کو شامل کر دے اور جھوٹ کے ذریعے دین پر حملہ آور ہو جائے۔ ان کا یہ منصوبہ اس بنا پر بھی آسان ہو گیا کہ گزشتہ زمانے کے ایسے امور

جاننے کے لئے صحابہ بھی ان کی جانب رجوع کرتے تھے جن کی انہیں خود معرفت نہ ہوتی تھی۔ یہود کے پاس چونکہ کتاب تھی اور ان میں علماء تھے اس لئے وہ عربوں کے ان امور میں استاد مانے جاتے تھے جو سابقہ ادیان سے متعلق ہوتے اور عربوں کو ان کا علم نہ ہوتا۔"

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ منقول تفسیر میں ہر طرح کی خشک و تر اور مقبول و مردود روایات جمع ہو گئی ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے علماء یہود۔۔۔ **وهؤلاء مثل كعب الاحبار و وهب بن منبه و عبد الله بن سلام و امثالهم** ۔اسرائیلیات بیان کرنے والے کعب احبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام وغیرہ ہیں۔ مثلاً کعب احبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام) اور ان جیسے لوگوں سے روایات لی ہیں۔ چنانچہ تفاسیر ان کی منقولات سے بھر گئی ہیں۔ پھر مفسرین نے اپنی کتابوں کو ان روایات سے بھر دیا ہے۔

(مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۴۳۹۔۴۴۰، طبع قاہرہ۔ تفسیر المنار، ج ۹، صفحہ ۲۱، طبع دار المنار مصر)

اور ڈاکٹر احمد امین المصری نے اس حقیقت سے یوں پردہ اٹھایا ہے کہ "**اتصل بعض الصحابةؓ بوهب بن منبه و كعب الاحبار و عبد الله بن سلام و اتصل التابعون بابن جريج هولاء كانت لهم معلومات يرو و نها عن التوراة و الانجيل و شروحها و حواشيها۔۔**"

بعض صحابہ وہب بن منبہ، کعب احبار اور عبداللہ بن سلام سے اخذ کرتے رہے اسی طرح تابعین ابن جریج سے روایات لیتے رہے۔ انکے پاس تورات، انجیل اور ان کی شروحات و حواشی کی معلومات تھیں۔ (ضحیٰ الاسلام، ج ۲، ص ۱۳۹، الفصل الرابع الحدیث والتفسیر، طبع جدید بیروت)

ان اسباب کی بنیاد پر ان سب یہودی علماء نے دین اسلامی میں اکاذیب اور اباطیل کی خوب نشر و اشاعت جاری رکھی۔ کبھی تو یہ کہتے کہ یہ ان کی کتب میں ہے یا ان کے علم مخزون میں ہے اور کبھی یہ دعویٰ کرتے کہ یہ باتیں انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہیں حالانکہ درحقیقت یہ ان کی من گھڑت باتیں ہوتی تھیں۔ صحابہ ان یہودیوں کے اقوال میں سے سچ اور جھوٹ کی تمیز کس طرح کرتے جبکہ وہ عبرانی زبان سے ہی ناواقف تھے جو ان کی کتب کی زبان

تھی۔ دوسری وجہ ان کے نہ سمجھنے کی یہ ہے کہ صحابہ ان یہود سے سوجھ بوجھ اور منصوبہ سازی میں بہت کمزور تھے۔ اسی سبب سے ان میں ان یہود کے جھوٹ رواج پا گئے۔ اس طرح صحابہ اور تابعین نے ان فریب کاروں سے بغیر تنقید اور چھان بین کے ان کی تمام روایات قبول کرلیں یہ اعتماد کرتے ہوئے کہ یہ بلا شک وشبہ صحیح احادیث ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم بعض اسرائیلیات بیان کریں جن سے تفسیر، حدیث اور تاریخ بھری پڑی ہیں اختصار سے ان یہودی زعماء کے حالات بیان کرتے ہیں۔۔۔۔۔

کعب احبار اس کا پورا نام کعب بن ماتع حمیری ہے اور وہ کعب الاحبار یا کعب الحبر کے لقب سے مشہور ہے یہ یمن کا رہنے والا یہودی تھا اور اسے علماء یہود میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں اسلام کے دائرے میں داخل ہوا، مدینہ منورہ میں ہی اس نے قیام کیا۔ فتح بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کا ہمرکاب تھا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے زمانے میں وہ شام میں مقیم ہوگیا۔ (اس لئے کہ یہاں پہلے سے یہود کثیر تعداد میں موجود تھے اور اب انہوں نے اموی نواصب کے ساتھ مل کر شام کو اسلام کے خلاف کاروائی کے لئے مرکز بنانا تھا۔ حمص جہاں ناصبیت کا گڑھ تھا، میں رہائش پذیر ہوا اور وہیں ۳۴ ہجری میں وفات پائی)۔ اسی مقام پر استاذ محمود ابوریہ نے اس کتاب کے حاشیے پر ایک انتہائی مفید اور حیران کن حقیقت کا انکشاف کیا ہے جس کو انہی کے الفاظ میں درج کرنا مناسب ہے۔ لکھتے ہیں:

"(۳) کان الاستاذ سعید الافغانی قد نشر بمجلة الرسالة مقالة ذکر فیها ان الصهیونی الاول هو عبد الله بن سبا، فرددنا علیه بمقال مفصل اثبتنا فیه ان الصهیونی الاول هو کعب الاحبار و نشر هذا الرد بالعدد ٦٥٦ من الرسالة"

استاذ سعید افغانی نے مجلہ "الرسالہ" میں ایک مقالہ نشر کیا جس میں ذکر کیا کہ پہلا صہیونی عبد اللہ بن سبا تھا۔ لیکن ہم نے استاد افغانی کے رد میں ایک مفصل مقالہ شائع کیا جس میں ہم نے ثابت کیا کہ پہلا صہیونی کعب احبار تھا۔ یہ جواب "الرسالہ" کے شمارہ نمبر ٦٥٦ میں نشر ہوا۔" (اضواء علی السنة المحمدیه، ص ۱۴۷، طبع دار المعارف) وہاں پر معاویہ نے اسے اس کے

کثرت علم کی بناء پر اپنا مقرب اور مشیر بنالیا۔ معاویہ نے ہی اسے بلاد شام میں قصے بیان کرنے کا حکم دیا۔ کعب، وہب بن منبہ اور ان کے علاوہ دیگر یہود کے واسطے سے جنہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ تلمود، اسرائیلیات، کی روایات و واقعات احادیث میں شامل ہوگئے، اس طرح (اموی نواصب کی یہود پر عنایت اور گٹھ جوڑ کے نتیجے میں) دینی اور تاریخی اخبار کا جزو بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کے تقریباً تمام ائمہ حدیث امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، ترمذی اور امام نسائی نے اس سے روایات لے کر اپنے مذہب کی دیوار استوار کی (ملاحظہ ہو: تقریب التہذیب لابن حجر، ص ۳۱۰)

وہب بن منبہ بھی ان یہود میں سے ہے جو اسلام میں اسی باطل غرض سے داخل ہوئے۔ یہ ۳۴ھ میں یمن میں پیدا ہوکر ۱۱۰ھ میں وفات پا گیا۔ یہ بھی یمن کے علاقے صنعاء کا باشندہ تھا۔ اس کے پاس علماء یہود کی روایات اور کتابوں کا بڑا وسیع علم تھا۔ حتیٰ کہ یہ اپنے آپ کو عبداللہ ابن سلام اور کعب الاحبار کے علوم کا جامع سمجھتا تھا چنانچہ اس نے یہودی نظریات اسلام پھیلائے۔ اہل سنت کے جید علماء نے اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ ھو مورخ یکثر من نقل الاسرائیلات، یہ (یہودی تاریخ کا) مورخ تھا اس نے کثرت کے ساتھ اسرائیلیات کو نقل کیا ہے"۔ (الکلمۃ الاخلاص للحافظ ابن رجب الحنبلی، ص ۱۳، حاشیہ ۲، طبع دمشق)۔ اگرچہ باقی لوگوں کے لئے کتابت حدیث ممنوع تھی لیکن "صحیفہ ھمام بن منبہ" حدیث کا پہلا معروف مجموعہ ہے۔ جو اس یہودی کے بڑے بھائی ہمام بن منبہ یمنی جو ۱۰۱ھ میں مرا، کے ہاتھ سے نکلا۔ اور حال ہی میں ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق و تعلیق اور تخریج کے ساتھ کراچی سے شائع ہوکر بلا معاوضہ بطور ہدیہ تقسیم کیا جارہا ہے۔

جہاں تک وہب بن منبہ کے قابل اعتماد و معتبر ہونے کا تعلق ہے تو اس بارے میں غیر شیعہ تمام محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل نے نہایت سچا اور ثقہ تابعی قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لئے حافظ ذہبی کی "سیر اعلام النبلاء، ج ۴، ص ۵۴۴ تا ص ۵۵۷" اور ابن حجر عسقلانی کی "تہذیب التہذیب، ج ۱۱، ص ۱۶۶" وغیرہ کتب کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی بناء پر امام بخاری اور امام مسلم دونوں

نے اپنی اپنی صحیح میں اس سے روایات اخذ کی ہیں۔

استاد محمود ابوریہ نے اپنی لاثانی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۵۰ پر ان الفاظ کا عنوان قائم کیا ہے۔ ''**کیف استحوذوا علی عقول المسلمین**''''یہ صیہونی یہودی کس طرح لوگوں کی عقلوں پہ قابض ہوگئے؟'' اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ان یہودی علماء نے اپنے عجیب وغریب اور بے مثال مکر وحیلہ سے نادر طریقے اختیار کئے تاکہ مسلمانوں کے اذہان پر قابض ہوجائیں اوران کے لئے قابل اعتماد بن جائیں اور لوگ ان کا احترام کرنے لگیں۔ ان عجیب اسالیب میں سے بعض یہ ہیں کہ ترمذی نے عبداللہ بن سلام سے روایت لی ہے کہ توراۃ کی سطر اول میں لکھا ہے: محمد رسول اللہ خدا کے مختار بندے ہیں ان کا مولد مکہ جائے ہجرت طیبہ ہے۔۔۔۔۔

اسی روایت کو کعب الاحبار چالاک نے مزید پختہ کر دیا ہے۔ امام دارمی نے اس سے روایت کیا ہے کہ تورات کی پہلی سطر میں یہ لکھا ہے کہ محمد اللہ کے رسول اوراس کے مختار بندے ہیں، پیدا مکہ میں ہوں گے، ہجرت طیبہ کو کریں گے، **و ملکه بالشام** ان کی باشاہی (ملوکیت) شام میں ہوگی''۔ (اس کے حاشیے پر علامہ محمود ابوریہ اپنی تصنیف **اضواء علی السنة المحمدیه** ص ۱۵۱، حاشیہ ۳ پر مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> **تخصیص الملك بالشام فی قول کعب انما جاء لغرض سیاسی خطیر مربك شیٔ من خبره و سیاتیك نباء عنه فیما بعد**۔ کعب کے قول میں بادشاہی کی شام کے ساتھ تخصیص ایک بڑے سیاسی مقصد کی بناء پر ہے۔ اس کا کچھ حصہ تو پہلے آپ کو بتایا جا چکا ہے۔ بعد میں اس غرض سے متعلق آپ کو مزید آگاہ کیا جائے گا۔

کعب الاحبار حضرت عمرؓ کے قتل میں شریک تھا

مزید برآں استاد ابوریہ ''کعب وعمرؓ'' کے عنوان کے تحت صفحہ ۱۵۲ پر رقمطراز ہیں کہ جب کعب اسلام لایا تو اول اس نے انتہائی چالاکی اور مکاری سے اپنا کام شروع کیا۔ ابتداء میں حضرت عمرؓ بھی اس اعتبار سے کہ یہ صحیح العقیدہ اور سچا مؤمن ہے۔ اس کی مرویات کو غور سے سنا

کرتے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے جھوٹی روایات کی خوب نشر و اشاعت کی۔ حضرت عمرؓ کو اگر چہ اس پر کچھ شک گزرا اور اس چالاک شخص کی حزم و دانش کی نگرانی کرنے لگے اور اپنی بصیرت سے اس کی اغراض خبیثہ پر نگاہ رکھنے لگے، لیکن اس یہودی کی چالاکی اور ہوشیاری عمرؓ کی ذہانت اور نیک نیتی پر غالب آ گئی۔ چنانچہ اس نے خفیہ اور اعلانیہ اپنا منصوبہ جاری رکھا۔ حتیٰ کہ نوبت قتل حضرت عمرؓ تک جا پہنچی۔ تمام قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ قتل ایک خفیہ تنظیم کی سازش کا نتیجہ تھا۔ یہ مکار کعب احبار ان کے بڑے ارکان میں سے ایک تھا۔ ان کا سربراہ خوزستانی کا بادشاہ ھرمزان تھا جسے قید کر کے مدینہ منورہ لایا گیا تھا۔ اس سازش پر عمل درآمد کی ذمہ داری ابولولو عجمی کو سونپی گئی تھی۔

استاد محمود ابوریہ اور شیخ علی طنطاوی بعض روایات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کعب احبار قتل عمرؓ کی سازش میں شریک تھا۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ بروایت طبری کعب احبار حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور انہیں کہا کہ آپ تین دن کے اندر مر جائیں گے (قتل کر دیئے جائیں گے)۔ (تاریخ الامم والملوک لابن جریر الطبری، ج ۵، ص ۱۲، تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۹۴، کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۲۶، طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۲۴۶، طبع لیدن، پھر فاضل محقق شیخ علی طنطاوی دمشقی جو بہت بڑے فاضل اور معروف سکالر ہیں حال ہی میں ان کا انتقال ہو چکا ہے ان کی ایک ضخیم تالیف ''اخبار عمرؓ و عبد اللہ بن عمرؓ'' مطبوعہ الطبعۃ الاولیٰ مطابع دار الفکر دمشق ۱۹۵۹ء ہمارے سامنے موجود ہے اس کے ص ۵۱۱ پر عنوان ''مقتل عمرؓ'' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

اذا صح هذا كان كعب الاحبار شريكاً في الجريمة و كانت موامرة و ماز عمه من انه يجد ذالك في التوراة زعم باطل، لان التوراة الموجودة اليوم هي التي كانت عند كعب الاحبار و ليس فيها (ولا يمكن ان يكون فيها) تاريخ موت عمر و تعيين اليوم الذي يموت فيه۔

جب یہ روایت صحیح تسلیم کر لی جائے تو کعب احبار اس جرم میں شریک ہوگا اور یہ ایک سازش تھی، کعب کا یہ کہنا کہ یہ بات توارۃ میں ہے، ایک باطل خیال ہے، اس لئے کہ

جو تورات آج موجود ہے وہی کعب کے پاس تھی، اس میں تو حضرت عمرؓ کی موت کی تاریخ اور موت کے دن کا تعین نہ ہے نہ موجود ہونے کا امکان ہے۔"

اسی طرح حنفی علماء میں سب سے نمایاں شخصیت علامہ شیخ محمد زاہد الکوثری کی ہے، انہوں نے بھی معتبر اور قابل وثوق روایات کی بنا پر کعب احبار کے بارے میں غیر معمولی شکوک وشبہات کا برملا اظہار کیا ہے جیسا کہ "مقالات الکوثری" ص ۳۳، طبع کراچی میں لکھتے ہیں کہ کعب احبار کے ذہن میں حضرت عمر ؓ کے بارے میں رنجش رہی، حتیٰ کہ ان کا میل جول ایسے لوگوں کے ساتھ بھی دیکھا گیا جو حضرت عمرؓ کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث تھے اور اس سے پہلے وہ یہودیوں کی بعض کتابوں کے حوالے سے حضرت عمرؓ کو یہ تنبیہ کر چکا تھا کہ آپ کو کسی وقت قتل کیا جائے گا۔

لمحہ فکریہ!

ذرا چشم بصیرت کو وا کر کے حقیقت بین نگاہوں سے سطور بالا میں بیان کئے گئے حقائق پر غور وفکر کیجئے۔ صریح مکابرہ اور تعنت محض سے بالاتر ہو کر مذکورہ مصنفات کا مطالعہ فرمائیں۔ صاف صاف نظر آئے گا کہ کس مذہب کی بنیاد یہود نے رکھی ہے۔

شام میں اموی ملوکیت کا قیام یہود کی پشت پناہی سے ہوا

اہل سنت مورخین نے کعب احبار اور دیگر یہود کی طرف سے روایت کردہ متعدد من گھڑت احادیث سے استدلال کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ بنو امیہ کی شام میں ملوکیت کا قیام یہودی منصوبے کا حصہ تھی۔ اس کے لئے انہوں نے ہر طرح کا حربہ استعمال کر کے راستہ ہموار کیا۔ پہلے ابوسفیان کی اولاد کو شام میں اقتدار کی مسند پر قبضہ دلوایا۔ پھر کعب یہودی نے شام میں ہی سکونت اختیار کر لی اور اس منصوبے پر تیزی سے عملدرآمد کرایا۔ استاد ابوزیہ مصری کہتے ہیں:

الید الیھودیة فی تفضیل الشام. ذکرنا لك من قبل ان اشادة کھان الیھود الی ان ملك النبی سیکون بالشام انما ھو لامر خبیٔ فی انفسھم و نبین ھنا ان الشــام مــا کان لینال من الاشادة بذکره و الثناء علیه الا القیام دولة بنی امیة فیه۔

شام کے فضائل بیان کرنے میں یہودیت کا ہاتھ۔ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ یہودی کاہنوں کا اس امر کو شہرت دینا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بادشاہی شام میں ہوگی، ان کے دلوں میں ایک مخفی منصوبے کی خاطر تھا۔ ہم یہاں یہ بیان کرتے ہیں کہ شام کے ذکر اور اس کی تعریفوں کو مشہور کرنے کی ضرورت کسی اور مقصد کیلئے نہ تھی۔ یہ کام صرف بنوامیہ کی حکومت کے قیام کیلئے انجام دیا گیا۔"

(اضواء علی السنة المحمدیه، ص۱۷۰)

اس سلسلے میں دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اموی حکومت نے خلافت کو ظالمانہ بادشاہت میں تبدیل کیا۔ اسی حکومت کے زیر سایہ امت فرقوں اور ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی اور اس دور میں وضع احادیث کا کام وسیع پیانے پر ہوا یہودیوں نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ جھوٹ اور فریب کے لشکروں کے ذریعے سے یہودی کاہنوں نے بنو امیہ کی خوب مدد کی۔ ان افتراء پردازیوں میں سے ایک حصہ شام اور اہل شام کی مدح میں مبالغہ آرائی تھی۔ اسی سلسلے میں انہوں نے یہ حدیث بھی وضع کی کہ طائفہ ظاہرہ علی الحق شام میں ہوگا۔ جب یہی اموی اندلس میں داخل ہوئے تو اسے بھی اہل غرب کی مدح میں شامل کرلیا۔ اس سلسلہ میں خود کعب احبار یہودی کا بیان ہے کہ:

اهل الشام سيف من سيوف الله ينتقم الله بهم من العصاة. و لعل العصاة هنا هم الذين لا ينضوون تحت لواء معاوية و يتبعون غيره و غيره هو علي رضي الله عنه۔

اہل شام اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں اللہ ان کے ذریعے سے نافرمانوں سے انتقام لیتا ہے۔ شاید یہاں نافرمانوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو معاویہ کے جھنڈے تلے جمع نہ ہوتے ہوں اور اس کے علاوہ کسی اور کی اتباع کرتے ہوں۔ معاویہ کے علاوہ وہ شخص علی ﷺ ہی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ ستم یہ ہے کہ بنی امیہ کے کاسہ لیسوں اور جبر و استبداد کے حامی

قلمکاروں نے نواصب یعنی اہل شام کے فضائل میں مستقل کتابیں تالیف کی ہیں اس تناظر میں حافظ ربعی مالکی (متوفی ۴۴۴ھ) کی کتاب ''احادیث فضائل الشام'' اس پر مقدمہ وتحقیق اور تعلیقہ دمشق کے استاد صلاح الدین المنجد نے تحریر کیا ہے، یہ کاتب ۱۹۵۰ء کو مطبعۃ الترقی دمشق سے شائع ہوئی ہے۔ حافظ ربعی کی اس کتاب کے مقدمے میں فاضل محشی استاد صلاح الدین المنجد نے اپنا اظہار خیال ان الفاظ میں کیا ہے:

تنقسم الاحاديث الواردة فی فضائل الشام و دمشق الی ثلاثة اقسام، الاسرائيليات وهی ترجع الامور جرت قبل الاسلام فی اماكن محيطة بدمشق كان اليهود قد عرفوها او ورد ذكرها فی التوراة، الاحاديث الموضوعة المنسوبة للرسول عليه السلام او للاشخاص التی تقدس دمشق و الشام و تطعن علی غيرهما من البلدان۔۔۔۔۔

شام اور دمشق کے فضائل سے متعلق حدیثیں تین قسموں کی ہیں اسرائیلیات جو قبل از اسلام یہودیوں نے وضع کیں اور ان کا ذکر تورات میں بھی داخل کر دیا۔ دوسری من گھڑت احادیث جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر دی گئی اور یا ان لوگوں کی طرف نسبت دے دی جنہوں نے دمشق و شام کے تقدس کو بیان کیا اور دوسرے شہروں کو ہدف طعن بنایا۔۔۔۔۔ (صفحہ۲۲)

تھوڑا ہی عرصہ میں پہلے یہ کتاب علامہ ناصر الدین البانی کی تحقیق وتخریج کے ساتھ دوبارہ دمشق، سعودی عرب اور بیروت سے چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے مخاطب مؤلف کے مقتدا ابو العباس احمد ابن تیمیہ حرانی (متوفی ۸۲۸ھ) کا رسالہ ''مناقب الشام و اھلہ'' تحقیق علامہ البانی کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ محولہ بالا دونوں کتابیں بندۂ ناچیز کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کو نافرمان قرار دے کر یہود اور بنو امیہ نے ان سے خوب انتقام لیا۔ ان بیچارے مسلمانوں پر وہ مظالم ڈھائے جن کے ذکر سے رونگٹے کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ بر سر منبر حضرت علی علیہ السلام اور آل رسولؐ کی مذمت کے لئے سب وشتم کی مکروہ و منحوس رسم جاری کر کے اس پر ہر حال میں عمل کرایا۔

جس طرح اس دور میں یہودی اموی گٹھ جوڑ سے شیعیان علیؑ پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ حتیٰ کہ موجودہ دور میں بھی بنو امیہ کے حامی یہودیت کی پشت پناہی سے شیعیان علیؑ کا قتل عام کر رہے ہیں۔ بالخصوص پاکستان کو انہوں نے اپنا ہدف بنا رکھا ہے۔ عراق، لبنان اور افغانستان میں بھی اموی ملوکیت کے حامی نواصب نے یہودیوں کا آلہ کار بن کر شیعیان علیؑ پر ظلم وستم اور قتل و غارت کی انتہا کر دی ہے۔ ایران پر جنگ مسلط کر دی۔ اس طرح آٹھ سالہ جنگ میں لاکھوں شیعیان علیؑ کو قتل کرایا۔ اہل حق کے خلاف اموی عہد کی طرح سب وشتم اور کفر کے فتاویٰ کی بوچھاڑ کی گئی۔ تحریر وتقریر کے ذریعے شیعیان علیؑ کے خلاف زہر اگلا گیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مولوی اعظم طارق کے ''خطبات جیل'' ہیں۔

بنو امیہ کو برسر اقتدار لانے میں یہودیت کارفرما ہے

یہ ایک طویل داستان ہے جس کے متحمل یہ اوراق نہیں ہیں لیکن اس کا صرف ایک پہلو سامنے لایا جاتا ہے۔ چنانچہ استاد محمود ابوریہ نے مذکورہ بالا کتاب کے صفحہ ۱۷۹ پر ''کعب و معاویہ'' کے عنوان سے یہودی اموی سازش کو بے نقاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں کعب کو احادیث روایت کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ عام لوگوں کے لئے بھی مخالفت تھی۔ تاہم کعب نے حیلے بہانوں سے اپنا کام جاری رکھا۔ حتیٰ کہ موقع پا کر حضرت عمرؓ کے قتل کے لئے خفیہ تنظیم قائم کی اور کامیابی حاصل کر کے اپنی یہودی اسرائیلی من گھڑت روایات کو خوب شائع کیا۔ اس کے بڑے بڑے تلامذہ مثلاً عبداللہ بن عمرو بن عاص، عبداللہ بن عمرؓ اور ابوہریرہ وغیرہ نے اس کا خوب ہاتھ بٹایا۔ چونکہ یہودی معاویہ کو پہچان چکے تھے کہ یہ شخص ہمارا پختہ آلہ کار بن سکتا ہے۔ اس لئے قتل عثمانؓ میں ان لوگوں نے فریقین کی خوب مدد کی۔ ایک طرف حضرت عثمانؓ اور ان کے گورنروں سے بدعنوانیاں صادر کراتے جو اپنی خواہشات سے ایسا کرنے پر پہلے ہی آمادہ ہوتے تھے۔ دوسری طرف احتجاج کرنے والوں کا ساتھ دیتے۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف ہنگامہ آرائی کے

دوران ایک موقع پر کسی شخص نے چند اشعار کہے۔ جن میں یہ ظاہر کیا کہ حضرت عثمانؓ کے بعد امیر المؤمنین علیؑ ہوں گے۔ تو کعب احبار نے یہ سن کر اپنے منصوبے کے مطابق پیشن گوئی کر دی اور کہا: بل ھو صاحب بغلة الشھباء (یعنی معاویہ) بلکہ عثمانؓ کے بعد امیر المؤمنین بغلہ شہباء پر سوار شخص یعنی معاویہ ہوگا۔ معاویہ کو بات معلوم ہوئی تو کہا اے کعب! آپ یہ کیوں کہتے ہیں حالانکہ یہاں علیؑ اور زبیرؓ موجود ہیں۔ کعب نے پھر کہا تم ہی امیر بنو گے۔ شاید اس نے حسب معمول یہ بات بھی ان کے ساتھ ہی کہی کہ میں نے یہ بات پہلی کتابوں میں پائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بنو امیہ کو بر سر اقتدار لانا یہودی اموی باہمی سازش اور گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ معاویہ بن ابی سفیان کعب الاحبار کے اس احسان کی قدر کرتا تھا۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر یہ یہودی کاہن عہد عثمانؓ سے ہی شام میں معاویہ کے زیر سایہ اپنے منصوبے پر عمل کر رہا تھا۔ لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ آج تک ان اسرائیلیات کی تصدیق اور تقدیس کرنے والے افراد موجود ہیں جب ہم ان روایات کی حقیقت عوام پر ظاہر کرتے ہیں تو ہمارے زمانے کے مدعیان علم، خاص کر بنو امیہ کی اولاد ان کی حمایت میں اپنی حماقت سے ہمیں سب وشتم کا نشانہ بنا لیتے ہیں اور کافر تک کہنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ انہیں سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور بے ساختہ زبان پر یہ جاری ہو جاتا ہے کہ۔

یہ ایں بے خاصلاں یا دانشے یا مرگ ناگا ہے

یہ تو کعب اور معاویہ کے گٹھ جوڑ کی صرف ایک مثال ہم نے بیان کی ہے، عمومی طور پر اسلام کو اس کی چالبازی اور مکاری سے جو نقصان پہنچا وہ ارباب بصیرت پر پوشیدہ نہیں ہے اس لئے کہ حضرت علی علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے اور ان یہودی کاہنوں نے شریعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کے لئے اپنی تمام تر طاقت جھونک دی تھی۔ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف اس کعب الاحبار صہیونی نے جو منصوبے بنائے اگر ان کی تمام تر تفصیل بیان کرنا چاہیں تو اس کے لئے الگ ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ حضرت علی علیہ السلام کعب الاحبار کے متعلق فرمایا کرتے تھے: انہ لکذاب۔ یہ انتہائی جھوٹا

شخص ہے۔

ناصبیت یہودیت کی راہ پر

گزشتہ سطور میں دی گئی مختصر وضاحت سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اموی ناصبیت دراصل یہودیت کی پیداوار ہے۔ اموی حکومت اور ان کی اسلام کے خلاف تحریک کے بانی کعب احبار اور اس قبیل کے یہودی تھے۔ اسی لئے بنو امیہ کی حکومت کو جائز تصور کرنے والے لوگوں کی اکثریت آج بھی یہودی گروہ کی آلہ کار ہے۔ جبکہ حضرت علی علیہ السلام کے ماننے والے جہاں بھی ہیں آج بھی یہودیوں سے اسی طرح برسرِ پیکار ہیں جیسے صدر اول میں تھے۔ ہمارے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش گوئی پر مشتمل حدیث نقل کرکے اس سے شیعہ کی مذمت ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ حدیث نواصب اور غلاۃ مفوضہ کی مذمت میں ہے۔ یہ دونوں گروہ راہِ حق سے منحرف ہیں۔ حدیث یہ ہے: **فيك مثل من عيسى ابغضته اليهود حتى يهتوا امه و احبته النصارى حتى انزلوه بالمنزلة التي ليست له ثم قال يهلك في رجلان محب مفرط يقرظني بما ليس في و مبغض يحمله شناني على ان يبهتني**، رواہ احمد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ تم عیسیٰؑ کی مانند ہو۔ یہود نے ان سے بغض کیا تو ان کی ماں پر بھی بہتان باندھ دیا۔ نصاریٰ نے ان سے محبت کی تو انہیں وہ منزلت دے دی جو ان کے لئے نہ تھی۔ پھر علیؑ نے فرمایا: میرے بارے میں محبت میں حد سے بڑھنے والا بھی ہلاک ہوگا، ایسی صفات مجھ میں ثابت کرے گا جو مجھ میں نہیں۔ ایک بغض کرنے والا ہوگا جسے میرا بغض مجھ پر بہتان تراشی پر مجبور کرے گا۔ (مشکوٰۃ احمد، ص ۵۶۵، طبع دہلی)

محبت میں غلو کرکے ہلاک ہونے والے لوگ یقیناً غلاۃ مفوضہ ہیں۔ جن کی آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے بارہا مذمت کی ہے۔ ان پر لعنت کی اور انہیں مشرک تک قرار دیا ہے۔ یہ غالیانہ خیالات ان لوگوں میں کیسے پیدا ہوئے؟ دیگر محرکات کے علاوہ ایک بڑا محرک عنصر یہودیت بھی ہے۔ جس طرح یہودی اموی منافقین اور بعض دیگر مفاد پرست عناصر کو استعمال کرکے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی جانشین کو اپنے حق سے محروم کرکے پوری امت بلکہ ساری انسانیت کو غلط

راستے پر ڈالنے کے لئے پہلا قدم اٹھانے میں کامیاب ہوئے اور بعد ازاں حضرت عمرؓ کو قتل کرایا۔ پھر حضرت عثمانؓ کو مروا کر حضرت علیؑ کے مقابلہ میں معاویہ کو لا کھڑا کیا اور معاویہ کی اسی طرح پشت پناہی کی جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ابوسفیان کی قیادت میں اسلام کے خلاف کاروائیوں میں مشرکین مکہ و عرب کی مدد کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اموی ملوکیت کی بنیاد رکھی۔ لیکن انہیں خدشہ تھا کہ عداوت اور بغض کے لباس میں آل رسولؐ اور حضرت علیؑ کے خلاف جتنی مہم چلائیں گے اس کا منفی اثر بھی ہوگا اور مقابلے میں حضرت علیؑ کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور ان کے موقف میں مزید پختگی پیدا ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے اپنے سابقہ سازشی تجربہ کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے کچھ آدمی حضرت علیؑ کے حامیوں کے روپ میں ادھر بھی داخل کیے۔ لیکن بحمد اللہ، یہ صہیونی ناصبی صہیونیوں کی طرح ہی ناکام ہوئے۔ اصل اسلام کو ان کے شاطرانہ حملوں سے حضرت علیؑ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے پوری طرح بچا لیا۔ جس طرح بغض علیؑ میں ہلاک ہونے والے اموی نواصب اور ان کے پیروکاروں کی مذمت سے کتب شیعہ مملو ہیں اسی طرح عبداللہ بن سباء کی مذمت میں بھی شیعہ کتب بھری پڑی ہیں۔

شیعہ دشمن عناصر کا خودساختہ افسانہ

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک نو مسلم (عبداللہ بن سبا) کے فریب میں اکثر صحابہ و تابعین آجاتے اور وہ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے؟ کیا وہ تمام صحابہ و تابعین دین اسلام سے اس قدر ناواقف تھے؟ چونکہ ایسا ہونا عادتاً ناممکن ہے لہٰذا وہ افسانوی کردار والا ابن سبا ہرگز کوئی وجود نہیں رکھتا تھا اور یہی بعض محققین کا نظریہ ہے۔ ان تصریحات کی بنیاد پر عبداللہ ابن سبا کی ساری داستان بے کار اور فضول ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مصر کے نامور فلسفی و ادیب اور مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین المصری نے اپنی مشہور کتاب ''الفتنة الكبرىٰ'' جلد دوم میں ص ۹۸، ۹۹، ۱۰۰ میں لکھتے ہیں:

اراد خصوم الشيعة ان يدخلوا فى اصول هذا المذهب عنصر ايهوديا امعانا فى الكيد و التنكيل منهم ولو قد كان اصل ابن السوداء مستندا الى اساس من الحق و التاريخ

الصحيح لكان من الطبيعي ان يظهر اثره و كيده في هذا الحرب العقدة المصلة التي كانت بصفين ولو كان من اطبيعي ان يظهر اثر حين من اصحاب علي في امر الحكومة و لكان من اطلبيعي بنوع خاص ان يظهر اثره في تكوين اهل الحرب الجديد الذي كان يكره الصلح و ينفر منه و يكفر من مال اليه او شارك فيه ولكن لا نرى لابن السوداء ذكرا في أمر الخوارج فكيف يمكن تعليل هذا الاهمال كيف يمكن ان نعلل غياب ابن سبا عن وقعة صفين و عن نشاة خزب المحكمة وما انا فلا اصل الامرين الابهلة وحدة وهي ان ابن السوداء لم يكن الا هما وعن وجد با الفعل فلم يكن ذا فطر كالذي صبورة المورخون وصور و الشاطه ايام عثمان و العام الاولمن خلافة علي و انما هو مشخص او خره خصوم الشيعة الشيعة و حدهم،

شیعہ کے دشمنوں کا نشانہ یہ تھا کہ شیعہ کے اصول مذہب میں یہودی عنصر داخل کر دیا جائے۔ یہ کچھ بڑے زبردست چالبازی اور مکروفریب کی صورتیں تھیں محض اہل تشیع کو زچ کرنے کیلئے ورنہ اگر ابن سبا کا معاملہ کسی صحیح بنیادوں پر مبنی ہوتا اور معتبر تاریخ سے اس کا پتہ چلتا ہوتا تو لازمی طور پر اس فرقہ کا اثر ونشان اور اس کا مکروفریب جنگ صفین میں ضرور ظاہر ہوتا خصوصاً معاملہ تحکیم کے موقع پر، جب اصحاب علیؑ میں اختلاف رونما ہوا اس وقت بھی فطری طور پر اس فرقہ کا وجود ہونا چاہیئے تھا لیکن ہم خوارج کے معاملے میں ابن سبا کا کوئی وجود نہیں پاتے تمام تاریخیں اس موقع پر اس کے ذکر سے خاموش ہیں اس خاموشی کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے اور واقعہ صفین اور فرقہ خوارج کے موقع پر ابن سبا کے غائب ہونے کی کیا وجہ بیان کی جاسکتی ہے ہم تو بس ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ابن سبا محض وہمی چیز ہے اور اگر بالفرض اس نام کا کوئی شخص موجود بھی رہا تو اسے ایسی اہمیت ہرگز حاصل نہیں جیسی مؤرخین تصویر کشی کرتے ہیں اور قتل عثمانؓ اور حضرت علیؑ کی خلافت کے پہلے سال میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ ابن سبا ایک ہوا ہے جسے اہل تشیع کے دشمنوں نے ان کیلئے تلاش کیا ہے۔

(الفتنۃ الکبریٰ، ج ۲، ص ۹۹، ۱۰۰ مطبوعہ دار المعارف مصر)

حنفی مکتب فکر کے نامور سکالر و دانشور استاد محمد کرد علی الدمشقی (المتوفی ۱۳۷۲ھ) مدیر مجلہ "المجمع دمشق" کچھ عرصہ وزارت معارف کے منصب پر فائز رہے بارہ سو کتابوں کے مطالعے اور تیس برس کی محنت شاقہ کے بعد شام کی سیاسی و علمی اور تمدنی تاریخ پر مشتمل "خطط الشام" کے نام سے چھ ضخیم جلدوں میں کتاب لکھی۔ فاضل موصوف اپنی اسی شہرۂ آفاق تصنیف "خطط الشام" جلد ۶ صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲ مطبوعہ المطبعۃ الحدیثۃ دمشق ۱۳۴۳ھ میں افسانہ عبداللہ بن سبا کی تردید کرتے ہوئے اپنی تحقیق کا ماحصل یوں پیش کرتے ہیں:

اما ما ذهب اليه بعض الكتاب من ان مذهب التشيع من بدعة عبد الله بن سبا المعروف بابن السوداء فهو وهم و قلة علم بحقيقة مذهبهم و من علم منزلة هذا الرجل عند الشيعة و برأتهم منه و من اقواله و اعماله و كلام علمائهم فى الطعن فيه بلا خلاف بينهم فى ذلك علم مبلغ هذا القول من الصواب۔

ترجمہ:۔ بعض مصنفین اس طرف گئے ہیں کہ مذہب شیعہ عبداللہ بن سبا کی پیداوار ہے، جو ابن السوداء کے نام سے مشہور ہے تو یہ محض ایک وہم و خیال ہے اور ان (مصنفین) کی مذہب سے ناواقفیت کی دلیل ہے جو شخص بھی یہ بات جانتا ہے کہ عبداللہ بن سبا کی اہل تشیع کے نزدیک کیا قدر و قیمت ہے اور وہ ان سے اور اس کے اقوال و اعمال سے کتنے سخت بیزار اور متنفر ہیں اور شیعہ علماء نے متفقہ طور پر اس کی مذمت کی ہے اس شخص کو معلوم ہے کہ یہ قول صحت و راستی سے کتنا دور ہے۔"

اس نظریہ کے حامل جید و مستند محققین کی تحقیقات سے حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ابن سبا کا کوئی وجود تھا ہی نہیں اور نہ ہی کوئی انسان اس کے نام کا گزرا ہے یہ محض بنو امیہ اور ان کے پرستاروں کی خیالی تخلیق ہے جنہوں نے اپنے دنیاوی اور سیاسی مفادات و اغراض کی وجہ سے شیعہ کو بدنام کرنے کے لئے ایک فرضی اور خیالی شخصیت کو جنم دے دیا اور پھر اسلام میں تمام تر خرابیوں کا ذمہ دار اسے قرار دے دیا گیا اور اس طرح یہ اپنے کندھوں پر تمام دنیا والوں کے گناہ لادے ہوئے ہے اگر ابن سبا واقعی کوئی شخصیت ہوتی تو آخر عائد کئے گئے الزامات کی تردید یا کوئی شکایت کرتا؟

چنانچہ یہ کہنا کہ شیعہ کی بنیاد عبد اللہ بن سباء ملعون نے رکھی ہے، صریح جھوٹ، دجالی مکر و فریب اور یہودی پروپیگنڈہ ہے۔ علامہ ڈاکٹر خالد محمود ڈائریکٹر اسلامک اکیڈیمی مانچسٹر جو عصر حاضر کے دیوبندی مکتب فکر کے ایک کہنہ مشق اور شہرت یافتہ عالم ہیں انہوں نے واشگاف لفظوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ عبد اللہ ابن سبا شیعہ اثنا عشریہ کا بانی نہیں ہے چنانچہ بریلوی اہلسنت کے خلاف لکھی گئی ان کی کتاب ''مطالعہ بریلویت'' حصہ پنجم ص ۱۴۱، طبع لاہور میں بعنوان ''عبد اللہ ابن سبا یہودی اثنا عشری شیعہ نہ تھا'' کے ذیل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جب یہود نے دیکھا کہ اپنے آدمی شیعیانِ علیؑ میں داخل کر کے بھی ہم کامیاب نہ ہو سکے تو انہوں نے یہ جھوٹ پھیلانے کی ناکام کوشش کی کہ شیعہ مذہب کے عقائد مثلاً امامت، وصایت اور رجعت وغیرہ عبد اللہ بن سباء یہودی سے لئے گئے ہیں۔ ان جاہل نواصب کو معلوم نہیں ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام تقریباً تیسری صدی ہجری کے نصف تک اسلامی معاشرے میں بقید حیات ظاہری موجود تھے اور اپنے اپنے عہد میں اپنے پیروکاروں کی رہنمائی فرما رہے تھے۔ جبکہ عام مسلمان عوام کی قیادت ان کے حکمرانوں کی وساطت سے یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ تب الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق یہودیوں نے اہل حق پر الزام لگایا کہ ان کی بنیاد ابن سباء یہودی نے رکھی ہے۔ یہ دجال کا ہی جادو ہے جو عوام کالانعام کے سر چڑھ کر بول رہا ہے حالانکہ عہد حاضر میں زمینی مشاہدات ثابت کر رہے ہیں کہ یہودی دجال کے پیروکار شیعیان علیؑ کے مخالفین اور اموی ملوکیت کو اسلامی بادشاہی تصور کرنے والوں کی اکثریت ہے۔

عبد اللہ بن سبا کے بارے میں شیعہ روایات پر اجمالی نظر

عبد اللہ بن سبا کے متعلق شیعہ کتابوں سے روایات پیش کرتے ہوئے مؤلف لکھتا ہے کہ:

''عبد اللہ بن سبا کی بات آئی تو یہ بتاتا چلوں کہ آج کل شیعہ مجتہد اور مصنفین اس بات کی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں کہ ہمارا پیشوا عبد اللہ بن سبا نہیں تھا بلکہ وہ عبد اللہ بن سبا کے وجود ہی کا انکار کرتے ہوئے صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ محض ایک فرضی کردار کا نام ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ابن سبا کا تذکرہ اور تعارف جس قدر شیعہ کتب میں تواتر و تفصیل سے موجود ہے اس قدر تو

شاید اہل سنت کی کتب میں بھی نہیں ہے مناسب یہ ہے کہ اس موقع پر شیعہ کی مستند و معتبر کتب سے عبد اللہ بن سبا کا تعارف اور اس کے عقائد کا کچھ تذکرہ ہو جائے تاکہ حقائق کھل کر سامنے آجائیں۔۔۔۔۔شیعہ کے نامور مجتہد علامہ مقانی ''تنقیح المقال'' میں اور علامہ باقر مجلسی جیسے عظیم شیعہ مجتہد و مصنف ''بحار الانوار'' جیسی ضخیم کتاب کی جلد نمبر ۲۵ کے صفحہ ۲۸۷ پر رجال کشی سے نقل کرتے ہیں (بحذف عربی) بعض اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن سبا یہودی تھا پھر اسلام لے آیا اور حضرت علی علیہ السلام کی ''ولایت'' کا قائل ہوا۔ یہ اپنی یہودیت کے زمانے میں یوشع بن نون علیہ السلام کے بارے میں غلو کرتے ہوئے کہتا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی ہیں۔ پس اسلام لانے کے بعد اس قسم کی بات وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کرنے لگا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے وصی ہیں۔ آگے مزید تفصیل سے ابن سبا کی دوسری صفات کا تذکرہ سنیئے۔ (بحذف عربی) ترجمہ۔ یہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے مشہور کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کی امامت کا قائل ہونا فرض ہے اور اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دشمنوں پر (جس سے اس ملعون کی مراد خلفاء راشدین تھے) پر تبرا کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین کو واشگاف کیا اور ان کو کافر کہا۔ یہیں سے وہ لوگ جو شیعہ کے مخالف ہیں یہ کہتے ہیں تشیع اور رافضیت یہودیت کا چربہ ہے۔ (بحار الانوار، ص ۲۸۷، ج ۲۵)

''بعد ازاں ''شیعہ مذہب میں ابن سبا کی تعلیمات کی جھلک'' کی سرخی قائم کر کے مزید لکھتا ہے کہ ''شیعہ کی معتبر کتب سے جو میں نے ابن سبا کے عقائد کو پیش کیا ہے اس میں تین باتوں کا ذکر ہے۔ (۱) عبد اللہ بن سبا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصی رسولؐ ہونے کا قائل تھا۔ (۲) وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دشمنوں پر اعلانیہ تبرا کرتا تھا۔ (۳) وہ حضرت علی علیہ السلام کے مخالفین کو کافر کہتا تھا۔''

(خطبات جیل، صفحہ ۲۳ تا ۲۶)

الجواب:۔ ان روایات سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

اولاً:۔ واضح ہو کہ بحار الانوار ج ۲۵ ص ۲۸۷ طبع جدید تہران میں رجال کشی کے حوالے سے نقل کی گئی محولہ بالا روایت مبہم اور مجہول ہے اس روایت کا آغاز ''**وذکر بعض اھل العلم**'' کے الفاظ

سے ہوتا ہے اب مولوی اعظم طارق اور اس کے پیر و مرشد یوسف لدھیانوی کیا ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ "بعض اہل العلم" سے کونسے علماء مراد ہیں؟ ان کے اسماء گرامی کیا ہیں؟ سنی ہیں یا شیعہ؟ جھوٹے ہیں یا سچے؟ اور ان کی علمی و تاریخی حیثیت کیا ہے؟ **هاتوا برهانكم ان كنتم صادقين**۔

میرا دعویٰ ہے کہ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب طلوع صبح قیامت تک ناصبیت نہیں دے سکتی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ روایت کرنے والے مبہم ہیں اصول حدیث سے معمولی شغف رکھنے والا باشعور انسان جانتا ہے کہ اس قسم کی روایت ہرگز صحیح اور قابل اعتماد نہیں ہو سکتی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تقریب التہذیب میں ایک مستقل باب "**المبهمات بترتيب من روى عنهم**" کے عنوان سے قائم کیا ہے جس میں "**عن بعض عمومته**" اور "**عن رجل من الصحابة**" وغیرھا کو مبہم اور مجہول قرار دیا ہے دیکھئے: تقریب التہذیب، ص ۴۶۳ مطبع فاروقی دہلی۔

مبہم روایت کے بارے میں اصول حدیث کے ماہرین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ "**وهى غير مقبولة عند الجماهير**" کہ وہ روایت جس کے بیان کرنے والوں کا پتہ نہ ہو تمام علماء کے نزدیک نا قابل قبول ہے۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی اصول حدیث کی مشہور کتاب **نخبة الفكر مع شرحه**، ص ۴۸ مطبوعہ دہلی میں روایت مبہم کی عدم صحت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> **ولا يقبل حديث المبهم ما لم يسم لان شرط قبول الخبر عدالة رواية و من ابهم اسمه لا تعرف عينه فكيف عدالته**۔
>
> "حدیث مبہم جس کے راوی کا نام معلوم نہ ہو قابل قبول نہیں ہے کیونکہ روایت کے قبول کی شرط راوی کی عدالت ہے اور جس راوی کے نام کا ہی پتہ نہ ہو تو اس کی اصل حقیقت کیسے پہچانی جا سکتی ہے؟ اور اس کی عدالت کیونکر ثابت ہو سکتی ہے۔"

امام نووی مقدمہ مسلم ص ۱۶ میں، علامہ جزائری توجیہ النظر الی اصول الاثر ص ۱۷۸ میں اور امام حاکم معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۲ میں صحیح روایت کی یہی تعریف کی ہے کہ **وصفة الحديث الصحيح ان يرويه عن رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم صحابى زائل عنه اسم**

السجهالة، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا صحابی روایت کرے جو مجہول نہ ہو، اور اسی لئے جید و معتمد علیہ علماء نے ”رجل من اصحاب النبیؐ “ کے الفاظ سے مروی ایک روایت پر جرح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ مجہول ہے (محلی ابن حزم ج ۴، ص ۲۱۶ و ج ۷ ص ۳۳۸ طبع قاہرہ، معالم السنن از امام خطابی، ج ۱، ص ۱۱۹ طبع حلب)

مزید برآں محدث سخاوی نے فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث ص ۱۳۶ طبع قدیم لکھنؤ، حافظ دار قطنی بغدادی نے سنن دار قطنی ج ۲ ص ۳۶۱ طبع قدیم دہلی، ابو عمرو عثمان ابن صلاح نے مقدمہ ابن الصلاح ص ۴۲، طبع مصر، علامہ جلال الدین سیوطی نے تدریب الراوی شرح تقریب النواوی ص ۴۹۹ طبع جدید مدینہ منورہ اور مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی ص ۴۸ طبع قدیم لکھنؤ میں اس پر سیر حاصل بحث کر کے مبہم روایات کو نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اس طرح کی بے بنیاد اور نا قابل اعتبار روایات کو بنیاد بنا کر اہل حق کو مطعون کرنا محض دجل و فریب اور انتہائی بغض و تعصب کا شاخسانہ ہے۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

ثانیاً:۔ یہ بات ہر ایک پر عیاں ہے کہ ہر مذہب والے اپنے مذہب کے بانیوں اور سربراہوں کا تذکرہ بڑے شان و شوکت سے کرتے ہیں مگر شیعہ کتب رجال کا مطالعہ کیا جائے تو کسی جگہ بھی عبداللہ بن سبا کی مدح نہیں کی گئی بلکہ ہر جگہ اس کی مذمت کی گئی ہے۔ حضرات ائمہ اہل بیت علیہم السلام میں سے حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام سے اس کے متعلق لعن و طعن اور اس سے برأت و بیزاری ثابت ہے ملاحظہ ہوں رجال کشی ص ۹۹، ۱۰۰ و ص ۱۰۱، اور تنقیح المقال، جلد ۲، ص ۱۸۳، ۱۸۴ وغیرہا۔ لہٰذا اسی بناء پر علماء شیعہ متقدمین ہوں یا متاخرین سبھی نے ہلکی سے ہلکی عبارت بھی اس کے بارے میں یہ لکھی ہے۔ ان عبد اللہ بن سبا العن من ان یذکر۔ عبداللہ بن سبا کے متعلق جتنا کہا جا سکے اس سے زیادہ ملعون ہے (اصل الشیعہ واصولہا، ص ۷۵ طبع نجف) اور جیسا کہ خود مؤلف نے بھی جو شیعہ کتب سے روایات نقل کی ہیں وہ سب کی سب اس کی شدید مذمت میں ہیں۔

لہٰذا شیعہ خیر البریہ نے ہمیشہ عبد اللہ بن سبا اور اس کے ہمنواؤں کی مذمت کی ہے اور بعض روایات کی بنا پر عبد اللہ بن سباء کو حضرت علی علیہ السلام نے اس کے باطل دعوائے نبوت اور حضرت علیؑ کے لئے قول ربوبیتہ کی بناء پر آگ میں جلا ڈالا اور اس کا قصہ تمام کر دیا۔ لیکن یہ یہودی بڑے ہی ڈھیٹ ہیں۔ انہوں نے اپنا ابلیسی کام عبد اللہ بن سلام اور کعب الاحبار کے ذریعہ جاری رکھا۔ لیکن یہ گمراہ افراد، شیعیان علیؑ کے عقائد پر اثر انداز ہونے میں قطعاً ناکام ہو گئے۔

جہاں تک مؤلف کے ان الزامات کا تعلق ہے کہ عبد اللہ بن سباء (۱) حضرت علیؑ کے وصی رسولؐ ہونے کا قائل تھا۔ (۲) وہ حضرت علیؑ کے دشمنوں پر اعلانیہ تبرا کرتا تھا۔ (۳) حضرت علیؑ کے مخالفین کو کافر کہتا تھا۔

مؤلف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تینوں عقیدے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت مسلمہ کو تعلیم کئے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کے وصی رسولؐ ہونے کے سلسلے میں آیت مبارکہ "**انذر عشیرتك الاقربین**" کی تفسیر میں متعدد تفاسیر اہل سنت کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا خلیفہ اور وصی مقرر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

ان هذا اخی و وصی و خلیفته فیکم فاسمعوا اله و اطیعوا۔

(یہی میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے تم سب کو اس کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا چاہیئے)۔ (تفسیر خازن، ج ۵، ص ۱۰۶، طبع مصر، معالم التنزیل بغوی بھامش خازن، ج ۵، ص ۱۰۵، طبع مصر، تاریخ طبری، ج ۲، ص ۲۱۷، کامل ابن اثیر، ج ۲، ص ۲۲ او غیر ھا من الکتب المعتبرہ)۔

اسکے علاوہ بھی اس مضمون پر مشتمل متعدد روایات اہل سنت کی کتب حدیث میں موجود ہیں۔

ثانیاً یہ ہے کہ بقول اہل سنت عبد اللہ بن سبا نے ۳۵ ہجری حضرت عثمانؓ کے عہد میں اسلام قبول کیا جبکہ اس سے بہت عرصہ پہلے جلیل القدر صحابہ کرام حضرت علی علیہ السلام کو بعد از نبیؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلیفہ بلافصل اور انہیں حقیقی جانشین رسولؐ مانتے تھے جیسا کہ علامہ محمد حسین الذہبی لکھتے ہیں: **وجد من الصحابة من كان يحب عليا و يرى انه افضل من سائر الصحابة و**

انہ اولی بالخلافۃ من غیرہ کعمر بن یاسر و المقداد بن الاسود و ابی ذر الغفاری و سلمان الفارسی و جابر بن عبد اللہ.... و غیر ھم کثیر،

صحابہ میں حضرت عمار بن یاسرؓ، مقداد بن اسودؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ اور جابر بن عبداللہ انصاریؓ وغیرہ ایسے کثیر تعداد میں صحابہ کرامؓ تھے جو حضرت علیؑ سے محبت کرتے تھے۔ ان کو تمام صحابہ سے افضل اور خلیفہ بلافصل مانتے تھے۔

(التفسیر و المفسرون، ج ۲، ص ۴، طبع دار الکتب الحدیثہ قاہرہ)

مؤلف کی بے سروپا منطق کے مطابق کہ حضرت علیؑ کو خلیفہ بلافصل ماننے والا صرف عبد اللہ ابن سبا اور اس کے پیروکار ہیں تو کیا یہ سب بزرگ صحابہ کرامؓ جو صرف حضرت علیؑ کو ہی خلیفہ بلافصل تسلیم کرتے تھے ایک طویل مدت بعد پیدا ہونے والے بدنام زمانہ شخص کے پیروکار سبائی رافضی تھے؟ اسی طرح یہی بات علامہ احمد امین المصری نے فجر الاسلام ص ۳۱۷ طبع مصر اور علامہ محمد عبداللہ عنان نے تاریخ الجمعیات السریہ و الحرکات الفکریہ ص ۲۶ طبع مصر میں ذرا تفصیل سے تحریر کیا ہے۔

دوسری بات حضرت علیؑ کے دشمنوں سے تبرا کرنا ہے تو کیا ملا صاحب حضرت علیؑ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی رکھنا کار ثواب سمجھتے ہیں؟ جبکہ مبغض علیؑ ناصبی ہوتا ہے اور ناصبی بالاتفاق کافر ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوم خم غدیر ﴿**اللھم وآل من والاہ و عاد من عاداہ**﴾ (سنن ابن ماجہ ص ۱۲) کا اعلان کس لئے فرمایا؟ علاوہ ازیں حضرت علیؑ کے دشمنوں، مبغضین سے برأت کے الفاظ پر مشتمل روایات بھی ذخیرہ حدیث میں موجود ہیں۔

تیسری بات حضرت علیؑ کے مخالفین کو کافر کہنا ہے۔ یہ بھی عبد اللہ بن سباء کی تعلیم نہیں بلکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا۔ مبغض علیؑ منافق، علیؑ سے بغض رکھنے والا منافق ہے۔ ملا صاحب بتائیں کیا منافق درحقیقت کافر ہوتا ہے یا نہیں؟ **الحب فی اللہ و البغض فی اللہ** کا کیا مطلب ہے؟

چونکہ نواصب خود ان احادیث کے احکام کی زد میں آتے ہیں اس لئے ان احکام و

نظریات کوعبد اللہ بن سباء کی طرف منسوب کر کے اپنے بچاؤ کے لئے ایک آڑ بنانا چاہتے ہیں جو محض بہانہ سازی ہے اور حقیقت سے اغماض کا نتیجہ ہے۔ لیکن کب تک بچیں گے، آخر سفیانی اور دجال کی معیت میں ان کا سرے سے خاتمہ ہونا ایک یقینی امر ہے۔ **لا یزالون یخرجون حتی یخرج اخرهم مع المسیح الدجال**۔

عربی عبارت کا غلط ترجمہ

مؤلف نے اس مجہول روایت کا ترجمہ بھی درست نہیں کیا ہے۔ کیونکہ "**کان یقول وهو علی یهودیته فی یوشع ابن نون وصی موسی علیه السلام بالغلو ۔۔۔۔۔**" کا ترجمہ وہ نہیں جو ہمارے مخاطب نے کیا ہے کہ "یہ اپنی یہودیت کے زمانے میں یوشع بن نون علیہ السلام کے بارے میں غلو کرتے ہوئے کہتا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی ہیں۔" (ص ۲۴) بلکہ اس عبارت کا صحیح ترجمہ یوں ہے کہ:

"وہ اپنی یہودیت کے زمانے میں موسیٰ علیہ السلام کے وصی یوشع بن نون کے بارے میں غلو کا قائل تھا۔"

آپ کے ڈوب مرنے کا مقام ہے یا نہیں؟

پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

عالی قدر قارئین!

آپ متوجہ رہیں ملاں صاحب مجہول روایات کی تکرار اور عبارات کی کتر بیونت اور علمی بددیانتی، خیانت اور فکری کج روی بار بار کرتے نظر آئیں گے اور پھر ان کی شوخ قلم اور تیز زبان کے نشتروں سے خانوادۂ عصمت وطہارت کے پاک نفوس بھی محفوظ نہیں رہے **العیاذ باللہ** ۔

قدر کیا ان کو چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
بھیک بھی جن کو میسر نہیں میخانوں کی

حرفِ آخر

مذہبِ اہل بیتؑ پر طعن وتشنیع اور اسے بدنام کرنے کا جو لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تو آج

تک جاری و ساری ہے انتہائی افسوس اور ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی نے یہ تک سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ اسلام میں یہودی نظریات پھیلانے والے کون ہے؟ پھر انہیں اپنے قد کاٹھ سے بڑھا کر ان سے روایات لے کر اپنے مذہب کی عمارت کو استوار کرنے والے کون تھے؟ تعجب ہے کہ جس مذہب کی بنیادی کتب کے راوی یہودی اور اسرائیلی ہیں وہ آج اسلام کا لبادہ اوڑھ کر صاف بچ نکلے اور مورد الزام ٹھہرایا ائمہ اہل بیتؑ کو (جو شریعت رسولؐ کے حقیقی وارث ہیں) اور ان کے ماننے والے مظلوم شیعوں کو؟

باب ۲

مسئلہ امامت کے بیان میں

مؤلف نے پہلا باب ''عقیدہ امامت اور انکار توحید'' کی سرخی سے باندھا ہے۔ امامت اور اس کے مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے راہِ حق سے منحرف ہو کر وادی ضلالت میں غوطہ زن ہوئے، لایعنی، بے ربط اور غلط بحث کر کے اپنی لاعلمی اور جہالت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

(۱) ''زمین کا مالک اللہ یا ائمہ۔ قرآن کریم برملا اعلان کرتا ہے کہ زمین کا مالک بے شک صرف اللہ ہے وہ اس کا جس کو چاہے وارث کر دے۔ (سورۂ اعراف) شیعہ مذہب کے بانیوں میں سے ایک محمد بن یعقوب کلینی اپنی کتاب اصول کافی میں ایک باب کا عنوان ہی یہ قائم کرتے ہیں کہ ساری زمین کا مالک امام ہوتا ہے اور اس پر ایک روایت نقل کرتے ہیں (بحذفِ عربی) ابو بصیر کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق ؑ سے سوال کیا کہ کیا امام پر زکوٰۃ نہیں ہوتی؟ تو آپ نے فرمایا: اے ابو محمد تو نے محال بات کہی تجھے معلوم نہیں دنیا و آخرت امام کی ملکیت ہوتی ہے جہاں چاہے امام اسے رکھے اور جس کو چاہے دے۔۔۔۔۔ (۲) مارنا اور زندہ کرنا۔ اللہ کی ذات کی یہ صفت کہ وہ حی و قیوم ہے۔۔۔۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح بیان کیا تھا میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اس کے جواب میں نمرود نے کہا تھا میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں اب نمرود والا ہو بہو یہی دعویٰ شیعہ نے حضرت علی المرتضیٰ کی طرف منسوب کر کے کہا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں میں حی لا یموت ہوں۔۔۔۔ (۳) فرعون کو غرق کرنا اور موسیٰ کو نجات دینا۔ (۴) قوم عاد، قوم ثمود اور اصحاب رس کو تباہ و برباد کرنا۔ (۵) ہر چیز کی گنتی شمار کر رکھنا۔ (۶) غیب کے خزانوں کی کنجیاں کس کے پاس ہیں؟ (۷) روزِ جزا کا مالک۔ (۸) اول آخر ظاہر و باطن۔ (۹) کائنات کے ذرہ ذرہ کا مالک۔ (۱۰) قسیم الجنۃ و النار۔۔۔۔ (خطبات جیل، ص ۲۸ تا ص ۳۵)

الجواب:۔ امامت کا صحیح مفہوم

آپ نے مؤلف کی بے تکیاں اور دور از کار موشگافیاں ملاحظہ کریں جو درحقیقت اس کا مصداق ہیں ۔

بک رہا ہوں جنون میں کیا کیا   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
(غالبؒ)

یہ ہیں وہ علمی جواہر پارے جو ہمارے مخاطب نے صفحہ قرطاس پر ثبت فرمائے ہیں۔ ایک سمجھ دار اور منصف مزاج آدمی جسے قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ سے کچھ لگاؤ ہے وہ بھلا ان بے ربط باتوں اور لامعنی دلیلوں سے کب متاثر ہوسکتا ہے؟ ہم یہاں پہلے مسئلہ امامت اور اس کے صحیح مفہوم کو کتب اہل سنت اور شیعہ سے واضح کرنا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ قارئین پر اصل حقیقت واضح ہو سکے اور مسئلہ امامت کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی خاندان کے چشم و چراغ اور معروف عالم شاہ محمد اسماعیل دہلوی مسئلہ امامت پر مفصل بحث کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''و نیز باید دانست که بعضے کاملین را در یک کما مشابهت بانبیاء الله حاصل می شود و بعضی را در دو کمال و بعضی را در سه کمال و همچنین بعضی را در همه کمالات مذکوره پس امامت هم هر مراتب مخلتفه باشد که بعضی مراتب امامت اکمل است از بعضی مراتب دیگر، این است بیان حقیقت مطلق امامت، پس کسیکه در همه کمالات مذکوره بانبیاء الله مشابهت داشته باشد امامت او اکمل باشد از امامت سائر کاملین، پس لابد درمیان این امام اکل و درمیان انبیاء الله امتیازی ظاهر نخواهد شد الا به نفس مرتبه نبوت پس در حق مثل این شخص توان گفت که اگر بعد از خاتم الانبیاء کسی بمرتبه نبوۃ فائز میشد بر آئینه همین اکمل الکاملین فائز می گردید.

ترجمہ:۔ ''یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض کاملین کو انبیاء کے ساتھ ایک کمال میں مشابہت ہوتی ہے اور بعض کو دو کمال میں اور بعض کو تین میں۔ اسی طرح بعض کو تمام کمالات میں مشابہت ہوتی ہے۔

پس امامت بھی مختلف مراتب پر ہوگی کیونکہ بعض کے مراتب امامت دوسرے سے اکمل ہوں گے، یہ ہے مطلق امامت کی حقیقت کا بیان۔ پس جو کوئی مذکورہ تمام کمالات میں انبیاء اللہ سے مشابہت رکھتا ہوگا، اس کی امامت تمام کاملین سے اکمل ہوگی۔ پس یہ ضرور ہوگا کہ اس امام اکمل اور انبیاء اللہ کے درمیان سوائے نبوت کے امتیاز ظاہر نہ ہوگا۔ پس ایسے شخص کے حق میں کہہ سکتے ہیں کہ اگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص مرتبہ نبوت سے سرفراز ہوتا تو بے شک یہی اکمل الکاملین سرفراز ہوتا۔" (منصب امامت (فارسی)، ص ۴۴، طبع گوشہ ادب، لاہور)

علامہ شبلی نعمانی امامت اور اجتہاد کے زیر عنوان تحریر کرتے ہیں:

"امامت کا منصب در حقیقت نبوت کا ایک شعبہ ہے اور امام کی فطرت قریب پیغمبر کی فطرت کے واقع ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں و از میان امت جمع هستند که جوهر نفس ایشان قریب بجواهر نفوس انبیاءً مخلوق شده و این جماعت در اصل فطرت خلفائے انبیاء اند در امت، اور امت میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا جوہر نفس انبیاءؑ کے جوہر نفوس کے قریب پیدا کیا جاتا ہے یہ لوگ اصل فطرت کے اعتبار سے امت میں انبیاءؑ کے خلیفہ ہوتے ہیں۔ (الفاروق، حصہ ۲، ص ۹۶، مطبوعہ دہلی)

شاہ اسماعیل دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی نے امامت کے مقدس منصب کی تعریف کر کے واضح کیا ہے کہ امامت کا یہ الٰہی عہدہ نبوت کے بالکل مشابہ ہے اور امام میں نبی کے تمام کمالات اور اوصاف موجود ہوتے ہیں سوائے اسم نبوت کے، کہ ختم نبوت کے بعد اس کا اطلاق کسی شخص پر نہیں ہو سکتا۔

صاحب دانش قارئین! اب ایک شیعہ عالم دین کے الفاظ میں امامت کی حقیقت ملاحظہ کریں۔ اور غور فرمائیں کہ اہل سنت اور شیعہ اثنا عشریہ کس طرح منصب امامت کی حقیقت بیان کرنے میں متفق ہیں، چنانچہ علامہ مجلسیؒ لکھتے ہیں:

"رتبہ امامت چنانچہ دانستی نظیر منصب جلیل نبوتست۔۔۔" امامت کا مرتبہ، جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے، نبوت کے منصب جلیل کی مانند ہے۔۔۔" (حق الیقین فارسی، ج ۱، ص ۲۹، طبع ایران)

امام کی تعریف:

جب اختصار کرتے ہوئے یہ امر ظاہر ہو چکا ہے کہ امامت، نبوت کے مشابہ اور مانند ہے، تمام کمالات اور اوصاف میں، اس امر میں شیعہ و سنی کا کوئی اختلاف نہیں ہے تو آیئے اب امام کی تعریف فریقین کے معتمد علماء اور کتب سے دریافت کرتے ہیں، تاکہ جاہل اور احمق نواصب کی طرف سے یہودی مرزائی پشت پناہی سے مسلمانوں میں افتراق ڈالنے کی سعی نا مشکور کی حقیقت کھل کر سامنے آ جائے۔ اہل سنت کے محقق عضد الدین ایجی کی علم کلام میں معروف کتاب ''مواقف'' کی شرح میں شریف علی جرجانی نقل کرتے ہوئے امام اور امامت کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

''المقصد الاول فی وجوب نصب الامام و لا بد من تعریفها اولاً قال قوم من اصحابنا الامامة ریاسة عامة فی امور الدین و الدنیا لشخص من الاشخاص ...... و نقض ها التعریف بالنبوة و الا اولیٰ ان یقال هی خلافة الرسول فی اقامة الدین و حفظ حوزة الملة بحیث یجب اتباعه علیٰ کافة الامة۔

پہلا مقصد۔ امام نصب کرنے کے وجوب میں، سب سے پہلے اس کی (امامت کی) تعریف لازمی ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ امامت دین اور دنیا کے امور میں کسی شخص کی ریاست عامہ کا نام ہے۔۔۔۔۔ نبوت پر صدق کی وجہ سے تعریف درست نہیں رہتی چنانچہ بہتر یہ ہے کہ کہا جائے یہ اقامت دین اور حفاظت مرکز ملت اسلامیہ کے لحاظ سے رسولؐ کی جانشینی ہے۔ اس لئے کہ اس کی اتباع تمام امت پر واجب ہے۔'' (شرح مواقف، ص ۷۲۹، مطبوعہ نولکشور)

حنفی مذہب کے مشہور فقیہ ابن عابدین شامی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''ریاسة عامة فی الدین و الدنیا خلافة عن النبی صلی الله علیه وسلم، وہ عمومی ریاست جو دینی اور دنیاوی امور میں نبیؐ کی نیابت کا کام کرتی ہے۔

(فتاویٰ شامی، ج ۱، ص ۳۸۴، باب الامامۃ، طبع بولاق مصر، الاحکام السلطانیہ الماوردی ص ۵ طبع مصر)

علامہ ابوشکور سالمی خلافت و امامت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی تعریف میں رقمطراز ہیں:

ان الخلافة ثابتة و الامارة قائمة مشروعة واجبة على الناس ان يرون على انفسهم امامًا بدليل الكتب و السنة و الاجماع۔

''بے شک خلافت و امامت مشروع اور ثابت ہے اور لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے اوپر ایک امام کو (خلافت کرتا ہوا) دیکھیں اس کی دلیل قرآن و حدیث اور اجماع امت ہے۔'' (التمہید فی بیان التوحید، ص ۱۷۲، طبع دہلی)

اور اسی طرح حافظ ابن تیمیہ حرانی لکھتے ہیں کہ:

ان ولاية امر الناس من اعظم واجبات الدين بل لا قيام للدين الا بها،

خلافت اسلامیہ کا قیام دین کے سب سے بڑے واجبات میں سے ہے بلکہ اس کے بغیر دین قائم ہی نہیں ہو سکتا۔'' (السیاسۃ الشرعیۃ، ص ۱۴۱، مطبوعہ مدینہ منورہ، المحلی لابن حزم، ج ۱، ص ۴۵، طبع منیریہ قاہرہ)

شاہ اسماعیل شہید الدہلوی اس سلسلہ میں اپنی مایہ ناز تصنیف ''منصب امامت، ص ۳ پر ابتدا ہی میں ''فصل اول در بیان حقیقت امامت'' کے ذیل میں یوں رقمطراز ہیں کہ:

باید دانست که امام نائب رسول است و امامت ظل رسالت احکام نائب را از احکام منیب توان شناخت و حقیقت ظل را از حقیقت اصل توان دریافت،

جاننا چاہیئے کہ امام نائب رسول ہوتا ہے اور امامت ظل رسالت، نائب کے احکام کو منیب کے احکام سے پہچانا جا سکتا ہے اور ظل کی حقیقت کو اصل سے معلوم کرنا چاہیئے۔

قارئین کرام! آپ نے اہل سنت علماء کی طرف سے کی گئی امام اور امامت کی تعریف پڑھ اور سمجھ لی ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیں کہ امامت کے ساتھ امام کی تعریف میں بھی اہل سنت و اہل تشیع دونوں مکتب فکر متحد و متفق ہیں۔ چنانچہ معروف شیعہ عالم دین علامہ حلیؒ رقم طراز ہیں:

''الامامة رياسة عامة في امور الدين و الدنيا لشخص من الاشخاص نيابة عن النبي صلى الله عليه و آله وسلم۔

امامت، نبی کی جانشینی میں کسی شخص کی دین و دنیا کے امور میں ریاست عامہ کو کہا جاتا ہے۔'' (باب حادی عشر الفصل السادس فی الامامۃ ص ۴۳ طبع قدیم ایران)

قارئین کرام! بنظر انصاف غور فرمائیں امامت اور امام کی تعریف میں کس طرح اہل سنت اور اہل تشیع یگانگت رکھتے ہیں حتیٰ کہ الفاظ اور عبارات بھی تقریباً ایک ہی ہیں۔ اس امر میں دونوں مکاتب کا اجماع اور باہمی اتفاق روز روشن کی طرح واضح وظاہر ہے۔

امام کے فرائض منصبی

جس طرح امامت وامام کی تعریف میں اہل سنت واہل تشیع ہم آہنگ ہیں، اسی طرح امام کے فرائض منصبی اور امامت کے مقاصد بیان کرنے میں بھی فریقین کے دانشور علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ علم کلام وعقائد کے معروف عالم علامہ عمر نسفی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''عقائد نسفیہ'' (جو درس نظامی میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے) میں لکھا ہے:

والمسلمون لابد لهم من امام يقوم بتنفيذ احكامهم و اقامة حدودهم و سد ثغورهم و تجهيز جيوشهم و اخذ صدقاتهم و قهر المتغلبة و المتلصصة و قطاع الطريق و اقامة الجمع و الاعياد و قطع المنازعات الواقعة بين العباد و قبول الشهادات القائمة على الحقوق و تزويج الصغار و الصغائر الذين لا اولياء لهم و قسمة الغنائم و نحو ذالك من الامور،

''مسلمانوں کے لئے امام کا ہونا ضروری ہے جو ان کے شرعی احکام کو نافذ کرے، حدود قائم کرے مسلمانوں کے ملک کی سرحدوں کا دفاع کرے، ان کے لشکر تیار کر کے روانہ کرے، ان سے صدقات وصول کرے۔ ظالموں، غاصبوں، ڈاکوؤں اور راہزنوں کو سزا دے کر سختی سے دبا دے۔ جمعہ اور عیدوں کی نمازوں کو قائم کرے۔ لوگوں میں واقع ہونے والے تنازعات کو ختم کرے۔ حقوق پر پیش ہونے والی شہادتوں (گواہوں) کو قبول کرے، ایسے نابالغ لڑکوں اور

لڑکیوں کی تزویج کرے جن کے سرپرست نہ ہوں۔ غنیموں کو تقسیم کرے اور اسی طرح کے دیگر امور (اس کی ذمہ داری اور فرائض میں آتے ہیں)۔" (شرح عقائد نسفیہ میں ص ۱۴۶ طبع دیوبند، شرح فقہ اکبر ص ۱۷۹ طبع کانپور)

قارئین محترم! غور فرمائیں! جو فرائض امام کے بتائے گئے ہیں کیا حضرت محمد ﷺ بحیثیت نبی و رسول انہی امور کو انجام نہیں دیتے رہے؟ کوئی بھی صاحب علم و عقل شخص اس حقیقت کو جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ گذشتہ عبارت میں جو مقاصد نصب امام کے بیان کئے گئے ہیں، وہی فرائض نبی اکرم ﷺ اپنی پوری زندگی میں ادا کرتے رہے۔ امام کے یہ فرائض کیوں نہ ہوں۔ امام جانشین اور نائب نبی ہے تو اس پر یہ فرائض عائد ہوں گے۔ اس طرح بھی مقصد امامت و نبوت کی ایک لحاظ سے وحدت و یگانگت ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ شیعہ اثنا عشریہ بھی امام کے یہی فرائض بتلاتے ہیں۔ چنانچہ الحسن بن یوسف بن علی المعروف "علامہ حلی" لکھتے ہیں: **وھی واجبۃ عقلاً لان الامامۃ لطف فانا نعلم قطعاً ان الناس اذا کان لھم رئیس مرشد مطاع ینتصف للمظلوم من الظالم و یردع الظالم عن ظلمہ کانوا الی الصلاح اقرب و من الفساد ابعد۔**

امامت عقلاً واجب ہے اس لئے کہ امامت (اللہ تعالیٰ) کا لطف و کرم ہے۔ ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ جب لوگوں کا کوئی ایسا سربراہ، مرشد اور واجب الاطاعت شخص ہو جو ظالم سے مظلوم کا بدلہ لے کر اسے انصاف فراہم کرے، ظالم کو ظلم سے باز رکھے، تو عوام نیکی کے زیادہ قریب اور فساد و شر سے زیادہ دور ہوں گے۔" (باب حادی عشر، ص ۴۳ طبع ایران)

اسی طرح عمدہ الفقہاء و الاصولیین محقق سید اسماعیل طبرسی نوری امامت کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **الامامۃ ھی الریاسۃ العامۃ الالٰھیۃ خلافۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فی امور الدین و الدنیا بحیث یجب اتباعہ علی کافۃ الامۃ،** (مطلب وہی جو سابقہ اوراق میں مذکور ہے) (کفایۃ الموحدین، ج ۲، الباب الرابع فی الامامۃ، ص ۳، طبع قم المقدسہ)

آپ نے دیکھا کہ امام کے فرائض و مقاصد کے حوالے سے سنی و شیعہ کے مابین کس حد تک ہم آہنگی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی تفاوت نہیں، بلکہ الفاظ تک ملتے جلتے ہیں۔ ہم قارئین کرام کو بتدریج مرحلہ وار آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہاں تک تو سنی و شیعہ بالکل متفق و متحد ہیں لیکن اب اس کے بعد ایک عنوان ایسا آنے والا ہے جہاں سے اختلاف کی ابتدا ہوگی۔

ہم قارئین سے گزارش کریں گے کہ وہ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور تعصب سے بالاتر ہو کر معقول دلائل اور حقائق کو پہچانتے ہوئے انہیں تسلیم کریں۔

امام کا تقرر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یا عوام کے انتخاب سے؟

یہ امر تو قبل ازیں واضح ہو چکا ہے کہ امام کے فرائض منصبی نبی اور رسول جیسے ہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پیغمبر پر احکامات مسلسل وحی کے ذریعے وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہتے ہیں۔ پیغمبر ان ہی احکام کی تبلیغ و تنفیذ کرتا ہے۔ جبکہ امام پیغمبر کی نیابت میں ان احکام کو مسلم معاشرے میں نافذ کرتا ہے اور دیگر تمام اختیارات کو نبی کے جانشین کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ شاہ اسماعیل دہلوی شہیدؒ نے صراحت کی ہے کہ انبیاء کرام کے جانشین سوائے وصف نبوت کے باقی تمام اوصاف میں مثل انبیاء کے ہوتے ہیں۔ انہی اوصاف میں سے ایک عصمت بھی ہے۔ چنانچہ امام میں اس وصف کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ جس طرح نبی بے لوث ہو کر شرعی احکام کو نافذ کرتا ہے اسی طرح امام بھی خارجی و باطنی عوامل کے دباؤ سے آزاد رہ کر احکام خداوندی کو نافذ کرے۔ بہرحال اس وصف پر عنقریب الگ سے بحث ہوگی۔ سردست یہ امر زیر بحث آتا ہے کہ امام کا تقرر خدا و رسولؐ پر واجب ہے یا مخلوق پر۔ تو فریقین کا اس سلسلے میں کیا نظریہ ہے اور ان کے نظریے میں کہاں تک استدلالی قوت اور معقولیت ہے۔

چنانچہ اسی مسئلے کی تصریح کرتے ہوئے مشہور حنفی سنی عالم ملا علی قاری ائمہ اربعہ میں سے امام ابوحنیفہ کی کتاب ''فقہ اکبر'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

ومنها مسئلة نصب الامام فقد اجمعوا علىٰ وجوب نصب الامام و انما الخلاف فی انه یجب علی الله او علی الخلق بدلیل سمعی او عقلی فمذهب اهل السنة و عامة

المعتزلة انه يجب على الخلق سمعاً لقوله عليه الصلوٰة و السلام على ما اخرجه مسلم من حديث ابن عمر بلفظ من مات بغير امما مات ميتة جاهلية و لان الصحابة جعلوا اهم المهمات نصب الامام حتى قدموه على دفنه عليه الصلوٰة و السلام،

انہی مسائل میں سے امام کے تقرر کا مسئلہ ہے، اس امر پر سب کا اجماع ہے کہ امام کا نصب واجب ہے، اختلاف اس امر میں ہے کہ یہ (نصب امام) اللہ تعالیٰ پر واجب ہے یا مخلوق پر واجب ہے۔ دلیل سمعی یا عقلی کی بناء پر، پس اہل سنت اور عام معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ امام کا تقرر انسانوں پر واجب ہے۔ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کی اطاعت کرتے ہوئے جسے مسلم نے ابن عمر سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ جو شخص بغیر امام کے مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مر گیا، اس لئے صحابہؓ نے امام کو مقرر کرنا از حد ضروری اور اہم قرار دیا حتیٰ کہ دفن رسولؐ کو ترک کر کے اسی کو ہی مقدم کیا ہے۔"

(شرح فقہ اکبر، ص ۱۷۹، طبع کانپور، مرام الکلام از مولانا عبدالعزیز فرہاروی، ص ۴۳، طبع ملتان)

اہل سنت کا نظریہ تو معلوم ہوگیا کہ امام کا تعین عوام کے اختیار میں ہے، عوام پر ہی واجب ہے۔ واجب اس لئے ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے بغیر امام مرنے والے کو جاہلیت اور کفر کی موت مرنے والا قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی خاطر کفن و دفن رسولؐ کو تو چھوڑا جا سکتا ہے مگر امام کو مقرر کرنے میں تاخیر نہیں کی جا سکتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ امامت اور امام کی ضرورت صرف پہلی صدی ہجری کے چند سال کے لئے مختص نہ تھی۔ بلکہ یہ تو انسانوں بالخصوص مسلمانوں کی دائمی ضرورت ہے۔ اسی لئے تو بغیر امام مرنے والے کو جاہلیت کی موت مرنے والا قرار دیا ہے۔ جس شخص کی امامت سے بے شمار انسانوں کی موت اسلامی بن جاتی ہے تو اس شخص کو قابل رشک حد تک صالح اور نیک کردار کا حامل ہونا چاہیئے۔ لیکن اہل سنت کو بنظر انصاف تعصب سے بالاتر ہو کر غور کرنا چاہیئے کہ اموی اقتدار کی ابتداء سے لے کر آج تک کتنے لوگ صالح، عادل اور نیک کردار کے حامل حکمران گزرے ہیں جن کا تقرر عوام کی اکثریت یا کم از کم اہل حل و عقد کی اکثریت نے ان کی صلاحیت کی بناء پر کیا ہو؟

گزشتہ زمانے کی تاریخ پڑھنے کی زحمت کون کرے گا۔ موجودہ دور میں بھی امام کی ضرورت ہے، بلکہ پہلے سے بڑھ کر اور شدت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ کوئی شخص کیا یہ بتا سکتا ہے کہ اب مسلمانوں کی اکثریت کا منتخب امام کون سا ہے؟ کسی اسلامی ملک کا صدر یا وزیر اعظم مسلمانوں کا متفقہ امام ہے جس کی معرفت اور اطاعت و انقیاد کے ساتھ "اسلامی موت" میسر آسکتی ہے؟ خواہ وہ حکمران خود صیہونی موت ہی مر رہے ہوں؟ دوسری جانب خود اہل سنت یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ

"ولا يجوز نصب امامين فى عصر واحد لانه يودى الى منازعات و مخاصمات مفضية الى اختلاف امر الدين و الدنيا كما يشاهد فى زماننا هذا"۔

"ایک زمانے میں دو امام نصب کرنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ اسکے نتیجے میں باہمی کشمکش اور جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں جو دین و دنیا میں اختلاف کی حد تک جلد پہنچتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے اس زمانے میں مشاہدے میں آرہا ہے۔"

(شرح فقہ اکبر، ص ۱۷۹، النبراس شرح شرح العقائد، ص ۵۱۲، طبع میرٹھ)

اقتدار کے حصول کی خاطر لڑائیاں جھگڑے تفتازانی کے دور میں بھی جاری تھے۔ جن کی بنا پر دینی و دنیوی سب امور میں اختلاف پیدا ہوا، مسلمانوں میں عناد، بغض و عداوت اور قتل و خونریزی جاری رہی۔ یہی حالت شرح فقہ اکبر کے مصنف ملا علی قاری کے دور دسویں گیارہویں صدی ہجری میں تھی۔ اگر اہل سنت کی مدون تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ حالت اموی اقتدار کی ابتداء سے لے کر آج تک جاری ہے۔ مسلم اکثریتی ممالک میں اب بھی اتحاد کا قطعی طور پر فقدان ہے۔ بلکہ اکثر لوگ باہم برسر پیکار رہتے ہیں اور بالآخر باری باری سب ہی کسی نہ کسی انداز سے یہودیوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہود کی اس غلامی سے چھٹکارے کا ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں ہے بلکہ اپنی پسند یا مجبوری سے صیہونی آلہ کاروں کو اپنا امام رہنما منتخب کرتے ہیں۔ چنانچہ جس "تقرر امام کے وجوب کی تکمیل" کا اختیار انہیں دیا گیا، اسے اپنی ہی بربادی اور ہلاکت کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ خواہ اس صورت حال سے مطمئن نہ بھی ہوں۔

چنانچہ امت مسلمہ کے عظیم دانشور امت کی بربادی، انتشار اور کمزوری کا مشاہدہ کر کے

اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عوام کا ''اختیار نصب امام'' یعنی جمہوریت انتہائی مہلک ابلیسی نظام ہے۔ جس کے ذریعے سے کبھی اچھا اور صالح اسلامی نظام حکومت قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جمہوری و شورویٰ طریقے کے دوسرے پہلو۔ انما بتنصیص الامام و تعیینہ (کسی شخص کی امامت پہلے امام کی نص اور اس کی تعیین کرنے سے ثابت ہوتی ہے) کو بھی غلط اور ضرر رساں قرار دے چکے ہیں۔ کیونکہ یہ تو مشترکہ مفادات کے تحفظ کی خاطر خواہشات نفسانیہ کی بنیاد پر ہوگی۔ معصوم نبی یا امام کے علاوہ کسی غیر معصوم کی طرف سے اپنے بعد کسی شخص کو مقرر کرنا مفاسد کثیرہ پر مشتمل اور ملوکیت کے قیام، دوام اور استحکام کے لئے ولی عہدی کی راہ ہموار کرنے کے مترادف ہے۔

اسی سلسلے میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

جب طرز جمہوری سے گریز اختیار کیا جائے گا تو پختہ کار شخص کو اپنا رہنما اور امام واجب الاطاعت بنانے کے لئے اس کی تلاش کیسے کی جائے گی؟ اس مقصد کے لئے جمہوری یا نیم جمہوری طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ انسان اپنے اختیار سے پختہ کار کی تلاش کرتے کرتے تھک ہار چکے ہیں۔ مراد کی دستیابی کی بجائے انہیں رہزن ملے ہیں جنہوں نے امت مسلمہ کا ستیاناس کر کے آج اس سطح تک پہنچا دیا ہے کہ دنیا کی کمزور ترین اور انتہائی لاچار و بے بس قوم مسلمان ہے جب جمہوری طرز یعنی عوام کے ''اختیار نصب امام'' کے نظریے کی غلطی واضح ہوگئی تو بادشاہی نظام تو اس سے بھی بہت پہلے ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ ملوکیت کو محکم ابلیسی نظام قرار دیتے ہوئے ابلیس کی مجلس شوریٰ کے عنوان کے تحت ابلیس کے پہلے مشیر کی زبانی جس حقیقت کو بیان کرتے ہیں وہ اس طرح ہے۔

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا دونوں ملوکیت کے بندے ہیں تمام

(ارمغانِ حجاز، اردو حصہ)

یعنی یہ ابلیس اور اس کے آلہ کاروں کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اب صوفی وملا پوری طرح ابلیس کے قائم کردہ بادشاہی نظام کے بندے یعنی غلام بن چکے ہیں۔ یہ ملوکیت کا نظام کیا ہے؟ تنصیص غیر معصوم بر غیر معصوم کی ایک شکل ایک دوسرے نام "ولی عہدی" سے جاری کی گئی۔ اگر معصوم نبی اپنے بعد کسی شخص کو اپنا جانشین بنائے گا تو لازماً ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس منصب کا اہل اور اس نظام کو سمجھ کر اسے نافذ و جاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوگا۔ بصورت دیگر پوری دیانت داری سے ولی عہد نامزد کرنے کے باوجود ناقص انتخاب کا خدشہ باقی رہے گا۔ عملاً بھی ایسے ہی ہوا اور اس امت کا جو حشر اس وقت ہے، وہ اسی اختیار انتخاب امام اور تنصیص امام غیر معصوم کا تلخ ثمر ہے جس کا تقریباً چودہ سو سال سے امت مسلمہ مزہ چکھ رہی ہے۔

پس امت کی اس صورتحال کا علاج اسی میں ہے کہ حکیم مطلق کے تجویز کردہ نسخہ کو استعمال کیا جائے۔ چنانچہ جس طرح انسانوں کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی لطف و کرم سے انبیاء و مرسلین علیہم السلام منصوب و مبعوث کرتا ہے ان کا تقرر لوگوں کے اختیار میں نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح ان کے جانشین کا تقرر بھی اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس لئے قرآن حکیم میں کھلے الفاظ میں اس کی صراحت فرمادی ہے۔ ارشاد ربانی ہوتا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ...... الخ﴾ (سورۃ النور آیت ۵۵)

"تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اعمال صالحہ بجالائے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین پر خلیفہ و امام مقرر کرے گا جس طرح کہ ان کو خلیفہ مقرر کیا جو پہلے گزر چکے۔"

اس آیت مبارکہ کا بنظر امعان مطالعہ کیا جائے تو مسئلہ تقرر امام نکھر کر سامنے آجاتا ہے یہ وعدہ خدائی اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ امام کا تقرر خود اللہ تعالیٰ کے ہی اختیار میں ہے لہٰذا خدا نے "کما استخلف الذین من قبلھم" فرما کر وضاحت کردی کہ تقرر امام و خلیفہ میں عوام کوئی بھی دخل اندازی کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت مولانا الشاہ اسماعیل شہید

دہلوی نے اپنی گرانقدر تالیف ''منصب امامت'' ص ۷۴ طبع لاہور میں نہایت عمدہ الفاظ میں اس کی وضاحت یوں کردی ہے کہ:

حکیم علی الاطلاق بنا بر پرورش بندگان خود شخصی را از مقربان بارگاہخود چیدہ و برگزیدہ منصب نیابت انبیاء اللہ درباب تکمیل عباد بادعطا فرمودہ،

''حکیم مطلق اپنے بندوں کی تربیت کے لئے اپنے مقربان بارگاہ سے کسی بندے کو چن کر انبیاء کرام کی نیابت کا منصب عطا فرما دیتا ہے۔''

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۵۴ پر فرماتے ہیں:

پس امامت فی الحقیقۃ از عطایائے ربانی است نہ از اصطلاحات انسانی،

''امامت در حقیقت عطیہ ربانی ہے نہ کہ انسانی اصطلاحات سے ہے۔''

ان حقائق کی روشنی میں روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ خود امام مقرر کرتا ہے یا بالواسطہ اپنے رسول یا نبی کے ذریعہ اس کا اعلان کراتا ہے۔ اور یہ بھی اللہ رب العزت کی خصوصی مہربانی ہے، ورنہ انسان کسی بھی زمانے میں اپنی ضرورت نبی و امام کے پیش نظر اللہ تعالیٰ سے درخواست کرکے یا حق جتلا کر نبی یا امام منصوب و مبعوث نہیں کرا سکتے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل اور مشاہدے میں آچکی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے انسانوں کی راہنمائی کے لئے نبی و امام مبعوث و منصوب کرتا ہے تو ابلیس کے اغواء سے انسانوں کی اکثریت انہیں ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ چنانچہ اسی ناشکری کے صلے میں لوگوں کی اکثریت زوال و تنزل، ہلاکت اور تباہی، ظلم و ستم اور جبر و قہر کا شکار رہتی ہے لیکن اکثریت کے جرم کے باعث ''خشک کے ساتھ تر بھی جل جاتی ہے۔''

اسی لئے شیعہ اثنا عشریہ نے اس درست نظریہ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے عین مطابق اختیار کیا ہے۔ خواہ اکثریت کے انحراف کے سبب اب تک اس نظریئے پر اکثر امت کا عمل درآمد نہیں ہو سکا اور اس نظریے کے حامل بھی اپنوں اور اغیار کے دوہرے مظالم و مطاعن کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔

امام کا نبی کی مثل معصوم ہونا ضروری ہے اور کیا عصمت منافی ختم نبوت ہے؟

ارباب فضل جانتے ہیں کہ امام مثل نبی کے مہد سے لحد تک زندگی کے ہر حصے میں معصوم ہوتا ہے صفت عصمت اس سے منفک و جدا نہیں ہوتی بلکہ اس کا انفکاک ناممکنات میں سے ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ نالائق مؤلف امام کی عصمت کے بارے میں طعنہ زنی کرتے ہوئے یوں رطب اللسان ہے کہ

''عقیدہ شیعہ انبیاء علیہم السلام کی طرح ائمہؑ بھی معصوم ہوتے ہیں۔ محمد بن یعقوب کلینی نے اماموں کے فضائل و خصائص بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ ﴿الامام معصوم من الذنوب و المبرء من العیوب﴾ (اصول کافی، ج۱، ص۲۰۰)۔۔۔۔۔۔ بحار الانوار میں ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا ہے۔ ''یعنی امام معصوم ہوتے ہیں اور امام کو عصمت لازم ہے اس باب میں عیون الاخبار کے حوالہ سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے جس کے آخر میں ہے ''اور وہ معصوم ہوتے ہیں ہر گناہ غلطی سے'' (بحار الانوار، ج ۲۵، ص۱۹۳) (خطبات جیل، ص۴۷)

الجواب: اسی طرح مؤلف نے ص۴۷ سے طے کر ص۴۷ تک امام معصوم ہونے پر تنقید کر کے محض حقیقت ناشناس عوام کو اندھیرے میں رکھنے کی ناروا اور ناکام سعی کی ہے جس کا اصل حقیقت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ علمائے علم کلام نے عصمت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

﴿العصمة لطف خفی یفعل الله تعالیٰ بصاحبها بحیث لا یکون له داع الی ترك الطاعة و ارتکاب المعصیة مع قدرته علی ذلك﴾

عصمت ایک ایسا لطف خفی ہے جب خلاق عالم صاحب عصمت پر اس کا افاضہ کرتا ہے تو اس لطف کی موجودگی میں اس شخص کے اندر طاعت کے ترک کرنے اور معصیت کا ارتکاب کرنے کا داعی و محرم پیدا ہی نہیں ہوتا باوجودیکہ وہ ان امور پر قدرت رکھتا ہے۔

مزید برآں مشہور متکلم اور فلسفی علامہ سید شریف جرجانی نے اپنی تالیف ''تعریف الاشیاء'' میں عصمت کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں لکھی ہے: **﴿العصمة ملكة اجتناب المعاصی مع التمکن منها﴾** (تعریف الاشیاء، ص ۶۵، طبع مصر) گناہ کر سکنے کے باوجود گناہوں سے بچنے

کا ملکہ عصمت ہے، یہی عبارت اقرب الموارد میں ہے ملاحظہ ہو: اقرب الموارد، ج ۲، ص ۹۱ طبع مصر۔

بعض متکلمین یوں رقمطراز ہیں: ﴿ملكة نفسانية يخلقها الله سبحانه في العبد فتكون سبباً لعدم خلق الذنب فيه﴾ عصمت وہ ملکہ نفسانیہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندے میں پیدا کرتا ہے جو اس میں گناہ پیدا ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔

(نبراس شرح شرح العقائد ص ۵۴۲ طبع میرٹھ)

امام چونکہ فرائض منصبی میں نبی کی مانند ہے اور اسی کے منصب پر اس کا جانشین ہوتا ہے سوائے وصف نبوت کے۔ لہٰذا جس طرح نبی کے لئے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے عصمت کا وصف ضروری ہے۔ اسی طرح اس کے جانشین امام وخلیفہ کے لئے بھی وصف عصمت لازم ہے۔ چنانچہ معروف شیعہ مخالف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بھی اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے جیسا کہ لکھتے ہیں ﴿امام نائب نبی است و نبی صاحب شریعه است نه صاحب مذهب..... و چون امام معصوم از خطا است و حکم نبی دارد﴾ ''امام نبی کا نائب ہے اور نبی صاحب شریعت ہے نہ کہ صاحب مذہب اور جو امام خطا سے معصوم ہے حکم نبی کا رکھتا ہے''۔ (تحفہ اثنا عشریہ، ص ۱۰۹، طبع ثمر ہند)

اگر امام معصوم نہ ہوگا تو لامحالہ اس سے شرعی احکام کی سمجھ بوجھ اور نفاذ میں عمداً یا سہواً خامی واقع ہوگی۔ جس سے قیام عدل میں خلل پیدا ہوگا۔ نتیجتاً معاشرے میں ناانصافی اور ظلم وستم کا دور دورہ ہوگا۔ اس لئے مرکزی قیادت یعنی امام کے لئے لازمی ہے کہ وہ معصوم ہو تاکہ نچلی سطح کے حکام کی بے اعتدالیوں اور کمزوریوں کا درست عادلانہ فیصلوں کی روشنی میں ازالہ کرے اور ہوائے نفسانی کے تحت کسی میلان و رجحان کے بغیر الٰہی احکام کو نافذ کرے۔ غالباً اسی نقطہ کو مدنظر رکھتے ہوئے متعدد محققین علماء اہل سنت نے عصمت کو غیر انبیاء کے لئے بھی ثابت کیا ہے اور اسی وصف کے حامل اشخاص کو انبیاء کی نیابت کا زیادہ مستحق اور اہل قرار دیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں: ﴿و كذالك نقول لا ريب عند احد عامياً كان او عالماً ان الانبياء عليهم السلام

کانوا مجبولین علی الصدق و العفاف و الورع و الاعمال الحسنة قبل النبوة ایضاً وان قوماً سوی الانبیاء یجبلون علیها ایضاً وان هذه الخصلة فی المسماة بالعصمة﴾

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ عام آدمی ہو یا عالم، کسی کو اس امر میں شک وشبہ نہیں ہے کہ صدق پاکدامنی، تقویٰ اور اعمال حسنہ نبوت سے قبل بھی انبیاء علیہم السلام کی فطرت میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء کرامؑ کے علاوہ بھی کچھ لوگ فطرت میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء کرامؑ کے علاوہ بھی کچھ لوگ فطری طور پر انہی اوصاف سے متصف ہوتے ہیں۔ اور یہی (فطری) خصلت عصمت کہلاتی ہے۔ (تفہیمات الٰہیہ، جلد۲، ص ۲۱، مطبوعہ بجنور)

ارباب انصاف بتایئے کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کون افراد ہیں جن کی فطرت اور جبلت میں عصمت کا وصف موجود ہوتا ہے؟ اس کی نشان دہی بھی خود شاہ ولی اللہ دہلوی ہی کرتے ہیں کہ ﴿پس وارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم بسہ قسم منقسم اند ان فوراثة الذین اخذوا الحکمة و العصمة و القطبیة الباطنیة هم اهل بیتهٗ و خاصته﴾ (چنانچہ آنحضرت (ص) کے وارث بھی تین اقسام پر ہیں ایک وہ وارث ہیں جنہوں نے حکمت، عصمت اور قطبیت باطنیہ (وراثت میں) پائی، وہ آپ کے اہل بیتؑ اور آپ کے خاص لوگ ہیں)۔ (تفہیمات الٰہیہ، جلد دوم، ص ۱۴)

وہ اہل بیت اور ان میں سے بھی خاص کون ہیں جنہوں نے حکمت، عصمت اور قطبیت باطنیہ وراثت میں پائی؟ اس کا جواب بھی خود شاہ ولی اللہ دہلوی ہی فراہم کرتے ہیں؟ ﴿..... واذا تمت العصمة کانت افاعیلة کلها حقه لا اقول انها تطابق الحق بل هی الحق بعینها بل الحق امر ینعکس من تلک الافاعیل کالضوء من الشمس و الیه اشار رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم حیث دعا الله تعالٰی لعلی کرم الله وجه اللّٰهم ادر الحق معه حیث دار ولم یقل ادره حیث دار الحق﴾ (جب (صاحب حکمت کی) عصمت کامل ہو جائے تو اس کے تمام افعال حق ہو جاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ حق کے مطابق

ہوتے ہیں بلکہ اس کے تمام افعال عین حق ہوتے ہیں، بلکہ حق ایک ایسا امر بن جاتا ہے جو ان افعال سے اس طرح ظاہر و منعکس ہوتا ہے جس طرح سورج سے روشنی منعکس ہوتی ہے، اس امر کی جانب رسول اللہ (ص) نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کے لئے یہ دعا کرتے ہوئے ارشاد کیا ہے! اے اللہ حق کو اس کے ساتھ پھیر دے جدھر وہ پھرے، یہ نہیں فرمایا اسے (علیؑ کو) ادھر پھر دے جدھر حق پھرے)۔ (تفہیمات الٰہیہ، ج ۲، ص ۲۲)

یعنی امتِ مسلمہ میں پیغمبر (ص) کے علم و حکمت کے وارث اور انبیاءؑ کے بعد پہلے شخص حضرت علی علیہ السلام ہیں جو حق کے لئے معیار اور کسوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی گزشتہ امتوں کے حکماء کے اوصاف اور مراتب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿ثم یثبت لھم العصمة التامة و الحکمة الکاملة و الوجاھة العامة فیصیدون کانھم انبیاء لکن لم یوح الیھم﴾

پھر ان کیلئے عصمت تامہ، حکمت کاملہ اور عمومی وجاہیت ثابت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اس طرح ہو جاتے ہیں گویا کہ وہ انبیاء ہیں لیکن ان کی طرف وحی نہیں آتی۔

(تفہیمات الٰہیہ، ج ۲، ص ۲۳)

شاہ ولی اللہ دہلوی نے تو کھل کر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی عصمت مطلقہ کے بارے میں اپنا بیان درج کرا دیا ہے اس کی مزید تائید ان کے مایہ ناز شاگرد ملا محمد معین سندھی طویل بحث و استدلال کے بعد ان الفاظ میں کرتے ہیں:

﴿فلا وجه لان یمتری من له ادنٰی انصاف فی ان من صدق علیھم ھذا الحدیث و الایة من غیر شائبة وھم الائمة الاثنی عشر من اھل البیت و سیدة نساء العالمین بضعة رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیه وسلم ام الائمة الزھراء الطاھرة علی ابیھا و علیھا الصلٰوة و السام لا شائبة فی کونھم معصومین کالمھدی منھم علیه السلام بما یخصه من حدیث قفاء الاثر و عدم الخطاء علی ما تمسك به الشیخ الاکبر رضی

اللّٰہ عنہ بالمعنی الذی بیناہ سوالا و جواباً فیما تقدم.....﴾

جو شخص ادنیٰ انصاف سے بھی کام لے گا، اس کیلئے اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ حدیث اور آیت بغیر کسی شائبہ کے مصداق اہل بیتؑ میں سے ائمہ اثنا عشر اور سیدہ نساء العالمین، جگر گوشہ رسولؐ، ائمہ اطہارؑ کی ماں محترمہ فاطمہ زہراء طاہرہ (علی ابیھا وعلیہا الصلوٰۃ و السلام) ہیں اور ان کے معصومؑ اور خطاء سے پاک ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، جیسا کہ انہی میں سے امام مہدی علیہ السلام معصوم ہیں، اس لئے کہ ان کو حدیث اقتفاء الاثر (نبیؐ کے نقش قدم پر چلنے کی حدیث) خاص کرتی ہے، جیسا کہ شیخ اکبرؒ نے اس حدیث سے اس معنی میں تمسک کیا ہے جو ہم نے اس سے پہلے سوالاً جواباً بیان کیا ہے۔" (دراسات اللبیب، ص ۲۰۸، ۲۰۹، طبع قدیم لاہور)

اس عبارت سے آگے چل کر تھوڑا بعد ہی مزید لکھتے ہیں:

﴿و اذا ثبت ھذا علم ان من اقر بصحۃ حدیث التمسک الزم بعصمۃ الأمۃ حتی استحالۃ الخطاء عنھم کالمھدی علیہ السلام منھم عند الشیخؒ و ھذا مخصوص فی الائمۃ اھل البیت.....﴾

جب یہ امر ثابت ہو گیا تو معلوم ہوا کہ جو شخص حدیث تمسک (ثقلین) کے صحیح ہونے کا اقرار کرتا ہے اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ ائمہ کی عصمت حتیٰ کہ ان سے خطا کے صادر ہونے کو محال تسلیم کرے، جیسے شیخ اکبر کے نزدیک امام مہدیؑ ہیں اور یہ امر (عصمت اور خطا سے پاک ہونا) ائمہ اہل بیتؑ کے ساتھ مخصوص ہیں۔" (دراسات اللبیب، ص ۲۱۰)

اسی نظریئے کی تائید اہل سنت کے معروف عالم دین فخر الدین رازی اپنی شہرہ آفاق تفسیر کبیر کی جلد ۳، ص ۲۴۳ پر سورۃ النساء کی آیت ﴿اولی الامر منکم﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے "المسائلۃ الثالثۃ" کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

﴿ومن امر اللہ بطاعۃ علی سبیل الجزم و القطع لابدان یکون معصوماً عن الخطاء اذ لو لم یکن معصوماً عن الخطاء کان بتقدیر اقدامہ علی الخطاء یکون قد امر اللہ بمتابعتہ فیکون ذالک امراً بفعل ذالک الخطاء و الخطاء لکونہ خطاء منھی

عنه فهذا یفضی الی اجتماع الامر و النهی فی الفعل الواحد بالاعتبار الواحد وانه محال فثبت انه تعالٰی امر بطاعة اولی الامر علی سبیل الجزم و ثبت ان کل من امر اللہ بطاعتہ علی سبیل الجزم وجب ان یکون معصوماً عن الخطاء فثبت قطعاً ان اولی الامر المذکور فی ھذہ الایة لابدان یکون معصوماً﴾

جس شخص کی اطاعت کا حکم اللہ تعالٰی نے بطور جزم اور قطعی انداز میں دیا ہو لازمی ہے کہ وہ خطاء سے معصوم ہو اس لئے کہ اگر وہ خطا سے معصوم نہیں ہوگا تو اگر وہ کوئی خطا کارانہ اقدام کرے گا تو اللہ نے اس کی پیروی اور اطاعت کا حکم دیا ہوگا اس طرح یہ حکم اس خطا پر عمل کرنے کا حکم قرار پائے گا، حالانکہ خطاء سے اس حیثیت سے کہ وہ خطا ہے، نہی کی گئی ہے، تو یہ معاملہ امر و نہی کے بیک وقت ایک ہی فعل میں اکٹھا ہونے تک جا پہنچتا ہے، جبکہ یہ محال ہے (کہ ایک ہی کام منع بھی ہو اور اس کے کرنے کا حکم بھی دیا جائے) پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالٰی نے اولی الامر کی فرمانبرداری کا قطعی حکم دیا ہے، اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جس شخص کی اطاعت کا حکم اللہ تعالٰی نے جزم کے ساتھ دیا ہو، واجب ہے کہ وہ معصوم عن الخطاء ہو، چنانچہ قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ اس آیت میں مذکورہ اولی الامر کے لئے ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو۔"

خاندان ولی الٰہی کی معروف شخصیت مولانا شاہ اسماعیل دہلوی اپنے پیر و مرشد سید احمد بریلوی کے ارشاد کے مطابق ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> واین حفظ نصیبه انبیاء و حکماء است و همین را عصمت می نامند ندانی که اثبات وحی باطن و حکمت و جاهت و عصمت مر غیر انبیا را مخالف سنت و از جنس اختراع بدعت است۔
>
> "۔۔۔ اور یہ حفظ انبیاء اور حکماء کا نصیب ہے اور اسی کو عصمت کہتے ہیں یہ نہ سمجھنا کہ باطنی وحی اور حکمت اور وجاہت اور عصمت کو غیر انبیاء کے واسطے ثابت کرنا خلاف سنت اور اختراع بدعت کی جنس سے ہے۔" (صراط مستقیم ہدایت رابعہ در بیان ثمرات حب ایمانی، ص ۴۳، مطبوعہ دیوبند)

عصرِ حاضر کے دیوبندی حضرات بالخصوص ان میں سے متشددانہ[1] نظریات کی حامل ایک جماعت "اشاعت التوحید والسنۃ" کے بانیان کے پیر و مرشد اور استاذ شیخ حسین علی واں بھچراں ضلع میانوالی بھی ائمہ اہل بیت اطہارؑ کی عصمت کے قائل ہیں، چنانچہ اپنے سلسلہ ہائے تصوف میں سے ایک سلسلہ شطاریہ کے ذیل میں رقمطراز ہیں: "الٰہی بحرمت امام معصوم حضرت امام زین العابدینؑ۔" (فیوضات حسینیہ المعروف بہ تحفہ ابراہیمیہ، ص۲۰۲)

اگر ائمہؑ کی عصمت کا قائل ہونا عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے اور اسے شیعہ کے کفر کے اسباب میں سے ایک سبب شمار کیا جاتا ہے تو شیعہ سے قبل حسین علی واں بھچراں والے پر کفر کا فتویٰ لگانا ضروری ہے اس لئے کہ وہ بھی شیعوں کی طرح امام کو معصوم سمجھتا ہے اور اس کا کھلم کھلا اظہار کر رہا ہے۔ دیکھئے مجاہدین ختم نبوت کی جرأت ایمانی کسی اصول کی پابند ہے یا فقط عناد سے مجبور ہیں۔

جب یہ امر واضح ہوگیا کہ ائمہ بھی انبیاء کی مانند معصوم ہوتے ہیں اور اس میں اہل سنت کے قابل اعتماد محقق علماء بھی شیعہ اثناء عشریہ کے ہمنوا ہیں، تو اگلا مرحلہ نسبتاً آسان اور قریب آجاتا ہے نیز بعض معاندین جہلاء کا اعتراض خود اہل سنت علماء نے ہی مسترد کر دیا ہے کہ غیر انبیاء کے لئے عصمت ثابت کرنا عقیدہ ختم نبوت کے منافی اور شرک فی النبوۃ ہے اگر ان جہلاء اور مبغضین کو اپنے اس الزام پر اصرار ہے تو پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسماعیل دہلوی، فخر الدین رازی، شیخ اکبرؒ، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے شاگرد رشید مولانا حسین علی واں بھچراں اور ان حضرات کے معتقدین و مداحین پر الزام لگائیں بعد میں اگر ان میں کوئی سکت رہ گئی تو اہل حق شیعہ اثنا عشریہ کا سامنا بھی کرلیں۔

---

[1] اندیشہ ہے کہ بعض طبائع پر یہ گراں گزرا ہو کہ ہم نے اس مکتب کے بارے میں تلخ کلامی کی ہے انہیں یقین کر لینا چاہیئے کہ ہم نے یہ الفاظ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اسی مکتب کے روح رواں مولانا حسین احمد مدنی سے اخذ کئے ہیں جیسا کہ لکھتے ہیں "حضرت مولانا حسین علی صاحب مرحوم کے متوسلین میں تشدد بہت زیادہ ہے جو کہ غلط درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔" (ملاحظہ ہو مکتوبات شیخ الاسلام ج ۴ ص ۱۰، طبع دیوبند)

بارہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا تعین

اور امام کو ہادی ہونا چاہیئے جس کو ہدایت کی احتیاج نہ ہو بلکہ خدا کی طرف سے اس کی ہدایت کا بندوبست کیا گیا ہو۔ چنانچہ سورۂ یونس میں ارشاد ہے ﴿اَفَمَنْ يَّهْدِىْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّىْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى﴾ ''کیا جوحق کی طرف ہدایت کرتا ہے اس کی پیروی زیادہ بہتر ہے یا اس کی کہ جو ہدایت نہیں کرتا بلکہ خود ہدایت کا محتاج ہے۔''

ہر شخص عہدہ امامت پر فائز نہیں ہوسکتا چونکہ امام سب سے زیادہ اوصاف وکمالات انبیاء سے مشابہت رکھتا ہے اور ارادہ الٰہیہ اس کی امامت کے متعلق قائم ہوتا ہے نبی کی طرح دیگر تمام مخلوق سے من کل الوجوہ فوقیت کلی رکھتا ہے۔ امام کا ہر جہت سے عند اللہ افضل اور برتر ہونا امامت کو لازم ہے اگر غیر افضل کو امام بنا دیا جائے تو بے انصافی اور خیانت لازم آتی ہے اور ذات باری تعالیٰ جل جلالہ ان چیزوں سے بری ہے۔ اگر نائب سے اپنے منیب سے مشابہت نہ رکھے تو منافی حکمت ہے چنانچہ مولانا شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

پس تفویض منصب نیابت شخصی جلیل القدر بشخصیکه در باب عزت و اعتبار بمحفل حضار دربار و در باب کمالات نفسانی مشابهت با منیب خود نداشته باشد منافی حکمت ست پس واضح شد که حصول منصب نیابت انبیاء اللّه در باب تکمیل بدون حصول معنی مشابهت بایشان در نفس کمال متصور نیست۔

''پس ایک جلیل القدر کی نیابت کا منصب ایک ایسے شخص کو دینا بعید از حکمت ہے جو عزت و آبرو کے بارے میں حاضرین دربار کی مجلس میں رفعت اور کمالات نفسانی کے معاملہ میں اپنے منیب کے ساتھ مشابہت نہ رکھتا ہو، پس واضح ہوگیا کہ انبیاء اللہ کی نیابت کا منصب ان سے مشابہت کے بغیر نفس کمال میں متصور نہیں ہے۔'' (منصب امامت، ص ۴۷، طبع لاہور)

ان بارہ اماموں کا تعین نص سے ہوتا ہے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے لئے نص فرمائی اور انہوں نے اپنے بعد ائمہؑ کے لئے وهكذا كل امام

ینص علی من یلیہ ،شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے وصیت نامہ میں ائمہ اہل بیتؑ کی امامت اور ان کا ایک دوسرے کے بارے میں نص وارد کرنا ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

این فقیر را معلوم شده است که ائمه اثنا عشر رضی اللّٰه عنهم اقطاب نسبتی بوده اند..... و نص و اشاره هر یکی هر متاخر باعتبار همان قطبیت است و امور امامت که می گفتند راجع بهمان است.

''اس فقیر کو معلوم ہوتا ہے کہ بارہ امام رضی اللہ عنہم اقطاب نسبتی ہیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی جانب سے نص و اشارہ اپنے بعد والے امام کے لئے اسی قطبیت کے اعتبار سے ہے اور امور امامت جو انہوں نے فرمائے ہیں اسی قطبیت کی طرف راجع ہیں۔''

(المقالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیۃ ص ۶ طبع نول کشور)

اسی خاندان کے چشم و چراغ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی اس سلسلے میں تصریح قابل ملاحظہ ہے کہ:

و معنی امامت که در اولاد حضرت امیرؑ باقی ماند و یکی مر دیگرے را وصی آن می ساخت، اور معنی امامت کے کہ جو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اولاد میں باقی رہی ہے اور ایک دوسرے کو اپنا وصی بناتا رہا ہے۔ (تحفہ اثنا عشریہ، باب ہفتم ص ۳۳۹) اور اس طرح کی عبارت ان کی تفسیر عزیزی، پارہ عم، ص ۳۰۷، مطبوعہ کانپور میں سورۃ الشمس کی تفسیر کے ضمن میں یوں موجود ہے کہ:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد امجاد باقی رہی اور آپ کا نام و نشان قائم رہا اور نور اس ولایت کا جس کے آپ حامل تھے نسلاً بعد نسل ایک حامل آپ کی اولاد میں پیدا ہوتا رہا اور امام اپنے وقت کا پیدا ہوتا رہا ہر چند کہ وہ ہیات اجتماعی مٹ گئی تھی لیکن وہ نور متفرق اور منتشر ہو کے موافق استعداد کے ہر ایک فرقے میں اہل خیر سے قائم رہا ان سببوں سے یہ امت اس طرح کے عذاب سے بچی رہی۔''

ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے ہر امام اپنی امامت کے ثبوت میں چند علامات ظاہر کرتے

تھے۔ یہ امر معروف تھا اس عہدۂ جلیلہ (امامت) کے لئے اپنے جدِ اعلیٰ حضور سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اپنے سے پہلے امامؑ کی تصریحات سے اور کبھی ان کی تلویحات سے استنباط کیا ہے لیکن پھر بھی بعض مفاد پرست لوگ ایک کی وفات پر اس سلسلے میں چہ میگوئیاں کرتے اور بعض گمراہ کن دعویٰ بھی کر لیتے مگر بالآخر ان کا دعویٰ اور ان کے حامی زائل ہو جاتے تھے۔ بہر کیف امام کے لئے ضروری ہے کہ منصوص علیہ ہو، جس پر نص وارد نہیں وہ اس عہدہ پر متمکن نہیں ہوسکتا۔ پس بعد از امام الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے علاوہ کوئی بھی امامت کا استحقاق نہیں رکھتا۔

انبیاء کرامؑ اور ائمہ اہل بیتؑ کے تکوینی و تشریعی اختیارات

چونکہ اللہ جل شانہ نے اپنے بعض مقرب بندوں کو تکوینی امور کے نفاذ اور الٰہی ارادوں اور فیصلوں پر عمل درآمد کے لئے اپنا خاص کارکن منتخب کیا ہوتا ہے، جس طرح کہ جبرئیل علیہ السلام اور ان کے ماتحت بہت سے ملائکہ کی وساطت سے اللہ تعالیٰ نے ظالم اور نافرمان اقوام کو سزا دی اور بعض انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کی مدد کر کے انہیں نجات دلائی۔ اسی طرح میکائیل علیہ السلام اور ان کے ماتحت بے شمار فرشتے رزق کی تقسیم اور بارش برسانے وغیرہ امور پر متعین ہیں۔ عزرائیلؑ اور دیگر ملائیکہ کو بھی اسی نوعیت کے فرائض سونپے گئے ہیں۔ یہ فرشتے کسی طرح بھی الٰہی اختیارات میں شریک نہیں ہیں نہ خود کسی قسم کا اختیار رکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے احکام کی تعمیل کے لئے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے الٰہی اختیارات استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا بھی درست ہے کہ غزوہ بدر میں فرشتوں کو مسلمانوں کی مدد و نصرت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہی ارسال فرمایا تھا۔ یہ مدد و نصرت اور سبب نجات درحقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی مہیا کیا گیا تھا۔

سورہ نازعات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾

پس قسم ہے ان کی جو امور کی تدبیر کرنے والے ہیں۔ (پارہ ۳۰ سورۃ نمبر ۷۹ آیت ۵)

شاہ عبد العزیز دہلوی اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مدبرات امراً قلوب کاملین مکملین که بعد از وصول برائے دعوت خلق بحق نزول می فرمایند و به صفات الٰهیه متصف شده رجوع میکنند،

''المدبرات امراً سے مراد کامل و مکمل دل ہیں جو مرتبہ وصول تک رسائی حاصل کرنے کے بعد مخلوق کو خالق سے ملانے (اور انہیں پستی سے بلندی کی طرف لے جانے) کے در پے ہوتے ہیں اور صفات الٰہیہ سے متصف ہو کر مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

(تفسیر فتح العزیز پارہ عم ص ۲۳ طبع دہلی)

مفسرین اہل سنت نے صفات مذکورہ کو ملائیکہ کے علاوہ نفوس کاملہ اور ارواح فاضلہ پر بھی منطبق کیا ہے ان کے لئے تدبیر و تصرف اور انتظام و انصرام کائنات کو تسلیم کیا ہے اور ان نفوس قدسیہ کو کائنات پر اطلاع بھی ہے جو الٰہی تکوینی فیصلوں پر عمل درآمد کے لئے مستعد ہوتے ہیں اور ان فیصلوں کو نافذ کرتے ہیں۔

کیا تکوینی امور کے نفاذ پر صرف فرشتے ہی متعین ہیں؟ یا وہ نفوس مقدسہ بھی اس فریضے کی ادائیگی میں نہ صرف شریک ہیں بلکہ ملائکہ سے افضل ہونے کی وجہ سے وہ ان تمام مدبرات امور (فرشتوں) کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں؟ محقق صوفیاء اہل سنت اس امر کے قائل ہیں کہ یہ ارواح مقدسہ تدبیر امور تکوینیہ کے لئے فرشتوں سے بالاتر درجہ پر فائز ہوتی ہیں۔ فرشتے اور دیگر ارواح مقدسہ ان کے ماتحت تکوینی امور کی تدبیر کے لئے ساعی اور عامل ہوتے ہیں۔ اہل سنت کے تمام مدارس میں پڑھائی جانے والی مشہور تفسیر ''بیضاوی'' مطبوعہ مطبع احمد دہلی میرے پیش نظر ہے۔ آیت ﴿فالمدبرات امراً﴾ کے ذیل میں لکھا ہے:

صفات النفوس الفاضلة حال المفارقة (الی ان قال فتسط الی عالم الملکوت و تسبح فیه فتسبق الی خطائر القدس فتصیر لشرفها و قوتها من المدبرات

اللہ تعالیٰ فاضل نفوس (انبیاءؑ و اہل بیتؑ) کی ارواح کا تذکرہ فرماتا ہے کہ جب وہ ارواح اپنے مبارک بدنوں سے جدا ہوتی ہیں تو تمام عالم بالا کی طرف سبک خرامی اور دریائے ملکوت میں شناوری کرتی ہے تو پھر خطائر قدسی تک تیزی سے رسائی جاتی ہیں پھر اپنی بزرگی اور قوت کے باعث

جہان میں کاروبار عالم کے تدبیر کرنے والوں کی شامل ہو جاتی ہیں یعنی یہ ارواح مقدسہ بعد از وصال تصرف فرماتی ہیں اور جہان کی کاموں کی تدبیر کرتی ہیں۔

(تفسیر بیضاوی ج ۲ ص ۲۲۱ مطبع احمدی دہلی)

شیخ عبدالحق دہلوی نے بھی قاضی بیضاوی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

آیت کریمہ ﴿**والنازعات غرقاً الآیة رابصفات نفوس فاضله در حالت مفارقت از بدن که کشیده می شوند از ابدان و نشاط می کنند بسوئے عالم ملکوت و سیاحت می کنند بحائر قدس پس میگردند بشرف و قوت از مدبرات امر**﴾۔ (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۱۰۴ مطبوعہ لکھنؤ)

''یعنی یہ صفات نفوس انسانیہ اور ارواح کاملین کی ہیں جو کہ وقت وصال میں اپنے ابدان مبارکہ سے کھینچے جاتے ہیں اور خوشی و راحت کے ساتھ عالم ملکوت کی طرف چلتے ہیں اور اس میں سیر وسیاحت کرتے ہیں پس مقدس مقامات کی طرف سبقت لے جاتے ہیں اور اپنے فضل وشرف اور قوت وقدرت کی وجہ سے مدبرات امر میں سے ہیں۔''

بعینہ یہی مفہوم بلکہ اس سے زیادہ وضاحت تفسیر روح المعانی ج ۳۰ ص ۲۴ میں علامہ آلوسی بغدادی کے کلام میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو وصال کے بعد بھی کرامتوں سے نوازتا ہے جیسا کہ حالت حیات میں بھی مریض کو ان کے ہاتھ پر شفا بخشتا ہے کسی کو ان کے ذریعے غرق ہونے سے بچاتا ہے کبھی ان کے ذریعہ دشمنوں پر غلبہ دیتا ہے تو کبھی ان کے عرض کرنے پر بارش برساتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ اہل سنت کے دیگر اکابر کی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی علامہ بیضاوی کے ساتھ متفق ہیں۔ ان کے علاوہ امام شیخ اسماعیل حقی بروسوی، فخر الدین رازی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی بھی اسی سے ملتی جلتی عبارات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

چنانچہ شاہ اسماعیل دہلوی، سید احمد بریلوی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

بالجمله ائمه این طریق و کابر این فریق در زمره ملائکه مدبرات الامر که در تدبیر

امور از جانب ملا اعلیٰ ملهم شده در اجرای آن می کوشند معدود ان پس احوال این کرام بر احوال ملائکه عظام قیاس باید کرد۔

"حاصل کلام اس راستے کے امام اور اس گروہ کے بزرگ ان فرشتوں کے زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں جن کو ملاء اعلیٰ کی طرف سے تدبیر امور کے بارے میں الہام ہوتا ہے اور وہ اس کے جاری کرنے میں کوشش کرتے ہیں پس ان بزرگوں کے حالات کو بزرگ فرشتوں کے احوال پر قیاس کرنا چاہیئے۔" (صراط مستقیم، ص ۳۸ مطبوعہ دیوبند)

یہ حیثیت تو عام صحابہ کرام اور تابعین عظام کی بیان کی ہے جبکہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دیگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت اس سے کہیں بالاتر ہے، اس لئے کہ ملاء اعلیٰ اور ملاء اعلیٰ والوں کے سردار جبرئیل سدرۃ المنتہیٰ سے اوپر نہیں جا سکتے کہ:

اگر یک سرموئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

لیکن محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قاب قوسین او ادنیٰ کے مرتبہ پر فائز ہیں۔ چنانچہ ان حضرات کو اپنے مرتبے کے لحاظ سے ہی تدبیر اور تکوینیہ کی تکمیل کے لئے منصب عطا ہوگا۔ اس سلسلے میں شاہ اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں:

همچنیں اکمل افراد انسانی مصدر خدمات جمیع ملائکه مدبرات الامر میتواند شد مثلا در جهاد یا اهلاك کفره بدعا و همت خدمتیکه به ملائکه غضب تعلق در دازان بظهور می رسد و در ایصال منافع علیه خدمتیکه بملائکه رحمت تعلق دارد از ان متحقق می شود و در تسبیح و اذکار بجا آوردن عبادات خدمتیکه بملائیکه مسبحین تعلق دارد از و رد می نماید و در تعلیم و ارشاد و تلقین خدمتیکه بملائکه حدام وحی تعلق می دارد از دست او درست می آید و در اقامت سلطنت عادله و خلافت کبریٰ و قیام بمناصب امامت باطنه و نبوت و رسالت و مراتب اولوالعزم و خاتمیت خدماتیکه تعلق بملائی اعلیٰ می دارد از و صورت ی بندد و قس علی

ذلك سائر الخدمات....."

"۔۔۔۔۔اسی طرح انسانی افراد میں سے کامل لوگ تدبیر کرنے والے فرشتوں کی ساری خدمتوں کا مصدر ہو سکتے ہیں مثلاً جہاد یا دعا کے ساتھ کفار کے ہلاک کرنے کی خدمت جو فرشتگانِ غضب سے متعلق ہے جہاد اور دعا کے ذریعہ اس کامل انسان سے ظاہر ہو جاتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے منافع پہنچانے کی خدمت جو فرشتگانِ رحمت کے متعلق ہے اس سے حاصل ہوتی ہے اور تسبیح و اذکار اور بجا آوری عبادت کی جو خدمت فرشتگان میں مسبحین کی متعلق ہے اس سے صادر ہوتی ہے اور پڑھنے پڑھانے اور ارشاد و تلقین کی جو خدمت فرشتان خدام وحی سے متعلق ہے اس سے درست ہوتی ہے اور سلطنت عادلہ اور خلافت کبریٰ کے قائم کرنے، امامت باطنہ، نبوت، رسالت، اولوالعزم اور خاتمیت کے عہدوں اور مرتبوں کے مرتب کرنے کی جو خدمتیں ملاء اعلیٰ کے فرشتوں سے متعلق ہیں اس سے ہوا کرتی ہیں اور باقی خدمتوں کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہیئے ۔۔۔"

(صراط مستقیم فصل چہارم در بیان طریق ادای طاعات، ص ۱۰۰، ۱۰۱)

کیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی مرتضیٰ علیہ السلام سے بڑھ کر بھی کوئی شخص کامل ہو سکتا ہے؟ چنانچہ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ تمام امور تکوینیہ کی تدبیر کے لئے آپ فرشتوں کے سربراہ اور رئیس ہیں۔ شاہ صاحب نے واضح کر دیا ہے کہ سزا دینے اور منافع پہنچانے کی تمام خدمات اللہ تعالیٰ انہی بزرگوں کی وساطت سے کائنات میں نافذ کرتے ہیں۔ اس لئے اگر ان حضرات کے ان افعال و اعمال کو ان کی طرف منسوب کیا جائے تب بھی اس میں کوئی قباحت نہیں۔ چونکہ ان بزرگوں نے ان امور کو اللہ رب العزت کے حکم اور اجازت سے انجام دیا ہوتا ہے اس لئے درحقیقت ان امور کا فاعل اور مدبر اللہ تعالیٰ ہی ہوگا۔ اس میں کون سی بات شرک والی ہے، اسی مقصد کی وضاحت شاہ اسماعیل دہلوی صاحب نے سید احمد بریلوی کے الفاظ میں اس طرح سے کی ہے۔ "۔۔۔۔۔مثلاً بادشاہ ہندوستان کے چیلہ خاص کو پہنچتا ہے کہ کہے ہماری سلطنت شہر کابل سے لے کر سمندر کے کنارہ تک ہے اسی طرح ان مراتب عالیہ اور مناصب رفیعہ کے صاحبان عالم مثال اور عالم شہادت میں تصرف کرنے کے مطلق ماذون ومجاز ہوتے ہیں اور ان بزرگواروں کو حق

پہنچتا ہے کہ تمام کلیات کو اپنی طرف نسبت کریں مثلاً ان کو جائز ہے کہ کہیں عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے یعنی اس کلام کا یہ ہے کہ عرش سے فرش تک ہمارے مولیٰ کی سلطنت ہے اور سب چیزوں کی طرف ہماری نسبت متساوی ہے یا اس طرح کہیں کہ کسی چیز کو ہمارے ساتھ خصوصیت نہیں کہ وہ چیز ہماری طرف منسوب ہو اور اس کے سوا دوسری چیزیں ہماری طرف منسوب نہ ہوں۔"

(صراط مستقیم ص ۱۱۴)

اسی طرح الٰہی خدمات غضب و منافع انجام دینے والوں میں حضرت علی علیہ السلام سرفہرست ہیں۔ چنانچہ شاہ اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں:

و حضرت مرتضیٰ را یک نوع تفضیل بر حضرت شیخین هم ثابت است و آن تفضیل بجهت کثرت اتباع ایشان و وساطت مقامات ولایت بل سائر خدمات است مثل قطبیت و غوثیت و ابدالیت و غیرها همه از عهد کرامت مهد حضرت مرتضیٰ تا انقراض دنیا همه بواسطه ایشان است و در سلطنت سلاطین و امارات امراهم همت ایشان را دخلی است که بر سیاحین عالم ملکوت مخفی نیست

حضرت علی ﷺ کیلئے شیخین رضی اللہ عنہما پر بھی ایک گونہ فضیلت ثابت ہے اور وہ فضیلت آپ کے فرمانبرداروں کا زیادہ ہونا اور مقامات ولایت بلکہ قطبیت اور غوثیت اور ابدالیت اور انہی جیسے باقی خدمات آپ کے زمانہ سے لے کر دنیا کے ختم ہونے تک آپ ہی کی وساطت سے ہوتا ہے اور بادشاہوں کی بادشاہت اور امیروں کی امارت میں آپ کو وہ دخل ہے جو عالم ملوکیت کی سیر کرنے والوں پر مخفی نہیں ۔۔۔۔۔۔" (صراط مستقیم باب دوم ہدایت ثانیہ، ص ۶۷ طبع دیوبند)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اہل بیتؑ کے تکوینی امور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت امر و ذریت طاهره اور تمام امت بر مثال پیران و رشدان می پرستند و امور تکوینیه را بایشان وابسته می دانند و فاتحه و درود، صدقات و نذر و منت بمام ایشان رائج و محمول گردیده چنانچه باجمیع اولیاء الله همیں معامله است"

"حضرت علی ﷺ اور ان کی اولاد کو امت کے اکثر افراد پیروں اور مرشدوں کی طرح

مانتے ہیں۔ امور تکوینیہ کو ان حضرات کے ساتھ وابستہ جانتے ہیں اور فاتحہ، درود، صدقات اور نذر و نیاز ان کے نام کی ہمیشہ کرتے ہیں جیسا کہ تمام اولیاء اللہ کا یہی طریقہ و معمول ہے۔"

ملاحظہ ہو تحفہ اثنا عشریہ، ص ۳۹، ۴۰، مطبوعہ ثمر ہند، تفسیر عزیزی، ص ۲۷، ۲۸، طبع دہلی

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی بھی حضرت علی علیہ السلام کے لئے اس مقام و مرتبے کے قائل ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ایھا الاخ ان الامام علیا کرم اللّٰہ وجھہ لما کان حاملا لثقل الولایۃ المحمدیۃ علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ و السلام و التحیۃ کان تربیۃ مقام الاقطاب و الاوتاد و الابدان الذین ھم من اولیاء العزلۃ و غلب فیھم جانب کمالات الولایۃ مفوضۃ الی امدادہ و اعانتہ و راس قطب الاقطاب تحت قدمہ و یجری امرہ و یحصل مھمہ بحمایتہ و رعایتہ و یخرج بہ عن عھد مداریتہ و السیدۃ فاطمۃ و ابناھا الامامان رضی اللّٰہ عنھم ھم ایضاً شرکاوہ فی ھذا المقام

اے بھائی، بے شک جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ ثقل ولایت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ و السلام والتحیہ کے حامل ہیں تو اقطاب، اوتاد اور ان ابدال کے مقام کی تربیت، جو گوشہ نشین اولیا میں سے ہوتے ہیں اور ان میں کمالات ولایت کے پہلو کا غلبہ ہوتا ہے۔ آپ کی امداد اور اعانت پر منحصر ہے۔ قطب الاقطاب یعنی سب سے بڑا قطب جو قطب مدار ہوتا ہے، وہ آپ کے قدم کے نیچے ہوتا ہے۔ آپ کی حمایت اور نگرانی میں اس کا امر جاری ہوتا ہے اور وہ اپنے فرائض (آپ کی حمایت و نگرانی میں) انجام دے کر اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ سیدہ فاطمہ اور ان کے دونوں امام بیٹے (حسن و حسین علیہما السلام) رضی اللہ عنہم بھی اس منصب میں حضرت علی (علیہ السلام) کے شریک کار ہیں۔ (المنتخبات من المکتوبات ص ۶۳ مکتوب نمبر ۲۵۱ طبع استنبول)

مزید برآں اسی امر کو شاہ عبد العزیز دہلوی نے بھی تحفہ اثنا عشریہ مطبوعہ مطبع ثمر ہند لکھنؤ کے صفحہ ۳۳۹ پر بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مؤلف اور اس کے ہمنواؤں کی کج فہمی

اگر یہ کج فہم نادان لوگ قرآن کریم کا سرسری مطالعہ ہی کر لیتے تو اتنی بڑی کج فہمی یا نادانی کا ارتکاب نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں میں سے ایک حضرت خضر علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قصہ بیان کیا ہے جس سے تکوینی و تشریعی اختیارات کی ایک حد تک اپنے خاص بندوں کو تفویض کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، خضر علیہ السلام سے قبل اور ان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو بھی تکوینی امور میں ایک حد تک اختیار سونپ دیتا ہے۔ ان اختیارات کے حامل تشریعی نبی بھی ہو سکتے ہیں جبکہ خضر علیہ السلام کی مانند بہت سے دیگر خواص یعنی ائمہ اور اوصیاء اس منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ قرب نوافل کی حدیث اس امر کی مزید وضاحت اور تائید کرتی ہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں شاہ اسماعیل دہلوی اور ان کے پیر و مرشد سید احمد بریلوی کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے کہ اللہ کے یہ مقرب بندے مجازاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں قوم کو ہم نے تباہ کیا یا ہم نے فلاں قوم کو نجات دی یا ان کی مدد و نصرت کی اس لئے کہ وہ ان خدمات و تصرفات میں اللہ تعالیٰ کے خاص نمائندے اور بندے ہوتے ہیں۔

مؤلف کے رکیک ایرادات اور ان کے جوابات

مولوی اعظم طارق نے بحر ضلالت میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے عنوان ''شیعہ اور انکار توحید'' کے تحت مندرجہ ذیل عناوین کے ذریعے سے اپنی لاعلمی اور جہالت کا مظاہرہ کیا ہے جن کا خلاصہ بیان کر کے مندرجہ بالا علمی حقائق کے ساتھ موازنہ کے لئے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ تمام اعتراضات انتہائی مخدوش و کمزور ہیں۔ ان کے اجمالی جوابات ترتیب وار ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) زمین کا مالک اللہ یا آئمہ

ملاں جی نے آیت ﴿ان الارض للّٰہ یورثھا من یشاء﴾ (سورۂ اعراف) سے استدلال کیا ہے اور بعد ازاں اصول کافی کی ایک روایت، جس میں یہ امر بیان ہوا ہے کہ دنیا و

فیہا امام کی ملکیت ہے، کوتوحید کے منافی اور اپنی بے عقلی سے شرک قرار دیتا ہے۔ اگر اس روایت اور اس نوع کی دیگر روایات کا مفہوم شرک ہے تو پہلے اس احمق ملاں اور اس کے پیروکاروں کو شاہ اسماعیل دہلوی، سید احمد بریلوی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان جیسے دیگر محققین علماء وصوفیاء کو مشرک و کافر قرار دینا ہوگا۔ ورنہ اپنی حماقت اور بے عقلی سے توبہ کر کے سیدھی راہ اختیار کرنی ہوگی، پھر اہل حق کی ہموائی ان پر لازم ہوگی۔ لیکن تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کی کنیت ابوتراب ہے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کو اس کنیت سے سرفراز فرمایا۔ چنانچہ علامہ وحید الزمان حیدرآبادی مترجم صحاح ستہ اپنی شہرہ آفاق کتاب انوار اللغۃ پارہ ۲ ص ۸ مطبوعہ بنگلور میں اس کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتے ہیں کہ "ابوتراب آپ کی کنیت اس لئے ہوئی کہ آپ ساری زمین کے سردار ہیں اور حجت ہیں اللہ کی زمین والوں پر۔"

دراصل و فرع بہ بین و تمیز مرتبہ کن
ابو البشر بود آدم ابو تراب علیؑ است

(۲) مارنا اور زندہ کرنا

بحار الانوار کے حوالہ سے بے دانش ملاں جی لکھتے ہیں کہ شیعوں نے علیؑ کی طرف مارنے اور زندہ کرنے کا دعویٰ منسوب کیا ہے۔ شاہ عبد العزیز دہلوی تحفہ اثنا عشریہ کے باب اول "در حدوث مذہب شیعہ" میں عبد اللہ بن سبا اور اس کے پیروکاروں کی تردید کرتے ہوئے اس امر کی تائید واثبات کرتے ہیں کہ یہ الفاظ حضرت علی علیہ السلام سے صادر ہوئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"و بعض کلمات مرتضویؑ را کہ در حالت سکر و غلبہ حال کہ اولیاء اللہ را می باشد مثل انا حی لا یموت و انا باعث من فی القبور و انا مقیم القیامۃ از انجناب سربرزدہ بود موید مقالہ و شاھد دلالت خود گر دایند..."

اور بعض باتیں جو جناب امیر علیہ السلام سے وجد و حال میں جیسا کہ اولیاء اللہ کو ہوتا ہے سرزد ہوئی تھیں۔ موید اپنے قول کی بنائیں اور گواہ اپنی رہنمائی کی ٹھہرائیں پہلے قول کا معنی کہ میں ایسا زندہ ہوں کہ مجھ کو موت نہیں، دوسرے کے، میں ہی اٹھانے والا مردوں کا ہوں قبروں سے،

تیسرے کے، میں ہی قائم کرنے والا قیامت کا ہوں۔"

(تحفہ اثنا عشریہ فارسی ص ۶ ترجمہ اردو ہدیہ مجیدیہ ص ۷)

کیا یہ نا قابل انکار حقیقت نہیں ہے کہ ﴿و ابرء الاکمہ و الابرص و احی الموتی اذن﴾ اس جگہ ابراء یعنی شفا دینے اور احیاء یعنی مردے زندہ کرنے کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی طرف کی ہے بلکہ دوسری جگہ قرآن حکیم میں خود خالق کائنات جل جلالہ نے بھی ﴿تبرئ الاکمہ و الابرص﴾ اور ﴿تخرج الموتیٰ﴾ فرما کر ابراء اور احیاء کی اسناد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نسبت مبنی بر مجاز ہے لیکن حقیقت ذاتیہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ آپ کے بعض علماء نے اپنے اکابر کی مدح سرائی کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کرنے سے بھی دریغ نہ کیا چنانچہ مولوی محمود الحسن دیوبندی نے اپنے مرشد مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب کی وفات پر مرثیہ لکھا جس میں کہا ہے

مُردوں کو زندہ کیا اور زندوں کو مرنے نہ دیا
اس مسیحائی کو دیکھیں ذرا ابن مریم

(مرثیہ گنگوہی ص ۳۴ طبع ساڈھورہ)

اس شعر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معاذ اللہ چیلنج کیا گیا ہے کہ تم بھی مسیحا ہو مگر تم صرف مردے زندہ کر سکتے ہو لیکن کسی زندے کو مرنے سے نہیں بچا سکتے ہمارا مسیحا رشید احمد گنگوہی اس شان کا مالک ہے کہ وہ زندوں کو مرنے بھی نہیں دیتا۔ استغفر اللہ العظیم،

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ اس شعر میں مُردہ سے مراد جاہل اور زندہ سے مراد عالم ہے یعنی جاہلوں کو عالم بنایا اور عالموں کو جاہل نہ بننے دیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ توجیہہ قطعاً باطل اور مخدوش ہے اس لئے کہ اگر یہ معنی مقصود تھا تو پھر خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقابل کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ہر نبی میں تعلیم کا وصف موجود ہوتا ہے بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقابل کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ زندہ کرنے سے مراد حسی زندہ کرنا ہے جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشہور

وصف تھا۔ جس وصف کو ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے لئے ثابت کرنا آپ کے نزدیک شرک اور ناجائز ہے وہ اپنے پیروں اور مولویوں کے لئے عین توحید اور خالص ایمان کیسے ہوگیا؟

ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا

(۳) فرعون کو غرق کرنا اور موسیٰؑ کو نجات دینا

بصایر الدرجات کی ایک اسی نوع کی روایت کو مؤلف نے اس امر میں بھی قرآنی مفہوم و الفاظ کا متضاد قرار دیتے ہوئے اہل حق پر شرک کا الزام عائد کرنے کی لاحاصل سعی کی ہے۔ ہمارے مخاطب اور اس طرح کے دیگر احساس کمتری میں مبتلا افراد کو چاہیئے کہ پہلے شاہ عبدالعزیز دہلوی اور ان کے تمام اہل خاندان اور ان کے تمام معتقدین پر کفر و شرک کا فتویٰ صادر کریں۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اس بناء پر مذہب حق پر شرک کا الزام لگانا محض ابلیسی عناد، انتہائی تنگ ظرفی اور قلبی بغض کی غمازی کرتا ہے۔ اگر آپ تعصب و تعنت کی پٹی اتار کر اصل حقائق کے ادراک کی کوشش کرتے ہیں تو ہمارا مؤقف آپ کو بآسانی سمجھ آ جاتا اور اس سے انکار یا پہلوتہی کی گنجائش ہی نہ ہوتی، البتہ اس کے لئے خدا خوفی اور انصاف و دیانت کا ہونا اہم شرط ہے

سمجھ میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے مگر
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے

(۴) ''قوم عاد و قوم ثمود اور اصحاب رس کو تباہ و برباد کرنا''

(۵) ''ہر چیز کی گنتی شمار کر رکھنا''

ان عنوانات میں احمق ملاں کو جو شرک نظر آ رہا ہے یہ اس کی کوتاہ نظری اور کم فہمی کی دلیل ہے۔ مندرجہ بالا سطور ''انبیاء کرام اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے تکوینی و تشریعی اختیارات'' کے زیر عنوان ان کی کج فہمی اور حماقت سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے۔

ہزاروں نکتے یہاں بال سے بھی ہیں باریک
کہ جس کی عقل ہو موٹی اس کو کیا جانے

(۶) ''غیب کے خزانوں کی کنجیاں کس کے پاس ہیں؟''

سورہ انعام کی آیت ﴿و عندہ مفاتیح الغیب لا یعلمها الا هو﴾ سے استدلال کرتے ہوئے جلاء العیون سے حضرت علی علیہ السلام کے خطبے کے الفاظ نقل کئے ہیں جس میں ہے کہ ﴿انا عندی مفاتیح الغیب لا یعلمها بعد رسول الله الا انا.... الخ﴾ اس میں تعجب اور حیرت کی کون سی بات ہے؟ جس طرح اللہ تعالیٰ نے دیگر اختیارات اپنے خاص بندوں کو سونپ رکھے ہیں تو ان اختیارات کو درست طریقے سے درست وقت پر یعنی موقع و محل کی مناسبت سے استعمال کرنے کیلئے ضروری علم سے بھی نوازا ہے اور اس علم کے خزانے کی کنجیاں انکے سپرد کی ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ﴿اوتیت مقالید الدنیا علی فرس ابلق﴾ کہ ساری کائنات کی چابیاں مجھے ایک چتلے رنگ کے گھوڑے پر لاد کر عطا کی گئی ہیں۔ یہ وہ ارشادات ہیں جو آپؐ نے اپنے صحابہ کرامؓ کے سامنے بیان فرمائے۔

(شرح زرقانی ج ۵ ص ۳۶۰ طبع جدید بیروت)

معمولی تبدیلی الفاظ کے ساتھ یہ حدیث معتبر و مستند کتب احادیث میں پائی جاتی ہے: ﴿بینا انا نائم اذ اوتیت بمفاتیح خزائن الارض فوضعت فی یدی﴾. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۳۸) بلکہ متعدد مقامات پر یہ حدیث موجود ہے کہ انی اعطیت مفاتیح خزائن الارض، ملاحظہ ہوں ص ۵۸۵، ص ۹۵۱، ۹۷۵، ج ۲، مطبوعہ میرٹھ)

اس کے علاوہ ایک اور روایت جو حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی سے ہے کہ وہ آپ کو وضو کرا رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا: اے ربیعہ مانگ مجھ سے جو کچھ مانگنا چاہتا ہے؟ عرض کیا: ﴿اسئلك مرافقتك فی الجنة﴾ میں آپ سے یہ مانگتا ہوں کہ جنت میں مجھے اپنے ساتھ رکھیں تو پیغمبرؐ نے فرمایا: ﴿او غیر ذلك﴾ یہی مانگتے ہو یا کچھ اور بھی چاہیئے؟ عرض کیا: ﴿هو ذاك یا رسول الله﴾ میرا مدعا صرف یہی ہے مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا: ﴿فاعنی علی نفسك بكثرة السجود﴾ پھر اپنے نفس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عبادات کی کثرت کے ساتھ میری امداد کیجئے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی الدیوبندی اس حدیث کی شرح میں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿و یوخذ من اطلاقه علیه السلام الامر بالسوال ان الله سبحانه مکنه من اعطاء کل ما اراد من خزائن الحق و من ثم عد ائمتنا من خصائصه علیه السلام انه یخص من شاء بما شاء ..... الخ﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محض ''سَل'' فرما دینے اور ان پر کوئی پابندی عائد نہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے حسب ارادہ تصرف کرنے اور انہیں تقسیم کرنے کا اختیار دے دیا ہے اور یہیں سے ہمارے ائمہ نے آپؐ کے خصائص میں ایک یہ خصوصیت بھی شمار کی ہے کہ آپ جو چاہیں جس کو چاہیں باذن اللہ عطا فرما سکتے ہیں۔''

(فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۹۶ طبع بجنور)

مندرجہ بالا حدیث کی وضاحت میں یہی تحقیق ملا علی قاری الحنفی نے مرقاۃ شرح مشکواۃ ج ۲ ص ۳۲۲ مطبوعہ ملتان اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۴۲۵ مطبوعہ نولکشور میں پیش کی ہے۔

اہل حق کا عقیدہ ہے کہ یہ حضرات ائمہ اہل بیت علیہم السلام جو حضور نامدارؐ کے حقیقی جانشین اور علوم انبیاء کے وارث ہیں اللہ تعالیٰ کے کنجی بردار ہیں نہ یہ کہ اب اللہ فارغ ہو چکا اور سب کچھ ان کے قبضہ میں آ گیا ہے (معاذ اللہ) جو علم ان شخصیات کو عطا کیا گیا ہے وہ اتنا ہے جو ان اختیارات کے استعمال میں لازمی اور ضروری ہے۔

ملا علی قاری حنفی اپنے بزرگ شیخ کبیر امام ابوعبداللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

﴿و نعتقد ان العبد یصیر الی لغت الروحانیة فیعلم الغیب و تطوی له الارض و یمشی علی الماء و یغیب عن الابصار﴾

ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ بندہ روحانی کیفیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو وہ غیب کو جانتا ہے اور اس کے لئے زمین سمٹ جاتی ہے اور وہ پانی پر چلتا ہے اور نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ص ۶۲ طبع ملتان)

مؤلف نے اپنی نارسا عقل اور ناقص فراست کے بل بوتے پر کفار و مشرکین کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کو مسلمانوں پر چسپاں کرنے کی ایک غیر شرعی جسارت کی ہے۔ اہل اسلام کو مشرک بناڈالنا سراسر ظلم و تعدی ہے اور سینہ زوری ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن عمر کا قول ہے: ﴿یراھم شرار خلق اللّٰہ و قال انھم انطلقوا الی آیات نزلت فی الکفار فجعلوھا علی المؤمنین﴾ ''وہ لوگ خدا کی مخلوق میں بدترین ہیں جو کفار کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مومنوں پر چسپاں کرتے ہیں۔''

(صحیح بخاری، ج ۴ص ۱۲۰باب قتل الخوارج والملحدین طبع عثمانیہ مصر)

ان بعض آیات قرآنیہ (جو بتوں کے حق میں نازل ہوئی ہیں) کو انبیاء و ائمہ اہل بیت علیہم السلام پر منطبق کرنا خود بدبختی اور بدترین خلائق ہونے کی دلیل ہے وہ کون سی جماعت و فرقہ ہے جو بتوں اور بت پرستوں (مشرکین و کفار) کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو اہل ایمان پر چسپاں اور فٹ کرنے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا ہے اور لوگوں کو بہکاتے اور گمراہ و بے دین بناتا ہے جناب عبد اللہ بن عمر کے اس قول کے مصداق یقیناً آپ ہی لوگ ہیں۔

الحمد للہ کوئی شیعہ سنی مسلمان خواہ جاہل ہی کیوں نہ ہو وہ بھی خدا کے سوا کسی کو عبادت کے لائق اور عبادت کا حقدار نہیں مانتا بلکہ ہم شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انبیاء کرامؑ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام باذن اللہ کمالات و تصرف کے مالک ہونے کے باوجود خدا کی مشیت کے ماتحت ہیں اور ایک لحہ کے لئے بھی وہ اللہ تعالیٰ سے مستغنی و بے نیاز نہیں ہوسکتے ان کی مشیت بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت ہے ﴿وما تشاؤن الا ان یشاء اللّٰہ رب العالمین﴾

شاہ عبد العزیز دہلوی خواص اولیاء اللہ کے تصرفات کے بارے میں سورۃ انشقت پارہ ۳۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿بعضے از خواص اولیاء اللّٰہ را کہ آلہ جارحہ تکمیل و ارشاد بنی نوع خود گردانیدہ اند دریں حالت ہم تصرف در دنیا دادہ و استغفرا آنھا بہ جھت کمال وسعت

تدارك آنها مانع توجه بایں سمت نمی گردد و اویسیاں تحصیل کمالات باطنی از آنها می نمائنده و ارباب حاجات و مطالب حل و مشکلات خود از آنها می طلبند و می پابند و زبان حال دراں وقت هم مترنم بایں مقالات است من آیم بجان گر تو آئی به تن﴾

''بعض خاص اولیاء اللہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے بندوں کی ہدایت وارشاد کے لئے پیدا کیا، ان کو اس حالت میں بھی اس عالم کے تصرف کا حکم ہوا ہے اور اس طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کا استغراق بوجہ کمال وسعت تدارک نہیں روکتا ہے اور اس سلسلہ کے لوگ باطنی کمالات انہی سے حاصل کرتے ہیں حاجت مند اور اہل غرض لوگ اپنی مشکلات کا حل انہی سے چاہتے ہیں اور جو چاہتے ہیں وہ پاتے بھی ہیں اور زبان حال سے یہ ترنم کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ اگر تم میری طرف بدن سے آؤ گے تو میں تمہاری طرف جان سے آؤں گا۔''

(تفسیر عزیزی پارہ عم (فارسی) ص ۱۱۳ طبع مجتبائی دہلی)

اور اپنی اسی تفسیر کے ص ۵۰ اولیاء کرام (ائمہ اہل بیتؑ) دنیا سے انتقال کرنے کے بعد ان کے تصرفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿از اولیائے مدفونین و دیگر صلحائے مومنین انتفاع و استفاده جاری است و آنها را افاده و اغانت نیز مقصود﴾

''دفن کئے ہوئے اولیائے کرام اور دیگر نیک مومنین سے نفع اٹھانے اور فائدہ حاصل کرنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور ان کو فائدہ پہنچانے کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔''

مندرجہ بالا سطور میں حضرت مولانا اسماعیل دہلوی وغیرہ علماء کی تصریحات کو دوبارہ غور سے پڑھ لینا شکوک وشبہات کو رفع کر دے گا۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہیں: **﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ..... الخ الآية﴾** وہی غیب دان ہے اور اپنی غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔

(سورہ الجن آیت ۲۶)

اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر غیب کو ظاہر کرتا ہے اور اسی ضمن میں ائمہ ہدیٰ آتے ہیں، اس لئے کہ علم رسولؐ کے وارث اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوقات کی رہنمائی کے لئے نامزد نمائندے ہوتے ہیں۔

(۷) ''روز جزا کا مالک''

شاہ عبد العزیز دہلوی حضرت علی علیہ السلام کے قول ﴿انا مقیم القیامۃ﴾ کو اُن سے صادر شدہ تسلیم کرتی ہے۔ چاہے جس حال میں صادر ہوا، تب اس مفہوم میں اس سے بڑھ کر کون سی شرک والی بات آ گئی ہے، اس کا مطلب بھی وہی ہے جو محقق علماء و صوفیاء نے بیان کیا ہے مگر جنہوں نے ''نہ ماننا'' ہی اپنا معمول بنا رکھا ہو وہ کس طرح سمجھیں؟ انہوں نے محض اپنی ضد اور حماقت پر قائم رہنا ہے۔

(۸) ''اول آخر ظاہر و باطن''

بحار الانوار کے حوالہ سے مؤلف لکھتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے حق میں یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی اول و آخر و ظاہر و باطن ہوں جبکہ سورۃ حدید میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

ناسمجھ مؤلف نے اگر شاہ عبد العزیز دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ میں اس حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں پڑھا تھا تو اب اسے پڑھنے کی زحمت گوارا کر لے اور مولانا شاہ اسماعیل دہلوی کی وضاحت ان کی تصنیف ''صراط مستقیم'' میں دیکھ لیجئے۔ نیز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتب تصوف خصوصاً ''تفہیمات الٰہیہ'' اور ''قصیدہ الطیب النعم'' کا عمیق نگاہوں سے مطالعہ کریں۔

(۹) ''کائنات کے ذرہ ذرہ کا مالک''

خوارج کی طرح ظاہری آیات سے استدلال کر کے غلط مفہوم اخذ کرنا اور فتوے لگانا انتہائی درجہ نامعقولیت اور نادانی ہے۔ محقق صوفیاء بالخصوص دہلوی خاندان کی اس سلسلے میں کتب کا مطالعہ کریں اگر مطالعہ کی صلاحیت اور سمجھنے کی لیاقت ہے لیکن ان کو اس کی صلاحیت کہاں؟

بصائر الدرجات سے مولا علی علیہ السلام کے خطبے کے الفاظ ﴿انا الذی سخرت لی

السحاب ... الخ﴾ کونقل کیا ہے۔ بے وقوف یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے تو عام انسانوں کو بھی خطاب کیا ہے کہ میں نے یہ مظاہر کائنات تمہارے لئے مسخر کئے ہیں۔

آپ کے غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی تو ارحام اور بطون میں موجود اشیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جو خوراک وغیرہ ان کے پیٹ میں ہوتی ہے اس کی بھی خبر دیتے ہیں جیسا کہ خود کہتے ہیں:

﴿اگر نمی بود لگام شریعت بر زبان من هر آئینه خبر می کردم شمارا با آنچه می خوراید و می نهید در خانهائے خود من میدانم آنچه ظاهر و باطن شما است و شما در درنك شیشه ها اید در نظر من.....﴾

”اگر شریعت کی لگام میری زبان پر نہ ہوتی تو یقیناً میں تمہیں اس کی خبر دیتا جو کچھ تم کھاتے ہو، جو کچھ اپنے گھروں میں رکھتے ہو، میں جانتا ہوں، جو کچھ تمہارا ظاہر اور جو کچھ تم نے پوشیدہ رکھا ہے اور تم میرے نزدیک شیشوں کی مانند ہو (جن کا اندر باہر سے صاف نظر آتا ہے)۔

(اخبار الاخیار از شیخ عبد الحق دہلوی ص ۱۹ طبع دیو بند)

صاحب لولاک وقاب قوسین کے وارث تھے۔ امام کا مقام و مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا عالم ہے کہ کسی شئے سے جاہل نہیں ہوتا ﴿لا یغیب عن علمه مثقال ذرة﴾ کائنات کا کوئی ذرہ نگاہ امامت سے پوشیدہ نہیں ہے اسی لئے حقیقی امام ہی وہ ہے کہ جو کسی سائل کے جواب میں یہ نہ کہے کہ وہ نہیں جانتا۔ اگر حضرت علی علیہ السلام یا دیگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام اس طرح کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس میں شرک کی کیا بات ہے؟ اسی بناء پر علماء اہل سنت نے لکھا ہے:

﴿والحکایات فی ذلك عن اولیاء اللّٰه تعالیٰ کثیره جدًا و لا ینکر ذالك الا معاندا و محروم﴾۔ (فتاوی حدیثیہ لابن حجر مکی ص ۳۹۴)

اس بارے میں اولیاء اللہ سے بہت زیادہ حکایات ثابت ہیں اور اس امر کا منکر یا محض عناد کی وجہ سے انکار کرتا ہے اور یا محرومی کی وجہ سے۔

جو لوگ الٰہی اختیارات کو ناجائز طور پر غاصبانہ انداز میں اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھے ہیں

اور نااہل لوگوں کو اللہ کا نمائندہ تسلیم کئے ہوئے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندوں اور ان کے پیروکاروں پر شرک کا الزام لگاتے ہیں جو خود ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' کے مصداق ہیں۔

شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

(۱۰)''قسیم الجنة و النار''

۔۔۔۔۔شیعہ کا عقیدہ کیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیں بصائر الدرجات کے صفحہ نمبر ۲۲ پر حضرت علی ؑ کے خطبہ کو عربی اور اردو میں اس طرح تحریر کیا گیا ہے: ﴿و انا صاحب الجنة و النار اسكن اهل الجنة و اسكن اهل النار النا الى ترويج اهل الجنة و الى عذاب اهلالنار﴾ اور ملاں باطر مجلسی نے بھی بحار الانوار کی جلد نمبر ۳۹ ص ۱۹۳ میں تحریر کیا ہے ان ﴿ان عليه السلام قسيم الجنة و النار﴾ حضرت علی علیہ السلام جنت، جہنم میں تقسیم کے اختیارات رکھتے ہیں۔۔۔۔۔'' (خطبات جیل ص ۳۴، ۳۵)

اگر ملاں جی علامہ قاضی عیاض کی ''شفاء بتعريف حقوق المصطفیٰ'' کی جلد اول ص ۲۲۳ اور صواعق محرقہ لابن حجر الہیثمی ہی کا متعلقہ صفحہ دیکھ لیتے تو حضرت علی علیہ السلام کی ذات اقدس پر اعتراض کرنے کی نوبت پیش نہ آتی بلکہ یہ تو اہل سنت کی مسلمہ روایات ہیں چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿يا على انت قسيم الجنة و النار يوم القيامة..... تقول النار هذا لى و هذا لك﴾

اے علیؑ تو قیامت کے دن جنت اور دوزخ کا تقسیم کرنے والا ہے اور حضرت علیؑ دوزخ سے کہیں گے یہ میرا ہے اور یہ تیرا ہے۔ (صواعق محرقہ ص ۷۵ مطبوعہ قدیم مطبع میمنیہ مصر)

علامہ قاضی عیاض مالکی اپنی کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ ج ۱ ص ۲۲۳ مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البابی مصر میں لکھتے ہیں: ﴿و قد خرج اهل الصحيح و ائمة (الى ان قال) و انه قسيم النار يدخل اولياؤه الجنة و عداؤ النار﴾

''یعنی اہل صحاح اور محدثین نے تخریج کی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام دشمنوں کو دوزخ میں داخل کریں گے اور دوستوں کو جنت میں، کیونکہ وہ قسیم النار (بھی) ہیں۔''

اور علامہ شہاب الدین خفاجی اس حدیث کی شرح میں اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ

''امام ابن اثیر نے نہایہ میں بیان کیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؑ فرماتے ہیں کہ ﴿انا قسیم النار﴾ میں دوزخ تقسیم کرنے والا ہوں۔

اس کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ

ابن اثیر الجزری قابل وثوق مورخ ہیں اور حضرت علیؑ کا قول محض رائے نہیں ہے کیونکہ اس میں اجتہاد یا رائے کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا لہٰذا یہ حکماً حدیث مرفوع قرار پاتی ہے۔'' ملاحظہ کیجئے نسیم الریاض شرح شفا قاضی عیاض ج ۳ ص ۱۶۳ طبع مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ۔

اگر حضرت علی علیہ السلام کو قسیم النار و الجنۃ کہنا شرک ہے تو سب سے پہلے حضرت سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر اور پھر حضرت علی علیہ السلام پر اعتراض کرنے کی جسارت ہوتی ہے کہ جنہوں نے حضرت علی علیہ السلام کو قسیم النار و الجنۃ کی سند عطا فرما کر جنت وجہنم کے تقسیم کا اختیار عطا فرما دیا ہے۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ مؤلف دارد حیف کز پس امروز بود فردائے

کیا مؤلف ہمیں بتا سکتے ہیں کہ پہلے سب علماء اہل سنت مورکھ، جاہل اور غیر محقق تھے؟

بس صرف پندرہویں صدی میں محقق پیدا ہوا، تو صرف آپ، یا للعجب و لضیعۃ الادب۔

بعد ازاں اگر جان میں کوئی رمق رہ گئی ہو تو اپنے مذہب کے اکابرین قاضی عیاض، شہاب الدین خفاجی اور احمد ابن حجر مکی اور ان پر اعتماد کرنے والوں کو بھی مشرک قرار دے دیں۔

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

یا علیؑ مدد اور علیؑ مشکل کشا کہنے کا جواز

ملاں نے بغض علیؑ کی وجہ سے اپنے دل ماؤف کی بھڑاس جس انداز سے نکالنے کی لاحاصل کوشش کی ہے وہ بھی ملاحظہ کر لیجئے چنانچہ لکھتے ہیں:

''شیعہ مشرکوں کا وہ گروہ ہے جو یا علیؑ مدد، مولیٰ علی مشکل کشاء کے نہ صرف خود نعرے لگاتا ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ خود انبیاء علیہ السلام جیسی موحد شخصیات بھی ''یا علی مدد'' کے نعرے لگا کر اللہ

کے سوا ان سے مدد مانگا کرتی تھیں اور اپنی پریشانیوں سے حاجت روائی کے لئے ان سے امیدیں وابستہ رکھا کرتی تھیں۔ جو گروہ اور طبقہ معاذ اللہ انبیاء علیہم السلام کو بھی شرک کے ارتکاب کو مرتکب قرار دے رہا ہو اس ہدایت کی امید کرنا ہی بے وقوفی ہے کیونکہ عام مشرک کو اگر شرک کی خباثت سے آگاہ کریں تو اس کے باز آنے کی امید ہو سکتی ہے لیکن جو گروہ شرک کو انبیاء علیہم السلام کی سنت قرار دے رہا ہو۔ پھر اس سے اسلام اور توحید کی توقع رکھنا بالکل ایسے ہے جیسے کوئی پاگل شخص سے دانائی کے اسباق پڑھنے کا خواہاں ہو۔" (خطبات جمیل ص ۶۱)

حلی جواب:

ملاں صاحب کے یہ سب شکوک و شبہات، اباطیل و خرافات، ادھر ادھر کی باتیں اور غوغا آرائی دراصل مسئلہ استمداد کو نہ سمجھنے اور عدم فہم و ادراک کا بھیانک نتیجہ ہے۔

حل کیا کرے گا مسئلہ زندگی وہ اب
جس کو شعور ناقص و کامل نہیں رہا

شیعیان حیدر کرار حضرت علی علیہ السلام کو بطور خدا کی مدد اور عون الٰہی کا مظہر سمجھ کر اور وسیلہ مان کر مدد کے لئے پکارنا، مدد مانگنا بالکل جائز اور درست سمجھتے ہیں اس کو کفر و شرک قرار دینا غیر صحت مندانہ اقدام ہے۔ ہمارے نزدیک حقیقی مستعان اور مستغاث صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ہم جب حضرت علی علیہ السلام یا دیگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کو مدد کے لئے یا کسی اور حاجت کیلئے پکارتے ہیں تو یہاں اسناد حقیقی نہیں بلکہ یہ نسبت و اسناد مبنی بر مجاز ہوتا ہے اور اگر یہاں اسناد کو حقیقی ہی مانا جائے تب بھی کوئی سقم نہیں پڑتا کیونکہ اسناد حقیقی دو اقسام پر مشتمل ہے:

(الف) حقیقی ذاتی۔ (ب) حقیقی عطائی۔

حقیقی ذاتی صرف ذات باری تعالیٰ کے لئے ہی مختص ہے جبکہ حقیقی عطائی ذات باری کیلئے محال ہے اور مخلوق کیلئے ثابت ہے۔ قرآن مجید میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں علم کی نسبت و اسناد بندہ کی طرف موجود ہے۔ ﴿من عباده العلماء﴾ (سورہ فاطر آیت ۲۸) اور ﴿بغلام علیم﴾ (سورہ الحجر آیت ۵۳ و سورۃ الذاریات یت ۲۸) اور اسی

طرح آیت ﴿انما انا رسول ربك لاهب لك غلاماً زكيا﴾ اے مریم میں تیرے رب کا رسول ہوں تجھے پاک بیٹا دینے آیا ہوں۔(سورۃ مریم آیت ۱۹) اس آیت مبارکہ میں ''اھب'' واحد متکلم کا صیغہ ہے یہاں ہبہ کرنے کی نسبت اور اسناد جبرئیل علیہ السلام کی طرف ہے یعنی بخشنے اور دینے کی نسبت جبرائیل نے اپنی طرف کی ہے اور اسی طرح ﴿انا اتيك به قبل ان يرتد اليك طـــرفك﴾ آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے میں تخت کو آپ کے پاس حاضر کرتا ہوں۔(سورۃ النمل آیت ۴۰) اس آیت مبارکہ میں ''اتیان'' (لانے) کی نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف بن برخیا کی طرف ہے۔ علاوہ ازیں متعدد آیات قرآنیہ اور بے شمار احادیث نبویہ اس موضوع پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

سفینہ چاہیئے اس بحر بے کراں کے لئے

مشکل کشاء، حاجت روا، یا علیؑ مدد ایسے کلمات میں اسناد حقیقی نہیں بلکہ اسناد مجازی ہے جیسا کہ ﴿انبت الربيع البقل﴾ میں انبات کی اسناد ربیع کی طرف مجازی ہے علم معانی و بیان کی بنیادی کتب تلخیص المفتاح، مختصر المعانی اور مطول میں مفصل بحث موجود ہے کہ اگر یہ کلمات غیر مسلم کی زبان سے نکلیں تو یہ اسناد حقیقی متصور ہوں گے کیونکہ اسکا غیر مسلم ہونا اسناد حقیقی ہونے کا قرینہ ہے اور اگر یہی کلمات کسی مسلمان کی زبان سے صادر ہوں تو یہ اسناد مجازی ہوگی۔ کیونکہ اس کا اسلام قرینہ ہے مجاز کا، لہٰذا حضرت علی علیہ السلام کو مشکل کشاء کہنا اور ان کو مدد کے لئے پکارنا یہ سب حقیقت عطائیہ ہے۔ شرک یا کفر تب ہو جب نسبت کو حقیقت ذاتیہ پر محمول کیا جائے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ثابت ہوا کہ حضرت علی علیہ السلام یا دوسرے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کو مشکل کشاء اور یا علی مدد ایسے کلمات سے پکارنے کو شرک یا کفر کہنا پرلے درجے کی جہالت ہے۔ کاش مؤلف نے معانی و بیان کی کتاب ''تلخیص المفتاح'' اور اس کی شرح ''مختصر المعانی للتفتازانی'' پڑھ لی ہوتی تو ان کی سمجھ میں آجاتا کہ اسناد الی السبب اسناد مجازی کی ایک قسم ہے۔

<u>الزامی جواب</u>:۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے علاوہ دیگر اولیاء کرام کے متعلق مشکل کشاء مدد کرنے والا اور حاجت رواء ایسے کلمات علماء دیوبند کی مسلمہ کتابوں

میں موجود ہیں۔ چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''تعلیم الدین'' مکمل و مدلل ص ۷۱ مطبوعہ دار الاشاعت اردو بازار کراچی، مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی کلیات امدادیہ میں ''ارشاد مرشد ص ۱۴۳'' مطبوعہ کتب خانہ اشرفیہ دیو بند اور قطب العالم مولانا حسین احمد مدنی کی کتاب ''سلاسل طیبہ'' ص ۱۴ مطبوعہ ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو ہادی عالم اور مشکل کشاء تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

دور کر دل سے حجاب جہل و غفلت مرے رب
کھول دے دل میں در علم و حقیقت مرے رب
ہادی عالم علی مشکل کشا کے واسطے

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی بھی حضرت علی علیہ السلام کو مشکل کشائے دارین تسلیم کرتے ہیں

یہ بات بلا کسی شک و شبہ کے اظہر من الشمس ہے کہ خداوند عالم اہل حق کی تائید ایسے لوگوں سے بھی کر دیتا ہے جو خود ان کے زبردست مخالف اور دشمن ہوتے ہیں چونکہ حقیقت پھر بھی حقیقت ہی ہوتی ہے مخالف بھی اس کا اعتراف و اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا، جیسا کہ برصغیر کے مشہور عالم شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ایسے شیعہ دشمن کو بھی حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کو مشکل کشائے دارین تسلیم کرنا پڑا ہے چنانچہ انہوں نے اپنی معروف کتاب تحفہ اثنا عشریہ، ص ۲۹۱ باب ہفتم در امامت، طبع ثمر ہند میں اس حقیقت کا اقرار ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿**پس اہل سنت در تعین مصداق این آیت کہ متضمن وعدۂ صادقۂ الٰہی است رجوع بجناب مشکل کشائے دارین یعنی جناب ابو الحسنین آوردند**﴾ ''پس اہل سنت نے اس آیت (استخلاف) کے مصداق کے تعین میں کہ جو سچے وعدۂ الٰہی پر متضمن ہے جناب مشکل کشائے دارین یعنی حضرت ابو الحسنین علی مرتضیٰؓ کی طرف رجوع کیا ہے۔''

اور مولانا احمد حسین مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند کے مکتوبات جو انہوں نے اپنے ارادت مند احباب اور عزیزوں کے خطوط یا استفسارات کے جواب میں تحریر فرمائے ان میں علمی، فقہی

اور ملکی سیاسی خیالات و افکار اور مسائل کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ ''مکتوبات شیخ الاسلام'' کے نام سے چار جلدوں میں دیو بند سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی جلد اول مکتوب نمبر ۱۶۲ کا کچھ حصہ حضرت علی علیہ السلام کے مشکل کشا ہونے کی بحث پر مشتمل ہے چنانچہ مدنی صاحب رقمطراز ہیں:

''حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق مشکل کشا کا لفظ نہ معلوم کس وجہ سے طبیعت کو گراں ہوتا ہے زمانہ سابق میں یہ لفظ بہ منزلہ لقب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے مستعمل ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں شجرہ تصنیف کیا گیا ہے ہمیں زمانہ طفولیت میں سن رسیدہ لوگوں کی زبان پر اس کو بہت زیادہ جاری پایا مگر یہ لفظ عربی کے ''حلال المعاقد'' کا ترجمہ ہے حسب معنی لغوی خصوصیت ذات خداوندی کے ساتھ نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ بہر حال سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا وجہ اس لفظ کے ابا کی ہے۔ اگر کوئی خصوصی الوہیۃ یا نبوۃ ہوتی تو محل کلام تھا۔''

(مکتوبات شیخ الاسلام ج ا ص ۴۱۱، ۴۱۲، مطبوعہ مکتبہ دینیہ دیو بند ۱۳۷۱ھ)

ان کے علاوہ مولوی حسین علی صاحب واں بھچراں اپنی کتاب ''فیوضات حسینی المعروف تحفہ ابراہیمیہ'' میں اور مولوی صوفی عبد الحمید صاحب فاضل دیو بند مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اس کے ترجمہ ص ۶۸ میں لکھتے ہیں:

تہجد کی نماز کے بعد مشائخ کرام سے اس طرح توسل کرے کہ فاتحہ اور اخلاص تین بار پڑھ کر کہے الٰہی جو میں نے پڑھا ہے اس کا ثواب حضور کی روح کو اور تمام انبیاء و مرسلین اور ملائکہ مقربین و صحابہ و تابعین، اولیاء صالحین خصوصاً حضرات نقشبندیہ احمدیہ کی ارواح کو عطا فرما۔ اس کے بعد کہے: ﴿**الٰھی بحرمت خواجہ مشکل کشا پیر دستگیر حضرت مولانا محمد عثمان۔۔۔۔ الخ**﴾

اور فوائد[۱] عثمانی ص ۱۷، ۱۸ پر دو دفعہ مولانا محمد عثمان صاحب کو ''مشکل کشاء'' ادر

[۱] کتاب مجموعہ فوائد عثمانی کی اہمیت کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ اس کی تصحیح اور حاشیہ آرائی دیو بندی مکتب کے مقتدر و مستند عالم دین حضرت مولانا حسین علی واں بھچراں نے فرمائی ہے جیسا کہ اسی کتاب کے ص ۲ پر جلی حروف میں یہ تنبیہ لکھی ہے کہ ''باید دانست جناب مولوی حسین صاحب مصحح اند وقت معائنہ از اوّل تا آخر سانزدہ جا حاشیہ از یاد خویش نوشتہ اند۔۔۔۔''

''دستگیر'' لکھا گیا ہے۔ حالانکہ شرک اور کفر میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے کہ ہر انسان حیوان ضرور ہے مگر ہر حیوان انسان نہیں، اسی طرح ہر شرک کفر ضرور ہے مگر ہر کفر شرک نہیں ہوا کرتا۔ اب مؤلف اور ان کے ہمنوا دیگر معاونین باہم مل کر شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، مولانا اشرف علی تھانوی، حاجی امداد اللہ، مہاجر مکی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولوی حسین علی وغیرہ پر مشرک اور کافر ہونے کا فتویٰ صادر کیجئے اسے کہتے ہیں۔

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے

مؤلف جن باتوں کو ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے حق میں شرک قرار دے رہے ہیں وہی باتیں ان کے علمائے دیوبند سے بھی صادر ہوئی ہیں۔ انہوں نے ان باتوں کو شرک اور منافی توحید نہیں سمجھا، پھر مؤلف کا ان امور کو شرک کہنا چہ معنی دارد بقول شاعر ۔

منکر مے بودن و ہمرنگِ مستان زیستن

مؤلف اگر پہلے شرک کی تعریف ہی پڑھ لیتے کہ شرک ہے کیا چیز؟ تو مسلمانوں بشمول اپنے اکابر پر شرک و کفر کا فتویٰ نہ لگاتے۔ اور نہ ہی یہ عبث کام آپ سے سرزد ہوتا۔ مگر ۔

جنہیں ہو ڈوبنا وہ ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

چنانچہ علامہ سعد الدین تفتازانی نے شرک کی تعریف شرح عقائد نسفیہ ص ۵۶ مطبوعہ دیوبند میں یوں کی ہے:

﴿الا شراك هو اثبات الشريك فى الا لو هيت بمعنى استحقاق العبادة كما كان لعبده الاصنام بعمنى واجب الوجود كما كان للمجوس﴾

''شرک یہ ہے کہ کسی کو خدا کی الوہیت میں بایں معنی شریک مانا جائے کہ وہ مستحق عبادت ہے جیسا کہ بتوں کی پوجا کرنے والے ہیں بایں معنی کہ کسی کو خدا کی طرح واجب الوجود مانا جائے جیسے مجوسی مانتے ہیں۔''

اہل حق یعنی شیعہ نہ تو کسی کو خدا کے علاوہ لائق عبادت مانتے ہیں اور نہ ہی کسی کو واجب الوجود قرار دیتے ہیں اس لئے صرف حضرت علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کو مشکل کشا

اوران سے مدد مانگنے کی بنا پر مسلمانوں کو مشرک قرار دینا خود کا فرو مشرک ہونے کے مترادف ہے۔ غیر خدا کو جب تک خدا کی صفات کی طرح صفات کا حامل نہیں مانے گا شرک کا اطلاق نہ ہوگا یعنی خدا واجب الوجود ہے تو کسی اور کو صرف موجود ماننا شرک نہیں بلکہ واجب الوجود ماننا شرک ہے۔ اسی طرح خدا کی طرح مددگار اور مشکل کشاء ماننا ہی شرک متصور ہوگا نہ کہ باذن اللہ مددگار، باذن اللہ مشکل کشاء یہ شرک میں شامل نہیں ہیں انبیاء کرام علیہم السلام اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام باذن اللہ کمالات وتصرفات کے مالک ہونے کے باوجود وہ ہر لمحہ خدا کی مشیت کے تابع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کے جید علماء کے تواتر سے اس امر کے قائل ہوئے ہیں کہ یہ ہستیاں دارِ دنیا سے دار برزخ کی طرف منتقل ہونے کے بعد بھی اپنے ماننے والوں کی مدد کرتے ہیں اور دشمنوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں جیسا کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ ﴿**وقد تواتر عن كثير من الاولياء انهم ينصرون اوليائهم و يدمرون اعداء هم ويهدون الى الله من يشاء الله. الخ**﴾ اور بہت سارے اولیاء سے بطریق تواتر ثابت ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد فرماتے ہیں اوران کے دشمنوں کو تباہ فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت سے جسے چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی اور اس کی ذات تک واصل فرماتے ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر مظہری ج ۱ ص ۱۵۲ طبع دہلی وغیرھم۔ کیا مؤلف اور ان کے ہم مذہب انصاف کو پیش نظر رکھ کر اس کا کوئی معقول جواب دے سکتے ہیں؟؟ دیدہ باید

جہالت کا پڑا ہے فہم و دانش پر تیرے پردہ
ارے کم بخت اتنا بھی کبھی تو نے نہیں سوچا

قارئین کرام یہ شقاوت قلبی ہے کہ ۱۱، ۱۲، ۱۳ اور ۱۴ عنوانات قائم کر کے ان ناسمجھ ملاؤں کے رہنما نے حقائق کو مسخ کیا ہے اور اصل مذہب حقہ شیعہ اثنا عشریہ کی بجائے ادھر ادھر کی کتابوں سے اقتباسات دے کر دھوکہ دہی کی ناکام و مکروہ کوشش کی ہے۔ **نعوذ باللہ من هذا الشقاء العظيم و الفهم السقيم**۔

باب ۳

عقیدۂ بداء اور اس کی حقیقت

مؤلف نے ''بداء کا لغوی معنی اور شیعہ کی مراد'' اور ''عقیدہ بداء گھڑنے کی ضرورت'' کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

''لغت کی تمام کتب بداء کے معنی پر متفقہ طور پر یہ وضاحت کرتی ہیں کہ ﴿بدالہ ای ظھر لہ مالم یظھر﴾ یعنی جو بات معلوم نہ تھی اس کے معلوم ہو جانے کو بداء کہا جا ہے۔۔۔۔ بداء کا عقیدہ اللہ کے بارے میں سراسر اللہ تعالیٰ کی جناب میں گستاخی کا مرتکب ہونے اور خدائے علیم وخبیر کو جاہل ولاعلم تسلیم کرنے کے مترادف ہے تو پھر یقیناً آپ کے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہا ہوگا کہ آخر شیعہ کو ایسا غلط ترین اور بے ہودہ عقیدہ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرنے کی ضرورت ہی کیا پیش آئی تھی تو جناب والا میرا یہ دعویٰ ہے کہ شیعہ مذہب کے تمام اصول وفروع چند شاطر ذہنوں کی اختراع ہیں۔۔۔۔ امام کو اپنی خفت مٹانے اور پہلی بات سے ر کرنے پر پیدا ہونے والی شرمندگی سے بچنے کے لئے یہ کہنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کو اس مسئلہ میں بداء گیا ہے۔۔۔۔''

بعد ازاں اصول کافی ص ۲۳۲ مطبوعہ لکھنؤ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ

''ابو حمزہ ثمالی سے روایت ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں نے امام باقر علیہ السلام کو یہ فرما۔ ہوئے سنا کہ اے ثابت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امر یعنی ظہور مہدیؑ کو ۷۰ھ میں مقرر کیا تھا مگ جب حسین صلوات اللہ علیہ قتل کر دیے گئے تو اللہ کا غصہ اہل زمین پر بہت سخت ہو گیا لہٰذا اللہ۔ ظہور مہدیؑ کا جو منصب میرے لئے تھا مگر خدا نے اس کو پیچھے کر دیا اور اب اللہ میری اولاد میں چاہے گا کرے گا۔۔۔۔ بداء کا دوسرا واقعہ جو سخت ترین بھی ہے، بدا کا یہ واقعہ پہلے سے بھی

بڑھ چڑھ کر ہے یہ اسماعیل فرزند امام جعفر صادقؑ کا واقعہ ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد کے لئے خدا نے ان کے بڑے بیٹے اسماعیل کو امام کے لئے نامزد کیا۔۔۔ مگر افسوس کہ اسماعیل اپنے والد کے سامنے وفات پا گئے اور خدا کی تجویز غلط ہوگئی۔ خدا نے موسیٰ کاظم علیہ السلام کو امام بنایا۔ (اگر خدا کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ اسماعیل کی عمر بہت کم ہے وہ اپنے باپ کے سامنے ہی مر جائیں گے تو اسماعیل کو امامت کے لئے نامزد کر کے کیوں پشیمان ہوتا۔۔۔۔۔“ (خطبات جیل ص ۵۲،۴۶)

الجواب:۔ مؤلف اور اسکی قبیل کے مثل ﴿الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار﴾ جن کی کھوپڑیاں انسانی مغز و فکر سے خالی اور عاری ہیں، علم کی بات سمجھنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ ان کی باگ ڈور درحقیقت یہودیوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں گدھوں کی مانند قرار دیا ہے۔ یہ لوگ تو ان سے بھی بدتر ہیں اس لئے کہ وہ یہودی ان پر سوار اور مسلط ہیں۔ ان سے اپنی منشاء و مرضی کے کام لے رہے ہیں۔ امت مسلمہ میں افتراق و انتشار اور حقیقی اسلام و مسلمین کے خلاف جارحانہ کاروائیوں پر آمادہ کر کے انہیں جہنم کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

شیعہ اثنا عشریہ یعنی حقیقی اسلام کے خلاف یہود نے شروع دن سے ہی سازشیں کی ہیں عبد اللہ سبا کو بھی غلو کے خیالات کے پرچار کے لئے حقیقی اسلام میں داخل کرنے کی سعی لامشکور کی لیکن اس کی سازش کامیاب نہ ہوئی تاہم عام مسلمانوں کو حقیقی اسلام کے علم برداروں کے خلاف صف آراء کرنے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی، عام مسلمانوں کی قیادت یہود کی پشت پناہی سے نام نہاد مسلمان بادشاہ، ملا اور مشائخ کر رہے تھے۔ یہی لوگ ناصبیت (اسلام دشمنی) کے علمبردار تھے لیکن منافقانہ یا فریب خوردہ اپنے آپ کو برسر حق سمجھ رہے تھے۔

بداء میں صرف نزاع لفظی ہے

لفظ بداء کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے (۱) حقیقی (۲) مجازی۔

اولاً:۔ کسی معاملہ میں پہلے ایک رائے قائم کی جائے پھر اس کی غلطی ظاہر ہونے کی وجہ سے دوسری رائے پیدا ہو اس معنی سے ”بداء“ کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کرنا کفر ہے۔ مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ملے گا جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کسی امر سے پہلے جاہل و بے خبر

تھا۔(معاذ اللہ)

ثانیاً:۔کسی چیز کو اس بنا پر متغیر کر دیا جائے کہ اس کی مصلحت ایک خاص مدت تک محدود تھی جب وہ مدت ختم ہوگئی تو وہ مصلحت بھی باقی نہیں رہی اللہ تعالیٰ کو بعلم ازلی یہ بات معلوم تھی کہ اس چیز کی مصلحت معین مدت میں ختم ہو جائے گی لہٰذا بعد میں تغیر واقع کیا جائے گا تو اس معنی (مجازی) کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف بداء کی نسبت دینا بالاتفاق درست ہے نظام کائنات میں اس کے علم وقدرت کا مکمل طور پر نافذ ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ اس کا جاہل و عاجز ہونا ہی شیعہ کا عقیدہ ہے چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث اقرع وابرص واعمی میں ﴿بداء اللّٰہ ان یبتلیھم﴾ کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز دہلوی نے تحفہ اثنا عشریہ ص ۲۲۸ باب پنجم در الٰہیات طبع ثمر ہند لکھنؤ میں اہل سنت کا وہی نظریہ پیش کیا ہے جو شیعہ کا نظریہ مذکورہ بالاقسم دوم میں بیان کیا گیا ہے۔شاہ صاحب کی عبارت سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ شیعہ وسنی دونوں بداء کے قائل ہیں مگر اس کے باوجود شیعہ اثنا عشری پر الزام تراشی کا ایک ذریعہ مسئلہ بداء کو بھی بنایا گیا ہے۔حالانکہ اس مسئلہ میں شیعہ اور عام سنی دونوں مکاتب بالکل متفق ہیں صرف لفظی اصطلاحی فرق ہے جس مسئلہ کو شیعہ اثنا عشریہ کی اصطلاح میں بداء سے تعبیر کیا جاتا ہے اہل سنت علماء اسے قضاء معلق کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔مگر افسوس تو صرف اس امر پر ہے کہ اہل علم کی علمی اور دقیق بحثیں جہلاء کے ہاتھ چڑھ گئی ہیں۔

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

یہ امر تو بالکل اظہر من الشمس ہے کہ بداء اور قضاء معلق دونوں ایسی اصطلاحات ہیں، جن میں فقط لفظی اختلاف ہے ورنہ ان دونوں کا مفہوم قطعاً یکساں ہے۔اسی مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے ولی اللٰہی خاندان کے معروف چشم و چراغ شاہ اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں:

﴿القدر قد یطلق علی مقتضی غیبی لوجود شی ما و القضاء علی وجوده علی طبق ما اقتضاه وللقدر بهذه المعنی مرتبتان مبرم و معلق فالمبرم مالا یمکن التغیر فیه و یمتنع وجود المقتضی صیغة المفعول علی خلاف ما اقتضاه و المعلق ما کان

مقتضیاً لوجود شیٔ لکن یمکن التخلف عن اقتضائه او یصیر موجوداً لا علیٰ نحو اقتضاه﴾۔ (عبقات، عبقہ نمبر۱۲اص۱۵۳)

ترجمہ: "کسی شیٔ کے وجود کے متعلق عالم غیب میں جو کچھ کہا گیا ہے، کبھی قدر (اور تقدیر) کے لفظ سے یہی مراد لیا جاتا ہے، اسی طرح شیٔ کا اسی غیبی اقتضاء کے مطابق موجود ہونا اسی کو "قضاء" کہتے ہیں۔ قدر یا تقدیر کا جو مطلب اوپر بیان کیا گیا ہے اسی معنی میں تقدیر کے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ کہ اس کے دو مرتبے ہیں، ایک مرتبہ کو مبرم اور دوسرے کو معلق کہتے ہیں۔ مبرم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ردو بدل کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی، تغیر اس میں ناممکن ہوتا ہے اور جو کچھ غیب میں چاہا گیا ہے اس کے خلاف واقع نہیں ہوسکتا اور تقدیر معلق میں بھی کوئی بات چاہی تو جاتی ہے، لیکن جو کچھ چاہا گیا ہے، ہوسکتا ہے کہ بات اس کے مطابق نہ ہو یا جو کچھ چاہا گیا ہو وہ چیز موجود ہونے کے بعد اس کے مطابق نہ ہو۔۔۔۔۔" (عبقات عبقہ نمبر۱۲اص۱۵۳ مطبوعہ ادارہ مجلس علمی کراچی)

اگر عقل و علم سے بے زار ملاؤں نے شیعہ پر بہتان تراشی ضرور کرنی ہے تو پہلے اپنے اکابر سے ہاتھ دھولیں یا پھر کم از کم اپنی زبانوں پر قفل لگالیں۔

بداء کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے

عقلمند قارئین کے سامنے اس سلسلے کی مزید عبارات فریقین کی کتب سے موازنہ کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ عبدالعزیز فرہاروی شرح عقائد کی شرح میں لکھتے ہیں:

﴿..... **قوله تعالیٰ یمحوا اللّٰه ما یشاء و یثبت و عنده ام الکتاب ذکر بعض المفسرین ان عند اللّٰه سبحانه کتابین یمحوهما و یثبت اما ام الکتاب فلا یتغیر**﴾

"فرمان باری تعالیٰ۔ اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور اسی کے پاس ام الکتاب ہے۔ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ اللہ سبحانہ کے پاس دو کتابیں ہیں ان میں سے مٹاتا بھی ہے اور ثابت بھی رکھتا ہے لیکن ام الکتاب، سو اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔"

(النبراس شرح شرح العقائد ص۲۹۷ مطبوعہ میرٹھ)

اسی کے حاشیے پر مولوی برخوردار ملتانی رقم طراز ہیں:

﴿..... قولہ ذکر بعض المفسرین عکرمۃ عن ابن عباس الکتاب کتابان فکتاب یمحو اللّٰہ منہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب کذا فی تفسیر ابن کثیر﴾

ان کا قول کہ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ الکتاب دو کتابیں ہیں، ایک کتاب ایسی ہے جس میں سے اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے، اور ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔ اسی طرح تفسیر ابن کثیر میں ہے۔"

(ایضاً ص ۲۹۷ حاشیہ نمبر۲)

ابن کثیر نے اس آیت کے ذیل میں بہت سے اقوال اور احادیث درج کی ہیں۔ ان میں سے ایک قول حضرت عمر بن خطاب کا ہے۔ آپ طواف بیت اللہ کے اثناء میں روتے ہوئے یہ دعا کر رہے تھے۔ اے اللہ اگر تو نے مجھ پر کوئی گناہ یا بدبختی لکھ دی ہے تو اسے مٹا دے۔ ﴿فانك تمحو ما تشاء و تثبت و عندك ام الکتاب، فاجعلہ سعادۃ و مغفرۃ﴾ تو ہی جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے۔ تیرے پاس ہی ام الکتاب ہے۔ چنانچہ بدبختی اور گناہ کو نیک بختی اور مغفرت بنا دے۔"

حافظ ابن کثیر شامی صحابہ و تابعین اور دیگر اکابر کے عمل و اقوال نقل کر کے ان سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿و معنی ھذا الاقوال ان الاقدار ینسخ اللّٰہ ما یشاء منھا و یثبت منھا ما یشاء﴾ "ان اقوال کا معنی یہ ہے کہ تقدیروں سے اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے۔"

اس کے بعد امام احمد کی ایک روایت سے استدلال اس معنی کی تائید میں کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اپنے کسی گناہ کے سبب سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے ﴿ولا یرد القدر الا الدعا و لا یزید فی العمر الا البر﴾ تقدیر کو دعا ہی ٹال سکتی ہے اور نیکی کے سوا کوئی چیز عمر میں اضافہ نہیں کر سکتی۔"

صحیح بخاری کی روایت ﴿ان صلۃ الرحم تزید فی العمر﴾ سے بھی اس موقف کی تائید ہوئی ہے کہ صلہ رحمی عمر میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ ﴿ان الدعاء و

القضاء ليعتلجان بين السماء و الارض﴾ ''دعا اور قضا آسمان اور زمین کے درمیان آپس میں لپٹ جاتی ہیں۔ (یعنی دعا قضا کو لوٹانے کی کوشش کرتی ہے کبھی کامیاب ہو جاتی ہے کبھی ناکام)''

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ﴿قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم "یفتح الذکر فی ثلاث ساعات یبقین من اللیل، فی الساعۃ الاولیٰ منہا ینظر فی الذکر الذی لا ینظر فیہ احد غیرہ فیمحو ما یشاء و یثبت ....''﴾

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات کی تین ساعتیں باقی ہوتی ہیں کہ ذکر کھولا جاتا ہے۔ تین ساعات میں سے پہلی ساعت میں اللہ تعالیٰ اس ذکر میں نظر آتے ہیں جسے ان کے سوا کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ پس جو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں۔''

(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۱۹ مطبوعہ مصر)

ان روایات اور اقوال کا مفہوم مزید واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خود ہی واضح ہیں ان میں کوئی ابہام نہیں۔ صاف مطلب یہ ہے کہ ایک تقدیر مبرم ہے اور ایک متغیر ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور علم سے ہوتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی کمزوری یا جہل نہیں بلکہ اس کی قدرت کاملہ اور حکمت مخفیہ کا ایک اعلیٰ ثبوت ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اس تغیر قضاء کے مسئلہ میں اسی آیت سے استدلال کیا ہے لکھتے ہیں:

﴿و قد بینت السنۃ بیاناً و اضحاً ان الحوادث یخلقہا اللّٰہ تعالیٰ قبل ان تحدث فی الارض خلقا ما ثم ینزل فی ھذا العالم فیظہر فیہ کما خلق اول مرۃ سنۃ من اللّٰہ تعالیٰ ثم قد یمحی الثابت و یثبت المعدوم بحسب ھذا الوجود قال اللّٰہ تعالیٰ (یمحوا اللّٰہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب) مثل ان یخلق اللّٰہ تعالیٰ البلاء خلقاً ما فینزلہ علی المبتلیٰ و یصعد الدعا فیردہ، وقد یخلق الموت فیصعد البر و یردہ﴾

سنت نے واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حوادث کو زمین میں واقع ہونے سے

قبل ایک خاص انداز پر خلق کرتا ہے۔ پھر وہ اس جہان کی طرف نازل ہوتے ہیں۔ اس جہان میں اسی طرح ظاہر ہوتے ہیں جیسا کہ پہلی بار اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ بعد ازاں کبھی تو اللہ تعالیٰ (اس) ثابت کو مٹا دیتا ہے اور اس وجود کے لحاظ سے معدوم کو ثابت کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے۔ اسی کے پاس ام الکتاب ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی بلاء (مصیبت) پیدا کرتا ہے۔ پھر اسے مبتلا ہونے والے شخص کی طرف نازل کرتا ہے۔ اس کی طرف دعا اوپر اٹھتی ہے اور اس بلاء کو لوٹا دیتی ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ موت کو پیدا کرتا ہے نیکی اوپر اٹھتی ہے اور اسے رد کر دیتی ہے۔"

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۶۶ مطبوعہ منیریہ مصر)

علامہ شبیر احمد عثمانی نے کچھ اپنے الفاظ میں اور کچھ شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزند شاہ عبد القادر صاحب موضح القرآن کے الفاظ میں اس آیت کے ضمن میں واضح اور دوٹوک انداز میں لکھا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:

"یعنی اپنی حکمت کے موافق جس حکم کو چاہے منسوخ کرے جسے چاہے باقی رکھے، جس قوم کو چاہے مٹائے جسے چاہے اس کی جگہ جما دے جن اسباب کی تاثیر چاہے بدل ڈالے جن کی چاہے نہ بدلے۔ جو وعدہ چاہے شرائط کی موجودگی میں ظاہر کرے۔ جو چاہے شرائط کے نہ پائے جانے کی بناء پر موقوف کر دے۔ غرض ہر قسم کی تغیر و تبدل، محو و اثبات، نسخ و احکام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ قضا و قدر کے تمام وفاتر اسی کے قبضہ میں ہیں اور سب تفصیلات اور دفاتر کی جڑ جسے ام الکتاب کہنا چاہیئے اسی کے پاس ہے۔ یعنی "علم ازلی محیط" جو ہر قسم کے تبدل و تغیر سے قطعاً منزہ و مبری اور لوح محفوظ کا مآخذ ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے، بعض اسباب ظاہر ہیں، بعض چھپے ہیں۔ اسباب کی تاثیر کا ایک طبعی اندازہ ہے جب اللہ چاہے اس کی تاثیر اندازہ سے کم یا زیادہ کر دے۔ جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور کبھی گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے جو ہرگز نہیں بدلتا۔ اندازے کو تقدیر کہتے ہیں یہ دو تقدیریں ہوئیں ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی۔ جو تقدیر بدلتی ہے اس کو معلق (بداء) اور جو نہیں

بدلتی ہیں اس کو مبرم کہتے ہیں۔" (تفسیر عثمانی ص ۳۳۷ زیر آیت ۳۹ سورۃ الرعد)

چونکہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام اصل حاملین قرآن ہیں۔ اس لئے اس آیت کی بالکل واضح اور بلا تکلف سیدھے سادے عام فہم الفاظ میں تفسیر ان سے منقول ہے۔ عام مسلمانوں اور ان کے ملاؤں کی طرح ادھوری، مبہم اور الجھی ہوئی تفسیر پیش کر کے مسئلہ کو مزید الجھاتے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں کتب احادیث میں وارد روایات درج ہیں۔ جاہل ناصبی ملا ان روایات کو یا تو پڑھتے ہی نہیں۔ اگر پڑھتے ہیں تو خیانت کاری سے انہیں چھپاتے ہیں تاکہ مسلمان عوام حق کو سمجھ کر ان کے دام فریب سے آزاد نہ ہو جائیں اور حق کی جانب مائل نہ ہو جائیں۔ اسی سلسلہ میں چند روایات پیش کی جاتی ہیں تاکہ اہل سنت علماء کے بیانات اور ان کی مروی احادیث اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی احادیث کے مفہوم بلکہ بعض اوقات الفاظ میں بھی مطابقت سامنے آجائے۔

اصول کافی کی کتاب التوحید کے باب البداء میں اس سلسلے کی ایک روایت یہ ہے۔

﴿عن ابی عبد اللّٰہ قال فی ھذہ الآیۃ یمحوا اللّٰہ ما یشاء و یثبت قال فقال و ھل یمحا الا ما کان ثابتاً و ھل یثبت الا ما لم یکن﴾

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپؑ نے اس آیت **﴿یمحوا اللّٰہ ما یشاء و یثبت﴾** کے بارے میں فرمایا: مٹایا وہی جاتا ہے جو پہلے ثابت ہو اور ثابت وہی کیا جاتا ہے (وجود میں لایا جاتا ہے) جو پہلے نہ ہو۔"

شاہ ولی اللہ دہلوی کے الفاظ **﴿و یثبت المعدوم﴾** اور امام علیہ السلام کی اس تفسیر میں کس حد تک مطابقت اور مماثلت پائی جاتی ہے؟ غور فرمائیں۔

دیگر روایت عمر کی کمی بیشی کے سلسلے میں ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل اہل سنت علماء سے نقل کر چکے ہیں۔ **﴿عن حمران عن ابی جعفرؑ قال سالتہ عن قول اللّٰہ عز و جل قضیٰ اجلاً و اجل مسمی عندہ قال ھما اجلان اجل محتوم و اجل موقوف﴾**

حمران کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں کہ "اس نے فیصلہ کیا ایک مدت کا اور (ایک) مدت اس کے ہاں درج ہے۔" آپؑ

نے فرمایا: یہ دو مدتیں مقرر ہیں ایک اجل محتوم (حتمی) ہے اور ایک اجل موقوف ہے۔"

علامہ شبیر احمد عثمانی اور شاہ عبدالقادر دہلوی نے اسی اجل محتوم کو قضاء مبرم کہا ہے اور اجل موقوف کو قضاء معلق کہا ہے۔ ان کی وضاحت کے مطابق آخر الذکر تقدیر شرائط پر موقوف ہے۔ محتوم یا مبرم مشروط نہیں ہے بلکہ قطعی ہے۔

﴿عن الفضل بن یسار قال سمعت ابا جعفرؑ یقول العلم علمان فعلم عند اللّٰہ مخزون لم یطلع علیہ احد من خلقہ و علم علمہ ملائکتہ و رسلہ فما علمہ ملائکتہ و رسولہ فانہ سیکون لا یکذب نفسہ و لا ملائکتہ و لا رسلہ و علم عندہ مخزون یقدم منہ ما یشاء و یوخر منہ ما یشاء و یثبت ما یشاءُ﴾

فضل بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر (امام محمد باقرؑ) کو فرماتے سنا کہ علم دو ہیں ایک علم اللہ کے پاس مخزون ہے اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس پر مطلع نہیں ہوا۔ دوسرا علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو سکھایا۔ پس جو علم اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور رسولوں کو دیا وہ عنقریب واقع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو، اپنے رسولوں کو اور اپنے فرشتوں کو جھٹلاتا نہیں ہے۔ ایک علم اللہ تعالیٰ کے پاس مخزون ہے اس میں جو چاہتا ہے مقدم یا مؤخر کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے (یا مٹا دیتا ہے)۔"

اس میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ قضاء معلق یا موقوف کی اطلاع کسی کو نہیں ہوتی۔ عقلمندی اور دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مسلک کے بنیادی ماخذ دیکھ اور اچھی طرح سمجھ کر ہی بات کی جائے لیکن خیانت کاروں اور عقل کے اندھوں کو اس سے کیا غرض۔ ان حقائق کے دیکھنے کے لئے دیدہ بینا درکار ہے۔

دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے؟

﴿عن الفضیل قال سمعت ابا جعفرؑ یقول من الامور امور موقوفۃ عند اللّٰہ یقدم منھا ما یشاء و یوخر ما یشاء﴾

"فضیلؒ سے مروی ہے کہ میں نے ابوجعفرؑ کو فرماتے سنا۔ بعض امور موقوف ہوتے

ہیں۔ اللہ کے نزدیک، ان میں سے جنہیں چاہتا ہے مقدم کر دیتا ہے اور جنہیں چاہتا ہے مؤخر کر دیتا ہے۔"

﴿عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہؑ قال ان اللہ علمین علم مکنون مخزون لا یعلمہ الا ہو من ذلک یکون البداء و علم علمہ ملائکتہ و رسلہ و انبیائہ فنحن نعلمہ﴾

"ابو بصیرؓ سے مروی ہے کہ ابو عبد اللہ (امام صادقؑ) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے دو طرح علم ہیں۔ علم مکنون مخزون، جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی میں سے بداء ہوتا ہے۔ دوسرا وہ علم ہے جو اپنے فرشتوں، رسولوں اور انبیاء کو عطا کیا ہے۔ چنانچہ ہم اس علم کے عالم ہیں۔"

یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بداء بھی اللہ تعالیٰ کے علم ازلی محیط کا حصہ ہے نہ کہ بعد میں ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ جاہل ناصبی نادان لوگ اہل حق پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ یہی تقدیر معلق موقوف اور مشروط ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا یہ علم کسی نبی، رسول، فرشتہ یا امام کو عطا نہیں کرتا۔

﴿عن ابی عبد اللہؑ قال ما بدا اللہ فی شی الا کان فی علمہ قبل ان یبدو لہ﴾

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو کسی شئے میں بداء نہیں ہوا مگر یہ کہ بداء ہونے سے قبل بھی وہ چیز اللہ کے علم میں ہوتی ہے۔

﴿عن ابی عبد اللہ قال ان اللہ لم یبد لہ من جہل﴾

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کو بداء بے علمی کی بناء پر نہیں ہوتا۔"

جیسا کہ اس دور کے نواصب بھی الزام لگاتے تھے اور آج تک اسی سابقہ حماقت پر قائم ہیں حالانکہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ بداء کو اہل سنت کی اصطلاح میں قضاء معلق کہتے ہیں۔ الفاظ الگ الگ ہیں مگر معنی دونوں کا ایک ہے۔ نواصب نے اپنے آپ کو اہل سنت میں چھپایا ہوا ہے۔ لہٰذا انہیں اہل سنت کے بیان کو جو اثنا عشریہ مسلک کے عین مطابق ہے تسلیم کرنا چاہیئے۔

﴿عن منصور بن حازم قال سالت ابا عبد اللہؑ ہل یکون الیوم شئی لم یکن فی علم اللہ بالامس قال لا، من قال ہذا فاخزاہ اللہ قلت ارایت ما کان و ما ہو کائن الی یوم القیامۃ الیس فی علم اللہ قال بلی قبل ان یخلق الخلق﴾

منصور بن حازم سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ ؑ سے سوال کیا آیا آج کوئی ایسا واقعہ ہوسکتا ہے جو کل اللہ کے علم میں نہ تھا۔ آپؑ نے فرمایا: نہیں، جو اس کا قائل ہو اللہ اسے رسوا کرے۔ میں نے کہا: آپ کی رائے میں ﴿ما کان و ما یکون﴾ قیامت تک اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے یا نہیں؟ آپؑ نے فرمایا: ہاں اللہ کے علم میں ہے قبل اس کے کہ مخلوق کو پیدا کرتا۔''

(اصول کافی کتاب التوحید باب البداء صفحات ۸۵، ۸۶ مطبوعہ لکھنؤ)

مندرجہ بالا حقائق و دلائل سے پوری طرح واضح ہوگیا ہے کہ بداء کا لفظ ایک ایسی اصطلاح ہے جو ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ہاں قضاء معلق، موقوف یا مشروط کے تغیر و تبدل کے لئے مستعمل تھی۔ اہل سنت نے اسی مفہوم کو تقدیر میں ''تغیر و تبدل'' کے عام لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ بس اپنی حماقت اور اسلام دشمنی کی بناء پر نواصب نے اس اصطلاح کو غلط معنی پہنا کر الزام تراشی اور بہتان پردازی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور جاہل عن جاہل بغیر سمجھ بوجھ کے نقل کرتے جاتے ہیں۔ نہ شعور و فکر ان کی قسمت میں ہے نہ اس کے حصول کی کوشش کرتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو بداء ہو اور یہ لوگ بھی راہ راست پر آجائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سیدھی راہ پر آنے کی توفیق دے۔

قارئین کرام نے ملاحظہ کرلیا ہے کہ بداء یا قضاء معلق، موقوف یا مشروط کے لئے بنیادی طور پر اہل سنت علماء اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے سورۂ رعد کی آیت نمبر ۳۹ سے ہی استدلال کیا ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے چند جملوں میں وہی خیالات ظاہر کئے ہیں جو اصول کافی کی ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی روایات میں بیان کئے گئے ہیں حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

''۔۔۔۔۔ جو وعدہ چاہے شرائط کی موجودگی میں ظاہر کرے جو چاہے شرائط کے نہ پائے جانے کی بناء پر موقوف کردے۔۔۔۔۔''

یہی قضاء معلق یا مشروط ہے جس میں تغیر و تبدل کو اللہ تعالیٰ کے علم ازلی محیط میں سے بداء کہتے ہیں۔ وعدہ کے شرائط کی عدم دستیابی کی بناء پر ایفاء نہ ہونے کو ہی بداء کہا جاتا ہے۔ یہی شرائط ہی جن کا اللہ تعالیٰ کا علم ازلی نے احاطہ کئے ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر اس کے مقرب بندوں کو بھی ان شرائط کا علم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان شرائط کے پورا نہ ہونے پر وہ وعدہ پورا نہیں ہوسکتا۔ اس کی چند

مثالیں خود قرآن کریم میں موجود ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾

اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا اور پورا کیا ان اور دس سے پس پوری ہوگئی مدت تیرے رب کی۔ (سورہ الاعراف آیت ۱۴۲)

یہی حال حضرت یونس علیہ السلام کا ہوا۔ جب انہوں نے قوم سے وعدہ کیا کہ تم پر تین دن کے بعد عذاب آئے گا لیکن عذاب نہ آیا۔ اس سے قبل ہی حضرت یونس علیہ السلام عذاب کا اعلان کر کے بستی سے روانہ ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ یونس آیت ۹۸ میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾

"تو قوم یونس (کی بستی) کے سوا اور کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ (نزول عذاب سے پہلے) ایمان لے آتی اور ان کو ایمان لانا فائدہ دیتا کہ (یونس کی قوم کے لوگ) جب (عذاب آتا ہو) دیکھ کر ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کی (اسی) زندگی میں ان سے رسوائی کے عذاب کو دفع کر دیا اور ان کو ایک وقت تک فائدہ پہنچایا۔"

مؤلف اور اس کے پیشرووں و پیرووں کی انتہائی حماقت ہے کہ وہ بداء کے لغوی مفہوم اور شیعہ کی مراد کو زبردستی ہم آہنگ کرنے کی سعی نامشکور اور مکر مردود کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ پہلے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے حوالے سے بتا دیا گیا ہے کہ بداء جہل سے نہیں ہے بلکہ شرائط پوری نہ ہونے پر وعدہ پورا نہ کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اسی کو قضاء یا تقدیر موقوف یا معلق کہتے ہیں۔ اگر شرعی اصطلاحات مثلاً صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق جہاد وغیرہ کو لغوی مفہوم سے اخذ کر کے عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو دین کا ستیاناس ہو کر رہ جائے گا لیکن ان کی اجازت شاید کوئی احمق ہی دے گا۔ عقلمند انسان تو ان اصطلاحات کے شرعی مفہوم کو ہی معتبر سمجھے گا ہاں جن لوگوں کا مطمع نظر ہی محض تشتت اور مشاغبت ہو وہ عقل و دانش کی بات کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

مذہب شیعہ کے اصول وفروغ کتاب وسنت پر مبنی ہیں

مؤلف نے ”عقیدہ بداء گھڑنے کی ضرورت“ کا عنوان صفحہ نمبر ۴۷ پر قائم کر کے یہ جھوٹا دعویٰ کیا ہے کہ ”مذہب شیعہ کے تمام اصول وفروع چند شاطر ذہنوں کی اختراع ہیں۔“ ﴿معاذ الله عن سوء الاعتقاد الخبيث﴾ ۔حالانکہ تاریخی حقائق اور زمینی واقعات بانگ دہل اظہار کر رہے ہیں کہ مذہب نواصب یہودیوں کی اختراع اور ساخت کا نتیجہ ہے۔ آج امریکی اور اسرائیلی یہودیت کی آلہ کار کس مسلک والوں کی اکثریت ہے؟ اور بالواسطہ طور پر یہودی دجالوں کو ووٹ دیتی ہے۔ ”کیا یہ زندہ حقیقت اس امر کے اثبات کے لئے کافی نہیں ہے کہ ناصبیت، یہودیت کی ساختہ ہے جس پر اسلام کا مصنوعی لیبل لگا دیا گیا ہے تاکہ یہودی دجال عوام مسلمانوں کو فریب دے کر اصل اسلام سے دور رکھیں۔ مسلمانوں کو ان نواصب کی فریب سازی، مکاری اور آتش افشانی پر غور کرنا چاہیئے ﴿فان الاسلام يعلو و لا يعلى﴾ ۔

بداء حکمت الٰہی کا شاہکار ہے

مولوی اعظم طارق نے ص ۴۸ پر بداء کے بارے میں ہرزہ سرائی کی ہے۔ اس جاہل عنید کی خباثت ملاحظہ ہو، کہتا ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کو اپنے بیانات کی غلطی ظاہر ہونے پر خفت مٹانے کے لئے بداء کا سہارا لینا پڑا۔ خدا کی پناہ! کلیجہ کانپ گیا اس جملے پر، اتنی بڑی گستاخی، حالانکہ امت کے کسی فرد کا ان ذوات مقدسہ کے ارشادات پر تنقید کرنا گمراہی اور قلبی زیغ کی علامت ہے

ایاز! قدر خویش بشناس

اگر یہ ملاں غور وفکر کر لیتا تو سمجھ لیتا کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے تیس دن کا وعدہ کیا تھا جبکہ بعد میں دس دن کا اضافہ کر دیا۔ پیچھے قوم گمراہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی چالیس دن کیوں نہ بتائے؟ کیا اللہ تعالیٰ جھوٹ بولتا ہے؟ (معاذ اللہ) سطحی فکر کے حامل افراد اگر اس واقعہ سے ایسا نتیجہ نکال کر اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے اور وعدہ خلافی کا الزام عائد کریں تو ان کے پیروکار اس استدلال کو بھی ضرور داد دیں گے۔ لیکن اہل علم اور

ارباب عقل کے نزدیک ایسا استدلال پیش کرنا پرلے درجے کی حماقت اور انتہائی درجہ کی ہٹ دھرمی ہے۔

یہ حقائق ہیں تماشائے لب بام نہیں

ہمارے مخاطب نے بداء کے چند ایک واقعات لکھ کر اپنی ناسمجھی اور کوتاہ فہمی کا مزید ثبوت فراہم کیا ہے۔ پہلی روایت اصول کافی سے جو نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی حکومت کے قیام کے لئے ستر کی دہائی مقرر کی تھی لیکن جب امام حسین علیہ السلام شہید ہو گئے تو یہ امر مؤخر کر دیا گیا۔ اگرچہ اس روایت کے دو راوی (۱) سہل بن زیاد (۲) اور احمد بن محمد بن عیسیٰ دونوں ضعیف، نامعتبر، جھوٹے اور غالی ہیں۔ دیکھئے رجال کشی ص ۱۳۲ طبع کربلا، تنقیح المقال ج ۲ ص ۵۷ طبع نجف، رجال نجاشی ص ۱۳۲ طبع بمبئی وغیرہم۔

لہٰذا اصول حدیث کی رو سے یہ روایت پیش نہیں کی جا سکتی۔ تاہم اس میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے کہ ستر کی دہائی میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی قیادت میں اصلی اسلامی حکومت کے قیام کا وعدہ مشروط تھا لیکن اللہ تعالیٰ ان شرائط کو کسی پر ظاہر کرنے کا پابند نہیں ہے۔ شرائط کے نہ پائے جانے پر وعدہ پورا نہیں ہوتا۔ اسی باب کے گزشتہ صفحات میں علامہ شبیر احمد عثمانی کی عبارت دیکھ لیجئے یا اسے بھی کافر و مشرک قرار دے دیں۔ شرط یقیناً یہی ہوگی کہ اگر مسلمانوں نے امام حسین علیہ السلام کی نصرت کی اور انہیں ظالم منافق حکمران کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہوئی تو اصلی اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ نام کے مسلمانوں نے الٹا ظالم اور منافق حکمران کی مدد کی۔ یا اکثریت نے کم از کم حق کی مدد نہ کر کے اس کو رسوا کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے بھی اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔ یہ سب صورت حال اللہ تعالیٰ کے ازلی علم میں مخزون و مکنون ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ ساری تفصیلات پہلے سے اپنے نمائندوں اور عوام پر ظاہر نہیں کرتے۔ بلکہ مخفی رکھتے ہیں۔ اس کی مصلحت اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل سے بھی مشروط وعدہ حکومت کیا تھا لیکن وہ احمق بھی اپنے ہمنوا ناصبی پیروکاروں کی مانند یہ سمجھ بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حال میں دنیا کی حکومت ہمیں ہی دینی ہے۔ آج تک یہودی اس وعدہ کے ایفاء کے انتظار میں ہیں بلکہ ہر جائز و ناجائز

طریقے سے دنیا پر حکومت قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ابلیس کے اغواء سے انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ شاید جس طرح سے بھی حاصل ہو حکومت ان ہی کا حق ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں باقی لوگوں پر فضیلت عطا کی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی بنو اسرائیل کو خطاب کرکے فرمایا:

﴿یا بَنِی اِسْرَآءِ یْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾

''اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار۔'' (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۴۰)

مطلب یہ ہے کہ وعدہ پورا کرو گے تب میں پورا کروں گا، ورنہ تم سے عہد توڑ کر بنی اسماعیلؑ سے کرلوں گا۔

ظہور امام مہدی علیہ السلام کے وقت کا تعین کرنا

مؤلف لکھتا ہے کہ:

''امام باقر علیہ السلام سے خدا کی رائے بار بار بدلنے کا کوئی جواب نہ بن پڑا تو انہوں نے کہہ دیا کہ جن لوگوں نے ظہور مہدیؑ کا وقت بتایا وہ سب جھوٹے تھے۔ اصول کافی صفحہ ۲۲۳ میں ہے (بحذف عربی) امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے راوی کہتا ہے میں نے ان سے کہا کہ کیا ظہور مہدی کا کوئی وقت مقرر ہے تو امام نے فرمایا کہ وقت کے بیان کرنے والے جھوٹے تھے جھوٹے تھے جھوٹے تھے۔'' (خطبات جیل ص ۵۰)

الجواب:۔ مؤلف کو معلوم ہونا چاہیے کہ ﴿کذب الوقاتون﴾ (وقت بیان کرنے والے جھوٹے ہیں) اور امام کی طرف سے تعین وقت میں یا اپنے خواص کے سامنے اظہار وقت میں تضاد نہیں ہے۔ یہ ناصبی ملاں کی ناسمجھی ہے۔ اس پر تضاد بیانی کا الزام عائد کرنا اپنی کم عقلی و کوتاہ اندیشی بلکہ اپنی جہالت کے اعلان کے مترادف ہے۔ بعض جلد باز لوگ اپنے انداز سے وقت بیان کر دیتے تھے۔ امامؑ کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ عوام مسلمان بالخصوص شیعہ ا

اہل بیت علیہم السلام مظلومیت کی زندگی گزار رہے تھے اور ظالم و بدعنوان حکمران سے نفرت کرتے تھے۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ اصلی اسلامی حکومت جلد از جلد قائم ہو جائے۔ چنانچہ ان میں سے بعض لوگ اپنے اندازے سے وقت کا تعین کرتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں کو امام محمد باقر علیہ السلام نے جھٹلایا۔ نیز ستر کی دہائی میں اسلامی حکومت کے قیام کی خبر عام نہ تھی بلکہ اس امر کا بیان بھی امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے دور امامت میں کیا۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کی مشروط مشیت اور تقدیر تھی۔ جو شرط پوری نہ ہونے پر عملی جامہ نہ پہن سکی۔

اسی طرح مؤلف نے دوسرا واقعہ بداء درج کر کے اسے پہلے سے بھی بدترین اور سخت ترین قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ روایات کی صحت و ضعف یا اصل و وضع سے قطع نظر بداء کا حقیقی مفہوم ظاہر ہو جانے کی صورت میں اس واقعہ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ﴿لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون﴾ مسئلہ تقدیر بڑے بڑے فلاسفروں اور حکماء کو حیران و سرگرداں کر دیتا ہے۔ بداء مسئلہ تقدیر (موقوف، معلق یا مشروط) ہی تو ہے، جسے یہ ناصبی ناسمجھ غلط فہمی کی بناء پر غلط رنگ دے رہے ہیں۔

دوسرے واقعہ کی نوعیت کا تیسرا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ ائمہ مردوں کو بزعم شیعہ، زندہ کر سکتے تھے۔ روایت معجزات کی پیش کر دی ہے اور معجزات اور کرامات باذن اللہ ہوتی ہیں۔ اس میں مردوں کو زندہ کرنا بھی شامل ہے۔ اولیاء بھی مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں جیسا کہ انور شاہ کشمیری نے فیض الباری ج ۲ صفحہ ۶۱ پر لکھا ہے کہ:

"اولیاء کرام مردہ کو زندہ کر سکتے ہیں اور شیخ جیلانی نے ایک چیل کو زندہ کر دیا تھا۔"

اور ان کے شاگرد فیض الباری کے محشی مولانا بدر عالم میرٹھی سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند نے اس عقیدہ کو تسلیم کرتے ہوئے اسی قسم کا ایک اور معجزہ بھی درج کر دیا ہے۔ دیکھئے بدر الساری علی فیض الباری ص ۶۱، حاشیہ نمبر ا طبع ڈابھیل، باقی یہ کہنا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسماعیل کو زندہ کیوں نہ کر لیا۔ یا دوسرے نے ایسا کیوں نہ کر لیا؟ یہ واہیات سوالات ہیں۔ عمومی تقدیر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کبھی اپنے خاص بندوں کو مطلع کر بھی دیتے ہیں لیکن اس کے

اظہار پر پابندی ہوتی ہے۔کبھی اظہار کی اجازت ہوتی ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ تقدیر مشروط کا علم کسی کو بھی نہیں دیتا۔

مؤلف کا اپنی حماقت عظمیٰ کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہنا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند اکبر اسماعیل امامت کے لئے نامزد تھے، لیکن اسماعیل اپنے والد کے سامنے ہی وفات پا گئے اس طرح خدا کی تجویز غلط ہوگئی۔تب خدا نے موسیٰ کاظم علیہ السلام کو امام بنا دیا۔احمق ملا مزید کہتا ہے کہ اگر خدا کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ اسماعیل کی عمر کم ہے تو یہ پشیمانی اور پریشانی نہ ہوتی۔

احمق ملاں تو اپنی حماقت سے باز نہیں آئیں گے تاہم عوام کو ان کی جہالت سے بچانے کے لئے عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کا خلیفہ اور وصی مقرر کیا حالانکہ ہارون علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی ان سے قبل وفات پا گئے تب یوشع بن نون کو وصی اور خلیفہ نامزد کیا گیا۔کیا اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں تھا کہ ہارونؑ کی عمر موسیٰ علیہ السلام سے کم ہے اور انہوں نے پہلے تو ہارونؑ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔بعد میں اسے کوئی ایسی ضرورت ہوئی کہ ہارونؑ کو پہلے وفات دے دی۔کیا اللہ تعالیٰ ہارونؑ کی عمر میں اضافہ نہیں کر سکتا تھا؟ جو سوالات احمق ملا اپنی حماقت اور خیانت سے وفات اسماعیل کو سلسلۂ امامت میں رخنہ اور نقص و خلل کے لئے اٹھا رہے ہیں وہ سوالات ہارونؑ کی خلافت و امامت پر بھی ہو سکتے ہیں؟ ہارونؑ کی خلافت کے بارے میں علامہ عبدالکریم شہرستانی لکھتے ہیں:

﴿قالوا و کان موسیٰ علیه السلام قد افضٰی باسرار التوراة و الالواح الی یوشع بن نون وصیه و فتاه و القائم بالامر من بعده لیفضی بها الٰی اولاد هارون لأن الامر کان مشترکا بینه و بین اخیه هارون علیهما السلام، اذ قال تعالٰی حکایة عن موسٰی علیه السلام فی دعائه حین اوحی الیه اولا (وَ اشرکه فی امره (سورۃ طٰہٰ آیت ۳۲) و کان هو الوصی فلما مات هارون فی حال حیاة موسٰی انتقلت الوصیة الی یوشع بن نون ودیعة لیوصلها الٰی شبیر و شبر ابنی هارون قراراً و ذٰلک ان الوصیة و الامامة بعضها مستقر و بعضها مستودع﴾

یہودی قائل ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ اور الواح کے اسرار اپنے وصی اپنے غلام اور اپنے بعد قائم بالامر کے سپرد کئے تا کہ وہ یہ اسرار ہارونؑ کی اولاد تک پہنچا دیں۔ اس لئے کہ امر، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے مابین مشترک تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جب موسیٰ علیہ السلام پر پہلی بار وحی نازل کی تو ان کی دعا حکایت کرتے ہوئے فرمایا۔ (اور اسے میرے امر (نبوت) میں شریک قرار دے) چنانچہ ہارون علیہ السلام آپ کے وصی تھے۔ جب ہارونؑ موسیٰؑ کی زندگی میں ہی وفات پا گئے تب وصیت یوشع بن نون کی طرف امانتاً منتقل ہوگئی تا کہ وہ آئندہ مستقل طور پر ہارونؑ کے دونوں بیٹوں شبیر اور شبر تک پہنچا دیں۔ اس سبب سے کہ وصیت اور امامت مستقل بھی عطا ہوتی ہے اور امانت کے طور پر بھی کسی کو مل سکتی ہے۔'' (الملل والنحل ج ۱ص ۲۱۱ مطبوعہ مصر، عقد الجمان فی تاریخ اھل الزمان لبدر الدین عینی، ص ۷ الطبع مکتبہ الغزالی دمشق)

اس واقعہ سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وصایت و امامت کا سلسلہ سابقہ امتوں میں بھی جاری تھا۔ اسی طرح اس امت میں بھی جاری ہوا۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اپنا جانشین نامزد کر دیا اسی طرح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی اپنا جانشین حضرت علی علیہ السلام کو نامزد کر دیا تھا اور امامت و وصایت کا سلسلہ امانتاً نہیں بلکہ مستقلاً ان سے شروع ہوگیا۔ حدیث منزلت کا مفہوم مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں مزید واضح ہو جاتا ہے۔ ملا احمق نے جتنے سوالات حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے بیٹے اسماعیل کی وفات کے بارے میں اٹھا کر اپنی جہالت اور خیانت کا مظاہرہ کیا ہے اس نوعیت کے تمام سوالات موسیٰؑ اور ہارونؑ کے معاملے میں بھی اٹھائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسے سوالات ناسمجھ احمق ملحد ہی اٹھا سکتا ہے۔ کسی مؤمن کو اللہ تعالیٰ کے حکمت آمیز اقدامات و اختیارات میں مداخلت اور اعتراضات کی جرأت و جسارت نہیں ہوسکتی۔

انتہائی جہالت کے ساتھ عبارت میں صریح خیانت

مؤلف اپنے آتش بغض، تعصب اور عناد کو اس طرح لکھتا ہے کہ:

''امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد کیلئے خدا نے ان کے بڑے بیٹے اسماعیل کو امام کیلئے

نامزد کیا ظاہر ہے کہ ان بارہ لفافوں میں جو ہر امام کے نام کے رسول پر اترے تھے اسماعیل کے نام کا بھی لفافہ ہوگا اور اسماعیل اپنی والدہ کی ان سے پیدا بھی ہوئے ہوں گے اور سب علامات امامت ان میں موجود ہوں گی۔۔۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ جس کو شیخ صدوق نے رسالہ اعتقادیہ میں لکھا ہے یہ ہیں ﴿ما بدا اللّٰہ فی شئی کما بداله فی اسماعیل ابنی﴾ ایسا بداء اللہ کو کبھی کسی چیز میں نہیں ہوا جیسا بداء میرے بیٹے اسماعیل کی بابت ہوا۔" (خطبات جمیل ص ۵۲،۵۱)

الجواب :۔ ہمارا مخاطب خود ہی فرض کر لیتا ہے کہ اسماعیلؒ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد ہونے والے امام تھے، چنانچہ ان کی پیدائش ان سے ہوئی "ہوگی" ان کے نام کا لفافہ آسمان سے "نازل ہوا ہوگا" جس نظریہ میں تم ماضی شکیہ کے صیغے استعمال کر رہے ہو، اس کا الزام دوسروں پر عائد کرنا کہاں کی عدالت اور امانت و دیانت ہے؟ محض اپنی طرف سے مفروضے قائم کر کے دوسروں پر تہمت لگانا نواصب ہی کا کام ہے کوئی مسلمان ایسی قبیح حرکت نہیں کر سکتا۔ نام بہ نام لفافے نازل ہونا کوئی نامعقول امر نہیں ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو الواح عطا نہیں کی تھیں؟ اس کا ثبوت کیا ہے کہ اسماعیل کے نام کا لفافہ نازل ہوا تھا۔ محض "ہوا ہوگا" کے وہم کی بنیاد پر الزام تراشی بڑی خیانت کاری ہے۔

مولوی اعظم طارق نے اپنے پیشروؤں کی مانند خیانت کاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ ان کی خیانت اور کثر بیوقت کا ایک شاہکار شیخ صدوق کی یہ عبارت ہے جسے انہوں نے عمداً سیاق وسباق کو بالائے طاق رکھ کر درمیان سے عبارت کا ٹکڑا چرا لیا جبکہ اصل عبارت یوں ہے:

﴿و اما قول الصادق علیه السلام ما بداء له فی اسماعیل ابنی فانه یقول ما ظهر من اللّٰه امر فی شی کما ظهر منه فی ابنی اسماعیل اذ اخترمه قبلی لیعلم انه لیس بامام بعدی﴾

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد کہ جو بداء میرے بیٹے اسماعیل کے بارے میں ہوا، چنانچہ آپؑ نے فرمایا: کسی چیز میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا امر ظاہر نہیں ہوا جیسا کہ اس کی جانب سے میرے بیٹے اسماعیل کی بابت ظاہر ہوا، اس لئے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے ہی دنیا سے

اٹھالیا (وفات دے دی) تا کہ یہ امر معلوم ہو جائے کہ وہ میرے بعد امام نہیں ہے۔"
(اعتقادیہ شیخ صدوق ص ۲۹ طبع دہلی)

چونکہ شیطان کے اغوا سے بعض لوگ گمراہ ہو سکتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اغوائے شیطان کا بڑا راستہ بند کرنے کے لئے اسماعیل کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی میں ہی وفات دے دی۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اسماعیل امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد امام نامزد نہیں ہیں۔ کیونکہ اختلاف پیدا ہوسکتا تھا اس اختلاف کا ایک بڑا راستہ بند کیا گیا۔ پھر بھی اختلاف پیدا ہوا اور ایک فرقہ اسماعیلیہ وجود میں آ گیا جو آج تک باقی ہے۔ عبارت کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ جو کچھ ہوا اللہ کے سابقہ علم کے مطابق ہوا نہ کہ اب اللہ کے لئے کوئی بات ظاہر ہوگئی۔

"ظهر من الله" کی عبارت ہے نہ کہ "ظهر الله" یہ ظاہر ہونا ہماری نسبت سے ہے یعنی پہلے ہمارے علم میں بات نہ تھی اب سامنے آ گئی۔

مؤلف نے اپنی خیانت کاری اور جہالت سے اصل عبارت کو سیاق و سباق سے الگ کر کے غلط مطلب اخذ کیا اور ہوا ہوگا، علامت موجود ہوں گی، پیدا ہوئے ہوں گے، ان کے نام کا لفافہ ہوگا کے شکیہ الفاظ سے الزام تراشی کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے۔ اس کو کہتے ہیں دیانت، انصا اور تحقیق؟ لا حول و لا قوة الا باللّٰہ

سخن شناس نہ دلبر اخطا اینجا است

حالانکہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے واضح لفظوں میں فرمایا ہے جسے شیخ صدوق رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اسماعیل کی وفات آپؑ کی زندگی میں اسی مقصد سے ہوئی ہے تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ نہ اپنی زندگی میں امامت کے لئے نامزد تھے نہ آئندہ ہوں۔ اس خیال کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسماعیل کو موت سے ہمکنار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے۔ ﴿ان اللّٰہ لا یحب الخائنین﴾ اللہ تعالیٰ خیانت کاروں سے محبت نہیں کرتا۔

واضح ہو کہ امامت کے لئے محض بڑا بیٹا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ امامت کے لئے دیگر اوصاف بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بارہ امام پہلے سے نامزد کئے ہوئے ہیں شیعہ اثنا عشریہ تو کیا اہل

سنت کی کتب میں بھی ان بارہ ائمہ کے اسماء مبارکہ تک مذکور ہیں پھر یہ کہنا کہ ان کے نام کا لفافہ بھی اترا ہوگا، عظیم حماقت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

جس طرح مؤلف حقائق تک ذہنی رسائی نہ ہونے اور کوتاہ فہمی کی بناء پر غلط استدلال کرکے الزام تراشی کرتے ہیں۔ اس طرح کے جاہل ان پڑھ ملاں پہلے زمانے میں بھی پائے جاتے تھے۔ چنانچہ ابن عبدالبر نے ایک بڑا دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ جسے یہاں بیان کر دینا فائدے سے خالی نہیں ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ:

﴿قیل لعلی یا امیر المومنین ان ھھنا قومًا یقولون ان اللّٰہ لا یعلم ما یکون حتی یکون، فقال ثکلتھم امھاتھم من این قالو ذلك؟ قیل یتاولون القرآن فی قولہ عزوجل "ولنبلونکم حتی نعلم المجاھدین منکم و الصابرین و نبلوا اخبارکم" فقال علی رضی اللّٰہ عنہ من لم یعلم ھلك.... "﴾

حضرت علی علیہ السلام کو کہا گیا کہ اے امیر المومنین، یہاں کچھ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو آئندہ ہونے والے واقعات کا علم نہیں ہوتا حتیٰ کہ واقعات پیش آجائیں۔ آپؑ نے فرمایا: ان کی مائیں ان پر روئیں۔ یہ بات انہوں نے کس بناء پر کہی ہے؟ کہا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے تو حتیٰ کہ تم میں سے جہاد اور صبر کرنے والے ہم کو معلوم ہو جائیں اور تمہاری باتوں کو ہم آزمائیں گے" تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جس نے علم حاصل نہ کیا وہ ہلاک ہوگیا۔۔۔ **(جامع بیان العلم و فضلہ، ج ۱ ص ۱۳۸ طبع جدید بیروت)**

حقیقی اہل علم یعنی **مدینۃ العلم** کے باب سے دور رہنے والے اس طرح کے احمقانہ اور مضحکہ خیز استدلال کیا کرتے ہیں۔ ہمارے مخاطب اور اس کے ہم خیال لوگ پہلے بھی اسی انداز سے "علامہ" بنے رہے ہیں جیسے اب بغیر علم کے علامہ بنے ہوئے ہیں۔ محبان علیؑ کے خلاف اسی طرح استدلال کرکے خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں جس طرح ان کے پیشرووں نے مندرجہ بالا واقعہ میں قرآن کو سمجھا تھا۔

حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ اور مسئلہ بداء

مؤلف بعنوان ''حضرت لوط علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو بدا ہونے کا خدشہ ظاہر کیا'' کے تحت لکھتا ہے کہ:

''اصول کافی کے کتاب النکاح کے تحت باب اللواط میں ایک روایت ہے جس کا تھوڑا سا حصہ یہاں بیان کرتا ہوں کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے عذاب لے کر آئے تھے تو انہیں لوط علیہ السلام نے کہا اسے میرے رب کا پیغام پہنچانے والو تم کو میرے پروردگار کا کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے کہا ہمیں حکم یہ ہے کہ اس قوم کو ہم سحر کے وقت پکڑیں تو لوط علیہ السلام نے کہا مجھے تم سے ایک کام ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا کام ہے؟ تو لوط علیہ السلام نے کہا کہ تم اسی وقت اس قوم کی گرفت کرو کیونکہ خدشہ ہے کہ کہیں ان کے بارے میں میرے پروردگار کو بداء نہ ہو جائے **لاحول ولا قوۃ الا باللہ**۔۔۔۔ کیا اس عقیدہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی کسی بات پر یقین رہ جائے گا؟ پھر تو اس بات کا بھی امکان ہے کہ شاید رب العالمین قیامت قائم کرنے اور جنت وجہنم کی تقسیم، حشر کے روز اعمال کے وزن کرنے وغیرہ والی باتوں میں بھی بداء ہی کا شکار نہ ہو جائے (استغفر اللہ)۔

(خطبات جیل ص ۵۷)

<u>الجواب</u>:۔ مؤلف نے اصول کافی کے حوالے سے لکھا کہ لوط علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے بداء ہونے کا خدشہ ظاہر کیا، یہ اعتراض کرنے سے پہلے اگر یونس علیہ السلام کے واقعہ پر بانصاف غور کر لیتے تو اس حماقت کا ارتکاب ہرگز نہ کرتے لیکن ان کے اوپر شیطان سوار ہے، جو انہیں حق وصداقت کے نزدیک بھی نہیں جانے دیتا۔ سچ ہے

و کم من عائب قول صحیحا　　　　و آفته من الفهم السقیم

یعنی وہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو صحیح بات کو غلط کہتے ہیں حالانکہ وہ بات غلط نہیں ہوتی بلکہ دماغ اپنا خراب اور غلط ہوتا ہے۔

باقی آپ کا یہ کہنا کہ عقیدہ بداء کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی کسی بات حتی کہ قیامت کے قیام، جنت دوزخ کی تقسیم اور حشر کے دن اعمال کے وزن وغیرہ پر بھی اعتماد باقی نہیں رہتا۔ جاہل

ملا اگر اصول کافی کے حوالے سے سابقہ اوراق پر درج روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی وضاحت سمجھ لیتا تو اس قسم کا شبہ اس کے ناپاک وخبیث دل میں پیدا نہ ہوتا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ امور دو قسم کے ہیں۔ حتمی اور موقوف۔ حتمی امور میں بداء نہیں ہوتا جبکہ موقوف میں بداء ہوتا ہے۔ قیامت کا قیام وغیرہ حتمی امور میں سے ہیں، یہ کسی شرط کے ساتھ مشروط وموقوف نہیں ہیں۔ جبکہ کائنات کے اکثر روزمرہ امور زیادہ تر مشروط ہیں۔ یہ شرائط اور ان کا وجود یا عدم سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم محیط ازلی میں ہوتا ہے۔ یہ بداء ہماری یعنی انسانوں کی نسبت سے ایک اصطلاح ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام احوال کو محیط ہوتا ہے۔ چونکہ یہ ناصبی ملاں خود جاہل ہے اس لئے اس کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ بداء سے اللہ کی جہالت (نعوذ باللہ) ثابت ہوتی ہے یعنی بداء کے آئینے میں نواصب کو اپنی جہالت کی مکروہ تصویر نظر آتی ہے۔

باقی یہ روایات کہ بداء پر ایمان سب سے افضل عبادت ہے تو بے عقل مؤلف کو کون سمجھائے۔ جب یہ امر واضح ہوگیا کہ بداء اللہ تعالیٰ کے علم ازلی محیط کو کہا جاتا ہے جسے کائنات میں پیش آنے والے واقعات کی پوری تفصیلات و جزئیات سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اختیار اعلیٰ اور قدرت کاملہ کو ظاہر کرنے والی تقدیر ہے۔ تب اس پر ایمان لانا عین ایمان ہے جو سب عبادات کی بنیاد ہے۔ جو شخص اس معاملے میں متزلزل اور شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جائے تو گویا اس نے اللہ جل جلالہ کے اختیارات اور بے انتہا قدرت کو پوری طرح نہ سمجھا اور نہ ہی تسلیم کیا ہے۔ لیکن عقل سے عاری ملاں ہر معقول بات کو اپنی بے عقلی سے نامعقول بنانے کا فریضہ ادا کئے جا رہے ہیں جو ابلیس نے انہیں سونپا ہوا ہے۔

یہودی بداء کا انکار کرتے ہیں

قبل ازیں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ناصبیت کے حقیقی بانی اور مربی اس کی ابتداء سے آج تک یہود رہے ہیں اس کا مزید اور پختہ ثبوت ناصبیت اور یہودیت کے نظریات میں ہم آہنگی ہے، دیگر بہت سے مسائل کی مانند مسئلہ بداء میں بھی یہودی ناصبی متحد ہیں۔ چنانچہ علامہ شہرستانی لکھتے ہیں:

﴿ولم یجیزوا النسخ اصلاً. قالوا فلا یکون بعده شریعة اصلاً لان النسخ فی الاوامر بداء ولا یجوز البداء علی اللّٰہ تعالیٰ﴾

یہود نے نسخ کو اصلاً ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ قائل ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی شریعت بالکل نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اوامر میں نسخ بداء ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے بداء جائز نہیں ہے۔"

(الملل والنحل ج۱ ص۲۱۱، الباب الثانی، الفصل الاول الیہود خاصۃ طبع قاہرہ)

اس سے معلوم ہوا کہ یہود نے اپنی بے وقوفی اور جہالت کی بناء پر بداء کا غلط مفہوم اخذ کر کے اس کا انکار کیا۔ حالانکہ اہل حق کے نزدیک یہی نسخ و تبدیل، محو و اثبات احکام و شرائع، اوامر و نواہی میں کمی بیشی، تقادیر میں تقدیم و تاخیر یا تبدیل و تغیر اصطلاحاً بداء کہلاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی (نعوذ باللہ) بے علمی سے واقع نہیں ہوتا کہ اسے اللہ تعالیٰ کے حق میں ناجائز قرار دیا جائے۔ بلکہ اس کے ازلی علم میں شامل ہوتا ہے۔ ہٹ دھرم اور جاہل یہود اور ان کے بے عقل پیروکار اپنی نادانی سے اسے غلط مطلب پہنا کر اس کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ صدوقؒ نے بھی شہرستانی سے ملتی جلتی عبارت میں اس مفہوم کو ادا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

﴿قال الشیخ ابو جعفرؒ ان الیہود قالوا ان اللّٰہ تبارک و تعالیٰ قد فرغ من الامر قلنا بل ھو تعالیٰ کل یوم ھو فی شان لا یشغلہ شان عن شان یحیی و یمیت و یخلق و یرزق و یفعل ما یشاء و قلنا یمحو اللّٰہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب و انہ لا یمحوا الا ما کان و لا یثبت الا ما لم یکن و ھذا لیس ببداء کما قالت الیہود و اتباعھم فنسبنا الیہود لعنھم اللّٰہ فی ذلک الی قول بالبداء و تبعھم علی ذلک من خالفنا من اھل الاھواء المختلفة﴾

شیخ صدوقؒ کہتے ہیں کہ یہود قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کام سے فارغ ہوگیا ہے ہم کہتے ہیں کہ ہر روز اللہ تعالیٰ ایک کام میں ہوتا ہے وہ کام اسے دوسرے کام سے روک نہیں سکتا۔ زندہ کرتا ہے، مارتا ہے، پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے اور جو چاہتا ہے (دیگر) کام کرتا ہے ہم کہتے ہیں کہ اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے وجود میں لے آتا ہے۔ ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔ وہ

اسی چیز کو محو کرتا ہے جو پہلے سے ہوتی ہے اور اسی کو وجود میں لاتا ہے جو پہلے نہیں تھی۔ یہ وہ بداء نہیں ہے جس کا ذکر یہود اور ان کے پیروکار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان یہود نے ہماری طرف ہی منسوب کیا ہے کہ ہم ان کے مزعومہ بداء کے قائل ہیں اللہ ان پر لعنت کرے۔ اس غلط الزام تراشی میں بہت سے خواہشات کے پیروکاران یہود کے ہمنوا ہو گئے ہیں۔"

(اعتقادیہ شیخ صدوق ص ۲۷، ۲۸، مطبوعہ دہلی)

یہود بداء کا یہ معنی لیتے ہیں کہ اللہ کو پہلے سے کسی شئی کا علم نہ ہو، پھر اس کی نفی کرتے ہیں، اسی کا الزام مذہبِ حق پر لگاتے ہیں اور ناصبی بھی اسی سلسلے میں ان کے قدیم اتحادی ہیں۔ حالانکہ یہودی ناصبی احمقوں نے غلط سمجھا، غلط الزام لگایا اور ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سے غلطی پر ڈٹ گئے۔ شیطان کو راضی رکھنے کے لئے دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا بیڑہ اٹھالیا۔

باب ۴

امامت اور ختم نبوت کے بیان میں

مولوی اعظم طارق اور ان کے پیرو اپنی نافہمی اور لاعلمی کی بناء پر اہل حق پر ہمیشہ سے یہ الزام عائد کرتے چلے آئے ہیں کہ شیعہ اثنا عشریہ درحقیقت ختم نبوت کے منکر ہیں۔ (معاذ اللہ) سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شیعہ امام کو معصوم، مفترض الطاعۃ اور منصوص من اللہ جانتے ہیں اور امامت کو ایک وہبی وعطائی منصب یقین کرتے ہیں۔

کیا صحابیت مثل نبوت کے وہبی منصب ہے؟

یہ عقل کے اندھے اس مذکورہ سبب کی بنیاد پر شیعیان حیدر کرارؑ پر بے دریغ الزام تراشی اور بہتان پردازی کرتے ہیں لیکن اس مؤلف نے اپنی کتاب جو درحقیقت اس کے سرپرست مرزائیوں کے مشورہ سے اور ایک ناسمجھ (دیوبندی مولوی) کی مجموعہ خرافات ''شیعہ سنی اختلافات اور صراطِ مستقیم'' سے نقل کی گئی ہے۔ میں ''عقیدہ امامت اور ختم نبوت'' کے عنوان کے تحت چند ایسی حماقت آمیز باتیں لکھ دی ہیں جس کی بناء پر وہی الزام پلٹ کر اسی ناصبی ملاں اور اس کے ہم مشروب وہم پیالہ افراد پر عائد ہو جاتا ہے اور الزام ثابت ہو کر جرم بن جاتا ہے۔ جو فتویٰ یہ شیعہ پر لگانا چاہتے ہیں وہی خود ان پر لگتا ہے۔ چنانچہ مولوی اعظم طارق بے عقلی سے نقل مارتے ہوئے لکھتا ہے:

''اس کائنات میں انسانوں کو دو طرح کے مقامات نصیب ہوتے ہیں (۱) وہبی وعطائی (۲) کسبی۔

وہبی وعطائی ترقی اس مقام کو کہتے ہیں جو محض مشیت ایزدی سے کسی خوش نصیب کو عطا ہو ورنہ ہزاروں سال کی محنت وریاضت، دنیا بھر کے علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل ہونے کے بعد بھی اس کا حاصل ہونا ممکن نہ ہو اور یہ دو مقام ہیں (۱) نبوت کا مقام (۲) صحابیت کا مقام، کوئی بھی شخص اپنی قابلیت، دانائی، حسن وجمال یا مال ومنال اور عہدہ ومنصب کی بنیاد پر اگر یہ چاہے کہ

اسے نبوت حاصل ہو جائے یا صحابیت کا شرف نصیب ہو جائے تو یہ بات ہرگز ممکن نہیں ہے۔''
(خطبات جیل ص ۵۸)

مؤلف نے اپنی ہفوات جیل کے صفحہ ۶۰ پر عنوان ''نبوت وصحابیت کا مقام وہبی ہے کسبی نہیں'' کے تحت دوبارہ انہی الفاظ کو دہرایا ہے۔

الجواب :۔ اس مؤلف کی سمجھ پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اگر شیعہ امامت کے منصب کو وہبی قرار دیتے ہیں تو آپ نے بھی تو یہی کام کیا ہے کہ صحابیت کو نبوت کے مساوی قرار دے دیا ہے۔ صحابیت کو بھی نبوت کی مانند وہبی منصب قرار دینا بھی اسی طرح ختم نبوت کے منافی ہے۔ جس طرح ملاں مذہب حقہ پر انکار ختم نبوت کا الزام لگاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صحابیت تو محض ایک شرف ہے اسے وہبی کہنے سے ختم نبوت پر نہ کوئی زد پڑتی ہے نہ نبوت کے مقام سے مساوات لازم آتی ہے۔ حالانکہ یہ عذر بدتر از گناہ ہے۔ اس لئے کہ جب صحابیت کو بھی وہبی وعطائی منصب قرار دیا گیا جو صرف اور صرف اللہ کی مشیت پر ہی مل سکتا ہے۔ تو یہ لازماً نبوت کے ہم پلہ منصب ہے۔ اسی طرح محض شرف ہی نہیں بلکہ امام و وصی کی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے حامل، شارح اور مبلغ ومنفذ قرار دیئے جاتے ہیں اور اسی دلیل سے مؤلف انہیں یہ وہبی مقام دے رہا ہے کہ یہ پیغمبرؐ اور امت کے درمیان دین کی وصولی کے لئے واسطہ ہیں۔ اس لئے ان کا محفوظ یعنی دوسرے لفظوں میں معصوم ہونا ضروری ہے ورنہ دین پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ احمق ملاں کو کبھی غور وفکر کرنے کی توفیق نہیں ہوئی ورنہ جو الزام محض اپنے عناد وتعصب سے مذہب حق پر لگا رہے ہیں اسی کا ارتکاب خود کرتے ہیں۔ اگر پیغمبرؐ کے بعد دین کی تبلیغ وتشریح کے لئے ایک واسطہ یعنی صحابیت کا وہبی اور محفوظ یعنی معصوم ہونا ضروری ہے تو کیا ان کے بعد مسلسل انسانوں کو ایسے ہی واسطے کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا شیطان محبوس ہو چکا ہے کہ اب دین محفوظ ہو گیا ہے شیطان بھی آزاد اور اس کے پیروکار احمق ملاں بھی حق کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ اس لئے ایسے معصوم واسطہ کی مسلسل ضرورت باقی ہے۔ بے شمار لوگوں کو یہ وہبی منصب عطا کرنے سے بہتر نہیں ہے کہ پیغمبر کی مانند ان کا ایک ہی جانشین اس منصب پر فائز ہو تو کافی ہے۔ اس سے امت

میں تمام منازعات واختلافات کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

جن لوگوں نے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ بعض صحابہ مرتد بھی ہوگئے تھے جو اسی ارتداد کی حالت میں ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔ بعض ایسے بھی ہوئے ہیں جو اسی ارتداد کی حالت میں ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔ بعض ایسے بھی ہوئے ہیں جو پہلے اس نبوت کی نوعیت کے دینی منصب پر فائز ہوئے لیکن بعد ازاں انہیں یہ منصب راس نہ آیا اور بھگوڑے ہوگئے۔ دوبارہ مفاد دیکھا تو اس میں شامل ہوگئے۔ اشعث بن قیس وغیرہ ان میں شامل ہیں۔ اور اسی طرح کے بعض ایسے بھی ہوئے جنہوں نے کشت وخون اور جنگ وجدل وغارتگری کا بازار گرم کیا اور قرآن کو دھوکہ دہی کے لئے نیزوں پر اٹھایا۔ اصح الکتب صحیح بخاری میں ایک حدیث موجود ہے جو حدیث محشر کے نام سے مشہور ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

﴿ان اناسا من اصحابی یوخذ بهم ذات الشمال فاقول اصحابی اصحابی فیقال انهم لم یزالوا مرتدین علی اعقابهم منذ فارقتهم﴾

"میرے صحابہ میں سے کچھ افراد کو پکڑ کر دوزخ کی طرف لایا جا رہا ہوگا میں کہوں گا یہ تو میرے اصحاب ہیں مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کی وفات کے بعد یہ لوگ مرتد ہوگئے یعنی دین سے پھر گئے تھے۔"

(۱) صحیح بخاری ج ا ص ۱۴۲ باب بدء الخلق طبع عثمانیہ مصر۔
(۲) صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۴ باب فی صفۃ یوم القیامۃ طبع لکھنؤ۔

اس حدیث محشر کے تحت بخاری کے حاشیہ اور شرح مسلم میں امام نووی نے "ارتدوا عن الاستقامة لا عن الاسلام" لکھا ہے لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر استقامت نہ رہی تو پھر دین کیا بچا یہی استقامت ہی تو سب کچھ ہے مثال کے طور پر بسر بن ارطاۃ جو بظاہر صحابہ میں شمار ہوتا ہے جس نے اہل بیتؑ پر اتنے مظالم ڈھائے کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ جن کے تذکرے سے رونگٹے کھڑے

ہو جاتے ہیں اور زبان تھر تھرا جاتی ہے، قلم کانپنے اور لرزہ براندام ہو جاتا ہے اہل بیتؑ کو بے دردی سے قتل کیا اور انہیں خوف و ہراس کیا، عبید اللہ بن عباس کے دو چھوٹے بچے ان کی ماں کے سامنے قتل کر دیئے گئے لیکن ایسے ناقابل تلافی جرائم کے باوجود اس کا شمار صحابہ میں کیا جاتا ہے۔ مسند الامام احمد میں ''حدیث بسر بن ارطاۃ'' کا عنوان قائم کیا ہے اور نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' بھی لکھا ہے اسی طرح کتب صحاح ستہ میں سے جامع ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابی داؤد میں اس سے ''سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ سے روایت موجود ہے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سماعت کی صحت بھی ثابت ہے امام دارقطنی نے اس کے بارے میں کہا ہے:

﴿کانت له صحبة ولم تكن استقامة بعد النبی صلی اللّٰه علیه وسلم﴾

''یہ صحابی ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد استقامت ثابت نہیں ہے۔''

(شذرات الذہب لابن العماد حنبلی ج ۱ ص ۶۸ طبع بیروت،
تہذیب الکمال ج ۴ ص ۶۲ طبع بیروت)

اسی طرح کی ایک اور شخصیت جسے صحابیت کے مقدس نام سے نوازا گیا وہ ربیعہ بن یزید سلمی ہے الاصابہ فی تمیز الصحابہ لابن حجر عسقلانی اور الاستیعاب وغیرہ ایسی صحابہ کرامؓ کے تفصیلی حالات پر لکھی گئی کتب میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ امام بخاری اور ابن حبان ایسے ائمہ نقاد نے اسے صحابی تسلیم کیا ہے۔ امام بخاری نے اپنی ''تاریخ کبیر'' میں یہ قاعدہ اپنایا ہے کہ وہ بالعموم صحابی کے ساتھ ''لہ صحبة'' وغیرہ ایسے الفاظ درج کرتے ہیں۔ ربیع بن یزید کی صحابیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿ربیعة بن یزید السلمی له صحبة﴾ کہ ''ربیعہ بن یزید سلمی صحابی ہیں۔''

(تاریخ کبیر باب ربیعہ، ج ۲ ص ۲۵۶ الطبعۃ الاولی حیدر آباد دکن)

لیکن یہ شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت نشین ہونے کے باوجود زبردست دشمن اہل بیتؑ تھا۔ مشہور مورخ حافظ ابن عبد البر اندلسی نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

﴿و امام ربیعة بن یزید السلمی فكان من النواصب یشتم علیا رضی اللّٰه عنه﴾

''ربیعہ بن یزید سلمی پس یہ نواصب میں سے تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان اقدس میں گستاخانہ کلمات کہنے کی جسارت کیا کرتا تھا۔'' (الاستیعاب برحاشیہ الاصابہ ج ا ص ۵۱۱)

کیا وہی منصب پر فائز ہونے والے ایسے ہو سکتے ہیں؟ اگر نبوت وہی منصب ہے تو کیا انبیاء علیہم السلام میں کوئی ایسا شخص مل سکتا ہے جس نے اس مقدس منصب کے منافی کوئی کام کیا ہو؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام تو نبوت سے قبل بھی گناہوں سے پاک ہوتے ہیں تا کہ دوسروں کو راہِ راست پر لانے والے کی سابقہ زندگی کی طرف کوئی انگشت نمائی نہ کر سکے۔ انبیاء علیہم السلام میں کوئی باہمی اختلاف نہیں ہوا بلکہ سب کا دین ایک ہی رہا ہے۔ صحابیت اگر وہی منصب ہے تو ان میں محض مسائل میں باہم اختلاف ہی نہیں بلکہ حکومت کے مسئلہ میں اتنا شدید اختلاف ہوا کہ انتہائی شدید خون ریز جنگیں واقع ہوئیں۔ فریقین میں بے شمار صحابیت تھے اور قیادت بھی صحابی ہی کر رہے تھے۔

آپ جو الزام مذہب حق پر لگا رہے ہیں اپنی حماقت سے خود اس کا مورد بن گئے ہیں۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

اولی العزم پیغمبرؑ کو خلفاء راشدین کے تعویذ کا محتاج بنا دیا

سپاہِ صحابہ کا سابق رہنما مولوی ضیاء الرحمٰن فاروقی، امام کسائی کی کتاب ''قصص الانبیاء'' کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

''حضرت نوح علیہ السلام جب کشتی کا کچھ حصہ بناتے تو رات کو اسے زمین کا کیڑا کھا جاتا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کی جناب میں اس کا شکوہ کیا۔ اللہ نے فرمایا: اس پر میری مخلوق کے اکابر کے نام لکھ دو، جناب نوحؑ نے عرض کیا وہ کون ہیں؟ تو اللہ نے فرمایا: وہ میرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ ہیں۔''

(گستاخ صحابہ کی شرعی سزا، ص ۱۱، ناشر: ادارہ اشاعت المعارف، فیصل آباد)

محترم قارئین:۔ اللہ تعالیٰ نے جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مخاطب کر کے یوں فرمایا:

﴿وان من شیعتہ لابراھیم اذ جاء ربہ بقلب سلیم ﴾ ''اور بے شک یقیناً نوحؑ کے پیروکاروں میں سے ابراہیمؑ بھی تھے جب صاف دل سے اپنے پروردگار کے پاس آئے۔''
(سورۃ الصافات، آیت ۸۳،۸۴)

گویا اس مقام اور مرتبہ میں حضرت نوح علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی بلند تر اور اعلیٰ و برتر تھے اب منظر ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت نوح علیہ السلام جیسا اولی العزم پیغمبر ایک مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتا ہے اور جواب میں اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں رسول اکرمؐ اور حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کے نام لکھنے کا مشورہ دیتا ہے۔بات اگر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک محدود رہتی تو قابل فہم اور قابل قبول ہوتی کہ ان کا افضل الانبیاء ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے لیکن نوحؑ جیسے اولی العزم پیغمبر کو غیر معصوم خلفاء ثلاثہ کے تعویذ کا محتاج بنا دینا کیا انبیاء علیہم السلام کی توہین نہیں؟ اور کیا یہ واقعہ ثابت نہیں کرتا کہ مولوی اعظم طارق کے روحانی پیشواء اس بات کے قائل ہیں کہ صحابہ کرامؓ کا رتبہ اور مقام اولوالعزم پیغمبروں اور رسولوں سے بھی زیادہ ہے۔
﴿استغفر اللہ العظیم﴾

یہاں ضمناً اس جانب بھی اشارہ کر دینا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ''یا اللہ مدد'' کے علاوہ باقی سب کچھ شرک اور بدعت قرار دینے والے اس گروہ کے سرغنے کی طرف سے اس روایت کو قبول کرنا اور اس سے استدلال کرنا درحقیقت امت مسلمہ کے اس عظیم گروہ کی عظیم کامیابی ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء اللہ سے مدد مانگتے ہیں۔

امامت اور نبوت وہی منصب ہیں

مؤلف مذہب حق پر الزام تراشی کرتے ہوئے یوں زہر افشانی کرتا ہے کہ:
''اس وقت اس کائنات میں شیعہ سے بڑھ کر کوئی بھی گروہ اور طبقہ ختم نبوت کا منکر نہیں ہے۔شیعہ عقیدہ ختم نبوت کے ظاہری طور پر قائل ہونے کا اعلان تو کرتا ہے اور اس کے راہنماؤں پیشواؤں نے تقیۂ علماء حق کے ساتھ مل کر ختم نبوۃ کے تحریکوں میں بھی حصہ لیا ہے لیکن یہ ایک

ناقابل تردید حقیقت ہے کہ خود شیعہ ہی سب سے بڑا ختم نبوۃ کا منکر ہے۔۔۔''۔

(خطبات جیل، ص ۶۰، ۶۵)

الجواب۔ سچ ہے کہ ﴿الناس اعدا لما جهلوا﴾ یعنی آدمی اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جس سے جاہل ہو۔

چونکہ مؤلفِ موصوف مسئلۂ امامت کے مبادیات کو بھی سمجھنے سے بالکل عاری ہے اس لئے وہی خرافات اور زہر اگلتا جا رہا ہے یہ بات اربابِ عقل و علم پر پوشیدہ نہیں ہے کہ امامت اور نبوت دونوں وہبی منصب ہیں۔ یعنی عطائے الٰہی ہے جو اس نے اپنی برگزیدہ معصوم ہستیوں سے کسی صورت میں بھی باہر جانے نہیں دیا، لہٰذا یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی اولاد اور اہل بیتؑ کے لئے ہی مخصوص رکھا ہے کسی امتی کو اس کا اہل قرار نہیں دیا گیا۔ ان کی جنس ایک ہے نوع الگ الگ ہے۔ بعض اوصاف و خصائص میں فرق کے باوجود فرائض منصبی تقریباً ایک جیسے ہیں۔ نبی اور امام کی بعثت اور نصب کے مقاصد علم کلام و عقائد کی کتب میں شیعہ و سنی علماء نے واضح طور پر لکھے ہیں جو ایک ہی جیسے ہیں ہم اسی کتاب کے دوسرے باب میں بڑی شرح و بسط سے بحث کر چکے ہیں۔ فلیراجع الیه تاہم شیعہ کے نزدیک یہ امر قطعی طور پر طے شدہ ہے کہ نبوت کا سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے جبکہ امامت کا سلسلہ جاری ہے۔ آخری امام حضرت مہدی علیہ السلام ہیں۔ جن کا ظہور عنقریب متوقع ہے۔ جس طرح بنو اسرائیل کے آخری نبی عیسیٰ علیہ السلام زندہ اٹھا کر غائب کر دیئے گئے اسی طرح بنو اسماعیل میں سے آخری امام بھی زندہ غائب ہیں۔ دونوں کی غیبت انسانوں کی اپنی نافرمانی کی سبب ہوئی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ کرۂ ارض پر عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔

نبوت اور امامت کے فرق کو ہم نے اسی کتاب کے دوسرے باب میں بیان کر دیا ہے۔

شیعہ اور ختم نبوت

شیعہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور آپؐ کے بعد سلسلۂ امامت کا جاری ہونا ختم نبوت کی محکم دلیل ہے اگر آپؐ کے

بعد کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے وہ کافر اور واجب القتل ہے چنانچہ آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاءؒ عنوان ''النبوۃ'' کے ذیل میں رقمطراز ہیں:

﴿ویعتقد الامامیة ان کل من اعتقد او ادعی نبوة بعد محمد صلی الله علیه و آله وسلم او نزول وحی او کتاب فهو کافر یجب قتله﴾

''شیعہ امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے بعد جو شخص بھی نبوت یا نزول وحی کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے اور واجب القتل ہے''۔ (اصل الشیعہ واصولھا، ص ۸۸، طبع نجف)

شیخ صدوق علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

﴿وشریعة محمد صلی الله علیه و آله وسلم لا تنسخ الی یوم القیامة و لا نبی بعده الی یوم القیامة فمن ادعی بعد نبینا او اتی بعد القرآن بکتاب فدمه مباح لکل من سمع ذلك منه﴾

''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت قیامت کے دن تک منسوخ نہیں ہوگی۔ آپ کے بعد قیامت کے دن تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ جو کوئی ہمارے نبیؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے یا قرآن کے بعد کوئی کتاب لائے تو اس کا خون ہر اس شخص پر مباح ہے جو اس سے یہ دعویٰ سنے''۔ (علل الشرائع، باب ۱۰۱، ص ۱۲۴، طبع نجف)

علامہ طبرسیؒ نے حضرت علی علیہ السلام کا ایک طویل احتجاجی خطبہ نقل کیا کہ جس میں آپؑ نے ختم نبوت کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿اما رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم لیس بعده نبی و لا رسول ختم برسول الله الانبیاء الی یوم القیامة و جعلنا من بعد محمد خلفاء فی ارضه﴾

''رسول اللہ ﷺ تو خاتم النبیین ہیں۔ آپؐ کے بعد نہ کوئی نبی ہے نہ رسول۔ قیامت تک کیلئے رسول اللہ ﷺ پر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اور ہمیں اللہ نے محمد ﷺ کے بعد اپنی زمین میں خلفاء بنایا ہے''۔ (احتجاج طبرسی، ص ۸۰، طبع قدیم نجف، طبع جدید، ج ۱، ص ۲۲۰۔ عیون اخبار الرضا، ج ۲، ص ۱۲۰، باب ۳۵، ما کتب الرضا للمومن، طبع تہران)

ان واضح بیانات اور ارشادات کے بعد بھی یہ الزام لگانا کہ شیعہ درحقیقت ختم نبوت کے منکر ہیں انتہائی درجہ کی دجالیت اور فریب کاری ہے۔ خود تو صحابہ کو بھی انبیاء کا ہم پلہ اور مساوی قرار دے رہے ہیں جن کی زندگی کا بڑا حصہ کفر و شرک میں بسر ہوا بعد میں بھی ان میں سے بعض افراد کا کردار کوئی قابل رشک نہیں رہا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بھی ان کی جابجا کوتاہیاں اور خلاف ورزیاں قرآن وسنت سے ثابت ہیں۔ پھر بھی جھوٹا الزام مذہبِ حق پر۔ ﴿ الا لعنة اللّٰہ علی الکاذبین ﴾

تحریکِ ختم نبوت میں شیعہ علماء کا تاریخ ساز کردار

جب برصغیر کی پوری ملتِ اسلامیہ اپنے حقوق کی بازیابی، غاصب حکمرانوں سے نجات اور علیحدہ اسلامی مملکت کے حصول کی جدوجہد میں مصروفِ عمل تھی اس وقت شیعہ عوام نے دیگر مکاتب کے شانہ بشانہ بے دریغ قربانیوں کے ذریعے وطن عزیز کی بنیادیں اپنے لہو کے ساتھ استوار کیں۔ جب تحریکِ پاکستان میں قیادت کی فراہمی کا دشوار مسئلہ سامنے آیا تو محمد علی جناحؒ سامنے آئے جو بانیٔ پاکستان اور مسلمانوں کے نجات دہندہ بن گئے۔ جب تحریک پاکستان کو سرمائے کی ضرورت پڑی تو راجہ صاحب محمود آباد جیسی شخصیات نے دستِ تعاون دراز کیا اور اس خطے کے قیام واستحکام کی بقاء کے لئے اپنا بے دریغ سرمایہ صرف کیا، جب کبھی علمی وفکری میدان میں دفاعِ وطن کا مقام آیا تو علماءِ شیعہ نے اپنی بے پناہ علمی و قائدانہ صلاحیتوں سے نہ صرف وطن عزیز بلکہ امتِ اسلامیہ کا دفاع کیا۔ یوں سلسلہ قیام پاکستان تک چلتا رہا، مارچ ۱۹۴۸ء میں آل پاکستان شیعہ کانفرنس اس کے بعد ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا، قرارداد مقاصد کی تدوین میں شیعہ علماء کا کردار اور ۱۹۴۹ء میں نوابزادہ لیاقت علی خان کے دورِ حکومت میں تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ میں شیعہ علماء کی خدمات بھی اظہر من الشمس ہیں۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتبِ فکر کے جید علمائے کرام نے اسلامی دستوری ۲۲ نکاتی دستاویز مرتب کی جس میں شیعہ علماءِ کرام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ قادیانیت کے خلاف ۱۹۵۲ء میں آل پارٹیز کانفرنس میں شیعہ علماء نے بھرپور نمائندگی کی۔ اور ۱۹۷۱ء میں اسلامی مشاورتی کونسل میں شیعہ علماء کا لازوال کردار بھی ہر صاحبِ فکر ونظر

کے سامنے ہے لیکن ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ ان حقائق کے باوجود زمانہ حاضر کے ناصبی بڑے بے شرمی سے شیعہ خیر البریہ کو ختم نبوت کا منکر قرار دینے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں حالانکہ یہ تحریک ختم نبوت میں شیعہ کے تاریخ ساز کردار سے بخوبی واقف ہیں۔ تحریک ختم نبوت یں ہر جگہ شیعہ علما پیش پیش نظر آتے ہیں۔ تحریک ختم نبوت میں پہلا نام علامہ السید علی الحائری قدس سرہ کا آتا ہے جنہوں نے مرزائیت کی ڈٹ کر مخالفت کی اور مرزا احمد قادیانی نے اپنی متعدد کتابوں میں سرکار علا' موصوف کے بارے میں انتہائی نازیبا کلمات استعمال کیا ہے۔ ضمیمہ اعجاز احمد کے ٹائٹل پر لکھا ہے کر

''۔۔مولوی علی حائری صاحب شیعہ وغیرہ بھی مخاطب ہیں جن کا نام رسالے میں مفصل درج ہے''

علامہ مرزا یوسف حسینؒ نے قادیانیوں کے مشہور مناظر ابو العطا جالندھری اور دوسرے قادیانیوں سے متعدد مناظرے کئے جن میں سے ایک مناظرہ مہت پور ضلع ہوشیار پور میں کیا او انہیں شکست فاش دی اس مناظرہ کی روئیداد ''تحریری مناظرہ مہت پور'' کے نام سے مکتبہ الفرقان ربوہ سے شائع ہو چکی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مجلس عمل تحریک ختم نبوت میں علامہ حافظ کفایہ حسینؒ نائب امیر تھے جبکہ مولانا ابو الحسنات امیر تھے ان کی وفات کے بعد مولانا عطاء اللہ شہ بخاری نے منصب امارت سنبھالا تو حافظ صاحب نائب امیر رہے اور جناب مظفر علی شمسی صاحب اور مولانا سید اظہر حسن زیدی صاحب مرکزی رکن رہے۔ علامہ حافظ کفایت حسینؒ کے سانحہ وفات کے بعد جناب مظفر علی شمسی نائب امیر منتخب ہوئے جبکہ عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد مولانا سید یوسف بنوری امیر ہوئے۔

جسٹس منیر رپورٹ میں شاہد ہے کہ اہل تشیع نے انفرادی طور پر اور اجتماعی بھی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شیعہ علماء اور زعماء نے نہایت خلوص اور مکمل یکجہتی سے جو ایمان افروز کردار کیا۔ یہ اسی کا ہی نتیجہ ہے کہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

۱۹۷۴ء میں جو قادیانیوں کے خلاف تحریک چلی اس وقت جناب مظفر علی شمسی صاحب تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے تھے مرکزی ارکان میں جناب غضنفر کراروی صاحب (جو اب بھی تحریک ختم نبوت کے تاحیات مرکزی نائب امیر ہیں) اور مو

ملک مہدی حسن صاحب وغیرہ شامل تھے۔

جب بھی کوئی خصوصی کنونشن یا ملک گیر اجلاس ہوتا علماء شیعہ صف اول کے مقررین میں نظر آتے اور قومی اسمبلی میں بھی بڑی گھن گرج کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ جب قادیانی مسئلہ قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا شیعہ نقطہ نظر سے مرزائیت کے کفر پر ناقابل تردید دلائل پیش کیے گئے تھے۔

۲ جون ۱۹۵۲ء میں تھوسوفیکل ہال کراچی میں مولانا لال حسین اختر کی طلب کردہ "آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس" ہو یا آل ڈریکٹو مسلم کنونشن کا بورڈ"، ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو مسٹر محمد ہاشم گزدر کے مکان پر ہونے والا اجلاس ہو یا ۱۳ جولائی کو برکت علی محمڈن ہال میں مذہبی جماعتوں کا کنونشن، تمام مذہبی جماعتوں کی مجلس عمل ہو یا سکولوں، کالجوں اور جیلوں میں مرزائیوں کے خلاف اور دینیات پر لیکچر دینے کے معاملہ پر گرفتاریاں، ۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو ملتان میں ہونے والے واقعے کے احتجاج ہو یا ۱۶ اگست ۱۹۵۲ء کو وزیر اعظم سے ملاقات، ۱۹ اگست کو ملتان کا جلسہ ہو یا ۲۳ اگست کو لاہور کا جلسۂ عام، ۲۸ ستمبر کو سمندری کا جلسۂ عام ہو یا ۱۶ تا ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو لاہور میں ہونے والا آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اور مجلس عمل کا انتخاب، ۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کو وزیر اعلیٰ سے ملاقات کرنے والا وفد ہو یا ۲۲ فروری کو خواجہ ناظم الدین سے ملاقات، ۲۶ فروری کو مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ ہو یا اس کے بعد ہونے والی گرفتاریاں۔ غرض یہ کہ مرزائیوں کے خلاف تحریک کے آغاز سے لے کر پارلیمنٹ میں مرزائیوں کی شکست اور انہیں کافر قرار دلوانے تک ہر مقام پر شیعہ علمائے کرام اور نمائندگان نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا اس کے متعدد ثبوت تحریک ختم نبوت کے مرکزی رہنما مولانا اللہ وسایا کی مرتب کردہ تازہ کتاب "پارلیمنٹ میں قادیانی شکست" میں موجود ہیں۔ اسی کتاب کے صفحہ ۱۵، ۱۶ پر واضح تحریر ہے کہ ۱۶ جون ۱۹۷۴ء کو مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا اجلاس ہوا جس میں جناب مظفر علی شمسی نے بطور نائب صدر شرکت فرمائی۔ رئیس الحفاظ مولانا حافظ حسین اور علامہ مفتی جعفر حسین تو پہلے ہی اس کاروان کے روح رواں تھے۔ اسی طرح دیگر مقامات پر بھی شیعہ رہنماؤں کی خدمات کا ذکر موجود ہے یوں یہ عظیم تحریک بھی شیعہ کے بغیر نامکمل نظر آتی ہے۔

اب ہم ان بے حیا ناصبی ملاؤں سے پوچھتے ہیں کہ اس وقت شیعہ علماء کو تحریک ختم نبوت میں مؤثر نمائندگی اور اہم عہدے دیئے گئے اور تمہارے بزرگ بھی ساتھ ہی تھے اس وقت تمہارے مولوی یہ جسارت نہ کر سکے اب تمہیں شیعہ کو ختم نبوت کا منکر کہتے ہوئے شرم نہیں آتی اور جب علما شیعہ مرزائیت کے خلاف دلائل پیش کر رہے تھے تو کیا کسی مرزائی نمائندہ نے یہ کہا تھا کہ حضور آپ تو خود ختم نبوت کے منکر ہیں۔ آپ کس منہ سے ہمارے خلاف بول رہے ہیں۔ ہمارا چیلنج ہے کہ تا قیامت تک پوری ناصبیت مل کر بھی اس کا جواب پیش نہیں کر سکتی۔ ہم کلمہ و اذان میں محمد رسول اللہ کے فوراً علی ولی اللہ کہہ کر ختم نبوت کا اعلان کرتے ہیں کہ اب نبوت ختم ہوئی اور ولایت کا سلسلہ شروع ہوا۔

اہل سنت کے نزدیک صحابی سے، غیر صحابی افضل ہو سکتا ہے

نا سمجھ مؤلف نے صحابہ کرامؓ کو انبیاء کے مساوی وہبی منصب عطا ہونے کا باطل نظریہ گھڑا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے بعض محقق علماء اہل سنت متعدد صحیح احادیث سے استدلال کرتے ہوئے اس امر کے قائل ہوئے ہیں کہ صحابہؓ کے بعد آنے والے صلحاءِ امت میں سے بعض افراد صحابہ سے افضل ہو سکتے ہیں۔ اس تناظر میں جن احادیث سے بعض جید علماءِ اہل سنت نے استدلال کیا ہے ان سب روایات کا تذکرہ موجب اطناب وطوالت ہوگا لہٰذا بطور استشہاد صرف چند ایک احادیث نقل کی جاتی ہیں صحابی رسولؐ حضرت ابو جمعہؓ سے مروی ہے: ﴿قال تغذینا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و معنا ابو عبیدۃ بن الجراح قال فقال یا رسول اللّٰہ ھل احد خیر منا اسلمنا معك و جاھدنا معك قال نعم قوم یکونون من بعدکم یؤمنون بی ولم یرونی﴾ ابو جمعہؓ نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھایا، ابو عبیدہ بن جراح بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ابوعبیدہ نے کہا: یا رسول اللہ ہم آپ کے ساتھ اسلام لائے ہیں آپ کی معیت میں جہاد کیا ہے (اس کے باوجود) کیا کوئی ہم سے افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، تمہارے بعد کچھ لوگ ہوں گے جو مجھ پر ایمان رکھتے ہوں گے درانحالیکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔ (مسند الامام احمد ج ۴ ص ۱۰۶ مطبع میمنیہ مصر، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۶۵، ۶۶، طبع قاہرہ) اس کے

بعد تھوڑے تغیر الفاظ کے ساتھ حضرت ابو جمعہ ﷺ سے مروی ہے کہ ایک راوی ابومحیریز نے ابو جمعہؓ سے کہا کہ آپ صحابی رسولؐ ہیں ہمیں کوئی حدیث سنائیں جو آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو؟ ابو جمعہؓ نے کہا: ہاں، میں تمہیں ایک جید حدیث سناتا ہوں۔۔۔الخ اس کے بعد وہی الفاظ ہیں جو اوپر گزر گئے ہیں۔ یہ حدیث اپنے مطلب و مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ بعد میں آنے والی امت کے مخصوص افراد ان صحابہؓ سے بھی افضل ہوں گے۔

چنانچہ ابن حجر مکی اس امر کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿واعلم انه وقع الخلاف فی التفضیل بین الصحابة و من جاء بعدهم من صالحی هذه الامة فذهب ابو عمر بن عبد البر الی انه یوجد فیمن یاتی بعد الصحابة من هو افضل من بعض الصحابة و احتج علی ذلك بخبر طوبی لمن رانی و آمن بی مرة و طوبی لمن لم یرنی و آمن بی سبع مرات و بخبر.. . قال ابو عمر: فهذه الاحادیث تقتضی مع تواتر طرقها و حسنها التسویة بین اول هذه الامة و آخرها فی فضل العمل الا اهل بدر و الحدیبیة قال: و خبر خیر الناس قرنی لیس علی عمومه، لانه جمع المنافقین و اهل الکبائر الذین قام علیهم و علی بعضهم الحدود انتهی﴾

"جان لو کہ صحابہؓ اور ان کے بعد آنے والے امت کے صالحین کے مابین تفضیل کے مسئلہ پر اختلاف واقع ہوا ہے۔ چنانچہ ابوعمر بن عبدالبر اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ صحابہؓ کے بعد آنے والے لوگوں میں سے بعض افراد ایسے ہو سکتے ہیں جو بعض صحابہؓ سے افضل ہوں۔ اس رائے کی تائید میں انہوں نے بہت سی احادیث سے احتجاج کیا ہے۔ ایک یہ ہے: اس شخص کے لیے ایک بھلائی ہے جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا ایک بھلائی، اور جس شخص نے مجھے دیکھا نہیں مگر مجھ پر ایمان لایا اس کے لیے سات مرتبہ بھلائی (خوشی) ہے۔ اسی طرح کی دیگر احادیث،۔۔۔۔ ابن عبد البر نے کہا ہے کہ: یہ احادیث اپنے طرق کے تواتر اور حسن کی بناء پر اس امر کا فیصلہ کرتی ہیں کہ اس امت کا پہلا حصہ اور آخری یعنی بعد والا حصہ عمل کی فضیلت کے لحاظ سے برابر ہے۔ اہل بدر اور اہل حدیبیہ اس سے مستثنٰی ہیں۔ ابن عبد البر کہتے ہیں یہ حدیث کہ

میرے زمانے کے لوگ بہترین ہیں (خیر الناس قرنی) اپنے عموم پر نہیں ہے اس لیے کہ زمانے میں منافقین اور وہ کبیرہ گناہوں کے مرتکب بھی تھے جن میں سے بعض پر حدود بھی قائم ہ ہیں۔" (الصواعق المحر قہ، ص ۲۱۲، مطبوعہ قاہرہ)

ملاں صاحب حماقت کا پردہ اپنی عقل سے ہٹا کر غور فرمالیں جن لوگوں کو تم وہبی منصب فائز قرار دے رہے ہو ان میں منافقین اور کبیرہ گناہوں کے مرتکب بھی تھے اور جو واقعی صالح ـ بعد میں آنے والے صالحین امت بھی ان کے مساوی بلکہ ان سے افضل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح پوری امت ہی اللہ کی جانب سے وہبی و عطائی منصب پر فائز ہے۔ جو منصب نبوت کے ہم ; ہے۔ افسوس! ان ملاؤں نے حماقت کی آخری حدود کو بھی پھلانگ لیا ہے باوجود اس کے عالم د: ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے میں مصروف ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی انہی احادیث مذکورہ کی بناء پر لکھتے ہیں: ﴿بدانکہ ظاہ این حدیث و بعضی احادیث دیگر کہ درین باب بیاید دلالت دارد بر آنک تواند کہ بعد از صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کسے بیاید کہ مساوی باش ایشان را در فضل یا افضل باشد از ایشان و ابن عبد البرکہ از مشاہیر علمای حدیث است باین جانب رفتہ و تمسک باین احادیث نمودہ است﴾

"جان لو کہ اس حدیث اور اس باب میں آنے والی بعض دیگر احادیث کا ظاہر اس امر ; دلالت کرتا ہے کہ صحابہؓ کے بعد کوئی شخص ایسا آ سکتا ہے جو فضیلت میں انکے مساوی ہو یا ان سے افضل ہو۔ ابن عبد البر جو مشاہیر علمائے حدیث (محدثین) میں سے ہے، اسی جانب گئے ہیں او ان احادیث سے تمسک کیا ہے۔" (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۱۷۱ کتاب الفتن باب ثواب ھذہ الامہ)

اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ جہالت کا جو منصب مولوی اعظم طارق صاحب اور ان کے ہمنواؤں کو ملا ہے، یہ بھی اللہ کی طرف سے وہبی اور عطائی ہے۔ ان سے یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ امت کے جو لوگ وہبی و عطائی منصب صحابیت پر فائز لوگوں سے بھی افضل ہو سکتے ہیں۔ انہیں تو بعض انبیاءؑ کے ہم مرتبہ اور شاید فضلنا بعضھم علی بعض کے مصداق، بعض انبیاء سے افضل

ہونا چاہیئے۔ اس لیے کہ نبوت اور صحابیت کے درمیان میں کوئی تیسرا منصب تو ابھی احمق ملاؤں نے دریافت نہیں کیا۔ یا ابن عبد البر اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی پر فتویٰ حماقت صادر کر دیں۔ شیخ عبد الحق دہلوی یہ تو فرماتے ہیں کہ ان احادیث کا ظاہر مفہوم یہی ہے کہ غیر صحابی صحابی سے افضل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان احادیث کی بناء پر اس نظریے کا قائل ہو تو کسی احمق کو اسے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بلکہ مؤلف کے ممدوح بزرگ سید احمد بریلوی اور ان کے عقیدتمند شاگرد محمد اسماعیل دہلوی اس نظریئے کے قائل ہیں جیسا کہ لکھتے ہیں: ''اگر چہ صحابی ہونے کے لحاظ سے باقی امت مصطفویہ (علیٰ امامہا الصلوٰۃ والسلام) کی بہ نسبت صحابۂ کبار میں سے ہر ایک کے لیے فضیلت ثابت ہے لیکن ہدایت کے پھیلانے اور دین متین کے رواج دینے اور عند اللہ قرب کے مرتبوں پر کامیاب ہونے میں امت کے بعض بزرگوں کو بعض صحابہ پر بے شک افضلیت ثابت ہے۔۔۔''

(صراطِ مستقیم، ص ۶۸، مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند)

منصبِ امامت کا رتبہ نبوت سے بالاتر ہے

مؤلف نے زیرِ عنوان ''عقیدۂ شیعہ امامت نبوت سے بالاتر ہے'' کے ذیل میں اس طرح گوہر افشانی کی ہے کہ:

''اگر کوئی گروہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایک شخص کو صرف نبی یا رسول مانے حتیٰ کہ ظلی، مجازی اور بروزی نبی ہونے کا دعویٰ کرنے والے کی نبوت پر ایمان رکھے وہ بلاشبہ ختم نبوت کا منکر اور کافر ہوگا تو جو گروہ یہ عقیدہ و نظریہ رکھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جس سلسلۂ امامت کا آغاز ہوا اور بارہ امام پیدا ہوئے اس امامت کا درجہ نبوت کے درجہ سے بھی بلند ہے تو پھر کیا ایسے گروہ کو ختم نبوۃ کا منکر نہیں کہا جائے گا؟ یقیناً آپ کا جواب ہوگا کہ ایسا گروہ اس گروہ سے کئی گناہ بڑا کافر اور مرتد ہوگا جو گروہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے کمزور سے درجہ کے جاری رہنے کا عقیدہ رکھتا ہے۔ اب ذرا سینہ پر ہاتھ رکھ کر شیعہ کے اس دعویٰ کو سماعت فرمائیں کہ ان کے نزدیک امامت کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ شیعہ مذہب کے نامور مجتہد اور سینکڑوں کتابوں کے مصنف ملاں باقر مجلسی (جس کا تعارف خود ایرانی انقلاب کے راہنما شیعہ کے فقیہ ولی العصر

آیت اللہ خمینی نے اپنی کتاب کشف الاسرار میں خوب مبالغہ کے ساتھ کرایا ہے) لکھتے ہیں
''امامت بالاتر از رتبہ پیغمبری است'' امامت کا رتبہ نبوت سے بالا ہے۔'' (حیات القلوب، ص ،
ج ۳)'' (خطبات جیل، ص ۶۶، ۶۷)

<u>الجواب</u>: نبی اور رسول وہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے مبعوث کرتے ہیں۔ رسل وانبیاء علیہم السلام کے باہمی مراتب میں تفاوت پایا جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔

اسی طرح بعض انبیاء رسالت ونبوت کے ساتھ ساتھ امامت کے منصب پر بھی فائز تھے۔ مثلاً ہارون علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نبی تھے اور امامت کا منصب بھی انہی کے پاس تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزند شاہ عبد القادر اپنے حاشیہ موضح القرآن میں سورۂ اعراف کی ایک آیت کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

''حضرت ہارون اور ان کی اولاد حضرت موسیٰ کی امت میں امام تھے لیکن
جب ان کی جائے خلیفہ ہوئے تو امت حکم میں نہ رہی۔۔۔''

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایک ہی شخص نبی اور امام ہو سکتا ہے یعنی دونوں منصب ایک ہی شخص کو عطا ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی پتہ چل گیا کہ امامت ونبوت دو الگ الگ منصب ہیں۔ ضروری نہیں کہ جسے نبوت ملے وہ امام بھی ہو اور جسے امامت ملے وہ نبی بھی ہو۔

ان دو مناصب میں سے کون سا منصب (عہدہ) افضل ہے؟ اس کا فیصلہ عقل سے نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ یہ دونوں منصب اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہبی اور عطائی ہیں (صحابیت کے مرتبہ کو وہبی اور عطائی کہنے والے اس پر اعتراض کرنے سے پہلے سوچ لیں اگر عقل رکھتے ہیں تو) ہارون علیہ السلام کا مرتبۂ نبوت افضل تھا یا مرتبۂ امامت، اس کا فیصلہ عقل سے کام لے کر نہیں ہو سکتا۔

ابراہیم علیہ السلام پہلے اللہ کے اولو العزم نبی تھے۔ اس مرتبہ نبوت کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے امور میں آزمایا۔ چنانچہ ارشاد باریٰ تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۴)

جب ابراہیمؑ کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا، وہ ان آزمائشوں میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہیں لوگوں کا امام بناتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا اور میری اولاد میں سے بھی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔'' (سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۴)

جن باتوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا تھا اور وہ اس آزمائش میں پورے اترے تھے وہ یہ تھیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آتے ہی اس کی خاطر اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے جانا، اللہ تعالیٰ کی خاطر نمرود سے مناظرہ کرنا، آگ میں ڈالے جانے پر پوری طرح صابر رہنا، حکم آنے پر اپنے وطن سے ہجرت کر جانا، حکم ملتے ہی اپنے بیٹے جناب اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کیلئے لے جانا، تفصیل کیلئے: تفسیر ابن کثیر، صفوۃ التفاسیر صابونی وغیرہ کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس آیت شریفہ سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ امامت نبوت کے مرتبہ سے بالاتر ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نبوت کے عہدہ پر تو اس امتحان سے قبل ہی سرفراز تھے۔ اب ان سخت امتحانات میں سے گزار کر کوئی اعلیٰ عہدہ تفویض کیا گیا ہے۔ یہ امر تو پہلے ہی واضح ہو چکا ہے کہ امامت، نبوت سے الگ ایک منصب ہے۔ اگرچہ ان کی نوعیت اور فرائض منصبی تقریباً یکساں ہیں۔ تاہم کچھ تفاوت بھی پایا جاتا ہے جو غیر معمولی اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ علماءِ اہل سنت نے اس مرتبۂ امامت کو نہ سمجھتے ہوئے عام بادشاہوں کے لیے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں علامہ شوکانی لکھتے ہیں: ﴿وقد علمنا انه قد نال عهده من الامامة و غيرها كثيراً من الظالمين﴾ ''ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ امامت وغیرھا کے منصب پر بہت سے ظالم بھی فائز ہوئے ہیں۔''

حالانکہ اللہ تعالیٰ یہ اعلان فرما چکے ہیں کہ لا ينال عهدى الظالمين تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہدہ الٰہی وہبی اور عطائی ہے جو کسی کو کسب سے نہیں مل سکتا۔ ورنہ جن ظالموں نے اس منصب کے ظاہری اختیارات پر غاصبانہ قبضہ کیا انہیں بھی امام تسلیم کیا جائے۔

ظالم کو عہدۂ امامت تفویض نہیں ہوسکتا

امام ابو بکر جصاص رازی حنفی جو ایک مشہور مفسر قرآن ہیں، اپنی تفسیر احکام القرآن مے
اسی آیت ''لا ینال عهدی الظالمین'' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

﴿ان الظالم لا یکون اماما فلا یجوز ان یکون الظالم نبیّا و لا خلیفة لنبی و ا
قاضی﴾

''یہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ظالم ہرگز امام نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔ پس یہ جائز نہیہ
ہے کہ ظالم شخص نبی ہو یا نبی کا خلیفہ اور یا قاضی ہو'' (احکام القرآن، ج ا،ص ۶۹، طبع بیروت)

ارباب دانش کے نزدیک یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ظلم ایک ناپسندیدہ اور انتہائی مذموم و ف
صفت ہے اور ظالم ہر کسی کے نزدیک قابل نفرت ہے۔ قرآن حکیم میں ظلم کرنے والے کی شد
مذمت کی گئی ہے۔

نائب نبی یعنی امام تو ہر صفات کمال کا حامل اور ہر قسم کے رجس و نقائص سے مبرا ہوتا۔
لہٰذا امام ایسی صفت رذیلہ کا مرتکب ہرگز نہیں ہوسکتا۔

آمدن برسر مطلب:

پس معلوم ہوا کہ یہ ایک وہبی صفت ہے جس پر کوئی زبردستی قبضہ نہیں جما سکتا۔ یہ اللہ تعا
کی طرف سے عطا کردہ ''عہد'' ہے اسی لیے فرمایا ہے: ''لا ینال عهدی الظالمین'' میرا یہ عہ
کسی ظالم کو عطا نہیں ہوتا۔

یہ امر کہیں پر بھی مصرح نہیں ہے کہ جو نبی ہوگا وہی امام ہوگا۔ یہ امر واضح ہے کہ بعض
امام نہیں ہوتے۔ جیسے موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے بارے میں ذکر ہو چکا ہے۔ اسی طرح ضرور
نہیں ہے کہ امام کے پاس نبوت کا منصب بھی ہو۔ بالخصوص جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے تو اب صرف امامت جاری ہے اور یہ سلسلہ امامت و وصایت پہلے
امتوں میں موجود رہا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مذکور ہو چکا ہے ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام
امت میں امام اور وصی تھے۔ حدیث منزلت انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا

نبی بعدی اسی امر پر دلالت کرتی ہے۔

اگر شیعہ مسلمانوں نے مرتبۂ امامت کو نبوت سے بالاتر قرار دیا ہے تو ان کے پاس قرآنی نص سے مضبوط دلیل ہے۔ لہٰذا صحابیت کے مرتبہ کو وہبی اور عطائی کہہ کر نبوت کے برابر قرار دینے والوں کو اس صحیح عقیدہ پر اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔

علامہ محمد باقر مجلسیؒ کی محولہ بالا عبارت کے متعلق عرض یہ ہے کہ انہوں نے حیات القلوب ج ۳ ص ۱۰ پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل صحیح اور بجا ہے کیونکہ۔

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

البتہ مؤلف اور اس کے مرشد یوسف لدھیانوی نے علامہ محمد باقر مجلسیؒ کی عبارت نقل کرنے میں انتہائی دجل و فریب سے کام لیا ہے اصل عبارت یوں ہے: ”گاهے بر پیغمبر نیز اطلاق امام می نمایند و از بعضے اخبار معتبره معلوم می شود که مرتبه امامت بالا تر مرتبه پیغمبری است چنانچه حق تعالیٰ بعد از نبوت بحضرت ابراهیم خطاب فرموده که انی جاعلك للناس اماما “۔

اس عبارت میں علامہ مجلسیؒ نے قرآنی دلیل سے امامت کے منصب کو نبوت کے منصب سے بالاتر قرار دیا ہے لیکن امامت کو نیابت کے معنی میں نہیں لیا۔ تاہم اگر نیابت کے معنی میں ہی لے کر امامت کو بالاتر کیا جائے تو اس میں کوئی قدغن نہیں ہے۔ اور شیخ عبد الرزاق القاشانی اپنے عظیم استاد شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کی کتاب ”فصول الحکم“ کی شرح میں لکھتے ہیں۔

”(والولاية لا تنقطع ابداً) فهو باعتبار ولايته اشرف منه باعتبار رسالته و نبوته التشريعية فخاتم الرسالة من حيث الحقيقة هو خاتم الولاية ومن حيث كونه خاتماً للولاية معدن هذا العالم و علوم جميع الاولياء و الانبياء وهو مقامه المحمود الذى يبعثه فيه۔“

”ولایت کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ولایت کے اعتبار سے اپنی رسالت اور تشریعی نبوت سے افضل ہیں۔ حقیقی طور پر خاتم الرسالت خاتم الولایت ہی

ہے۔ پس خاتم ولایت ہونے کے لحاظ سے آپؑ اس علم اور تمام اولیاء و انبیاء کے علوم کے معدن ہیں۔ یہی وہ مقام محمود ہے جس پر اللہ تعالیٰ انہیں مبعوث فرمائے گا۔"

(شرح القاشانی علی فصوص الحکم، ص ۴۲، مطبوعہ مصر)

یہاں شیخ اکبر ابن العربی نے جس ولایت کو نبوت و رسالت سے افضل قرار دیا ہے اسے ہی دوسرے لفظوں میں امامت کہا جاتا ہے۔ چونکہ اہل سنت کے محقق صوفیاء بہت بعد میں غور و فکر کے بعد اس امر کو سمجھے ہیں اور یہ بھی صرف محقق صوفیاء اور ان کے اتباع تک ہی محدود رہا ہے۔ سطح بین ملاں اس حقیقت سے قطعاً نابلد ہی رہے ہیں لیکن اسی امر کو ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے بار بار اور متعدد صاحب ولایت و امامت قرار دیا ہے اور ولایت مترادف امامت قرار دی گئی ہے یعنی آپ کی ولایت کی معرفت کو ہی ایمان کی ضروریات میں سے شمار کیا ہے جو دوسرے لفظوں میں امامت ہے۔ لہٰذا شیعہ اثنا عشریہ کو کسی متصوف کی تشریحات و تحقیقات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے صوفیانہ اصطلاحات اور پیچیدگیوں کے بغیر ہی سادہ عام فہم انداز میں ولایت و امامت کے مرتبے کو بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ جب اہل سنت کے لیے اس کا کچھ کچھ مفہوم ظاہر ہو گیا تو انہوں نے بھی کہہ دیا کہ امام بمعنی ولی ہے۔ یعنی امامت و ولایت مترادف ہیں۔ مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب لکھتے ہیں کہ "اور ہم سب اہل سنت ائمہ اثنا عشر کو امام اور مقتدائے دین و قطب ارشاد عقیدہ رکھتے ہیں۔" (ہدایۃ الشیعہ، ص ۳۵، طبع قدیم دہلی)

شاہ عبدالعزیز دہلوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"و زمان حضرت امیرؑ ابتدای دورۂ ولایت شد و لہٰذا شیوخ طریقت و ارباب معرفت و حقیقت آنجناب را فاتح باب ولایت محمدیہ و خاتم ولایت مطلقہ انبیاء نوشتہ اند۔"

"حضرت امیرؑ کا زمانہ ولایت کا جاری ہونے کی ابتداء کا وقت تھا۔ اسی لیے شیوخ طریقت اور ارباب معرفت و حقیقت نے حضرت علی علیہ السلام کو ولایت محمدیہ کا دروازہ کھولنے والا اور انبیاء کی ولایت مطلقہ کا خاتم لکھا ہے۔" (تحفہ اثنا عشریہ، ص ۳۳۹، طبع لکھنؤ)

چونکہ ولایت محمدیہ تمام انبیاء کی ولایت اور نبوت سے افضل تھی۔ اور اس ولایتِ محمدیہ کے فاتح یعنی جاری کرنے والے مولا علیؑ ہیں۔ دیگر انبیاء کی ولایت بھی ان کی نبوت سے افضل تھی۔ اور ان کی ولایت کے خاتم بھی مولا علیؑ ہیں۔ جس طرح خاتم الانبیاء تمام نبیوں سے افضل ہیں اسی طرح خاتم الاولیاء بھی تمام اولیاء سے افضل اور ان کی ولایت مرتبہ میں ان سے اعلیٰ ہے۔ یہ امر بھی ظاہر ہو چکا ہے کہ نبوت سے ولایت افضل ہے۔ تو اب کوئی امر مانع نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کو گذشتہ تمام انبیاء سے بجز سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افضل قرار دیا جائے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام اور نبی تھے لیکن اس ولایت و امامت کا اظہار مولا علی علیہ السلام کے ذریعے سے ہوا۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا: ﴿انا مدینة العلم و علی بابها﴾ ''میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔''

نبی کی نبوت افضل ہوتی ہے یا اس کی ولایت؟

چونکہ انبیاء علیہم السلام اعلان نبوت سے قبل بھی مرتبہ ولایت پر فائز ہوتے ہیں۔ اسی نقطہ کو پیش نظر رکھ کر اہل سنت کے محققین متکلمین علماء نے یہ بحث کی ہے کہ آیا نبی کی نبوت افضل ہوتی ہے یا اس کی ولایت۔ چنانچہ اس امر میں اختلاف نقل کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالعزیز پرہاروی لکھتے ہیں۔

نعم قد یقع تردد فی ان مرتبة النبوة افضل ام مرتبة الولایة بعد القطع بان النبی متصف بالمرتبین۔

ہاں اس امر میں تردد پیدا ہوتا ہے کہ مرتبہ نبوت افضل ہے یا مرتبہ ولایت، جبکہ یہ امر طے ہو چکا ہے کہ نبی دونوں مرتبوں سے متصف ہوتے ہیں۔''

(النبراس شرح شرح العقائد، ص ۵۶۱، طبع میرٹھ)

بعض محقق علماء اس امر کے قائل ہوئے ہیں کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے۔ فقیل الولایة افضل بوجوه۔ کہا گیا ہے کہ ولایت کئی دلائل کی بناء پر افضل ہے۔''

شرح نبراس کے محشی ملا محمد برخوردار ملتانی لکھتے ہیں کہ۔

اس کے قائلین میں سے ایک قابل ذکر شخصیت محی الدین ابن عربی کی ہے۔ انہوں نے

فتوحات مکہ میں اس بارے میں دلائل پیش کئے ہیں۔ شعرانی نے الیواقت والجواہر میں فتوحات سے اس بحث کو نقل کیا ہے۔

محقق علماءِ اہل سنت کے طے شدہ اصول کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا برخوردار ملتانی لکھتے ہیں:

قال بحر العلوم و اما قبل النبوة فالتحقيق وعليه اهل الله من الصوفية الكرام انهم معصومون ايضاً من الكبائر و الصغائر عمداً كيف لا وهم انما يولدون على الولاية

بحرالعلوم نے کہا ہے کہ نبوت سے قبل، چنانچہ تحقیق یہی ہے اور اسی کو صوفیاء کرام اہل اللہ نے اختیار کیا ہے کہ وہ (انبیاءؑ) کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کا عمداً ارتکاب کرنے سے معصوم ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہوں، حالانکہ اُن کی ولادت ہی ولایت پر ہوتی ہے۔ (پیدائشی ولی ہوتے ہیں)۔"

(النبراس حاشیہ ملا برخوردار ملتانی ص ۴۵۳ حاشیہ نمبر ۴)

چنانچہ یہ امر اہل سنت کے محققین علماء کے نزدیک طے شدہ ہے کہ ہر ولی مرتبہ ولایت تک ائمہ اہل بیت بالخصوص حضرت علی علیہ السلام کی روح مبارک کے وسیلے سے پہنچتا ہے۔ اس قاعدہ کلیہ سے کوئی ولی مستثنیٰ نہیں ہے خواہ وہ اسی مرتبہ پر رہا ہو یا بعد میں نبی مبعوث ہوا ہو۔ لہٰذا یہ امر بھی از خود اور فی البدیہ پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے واسطے سے جو لوگ ولایت حاصل کرتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام اُن سے لازماً افضل ہوں گے۔ اگر شیعہ نے دیگر انبیاء علیہم السلام سے علی علیہ السلام اور ائمہ اہل بیتؑ کی ولایت و امامت کو افضل قرار دیا ہے تو یہ عقیدہ بے دلیل اور غیر معقول نہیں ہے اہل سنت بھی اس عقیدے کی بنیادیں مضبوط کرنے میں ان کے مؤید ہیں۔ بالخصوص جبکہ نبی کی نبوت سے اُن کی ولایت کو افضل قرار دینے کا نظریہ بھی اہل سنت کے محقق صوفیاء نے اختیار کر رکھا ہے۔ اس بابت معروف مفسر بیہقی زمان قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی سورہ آل عمران کی آیت ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کی تفسیر میں مرتبہ امامت و ولایت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وکان قطب ارشاد کمالات الولایة علی علیہ السلام ما بلغ احد من الامم السابقة درجة الاولیاء الا بتوسط روحه رضی اللّٰه عنه ثم کان بتلك المنصب الائمة الکرام ابناو وه الی الحسن العسکری

علی علیہ السلام کمالات ولایت کے قطب ارشاد ہیں گذشتہ امتوں میں سے کوئی بھی درجہ اولیاء تک ان کی روح پرفتوح کے توسط کے بغیر نہیں پہنچا۔ پھر آپ کی اولاد میں سے ائمہ اطہار امام حسن عسکری علیہ السلام تک اس منصب پر فائز ہیں۔۔۔۔۔'' (تفسیر مظہری، ج ۲ ص ۱۲۰ طبع دہلی)

اگر انبیاء علیہم السلام کی ولایت نہ ہوتی تو نبوت بھی نہ ہوتی۔ اسی ولایت کو اہل سنت کے محقق علماء وصوفیاء نے نبوت سے افضل و اعلیٰ قرار دیا ہے اور یہی مرتبہ ان انبیاء علیہم السلام کو حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد میں سے ائمہ اطہارؑ کی وساطت سے عطا ہوا ہے۔ اگر اس نظریہ کو کفر قرار دے کر فتویٰ صادر کرنا ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس فتویٰ کی زد میں اکثر علماء وصوفیاء اہل سنت بھی آتے ہیں اور وہ بھی اہل تشیع سے پہلے۔ شیعہ خیر البریہ تو اس فتویٰ کی مار اور زد سے باہر ہی رہیں گے۔ خدا را عقل و علم کے دائرے میں رہتے ہوئے بات کیا کریں۔

ائمہ اہل بیتؑ بعد از پیغمبرؐ ساری مخلوق سے افضل ہیں

مؤلف ایک عنوان ''عقیدہ شیعہ، ائمہ تمام انبیاء علیہم السلام، ملائکہ اور ساری مخلوق سے افضل ہیں'' قائم کر کے لکھتے ہیں۔

''شیعہ کے نامور مجتہد ملاں باقر مجلسی اپنی کتاب بحار الانوار میں ''عقائد الصدوق'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ یہ عقیدہ لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہیں کی۔ آگے چل کر ملاں باقر مجلسی تاکید وتائید (یعنی تشریح مزید) کے تحت لکھتے ہیں۔ (بحذف عربی) ترجمہ: معلوم ہو کہ شیخ صدوق نے ذکر کیا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ صلوات اللہ علیہم تمام مخلوقات پر فضیلت رکھتے ہیں ائمہ علیہم السلام تمام انبیاء سے افضل ہیں یہ ایسا عقیدہ ہے کہ اذعان و یقین کے ساتھ اخبار کا تتبع کرنے والا کوئی بھی شخص اس میں شک و شبہ کا شکار نہیں ہو سکتا۔۔۔'' (خطبات جیل، ص ۶۸، ۶۹)

الجواب۔ اگر ائمہ اثناعشر ﷺ کو ساری مخلوق سے افضل قرار دیا جائے اس پر تو کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ ائمہ اہل بیتؑ تو ان اشراف میں سے بھی اللہ کے منتخب بندے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

﴿المؤمن اکرم علی اللّٰہ من بعض الملائکۃ﴾

''مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بعض فرشتوں سے افضل ہے۔''

چنانچہ ملا علی القاری حنفی اس حدیث شریف کی شرح میں لکھتے ہیں:

''قال الطیبی تفصیلہ ان عوام البشر خیر من عوام الملائکۃ و خواص البشر خیر عن عوام الملائکۃ و خواصھم و خواص الملائکۃ من عوام البشر و علی التقدیرین یصح ان بعض المؤمنین اکرم اللّٰہ من بعض الملائکۃ''

''طیبی نے کہا ہے کہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عام انسان عام فرشتوں سے افضل ہیں اور خواص انسان عام فرشتوں اور خاص فرشتوں سے افضل ہیں۔ اسی طرح خاص فرشتے عام انسانوں سے افضل ہیں۔'' (مرقاۃ حاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۰۱۵ حاشیہ نمبر ۵ طبع دہلی)

لہٰذا تفضیل جنس البشر علی جنس الملائکۃ پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ یہ امر تو کسی جاہل احمق پر بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ خواص بشر میں سے ہیں لہٰذا ان کی خواص ملائکہ سے افضلیت مسلمہ ہے چہ جائیکہ عام فرشتے۔

جہاں تک انبیاء ﷺ سے ائمہ اہل بیتؑ کی افضلیت کا تعلق ہے تو یہ امر بھی اہل دانش سے مخفی نہیں ہونا چاہیے کہ جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء اور سید الانبیاء ہیں۔ اسی طرح آپؐ کے بعد جاری ہونے والا سلسلہ امامت و وصایت بھی آخری اور افضل ہے جس طرح سید الانبیاء والرسل کی لائی ہوئی شریعت دائمی اور عالمگیر ہے۔ اسی طرح آپ کے بعد ائمہؑ کی امامت بھی تا قیامت باقی رہنے والی اور عالمگیر ہے جبکہ پہلے انبیاءؑ کی نبوت قومی، علاقائی اور ایک زمانے تک محدود ہوتی تھی۔ اسی طرح ان کے مابین جاری ہونے والا سلسلہ امامت و

وصایت بھی مندرجہ بالا قیود میں مقید ہوتا تھا۔ جس طرح خاص قوم، علاقے اور وقت کیلئے مبعوث ہونے والے نبی کی نبوت سے خاتم الانبیاء کی نبوت افضل ہے۔ اسی طرح قومی اور علاقائی نیز ایک خاص وقت کے ساتھ مقید امامت سے عالمی و آفاقی اور دائمی امامت بھی افضل ہوگی۔ جس طرح ابراہیم علیہ السلام نبوت کے بعد منصب امامت پر بھی فائز ہوگئے تھے۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت کے ساتھ ساتھ مرتبہ امامت پر بھی فائز تھے۔ چونکہ آپؐ پر نبوت کے منصب کو ختم کر دیا گیا لیکن امامت کا عہدہ قیامت تک کے لیے جاری رکھا گیا ہے۔ منصب امامت کے اختیارات اور اس منصب کی حقیقت گذشتہ صفات میں بقدر کفایت بیان کر دی گئی ہے۔ چونکہ امام کو شریعت کی تشریح کرنا ہوتی ہے۔ نئی شریعت کا نزول ختم ہو چکا ہوتا ہے لہٰذا امام پر وحی جلی نبی کی طرح نہیں آتی مگر وحی خفی کا نزول یقیناً ہوتا ہے۔ دیگر تکوینی امور میں امام کے اختیارات وتصرفات بے شمار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ان امور کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے لہٰذا تفصیل کے خواہش مند حضرات وہاں مراجعت کر سکتے ہیں۔

مؤلف بعد ازاں صفحہ ۷۰ پر درج بالا عنوان قائم کرنے کے بعد لکھتا ہے۔

سابقہ انبیاءؑ کو نبوت علیؑ کی ولایت کا اقرار کرنے سے ملی

''شیعیان پاکستان کے حجۃ الاسلام علامہ حسین بخش جاڑا اپنی کتاب المجالس الفاخرہ فی اذکار العترۃ الطاہرہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان نقل کرتے ہیں: ﴿**لم یبعث نبی قط الابولایۃ علی بن ابی طالب**﴾ ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کوئی نبی نبی نہیں بن سکا جب تک اس نے ولایت علی کا اقرار نہیں کیا۔۔۔'' (خطبات جیل ص ۷۰، ۷۱)

الجواب:۔ مؤلف کو یہ امر بھی عجیب نظر آتا ہے حالانکہ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ آخر کرۂ ارض پر عادلانہ اسلامی حکومت کے قیام کا الٰہی وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاءؑ سے کیا تھا اور اس وعدہ کی تکمیل کے لیے انبیاءؑ سے مصائب برداشت کرنے اور مشکلات پر استقامت دکھانے کا عہد لیا تھا۔ جو امام مہدی علیہ السلام کے ذریعے ہی پورا ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

اگر مزید تسلی مطلب ہو تو ملا نظام الدین حسن نیشاپوری کی تفسیر سے ایک روایت پیش

خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

وعن ابن مسعود ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اتانی ملك فقال یا محمد سل من ارسلنا من قبلك من رسلنا علام بعثوا قال قلت علام بعثوا؟ قال علی ولایتك و ولایة علی بن ابی طالب رضی اللّٰہ عنہ،

''ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس فرشتہ آیا اور کہا: اے محمد آپؐ سے پہلے بھیجے گئے رسولوں سے پوچھیں کہ وہ کس بات پر مبعوث ہوئے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے کہا: وہ کس بات پر مبعوث ہوئے؟ تو فرشتے نے کہا: آپ کی اور علی رضی اللہ عنہ کی ولایت پر مبعوث ہوئے ہیں۔''

(تفسیر غرائب القرآن بھامش تفسیر طبری جز ۲۵ تفسیر سورۃ زخرف ص ٦٧)

ملا نظام الدین اس روایت کو درج کر کے اس کی تضعیف کے درپے نہیں ہوئے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ چنانچہ اس صحیح حدیث سے استدلال کر کے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جس شخص کی ولایت کے اقرار اور تائید کی بناء پر انبیاءؑ مبعوث ہوئے وہ شخص ان انبیاءؑ سے افضل ہی ہوگا۔ چنانچہ اس شخص کی علمی اور جسمی خدمات اور مقامات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات تک کسی نبی رسول کی رسائی نہیں ہوسکی۔

اگر ملاں اعتراض کریں کہ یہ روایت ضعیف یا من گھڑت ہے تو ان کی اپنی حماقت ہے۔ اس روایت کو درست مان کر اس کے مطابق عقیدہ بنانے سے کسی مسلمان کو زبردستی روکا نہیں جا سکتا۔ جبکہ ملا نظام الدین کی طرح کے بے شمار علماء اہل سنت اس روایت اور اس قبیل کی بہت سی دیگر روایات کو درست قرار دیتے ہیں۔

ائمہ اہل بیتؑ پر ایمان فرض اور انکار کفر ہے

ملا اعظم طارق نے خطبات جیل کے صفحہ ۷۵ پر ایک عنوان اس عبارت کا بنایا ہے کہ ''شیعہ عقیدہ، ائمہ پر انبیاءؑ کی طرح ایمان لانا فرض ہے اور ان کا انکار کفر ہے۔'' بعد ازاں صفحہ ۷۷ پر اسی نوع کا دوسرا عنوان دیا ہے کہ ''امامت کا عقیدہ نہ رکھنے والا کافر و جہنمی ہے'' اس

کے بعد صفحہ ۷۸ پر اسی کا ایک ذیلی عنوان ہے کہ "منکرین امامت اہل بدعت واجب القتل ہیں۔"

(خطبات جیل، صفحات ۷۵، ۷۷، ۷۸)

الجواب:۔ ملاں کے ان تمام عنوانات کا جواب ایک ہی حدیث میں موجود ہے۔ مولوی عبدالعزیز فرہاروی نے نبراس میں امامت کی بحث کے ذیل میں لکھا ہے:

"انہ یجب ... لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام من مات ولم یعرف امام زمانہ سواء کان فی زمانہ امام ولم یعرفہ او لم یکن فی زمانہ امام اصلاً فقد مات میتۃ جاھلیۃ.... والحدیث فی صحیح مسلم عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من مات بغیر امام مات میتۃ جاھلیۃ وفی روایۃ المسلم ایضاً مرفوعاً من مات و لیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ،

یہ کہ نصب امام واجب ہے۔۔۔۔ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان کی بناء پر جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اس نے اپنے زمانے کے امام کو پہچانا نہ ہو۔۔۔ خواہ اس کے زمانے میں امام موجود ہو اور اس نے اسے نہ پہچانا یا اس کے زمانے میں کوئی امام ہی نہ ہو (بہرحال) اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ حدیث صحیح مسلم میں ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص بغیر امام مرگیا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ مسلم کی روایت میں ہی مرفوعاً ہے کہ جو شخص اس حال میں کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(النبراس شرح شرح العقائد، ص۵۱۲)

ظاہر ہے کہ جاہلیت کی موت اور اسلام کی موت دو متضاد حالتیں ہیں۔ جاہلیت کی موت سے مراد یقیناً کفر کی موت ہے۔ اب یہ امر باقی ہے کہ کون سے امام کی معرفت اور بیعت ضروری ہے؟ معاویہ، یزید اور دیگر اموی عباسی حکمرانوں کی معرفت اور بیعت، اور ان کی بیعت ہی اسلام پر موت کی ضامن ہرگز نہیں ہو سکتی جن کی اپنی موت کفر یا نفاق یا ظلم پر ہوئی ہو، لہٰذا ان کی بیعت اسلامی موت کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ حدیث اپنے مفہوم کے لحاظ سے ابدی ہے تب موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو جاہلیت کی موت سے بچنے کے لیے کس امام کی بیعت ضروری ہے؟ کون

سے ملک کا صدر یا وزیر اعظم اس لحاظ سے نمونہ ہے کہ اس کی بیعت و اطاعت سے اسلام پر موت نصیب ہو۔ احمق اگر عقل کے ناخن لے کر سوچ بچار کر لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ ہر زمانے میں موجود امام ائمہ اثنا عشر، اہل بیتؑ میں سے ہیں۔ اب امام زمانہ امام مہدی علیہ السلام ہیں جن کی معرفت کے بعد موت اسلامی ہوگی۔ ورنہ جاہلیت اور کفر کی موت مریں گے۔ مُلا نفرت پھیلانے کے لیے یہ کہہ رہا ہے کہ امام کی معرفت کے بغیر مرنے والا کفر کی موت مرے گا، جہنمی ہے وغیرہ۔ حالانکہ یہ صرف شیعہ کا ہی عقیدہ نہیں ہے کہ بلکہ اہل سنت کی روایات بھی اس عقیدے کی تائید کر رہی ہیں۔ علماءِ اہل سنت بھی اس سلسلے میں شیعہ کے ہمنوا ہیں۔ فرق صرف امام کی پہچان میں ہے۔ بعض لوگوں نے معاویہ اور یزید کو اپنا امام بنا لیا ہے تاکہ وہ انہیں جاہلیت کی موت مرنے سے بچائیں۔ اسی طرح دیگر اموی اور عباسی بادشاہوں کو جنت میں لے جانے کا ضامن بنایا کسی نے اپنے زمانے کے ظالم و جابر حکمرانوں کو اپنا امام تسلیم کر لیا تاکہ ان کی قیادت میں سیدھے "احمقوں کی جنت" میں پہنچ جائیں۔ لیکن شیعہ نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نامزد اہل بیتؑ میں سے بارہ اشخاص کو اپنا امام و ہادی پہچانا۔ موجودہ زمانے میں امام حضرت مہدی علیہ السلام ہیں لیکن بعض اہل سنت کا مہدی ابھی پیدا ہونا ہے۔ بعد ازاں مؤلف کے امام حکمران وقت اسے سنی حکمرانوں اور ان کے درباری مُلوانے مل کر منتخب کریں گے۔ تب اس کی پیروی کر کے تاخیر سے جنت کی طرف سفر شروع کریں گے۔ جبکہ وقت گزر چکا ہوگا۔

آئمہؑ پر نزول وحی اور فرشتوں سے ملاقات

نادان مؤلف نے ایک عنوان "شیعہ کا عقیدہ ائمہ سے فرشتے ملاقات کرتے ہیں اور ان پر وحی نازل ہوتی ہے" کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

"یہ بات مسلمانوں کے عقیدہ کی بنیاد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جس طرح کوئی نبی نہیں آئے گا اس طرح اب جبرئیل امین یا کوئی اور فرشتہ کسی شخص پر نازل ہو کر وحی بھی نہیں لائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بھی بند ہو گیا ہے اور آسمان سے وحی کا دروازہ بھی بند ہو گیا ہے چونکہ وحی الٰہی کا مقصد ہی تعلیم دین تھا تو اب دین مکمل ہو چکا ہے

اللہ کی آخری کتاب نازل ہو چکی ہے لہٰذا اب نہ تو دین میں ترمیم ہوگی اور نہ ہی کوئی نیا دین نازل ہوگا لیکن عبد اللہ بن سبا نے چونکہ دین اسلام کے خلاف ایک نیا دین رائج کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا اس لیے اس نے شیعہ مذہب کی بنیاد میں یہ نظریہ رکھ دیا کہ بارہ اماموں پر وحی نازل ہوتی ہے اور ان سے فرشتے ملاقات کرتے ہیں چنانچہ ابن سبا کی فکر کو بعد میں آنے والے اس کے پیروکاروں نے خوب بنا سنوار کر شیعہ مذہب میں شامل کر دیا۔" (خطبات جیل، ص ۸۱)

الجواب:۔ ارباب دانش پر یہ امر پوشیدہ نہیں کہ نبی اور امام دونوں پر فرشتے نازل ہوتے ہیں لیکن نبی و رسول ان کو حاسہ بصر سے اور امام حاسہ بصیرت سے ادراک کرتے ہیں چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ تو یہاں تک فرما چکے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ﴾

تحقیق جنہوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر اسی پر قائم رہے ان پر اترتے ہیں فرشتے کہ تم مت ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور خوشخبری سنو اس بہشت کی جس کا تم سے وعدہ تھا۔ ہم ہیں تمہارے رفیق دنیا میں اور آخرت میں۔۔۔۔" (سورۃ حم السجدہ، آیت ۳۰، ۳۱)

اس آیت مبارکہ میں "الذین" سے غیر نبی ہی مراد ہیں تو اس قرآنی نص سے ثابت ہے کہ غیر نبی پر نزول ملائکہ ہوا کرتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی رقم طراز ہیں کہ:

"(تنبیہ):۔ بہت ممکن ہے کہ متقین و ابرار پر اس دنیوی زندگی میں بھی ایک قسم کا نزول فرشتوں کا ہوتا ہو جو اللہ کے حکم سے انکے دینی و دنیوی امور میں بہتری کی باتین الہام کرتے ہوں۔۔۔۔۔ بہرحال بعض مفسرین کے نزدیک یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں اور اس تقدیر پر اگلی آیت ﴿نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ زیادہ چسپاں ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔"

اس سے متصل بعد فائدہ نمبر ۴ کے ضمن میں علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی مزید لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔۔۔۔اور اکثر کے نزدیک یہ بھی فرشتوں کا مقولہ ہے۔ گویا فرشتے یہ قول ان کے دلوں میں الہام کرتے ہیں اور ان کی ہمت بندھاتے ہیں۔ ممکن ہے اس زندگی میں بعض بندوں سے مشافہۃ بھی اتنے الفاظ کہتے ہوں اور ممکن ہے موت کے قریب یا اس کے بعد کہا جاتا ہو۔ اس وقت ﴿نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم دنیا میں بھی تمہارے رفیق رہے ہیں کہ اللہ کے حکم سے باطنی طور پر تمہاری اعانت کرتے تھے۔۔۔۔۔''

(تفسیر عثمانی، ص۶۲۲، طبع بجنور)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے قرآن کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے ایک حقیقت تسلیم کر کے بیان کی ہے۔ عام متقین و ابرار پر بھی فرشتے نازل ہو کر دینی و دنیوی امور میں ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں تو تمام مخلوقات کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نامزد ائمہ پر اگر فرشتے نازل ہو کر ان کو الہام کریں تو اس میں اہل حق کو الزام کیونکر دیا جا سکتا ہے؟ یہ تو محض حماقت اور عداوت ہے۔ جس میں ذرہ برابر بھی معقولیت نہیں ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کے مطابق فرشتے عام مؤمنین اصحاب استقامت پر الہام کرتے ہیں۔ اگر ائمہ اہل بیتؑ کی یہی بات مان لی جائے اس لیے کہ وہ تمام مؤمنین کے امام ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ علامہ عثمانی کے مطابق فرشتے ایسے لوگوں سے بالمشافہ بھی ملاقات کرتے ہیں اور زندگی میں باطنی طور پر ان کی مدد اور تائید کرتے ہیں۔ اگر یہی بات ائمہ اہل بیتؑ نے فرمادی ہے کہ روح القدس، جو فرشتوں میں سے ہی ایک بزرگ اور طاقتور فرشتہ ہے، ہمارے ساتھ رہ کر باطنی طور پر ہماری مدد اور تائید دینی امور میں کرتا ہے، تو کون سی عجیب و غریب بات ہو گئی ہے؟

اگر ملاں ذرا تفحص و تتبع کر کے الہام اور وحی میں قطعی فرق اور حد فاصل بیان کر دیتے تو مسئلہ خود حل ہو جاتا اور اچھی طرح باور کر لیتے کہ یہ صرف اصطلاحات ہیں۔ ان کا معنی و مفہوم ایک ہی ہے۔

اس کی کچھ مزید تشریح شاہ اسماعیل دہلوی نے کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''حاصل کلام اس راستے کے امام اور اس گروہ کے بزرگ ان فرشتوں کے زمرے میں

شمار کئے ہوئے ہیں جن کو ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے تدبیر امور کے بارے میں الہام ہوتا ہے اور وہ اس کے جاری کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ پس ان بزرگوں کے حالات کو بزرگ فرشتوں کے احوال پر قیاس کرنا چاہئے۔" (صراطِ مستقیم، ص ۳۸، طبع دیوبند)

ایک دوسرے مقام پر مزید وضاحت سے لکھتے ہیں کہ:

افادہ اول برای انکشاف حالات سموات و ملاقات ارواح و ملائکہ و سیر جنت و نار و اطلاع بر حقائق آن مقام و دریافت آمکنہ آنجا و انکشاف امری از لوح محفوظ ذکر یا حی یا قیوم است،

"پہلا افادہ: آسمانوں کے حالات کے انکشاف اور ملاقات ارواح اور ملائکہ اور بہشت و دوزخ کی سیر اور اس مقام کے حقائق پر اطلاع اور اس جگہ کے مکانوں کے دریافت اور لوح محفوظ سے کسی امر کے انکشاف کے لیے یا حی یا قیوم کا ذکر کیا جاتا ہے۔۔۔"

(صراطِ مستقیم ص ۱۲۸ ہدایت ثانیہ)

اور اسی طرح امام غزالی اس سلسلہ میں بالصراحت لکھتے ہیں:

ومن اول الطریقۃ تبتدی المکاشفات و المشاہدات حتیٰ انہم فی یقظتہم یشاہدون الملائکۃ و ارواح الانبیاء و یسمعون منہم اصواتاً و یقتبسون منہم فوائد۔

"اس راہ کے سالکین کو مکاشفات و مشاہدات کی نعمت ابتدا ہی میں حاصل ہوجاتی ہے یہاں تک کہ وہ بیداری کی حالت میں نبیوں کی ارواح اور فرشتوں کا مشاہدہ کرتے، ان کی آوازیں سنتے اور ان سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔"

(المنقذ من الضلال ص ۳۳ باب طرق الصوفیہ طبع استنبول)

شاہ اسماعیل دہلوی اپنی ایک دوسری معرکتہ الآراء تالیف "عبقات" جو علم فلسفہ اور حکمت الٰہیہ کے موضوع پر نہایت بلند پایہ اور گرانقدر تصنیف ہے میں اس امر کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

"ولما کان التفہیم من اعلیٰ اقسامہا فلا بعد ان یسمی بالوحی الباطن۔

اور یہ تفہیم چونکہ اس حکمت کی سب سے اعلیٰ قسم ہے لہٰذا اگر اسے باطنی وحی کا نام دیا

جائے تو یہ کوئی بعید امر نہیں ہے۔" (عبقات، عبقہ الاشارہ الاجمالیہ الیٰ مراتب کمال النفس)

اگر ان مولویوں کو اس طرح کے احمقانہ فتوے جاری کرنے کا شوق دامن گیر ہے تو پہلے اہل سنت کے معتبر و مستند علماء و صوفیانہ کے خلاف فتویٰ کفر جاری کریں۔

" الهاماً يسمى و حيا خفيا كما يحصل لبعض ارباب المكاشفة و اصحاب الفراسة كما يشير اليه قوله تعالىٰ ان فى ذلك لايات للمتوسمين اى المتفرسين و قوله عليه الصلوٰة والسلام اتقوا فراسة المؤمنين و قوله فى امتى محدثون اى ملهمون"

"۔۔۔۔۔الہام جسے وحی خفی کہا جاتا ہے، جیسا کہ بعض مکاشفین اور اصحاب فراست کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان۔ بے شک اس میں عقل والوں یعنی فراست والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ: مؤمن کی فراست سے بچو۔ آپ کا یہ فرمان کہ میری امت میں محدث ہیں یعنی ملہم (جن پر الہام ہوتا ہے) ہیں۔"

(شرح شفاء از ملا علی قاری، ج ا ص ۴۰۱، ایضاً، ج ۲ ص ۵۱۹ طبع قسطنطنیہ)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے الہام کے وحی باطنی ہونے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿**قد كان فى امم محدثون فثبت بهذا ان الالهام حق و انه وحى باطن و انما حرمه العاصى لاستيلاء وحى الشيطان عليه**﴾ سابقہ امتوں میں بھی محدث ہوئے ہیں اس سے الہام کا وحی باطنی اور حق ہونا ثابت ہوا اور بدکاروں کو اس سے محروم رکھا گیا ہے کیونکہ ان پر وحی شیطانی کا غلبہ ہوتا ہے۔ (فتح الباری ج ۱۲، ص ۳۱۵ طبع بیروت)

دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا انور شاہ محدث کشمیری ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"ان يكلمه الله الا وحيًا" والمراد منه عندى الاعلام بخفية وهو النوع ول و يدخل فيه الالهام و المنام،

آیت مبارکہ (کہ "اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے، مگر وحی کے ذریعے سے" میرے نزدیک اس سے مراد خفیہ (باطنی) طور پر اطلاع دینا ہے۔ یہ (وحی کی) پہلی نوع ہے۔ اسی میں

الہام اور خواب (میں اطلاع دینا) شامل ہے۔"

(فیض الباری باب کیف کان بدء الوحی ج ا ص ۱۵ طبع ڈابھیل)

اس سے بھی بڑھ کر مولانا الشاہ اسماعیل الدہلوی صاف صاف لکھ چکے ہیں کہ بعض غیر انبیاء پر انبیاء کی وساطت کے بغیر وحی باطنی آتی ہے جس میں احکام تشریعی اترتے ہیں وہ ایک جہت سے انبیاء کے پیرو اور ایک جہت سے خود محقق ہوتے ہیں وہ شاگرد انبیاء بھی ہیں اور انبیاء کے ہم استاد بھی، وہ انبیاء کی مثل معصوم ہیں یہ لوگ دیگر تمام آدمیوں سے انبیاء کی خلافت کے زیادہ حقدار ہوتے ہیں اگرچہ ظاہری تسلط ان کو نصیب نہ ہو اور اگرچہ جہلاء ان کی خلافت و امامت کو نہ مانیں۔

(ملاحظہ ہو: صراط مستقیم، طبع کتب خانہ رحیمیہ دیوبند ص ۳۸ سطر ۸، ۹ و ص ۴۱ سطر ۱۳ تا ۱۷ و ص ۴۳ سطر ۱۴ تا ۱۸)

<u>تقریب استدلال</u>۔ اہل سنت کے مستند علماء نے اسی الہام کو وحی خفی یا باطنی وحی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اگر یہ امت کے عام مکاشفین کے لیے جائز ہے تو ائمہ اہل بیتؑ کے لیے اس کا اثبات کیونکر جائز نہیں جبکہ تمام اولیاء و مکاشفین ائمہ اہل بیتؑ سے کسب فیض کرتے ہیں اور اس راہ میں ان کے تلمیذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ تو عام سالکین نے راہِ طریقت کے بارے میں لکھا ہے جو امام ایسے سالکین کی آخری مدارج پر تربیت کے ذمہ دار اور قطب الاقطاب کے منصب پر فائز ہوں اور یہ سارا روحانی سلسلہ ہی ان کے زیر انتظام ہو۔ ان کے مقامات اور تصرفات کا اندازہ لگانا تو مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس امر کی یاد دہانی کے لیے گذشتہ اوراق میں مجدد الف ثانی کے ایک بیان کی طرف رجوع کر کے تسلی کی جاسکتی ہے۔

مؤلف کا احمقانہ استدلال

نادان مؤلف نے بحار الانوار کے حوالے سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں امامؑ نے اپنے علوم اور ان کے ذریعہ حصول کی خبر دی ہے۔ اس حدیث کے آخری حصہ سے انہوں نے احمقانہ استدلال کیا ہے۔ وہ الفاظ حدیث درج ذیل ہیں:

"واما النكت فی القلوب فالهام، واما النقر فی الاسماع فانه من الملك"

دل میں القاء سے مراد الہام ہے۔ کانوں میں ڈالنے سے مراد ہے فرشتہ (جو ہمارے کانوں میں ڈالتا ہے)"۔ (خطباتِ جیل، ص ۸۳)۔

حدیث کے ان الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے مؤلف لکھتا ہے: "۔۔۔ خاص طور پر فرشتہ کی طرف سے کان میں ڈالا جانے والا علم کہ جس کی آمد کا نام ہی وحی ہے کیا اب بھی کسی شیعہ کا وحی کے ختم ہو جانے پر ایمان ہو سکتا ہے۔۔۔"

<u>الجواب</u>۔ سمجھ بوجھ رکھنے والے ناظرین و قارئین گذشتہ سطور میں دیئے گئے علماء اہل سنت کے حوالہ جات کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ محققین علماء وصوفیاء اہل سنت نے الہام کو وحی خفی یا باطنی وحی کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ انور شاہ محدث کشمیری نے الہام کو وحی کی پہلی اور ابتدائی نوع قرار دیا ہے۔ یعنی الہام اور وحی میں قدر مشترک موجود ہے۔ ان کا باہمی فرق انتہائی دقیق ہے جو سطحی ملاؤں کی ظاہر بین نگاہ سے اوجھل رہتا ہے۔

مزید برآں ص ۸۴ میں بحار الانوار سے ایک اور روایت اپنے موقف کی تائید میں پیش کرکے یہ بتانا چاہتا ہے کہ امام جو الہام ہوتا ہے اس میں شیطان کی مداخلت ممنوع ہے۔ امام کے پاس شیطان نہیں آسکتا۔ ملاں کا خیال ہے کہ اس طرح ائمہؑ کا الہام وحی جلی ثابت کر دوں گا اور شیعوں پر ختم نبوت کے انکار کا الزام پختہ ہو جائے گا۔ یہ بھی ملاں کی حماقت پر مبنی خوش فہمی یا کم فہمی ہے۔ اس امر کا دعویٰ صرف ائمہ اہل بیت اطہارؑ ہی نے نہیں کیا بلکہ محققین علماء وصوفیاء اہل سنت نے اس راہ کے ہر امام کے لئے یہ مقام اور وصف ثابت کیا ہے۔ چنانچہ شاہ اسماعیل دہلوی رقمطراز ہیں:

"فهو وجيه معصوم صاحب ذوق حكيم ثم ان مما يقتضى تربية الله اياه ان يلقى عليه علومًا نافعة في قيامه بمنصبه فهذ الالقاء يسمى تفهيمًا و ان مما يقتضى تيقظ روحه و عصمته الا يختلط بعلومه شي مغائر لما تلقاه من الغيب و لذالك كانت الحكمة كلها حقا لا ياتيه الباطل و ان الحق يدور معه حيث دار و ذلك لعصمته و

التحاقه بالملاء الاعلی فلیس الحقّ الا ما سطع من صدره فالحق تابع له لا متبوع"

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ایک معروف اور جلیل القدر صحابی رسولؐ ہیں۔ یہ بزرگ خود تحدیثِ نعمت کے طور پر بتایا کرتے تھے کہ ملائکہ ان کو سلام کرتے ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم ج ا ص ۴۰۳ پر عمران بن حصینؓ سے مروی متعۃ الحج کے باب میں روایت سے ثابت ہے۔

ابن حجر عسقلانی اور ابن عبدالبر نے عمران بن حصینؓ کے تذکرے میں واضح الفاظ میں لکھا ہے: ﴿قال ابو عمر کان من فضلاء الصحابة و فقهاء هم یقول عنه اهل البصرة انه کان یری الحفظة و کانت تکلمه حتی اکتوی .. الخ﴾ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ نضلاء اور فقہاء صحابہ میں سے تھے، اہل بصرہ ان سے متعلق کہتے تھے کہ یہ محافظ فرشتوں (کراماً کاتبین) کو دیکھا کرتے اور ان سے کلام کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ جب انہوں نے داغ لگوایا (ابن زیاد کے حکم سے) تو فرشتوں نے ان پر سلام کرنا ترک کر دیا، لیکن جب داغ کا اثر زائل ہوگیا تو پھر سلام کرنے لگے۔" (الاصابہ مع الاستیعاب، ج ۳، ص ۲۶، ۲۷)

جب ایک عام صحابی سے فرشتوں کا سلام وکلام کرنا ثابت ہے تو ائمہ اہل بیت ﷺ سے اگر ملائکہ کا ہم کلام ہونا ثابت ہوتو کون سا کفر لازم آئے گا، لیکن جن لوگوں نے اہل بیتؑ سے بغض کو اپنا دین قرار دیا ہے، وہ اہل بیتؑ کی اس فضیلت کو برداشت نہیں کر سکتے۔

چنانچہ یہ ہستی صاحب وجاہت معصوم صاحب ذوق اور صاحبِ حکمت ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی تربیت کے پیش نظر اس پر وہ علوم عطا فرماتے ہیں جو اس کے منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں اس کے لیے نافع ہوتے ہیں۔ اس القاء کو تفہیم بھی کہتے ہیں۔ پھر اس کی عصمت اور اس کی روح کی بیداری کا ایک تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ غیب سے پایا ہے اس میں اس (حق) کے سوا کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حکمت تمام تر حق ہے اس میں باطل نہیں آسکتا۔ جہاں یہ ہستی گھومتی ہے حق بھی اس کے ساتھ گھومتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہستی ملاء اعلیٰ کے ساتھ شامل اور معصوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حق وہی قرار پاتا ہے جو اس کے سینے سے نمودار ہوتا ہے۔ پس حق اس ہستی کے تابع ہوتا ہے وہ ہستی حق کے تابع نہیں ہوتی۔

(عبقات، عبقہ نمبر ۱۱ مطبوعہ مجلس علمی کراچی)

جب یہ امر طے ہوگیا کہ ایسی ہستیاں معصوم اور مجسم حق ہوتی ہیں اور ان کی طرف کیا گیا الہام و القاء ہر طرح کے باطل کی آمیزش سے قطعاً پاک ہوتا ہے تو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے جو وضاحت کی ہے کہ امامؑ کے پاس شیطان نہیں آسکتا نہ اس کی طرف الہام میں اسے کوئی دخل اندازی کا راستہ ہے۔ اس پر نادان ملاں کس طرح اعتراض کرسکتا ہے؟ اگر اسے وحی جلی قرار دے کر ختم نبوت کے منافی قرار دیتا ہے تو پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی اور اس کے پوتے اسماعیل دہلوی پر یہ فتویٰ صادر کریں، اسی طرح تمام محققین صوفیاء و علماء اہل سنت کو ختم نبوت کا منکر قرار دے دیں جن میں شبیر احمد عثمانی بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد اگر سکت باقی ہوئی تو شیعوں کی طرف رخ کر لینا۔ اگر حق کی تلاش ہوگی تو بالآخر حق ائمہ اثنا عشرؑ اور ان کے حقیقی پیروکاروں کے پاس ملے گا، نہیں تو اس دنیا سے بے ایمان ہی مرد گے۔

ائمہ اہل بیتؑ کو تحلیل و تحریم کے اختیار کا مسئلہ

ملاں نے ایک عنوان ''شیعہ کا عقیدہ ائمہؑ کو تحلیل و تحریم کا اختیار حاصل ہے'' کے تحت اپنی ذہانت اور بصیرت کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کی تکمیل ہو چکی ہے اس کے احکام اوامر اور منہیات نا قابل تنسیخ و ترمیم ہیں۔۔۔۔۔شیعہ کی نہایت ہی مستند و معتبر کتاب اصول کافی میں محمد بن یعقوب کلینی اس روایت کو درج کرتے ہیں جو شیعہ کے امام (محمد بن علی تقی) سے ان کے ''شاگرد خاص'' محمد بن منان نے ایک اشکال کے جواب کی صورت میں بیان کی ہے۔ اشکال تھا کہ شیعہ کے درمیان (جبکہ ابھی وہ ویسے بھی گنتی ہی کے چند لوگ تھے اور ان کا ابتدائی دور تھا) حلال و حرام کے بارہ میں سخت اختلاف پیدا ہوگئے تھے۔ اب ان اختلافات کو دیکھ کر جب محمد بن منان جیسے مخلص شیعہ کا دل دکھا تو اس نے امام صاحب سے آکر اس اختلاف کا سبب دریافت کیا آپ نے فرمایا: (بحذف عربی اصول کافی ص ۸۷، اشاعت جدید ص ۴۴۱) اے محمد اللہ تعالیٰ ازل سے اپنی وحدانیت کے ساتھ منفرد رہا پھر اس نے محمد، علی و فاطمہ کو پیدا کیا پھر یہ لوگ ہزاروں قرن

ٹھہرے رہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام چیزوں کو پیدا کیا پھر ان مخلوقات کی تخلیق پر ان کو شاہد بنایا اور ان کی اطاعت اور فرمانبرداری ان تمام مخلوقات پر فرض کی اور ان کی تمام معاملات ان کے سپرد کیے تو یہ حضرات جس چیز کو چاہتے ہیں حلال کر دیتے ہیں جس چیز کو چاہتے ہیں حرام کر دیتے ہیں اور یہ نہیں چاہتے مگر وہ جو اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتا ہے۔"

(ملخص از خطبات جیل ص ۸۵ تا ص ۸۷)

الجواب۔ یہ عنوان بھی دیگر عناوین کی مانند جہالت، حماقت اور خیانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض دھوکہ دہی کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ شارع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ پیغمبر اور ائمہ اہل بیتؑ اس شریعت کے مبلغ، مفسر اور شارح ہیں۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلسل رہنمائی جاری رہتی ہے۔

ملاں نے اصول کافی کی ایک روایت نقل کی ہے جس کے آخری الفاظ بھی انہوں نے نقل کر دیئے ہیں۔ اپنی ناسمجھی اور نادانی سے وہ ان الفاظ کو چھپا نہیں سکا۔ لیکن ان کے مفہوم کی طرف اپنی کم فہمی کی وجہ سے متوجہ نہیں ہوا اور نہ اس کے کوتاہ بین مرشد لدھیانوی کو یہ الفاظ سمجھ میں آئے ہیں روایت کے وہ الفاظ یہ ہیں:

"..... **فهم يحلون ما يشاؤن و يحرمون يا يشاؤن لن يشاؤن الا ان يشاء الله تبارك و تعالىٰ**"

"وہ (آئمہؑ) جو چاہتے ہیں حلال کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں حرام کرتے ہیں لیکن وہ ہرگز نہیں چاہتے مگر وہی کچھ جو اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتا ہے۔" (خطبات جیل، ص ۸۷)

ناسمجھ ناقل یہ نہیں دیکھ سکا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی ان کی مرضی ہے۔ اللہ کی مشیت ہی ان کی مشیت ہے۔ ائمہ اہل بیتؑ تمہارے ملوک بنو امیہ کی طرح اپنی خواہشات نفسانیہ سے حلال وحرام اور جائز و ناجائز کے فتاویٰ و فرامین صادر نہیں کرتے تھے۔ پھر اس قسم کی تفویض پر اعتراض کی کیا گنجائش ہے کہ جب ان کی مشیت ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے اور اللہ کی مشیت انہیں ہر لمحہ معلوم ہوتی رہتی ہے۔ اب تو شریعت کے اصول و فروع واضح ہو چکے تھے۔ وحی جلی بند

ہو چکی تھی۔ اس لیے کسی کے بارے میں نیک نیتی سے بھی غلط فیصلے اور تشریح کی گنجائش نہ تھی نہ ہے۔ اس لیے ان کی مسلسل ہدایت و رہنمائی کا بندوبست کیا گیا۔ شریعت اسلامی کی تفسیر و تشریح اور تعبیر انہی سے حاصل ہو سکتی ہے جو راسخون فی العلم کے مصداق ہوں جن کی نشاندہی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت اصول کافی کے متعلقہ باب میں اس امر کی مزید وضاحت کرتی ہے۔ ضروری حصے کی عبارت پیش خدمت ہے:

"ان اللّٰه عزوجل ادب نبیه فاحسن ادبه فلما اکمل له الادب قال انك لعلی خلق عظیم ثم فوض الیه امر الدین والامة لیسوس عبادة فقال عزوجل ما اتاکم الرسول فخذوه وما نهاکم عنه فانتهوا وان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله کان مسددا موفقا مویدا بروح القدس لا یزل ولا یخطی فی شئ مما یسوس به الخلق فتادب باداب اللّٰه۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی بہترین طریقے سے تربیت کی۔ جب تربیت کامل ہوگئی تو فرمایا: **انك لعلی خلق عظیم** پھر دین اور امت کا معاملہ آپؐ کے سپرد کیا تاکہ اللہ کے بندوں کا انتظام سنبھال لیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا**﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہنمائی و موافقت اور تائید روح القدس کے ذریعے کی جاتی تھی۔ جن امور میں اللہ کی مخلوق کی رہنمائی اور انتظام کرتے تھے ان میں کسی طرح کی لغزش اور خطا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے آداب یعنی احکام پوری طرح سیکھ لئے تھے (اور ان پر عملدرآمد کرتے تھے)۔

(اصول کافی، ص ۱۶۳، باب التفویض الی رسول اللہ والی الائمہ، مطبوعہ لکھنؤ)

یہی اختیارات حلت و حرمت اہل سنت نے اپنے ائمہ مجتہدین کو تفویض کر رکھے ہیں جن لوگوں نے اختلافات سے اسلام کا چہرہ مسخ کر دیا۔ باقی امور شریعت کو چھوڑ کر اگر ملاں صرف نماز ہی دیکھ لیں کہ کس قدر اختلاف شافعی، حنفی اور دیگر مجتہدین میں پائے جاتے ہیں تو منہ دکھانے کے

قابل نہ رہیں۔ غزنوی سلطان کے دربار میں شافعی اور حنفی نماز کے مناظرے کا واقعہ دینی مدارس کے طالب علموں سے مخفی نہیں ہے۔ کس طرح شعائرِ اسلام کو مضحکہ خیز بنایا گیا۔ لیکن ع

غیر کی آنکھوں کا تنکا تجھ کو آتا ہے نظر
دیکھ اپنی آنکھ کا غافل ذرا شہتیر بھی

اسلام کش ملاں نے شیعیانِ علیؑ پر ناحق الزام لگانے کی سعی لا حاصل کی ہے جو ان کی روایتی کوتاہ اندیشی اور تنگ نظری کی دلیل ہے حالانکہ شیعہ مسلک میں کہیں بھی حلت و حرمت کا اختلاف نہیں ہے۔ نہ عبادت میں نہ باقی امور شریعت میں۔ نہ اس بنیاد پر آپس میں کوئی نزاع ہے۔ یہ سب کچھ ناصبی ملوکیت کے اجتہاد کا نتیجہ ہے کہ جس کی بنیاد پر پوری امت آپس میں دست بگریبان ہے۔

ائمہ اہل بیتؑ کو معجزات حاصل ہیں

ملاں اپنے ہفوات جیل میں ایک عنوان قائم کرتے ہیں کہ ''شیعہ کا عقیدہ: ائمہ کو معجزات حاصل ہیں'' بعد ازاں یوں گویا ہوتے ہیں کہ:

''یہ بات ہر مسلمان بخوبی جانتا ہے کہ معجزہ نبی اور رسولؐ کی نبوت و رسالت کی وہ دلیل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اور مخالفین و معاندین مشرکین و کفار کی عقلوں کو دنگ کر کے رکھ دیتا ہے جو بات کسی نبی کے ذریعہ مافوق الفطرت ظاہر ہو وہ معجزہ کہلاتی ہے اور جو کسی غیر نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں وہ کرامت کہلاتی ہے اب جس طرح انبیاءؑ کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس طرح معجزات کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ شیعہ کی سب سے زیادہ معتبر کتاب اصول کافی میں تو مستقل ایک باب موجود ہے ''باب ما عند الائمۃ من آیات الانبیآءؑ'' (یعنی انبیاء، سابقین کے ان معجزات کا بیان جو ائمہ کے پاس تھے) اس باب کے تحت امام باقرؑ کی ایک روایت ہے کہ حضرت امیر المومنین علیؑ ایک رات عشاء کے بعد باہر نکلے اور یہ فرما رہے تھے: ﴿خرج علیکم الامام علیه قمیص آدم و فی یده خاتم سلیمان و عصا موسیٰ﴾ (اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ، ص۱۴۲) یعنی امام تمہارے سامنے نکل کر آیا ہے اور اس

کے جسم پر آدم علیہ السلام کی قمیص ہے ہاتھ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہے۔۔۔۔۔۔" (خطبات جیل، ص ۸۹، ۹۰)

الجواب:۔ معجزہ اس خارق عادت امر یا واقعہ کو کہا جاتا ہے جس کو عام عادی حالت میں کوئی شخص انجام دینے سے عاجز و قاصر ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے اختیار سے اس امر کا اظہار اپنے خاص نمائندے اور بندے کے ذریعے اس لیے کرتا ہے تاکہ اس کے سچا اور برحق ہونے کی دلیل بن سکے۔

اہل سنت نے لفظ معجزہ کو مندرجہ بالا مفہوم کی تعبیر کیلئے استعمال کیا ہے اور اسے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص قرار دیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں اس لفظ کے ذریعہ خارق عادت الٰہی افعال کو کہیں بھی تعبیر نہیں کیا گیا اور نہ ہی اسے فقط انبیاءؑ کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کو اگر کسی دوسرے الٰہی نمائندے کیلئے استعمال کیا جائے تو اس کو ختم نبوت کے منافی قرار دینا صریح حماقت اور جہالت ہے۔ اس لیے کہ اس اصطلاح کا انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہونا کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ اہل سنت متکلمین نے معجزہ اور کرامت کی جو تعریف پیش کی ہے وہ درج ذیل ہے:

"..... معجزة وهي امر يظهر بخلاف العادة... على يد مدعي النبوة الولي و كرامته ظهور امر خارق للعادة من قبله"

معجزہ وہ امر ہے جو مدعی نبوت کے ہاتھ پر خلاف عادت ظاہر ہوتا ہے۔ ولی اور اس کی کرامت اسکے ہاتھ سے خارق عادت امر کا ظہور ہے۔" (نبراس شرح شرح العقائد ص ۴۳۰، ۴۷۵)

یعنی امر خارق عادت ہی ہے، نبیؑ کے ہاتھ سے ظاہر ہو تو اسے معجزہ کہہ دیا ہے اور کسی ولی کے ذریعے ظاہر ہو تو کرامت کہہ دیا ہے حالانکہ ایک ہی حقیقت امر کے لیے اپنے پاس سے سراسر بے دلیل اصطلاحات علیحدہ علیحدہ قرار دے کر اس کی بناء پر دوسروں پر کفر کے فتوے لگا پرلے درجے کی ضلالت ہے۔ نیز یہ کہنا کہ جو کوئی غیر نبیؑ سے معجزہ منسوب کرے وہ ختم نبوت کا منکر ہے سراسر جہالت اور بے علمی کی دلیل ہے جب اصل حقیقت ایک ہی ہے تو صرف لفظی

اختلاف کی بنیاد پر اس طرح کے گھناؤنے نتائج اخذ کر کے احمقانہ فتاویٰ صادر کرنا محض نادانی کا مظہر ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں اس طرح کے خارق عادات امور کے لیے خواہ نبیؐ سے ظاہر ہوئے ہوں یا ولی سے "آیات"، "بینات" اور "سلطان مبین" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اگر ملاں نے کبھی قرآن کریم کی تلاوت کی ہوتو اسے معلوم ہوگا لیکن قرآن اور اہل بیت مقرون ہیں۔ عترت رسول کو چھوڑ کر قرآن کہاں سے سمجھ میں آئے؟ ملا علی قاری اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

والآیات ای خوارق العادات المسماة بالمعجزات والکرامات للاولیاء۔ ان المعجزة امر خارق للعادة کاحیاء میت... والکرامة خارق للعادة"

آیات یعنی خوارق عادات، جنہیں معجزات کہا جاتا ہے اور اولیاء کے لیے کرامات کہا جاتا ہے... معجزہ امر خارق عادت ہوتا ہے جیسے مردہ کو زندہ کرنا... کرامت خارق عادت امر ہے..." (شرح فقہ اکبر، ص ۹۵، مطبوعہ کانپور)

معجزہ اور کرامت کی ایک ہی تعریف اور حقیقت ہے جسے ملاؤں نے بغیر کسی دلیل کے الگ الگ اصطلاح سے ظاہر کیا ہے۔ حالانکہ قرآن میں دونوں کو آیات ہی کہا گیا ہے۔

ملا علی قاری حنفی نے صراحت کر دی ہے کہ ایک ہی امر خارق نبی کے لیے معجزہ اور ولی کے لیے کرامت ہوتا ہے جس میں سب سے اول مثال کے طور پر مردوں کو زندہ کرنا بتایا ہے۔ پھر مزید وضاحت کرتے ہیں:

ثم ظاهر کلام الامام الاعظم فی هذا المقام موافق لما علیه جمهور علماء الاعلام من ان کل ما جاز ان یکون معجزة لنبی جاز ان یکون کرامة لولی۔

پھر امام اعظم کا کلام اس مقام میں جمہور علماءِ اعلام کے موقف سے مطابقت رکھتا ہے کہ جو امر کسی نبی کے لیے معجزہ بن سکتا ہے، جائز ہے کہ وہی امر ولی کے لیے کرامت ہو۔"

(شرح فقہ اکبر ص ۹۶)

نادان ملاں کس طرح کہہ سکتا ہے کہ شیعہ ائمہ اہل بیت ؑ کے لیے معجزات ثابت کرتے ہیں لہٰذا وہ ختم نبوت کے منکر ہیں۔ یہ امور خوارق عادات چند ایک ہوں یا جمیع انبیاءؑ کے

مجموعی طور پر، اس سے ختم نبوت پر کوئی زد نہیں پڑتی بلکہ تمام انبیاءؑ کی نبوت پختہ تر ثابت ہو
ہے اس لیے کہ ائمہؑ تمام انبیاءؑ کے علوم کے وارث ہیں اور ان کے مقصد کو آگے بڑھا
والے ہیں۔

قرآن کریم نے انبیاء کے علاوہ اولیاء کو عطا کئے گئے خوارق عادات امور کو بھی آیا
کے لفظ سے ہی تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا﴾

''اور سنا دے ان کو حال اس شخص کا جس کو ہم نے دی تھیں اپنی آیتیں پھر وہ
ان کو چھوڑ نکلا۔'' (سورۂ اعراف، آیت ۱۷۵)

مفسرین کے نزدیک آیات سے مراد اسم اعظم کا علم ہے جس کے ذریعہ وہ خارق عاد
امور انجام دیتا تھا۔ پس یہ بات قطعاً ثابت ہوگئی کہ قرآن کریم نے نبی اور ولی کے ہاتھ سے ظا
ہونے والے خارق عادت علم و عمل کو ایک ہی لفظ ''آیات'' سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ کسی ملاں کو یہ ح
نہیں ہے کہ اپنے پاس سے جدا جدا اصطلاحات مقرر کر کے پھر ان کی بناء پر کسی کے خلاف فتو
جاری کرنے لگے۔

جہالت و غباوت کا ارتکاب

مؤلف نے اپنے ہفوات جیل میں یہ سرخی لگائی ہے کہ ''امامیہ درحقیقت ختم نبوت کے منک
ہیں اس پر چار گواہ''

''پہلی شہادت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی!

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے رسالہ ''المقالہ الوضیۃ فی النصیح
و الـــوصیۃ'' میں جو ان کی کتاب تفہیمات الٰہیہ جلد دوم میں تفہیم (۲۴۶) کے عنوان سے شا
ہے وصیت (۵) کے ذیل میں لکھتے ہیں (بحذف فارسی) اس فقیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآ
وسلم کی روح پرفتوح سے سوال کیا کہ حضرت شیعوں کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں۔ جو اہل بیت
محبت کے مدعی ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا کہتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک

نوع کے روحانی کلام کے ذریعہ القاء فرمایا کہ ان کا مذہب باطل ہے اور ان کے مذاہب کا باطل ہونا لفظ ''امام'' میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ ''امام'' ان کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جس کی اطاعت فرض ہو اور جو اللہ کی طرف سے مقرر شدہ ہوں یہ لوگ ''امام'' کے حق میں ''وحی باطنی'' بھی تجویز کرتے ہیں۔۔۔۔۔''

دوسری شہادت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی''

حضرت شاہ صاحب تحفہ اثنا عشریہ کے باب ششم در بحث نبوت وایمان بانبیاء میں عقیدہ دہم کے ذیل میں لکھتے ہیں (بحذف فارسی) ترجمہ: اور امامیہ ہر چند کہ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کا اقرار کرتے ہیں لیکن در پردہ ائمہ کی نبوت کے قائل ہیں کیونکہ ائمہ کو انبیاء سے بہتر وبزرگ تر شمار کرتے ہیں اور تحلیل وتحریم کا معاملہ ائمہ کے سپرد کرتے ہیں جو کہ خلاصہ نبوت بلکہ بالاتر نبوت ہے پس درحقیقت ختم نبوت کے منکر ہیں۔۔۔۔۔

''تیسری شہادت شیعوں کے محدث ومجدد اعظم جناب باقر مجلسی

بحار الانوار کتاب الامامت باب ''انہم محدثون مضمون'' میں ائمہ کی مختلف روایات ذکر کرنے کے بعد روایت (۴۵) کے ذیل میں لکھتے ہیں (بحذف عربی) ترجمہ: ان احادیث سے نبی اور امام کے درمیان فرق کا استنباط کرنا مشکل ہے اسی طرح ان احادیث کے درمیان جمع کرنا بھی نہایت مشکل ہے۔۔۔ مختصر یہ کہ یہ یقین تو لازم ہے کہ امام، نبی نہیں ہوتے اور یہ بھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دیگر انبیاء اوصیاء سے اشرف وافضل ہیں ہمیں ان کے موصوف بالنبوۃ نہ ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں سوائے اس کے کہ خاتم الانبیاء کی جلالت کی رعایت ہو اور ہماری عقلوں کو نبوت اور امامت کے درمیان واضح فرق تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔

چوتھی شہادت شیخ مفید

۔۔۔۔ترجمہ: اور ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اماموں کو ایسا کلام سناتا ہے جو ان کی طرف القا کرتا ہے اس علم کے بارے میں جو آئندہ آنے والا ہو لیکن اس پر

وحی کا اطلاق نہیں کیا جاتا کیونکہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی کو وحی نہیں ہوتی اور یہ کہ جو چیزیں ہم نے ذکر کی ہیں ان میں سے کسی کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ کسی کی طرف وحی ہے اور اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ ایک وقت میں ایک لفظ کے بولنے کو جائز رکھے اور دوسرے وقت میں اس کو منع کر دے اور ایک چیز کے ساتھ کسی چیز کو موسوم کر دے۔ ایک وقت میں ممنوع قرار دے اور دوسرے وقت میں اس کو جائز قرار دے باقی رہے معانی تو وہ اپنے حقائق سے نہیں بدلتے۔ (خطبات جیل، ص ۹۳ تا ص ۹۸)

الجواب۔ پہلا گواہ شاہ ولی اللہ دہلوی کو پیش کیا ہے جنہوں نے لفظ امام، اس کے مفترض الطاعۃ اور منصوب للحق ہونے اور وحی باطنی اس کے لیے تجویز کرنے کی بناء پر مذہب حق پر درحقیقت ختم نبوت سے انکار کا الزام عائد کیا ہے۔

حالانکہ آپ گذشتہ صفحات میں پڑھ کر معلوم کر چکے ہیں کہ امام کا معصوم مفترض الطاعۃ ہونا اور وحی باطنی سے اس کا متصف ہونا دیگر اہل سنت کے علماء وصوفیاء کے علاوہ خود شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک بھی ثابت ہے لیکن شاہ ولی اللہ اور اس طرح کے دیگر اہل سنت کے علماء وصوفیاء اپنے ظاہری عقائد کی بناء پر لغزش کھا کر تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دوسری ناقابل اعتماد گواہی اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کی ہے۔ تحفہ اثناعشریہ سے شیعیان علیؑ پر یہ الزام نقل کیا ہے کہ شیعہ ائمہ کو انبیاءؑ سے بہتر اور افضل سمجھتے ہیں اسی طرح حلت حرمت کا اختیار ائمہ کو تفویض کرتے ہیں یہ بھی ختم نبوت کا انکار ہے۔ یہ گواہی بلکہ کذب بیانی جس پر مؤلف نے اپنے قصر استدلال کی بنیاد قائم کی ہے ایک انتہائی متعصب اور شیعہ دشمن مصنف کی زبان سے صادر ہوئی ہے جو اموی ذہنیت کے تحفظ کے علاوہ درحقیقت ناصبی نظریات اور عقائد کا پیروکار ہے لہٰذا اہل حق کے خلاف ایسے شخص کی گواہی بطور دلیل ہرگز پیش نہیں کی جا سکتی اور ایسا کرنا اصول و دیانت کے سراسر خلاف ہے مزید یہ کہ اس پر تفصیلی نقد و جرح پہلے ہو چکی ہے وہیں ملاحظہ کر لی جائے۔ لیکن تشریعی اختیارات کی بابت علامہ شبیر احمد عثمانی کی ایک وضاحت اس موقع پر اپنے بیان کے حق میں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔بعض محققین کا خیال ہے جو انبیاء جدید شریعت لے کر نہیں آتے ان کو بھی اتنا تصرف و اختیار عطا ہوتا ہے کہ مصالح خصوصیہ کی بناء پر شریعت مستقلہ کے کسی عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید یا عام ضابطہ سے بعض جزئیات کا استثناء کر سکیں۔۔۔۔۔"

(تفسیر عثمانی سورۃ الکھف آیت ۶۵ ف۲ طبع بجنور)

جب یہ امر مسلم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی تو اس طرح کی ضروریات کے لیے تصرف و اختیار ان اولیاء ہی کے پاس ہوگا۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں شبیر احمد عثمانی کی وضاحت کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام کو حاصل تھے۔ تو ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے بڑھ کر کون ولی ہو سکتے ہیں جن کو یہ اختیارات حاصل ہوں؟ یہی اختیارات و تصرفات ہیں جو شیعہ کتب میں درج ہیں۔ ان ائمہ اولیاء بلکہ مربیان اولیاء نے خود بیان کئے ہیں اور شیعہ رواۃ نے محفوظ کر لیے ہیں۔

انتہائی بددیانتی اور خیانت کا مظاہرہ

مؤلف نے حسب عادت ان عبارات کو نقل کرنے میں بھی دھاندلی روا رکھی ہے۔ بنابریں ہم مؤلف کے دجل و فریب کا پردہ چاک کرتے ہیں چنانچہ تیسری شہادت علامہ باقر مجلسیؒ کی پیش کی ہے کہ انہوں نے لکھا ہے کہ ان اخبار سے نبی اور امام میں فرق کا استنباط اشکال رکھتا ہے۔ مؤلف نے اس عبارت کے نقل کرنے میں صریح خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔ درمیان میں اپنی جھوٹی گواہی کے لیے استعمال کرنے کی خاطر عبارت حذف کر دی ہے اب ہم اہل نظر و فکر کی خدمت میں حذف شدہ حصہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ عربی عبارت میں وارد الفاظ "مشکل جدا" کے بعد علامہ مجلسیؒ لکھتے ہیں:

والذی یظھر من اکثرھا ھو ان الامام لا یری الحکم الشرعی فی المقام و النبی قد یراہ فیہ و امام الفرق بین الامام و النبی وبین الرسول ان الرسول یری الملک عند القاء الحکم و النبی غیر الرسول و الامام لا یریانہ فی تلک الحال و ان راٰیاہ فی سائر الحوال۔

اکثر روایات سے جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امام خواب میں شرعی حکم نہیں دیکھتا اور نبی کو خواب میں بھی شرعی حکم ملتا ہے۔ امام، نبی اور رسولؐ کے مابین فرق یہ ہے کہ رسول حکم کے القاء کے وقت فرشتے کو دیکھتا ہے۔ ایسا نبی جو رسول نہ ہو اور امام دونوں اس حال میں فرشتے کو نہیں دیکھتے۔ خواہ باقی احوال میں دیکھتے ہوں۔" (بحار الانوار، ج ۲۶ ص ۸۲ مطبوعہ تہران)

علامہ مجلسیؒ نے نبی اور امام میں فرق بیان کیا ہے لیکن یہ انتہائی درجہ حساس روحانی منصب کا معاملہ ہے۔ اس لیے اس کا حقیقی فرق الفاظ میں بیان کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ کیا آپ فوج کے کمانڈر انچیف اور چیف آف آرمی سٹاف کے درمیان فرق اور اختیارات میں تفاوت بیان کر سکتے ہیں؟ جب یہ ظاہری دنیوی عہدہ ایسا ہے کہ اس کی درست تعریف اور باہمی فرق واضح نہیں کیا جا سکتا جبکہ یہ امر واضح ہے کہ دونوں کے فرائض منصبی ایک ہی جیسے ہیں۔ جبکہ نبوت اور امامت کے مناصب انتہائی درجہ بلند ہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی نے اس امر کو کھل کر واضح کر دیا ہے کہ امام نائب رسول است آنچہ سنت اللہ در بندگان خود بواسطہ انبیاء و رسل جاری فرمود ہمانست بواسطہ ائمہ ھم جاری می فرماید، "امام نائب رسول ہے اللہ تعالیٰ نے جو طریقہ اپنے بندوں میں انبیاء اور رسولوں کے ذریعہ جاری فرمایا وہی طریقہ ائمہ کے ذریعہ بھی جاری فرمایا ہے۔"

(منصب امامت ص ۵۴)

اس پر سیر حاصل بحث وتبصرہ دوسرے باب میں کیا جا چکا ہے وہیں پہ مراجعت کر لی جائے۔

محترم قارئین! ملاں صاحب کی بددیانتی اور ناانصافی آپ نے ملاحظہ کر لی ہے اب اندازہ لگائیں کہ جب ناصبیوں کے رہنما کی دینی عقل وبصیرت کا یہ عالم ہو تو وہاں دوسروں کا کیا حال ہوگا؟

جس کی بہار یہ ہو سو اس کی خزاں نہ پوچھ

شیخ مفیدؒ کی گواہی مؤلف کے خود خلاف جاتی ہے

چوتھی گواہی شیخ مفیدؒ کی نقل کی گئی ہے حالانکہ یہ تو ملاں صاحب کے خود خلاف جاتی ہے۔ جب الہام اور وحی کی حقیقت پہلے گذشتہ اوراق میں بیان کر دی گئی ہے تو اب مزید کچھ کہنے کی

ضرورت تو نہیں ہے تاہم بطور تذکر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ خود علماءِ اہل سنت نے وحی اور الہام کی تعریف کرتے ہوئے الہام کو باطنی وحی قرار دیا ہے۔ **کمامر تفصیله** اس کے باوجود ملہم کو نبی نہیں کہا جا سکتا حالانکہ الہام اور وحی کا ذریعہ اور حقیقت ایک ہی ہے اسی طرح امام مرتبے میں بالاتر ہو کر بھی نبی نہیں کہلا سکتا، امام ہی کہلائے گا اگرچہ اس کے فرائض منصبی اور اختیارات نبی جیسے یا کچھ مزید بھی ہوں۔

اگر آپ شیخ مفیدؒ کی عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ "مطلب یہ ہے کہ نبوت کی حقیقت جو انبیاء کرام کو حاصل تھی وہی ائمہ کو بھی حاصل تھی۔ وحی ان پر بھی نازل ہوتی تھی اور ان پر بھی، مگر اس حقیقت پر پہلے زمانے میں نبی اور وحی کا لفظ بولنا جائز تھا اب جائز نہیں رہا۔" (خطبات جیل ص ۹۹)

اگر شیخ مفیدؒ کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کر کے شیعیان علیؑ پر فتویٰ لگانا درست ہے تو شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسماعیل شہید دہلوی، فتوحات مکیہ کے مصنف ابن عربی شیخ اکبر اور اس کے مداحین علماء دیوبند اشرف علی تھانوی وغیرہ پر بھی ایسا ہی فتویٰ لگانا پڑے گا اگر نہیں تو ائمہ اہل بیت ﷺ کے ذریعہ شیعہ علماء نے ایک علمی حقیقت کو بیان کر کے کوئی جرم نہیں کیا جس کی بناء پر کافر اور گردن زدنی قرار پائیں لیکن یہود اور ان کے آلہ کار نواصب کو الٰہی منصب سے عداوت ہے اس لیے یہ اپنے انجام بد سے دوچار ہونے تک باز نہیں آئیں گے۔ ذرا اپنے اکابر کی اس سلسلہ میں چند ایک عبارات ملاحظہ کیجئے چنانچہ احمد سرہندی لکھتے ہیں:

"باید دانست که منصب نبوت ختم بر خاتم الرسل شده است علیه و علی آله الصلوات و التسلیمات اما از کمالات آں منصب بطریق تبعیت متابعان او را نصیب کامل است۔

جاننا چاہئے کہ منصب نبوت بے شک خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو گیا ہے لیکن اس منصب کے کمالات آپ کے پیروؤں کو آپ کی پیروی کی حیثیت سے اب بھی پورے حاصل ہو سکتے ہیں۔" (مکتوبات امام ربانی ج ا ص ۲۹۹ مکتوب نمبر ۲۶۰ طبع دہلی)

احمد سرہندی صاحب کی درج بالا عبارت سے روز روشن کی طرح عیاں ہوا کہ نبوت کا منصب تو ختم ہے لیکن منصب کے تمام کمالات یعنی اوصاف اسی درجہ کے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یعنی صرف نام نبوت کا نہیں ہوگا باقی تمام اوصاف و کمالات کوئی بھی امتی ولی حاصل کر سکتا ہے۔ کیا یہ الفاظ ختم نبوت کے منافی نہیں ہیں؟ ذرا سوچ کر فیصلہ کریں آپ کا ایک بہت بڑا ذمہ دار عالم ان الفاظ کو ختم نبوت میں نقب زنی قرار دے چکا ہے۔

شیخ اکبر بڑی وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ختم نبوت کا صرف یہ مطلب ہے کہ منصب تشریع اب کسی کو حاصل نہ ہوگا نبوت کا مقام یعنی اس کے اوصاف و کمالات ابھی بھی حاصل کیئے جا سکتے ہیں۔ **فان النبوة التی انقطعت بوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما ھی نبوة التشریع لا مقامھا** . . . چنانچہ جو نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوگئی ہے وہ محض تشریعی نبوت ہے۔ اس کا مقام منقطع نہیں ہے۔"

(فتوحات مکیہ ج ۲ ص ۳ مطبوعہ دار صادر بیروت)

مقام نبوت یعنی اس کے کمالات، اوصاف اور اختیارات اب بھی باقی و جاری ہیں کوئی بھی امتی ولی اس مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ صرف منصب کا نام نبی نہیں رکھا جائے گا۔ اب اگر فتویٰ جاری کرنے کا شوق ہے تو دیانتداری اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان حضرات علماء وصوفیاء اہل سنت کہ جنہوں نے بڑے شد و مد سے اس نظریہ کا پرچار کیا ہے کو بھی اس کا نشانہ بنایئے بلکہ پہلے ان پر فتویٰ داغیں، اگر خود اس کی زد میں بچ گئے تو پھر شیعیان حیدر کرارؑ کی طرف رخ کر لینا۔

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

باب ۵

عقیدۂ امامت اور انبیاء کرام علیہم السلام

اگر چہ مؤلف شرعی حقائق اور معارف دینیہ سے قطعاً نابلد ہے۔ الانـاء یترشح بما فیه یعنی برتن سے وہی کچھ باہر آتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ ناصبیت خود چونکہ الحاد و لادینیت کے مجموعہ کا دوسرا نام ہے اس لیے یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کی خاطر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زبان درازی کو اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے۔ ان کے اہل حق پر عائد کردہ تمام الزامات بالکل بے بنیاد اور بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے ہیں ان الزامات کا علم و عقل سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

قبل ازیں امامت، نبوت اور اس طرح کے دیگر عنوانات کے تحت امامت کے مقام اور نبوت سے اس کے باہمی تعلق کو بقدر کفایت وضاحت کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ تاہم ہمارے مخاطب اپنی ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سے باز نہیں آتے اور ''خطبات جیل'' کے ص ۱۰۳ پر عنوان قائم کرتے ہیں کہ ''اماموں پر حسد کرنے کے باعث انبیاء ﷺ کو سخت ترین سزاؤں سے دوچار ہونا پڑا۔''

اس عنوان کے ذیل میں اس نے پھر علیٰحدہ علیٰحدہ عنوانات کے تحت چند روایات سے متعدد انبیاءؑ کے اس سلسلے میں واقعات اور شیعہ کتب سے روایات درج کی ہیں۔ جن کا اس الزام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلی روایت اصول کافی باب فیـه نکف و نتف من التنزیل فی الولایة سے لی ہے کہ:

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ ﴿ولـقـد عهدنا الی آدم من قبل کلمات فی محمد و علی و فاطمة و الحسن و الحسین و الائمة من ذریتهم فنسی﴾ حضرت محمد ﷺ اور ان کے بعد ائمہؑ کے بارے میں عہد تھا، جسے وہ بھول گئے۔ (خطبات جیل ص ۱۰۵)

الجواب:۔ اس روایت سے ملاں استدلال کرتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور جناب حواؑ کو اس لیے

جنت سے نکالا گیا کہ انہوں نے محمد و آل محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں عہد کو بھلا دیا تھا۔
اب ہم ارباب دانش و انصاف سے پوچھتے ہیں کہ اس روایت میں ایک لفظ بھی ایسا ملتا ہے کہ جس میں یہ ثابت ہو کہ حضرت آدمؑ و حواؑ کو جنت سے محض اس سبب سے نکالا گیا تھا کہ انہوں نے ائمہ سے حسد کیا، یہ تو ملاں نے خواہ مخواہ اپنی طرف سے نتیجہ اخذ کر لیا ہے۔ **لعنة الله علی الکاذبین**۔
دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت پر شیعہ علماء نے عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ مجلسیؒ نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

الثالث والعشرون ضعیف۔ وان معناه هذا فی غایة البعد، حدیث نمبر ۲۳ ضعیف ہے۔۔۔۔۔ اور اس کا یہ معنی انتہائی بعید از عقل ہے۔"

(مراۃ العقول شرح اصول کافی ج ا ص ۳۱۸ طبع قدیم ایران)

امین الاسلام علامہ طبرسیؒ آیت ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ کی تفسیر میں ارقام فرماتے ہیں:

﴿معناه امرناه و اوصینا الیه ان لا یقرب الشجرة ولا یاکل منها فترك الامر﴾

اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اسے حکم دیا اور اسے وصیت کی کہ وہ درخت کے نزدیک نہ جائے نہ اس میں کھائے لیکن اس نے امر کو چھوڑ دیا۔" (مجمع البیان، ج ۷، ص ۳۲ طبع تہران)

اس روایت کی حالت اور شیعہ علماء کا اس کے بارے میں نقطہ نظر سامنے آ جانے کے بعد اس روایت کو ماخذ بنا کر الزام لگانا جہالت اور حماقت ہے۔ کوئی دیانتدار اور باشعور انسان اس طرح کے بودے استدلال نہیں کر سکتا اسی طرح مؤلف نے اپنے "ہفوات جیل" کے ص ۱۰۶ تا ص ۱۱۱ پر حیات القلوب سے ایک طویل واقعہ نقل کر کے اپنی کتاب کے تقریباً چھ صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں۔ جبکہ اس واقعہ کا معتدبہ حصہ صرف ائمہ اہل بیتؑ کے فضائل و مناقب پر مشتمل ہے۔ اس پورے واقعہ میں کہیں بھی یہ ثابت نہیں کہ حضرت آدمؑ و حواؑ کو ائمہ اہل بیتؑ سے حسد کی وجہ سے نکالا گیا۔ تاہم اصول کافی کی مندرجہ بالا روایت اصلاً شیعہ کے نزدیک قابل اعتماد ہی نہیں بلکہ ضعیف ہے تو پھر اس پر اصرار کر کے الزام لگانا بد دیانتی اور فریب کاری ہے لیکن صہیونی دجال کے پیروکار اس ابلہ

فریبی کو ہی اپنا دین سمجھتے ہیں۔

ملاں نے اپنے ''ہفواتِ جیل'' کے ص ۱۱۲ پر ایک عنوان کی سرخی یوں لکھی ہے کہ ''حضرت ایوب علیہ السلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت میں شک کیا۔ اس لیے بیماری میں مبتلا ہوئے۔''

اس کے تحت لکھتے ہیں کہ:

''شیخ الطائفہ ابوجعفر کی کتاب ''مسائل البلدان'' میں پوری سند کے ساتھ حضرت سلمان فارسی اور حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنھم کا ایک مکالمہ نقل کیا گیا ہے۔۔۔۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: کیا تجھے معلوم ہے کہ قصہ ایوب کیسے پیش آیا اور ان سے اللہ کی نعمتیں چھیننے کا سبب بنا؟ سلمان نے کہا: اے امیر المؤمنین اللہ جانتا ہے یا آپ کو معلوم ہے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے (میری امامت ان کے سامنے پیش کر کے) ان سے اقرار لیا تو ایوب کو میری امامت میں شک ہوا اور کہنے لگے یہ تو بڑی بات ہے اور بڑا بھاری معاملہ ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ اے ایوب تو اس شخصیت میں شک کرتا ہے جس کو میں نے خود مقرر کیا ہے۔ اسی بناء پر تو میں نے آدمؑ کو ابتلا میں ڈالا پھر امیر المومنین کی امارت تسلیم کر لینے کے صلہ میں اس پر عنایات کیں اور اس کو معاف کر دیا۔۔۔'' (بحار الانوار، ص ۲۹۳، ج ۲۶)'' (خطباتِ جیل، ص ۱۱۲، ص ۱۱۳)

الجواب:۔ اس عنوان کے اثبات کے لیے جو بحار الانوار سے ایک روایت کا کچھ حصہ نقل کیا گیا ہے جبکہ بحار الانوار کے مؤلف علامہ باقر مجلسیؒ نے اس روایت کو ''مسائل البلدان'' نامی کتاب سے نقل کیا ہے اور ساتھ ہی اس کی سند بھی نقل کر دی ہے تا کہ اہل علم کے لیے اس روایت کی جانچ پڑتال کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے پوری سند اس طرح ہے:

﴿عن ابی محمد الفضل بن شاذان یرفعه الی جابر بن یزید الجعفی عن رجل من اصحاب امیر المؤمنین علیه السلام،۔۔۔۔﴾

چونکہ جابر بن یزید جعفی اور امیر المؤمنین علیہ السلام کے درمیان کا راوی مجہول ہے۔ اس بناء پر اس روایت میں ایک واضح انقطاع پایا جاتا ہے۔ منقطع روایت کو بنیاد بنا کر اتنے گھناؤنے جرم کی

فرد کسی شخص یا فرقے پر عائد کر دینا اور خود ہی فیصلہ کر لینا سراسر حماقت اور ناانصافی ہے۔ اسی روایت کا بنیادی راوی ابو محمد الفضل بن شاذان ہے۔ جس کی وفات رجال کشی ص ۴۵۵ اور تنقیح المقال من ابواب الفاء ج ۲ ص ۱۰ کے مطابق ۲۶۰ ھ میں ہوئی ہے۔ جبکہ جابر بن یزید جعفی کی وفات ۱۲۸ ھ میں ہوئی۔ ان دونوں میں ملاقات کا امکان ہی نہیں جبکہ سند میں درمیان کے راویوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ روایت غایت درجہ ساقط الاعتبار ٹھہرتی ہے۔ یہ امر بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ ابو محمد الفضل بن شاذان کی شخصیت ایک متنازع حیثیت کی حامل ہے جیسا کہ رجال کشی اور تنقیح المقال میں سے اس کے حالات کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نوع کی روایات کو الزام ثابت کرنے کے لیے پیش کرنا تقاضائے انصاف کے سراسر منافی ہے۔

کرۂ ارض میں تمام انسانوں پر اسلامی احکام نافذ نہ ہو سکے

مولوی اعظم طارق "ہفوات جیل" کے صفحہ نمبر ۱۱۳ پر ایک عنوان قائم کرتے ہیں کہ "حضور ختم المرسلین اور تمام نبی ناکام ہو گئے"

امام خمینیؒ کے ایک فرمان سے مُلا اور اس کے ہمنوا "دانشوروں" نے سمجھا کہ ان الفاظ سے انبیاء علیہم السلام کی توہین ہوتی ہے حالانکہ امام خمینیؒ کے منقولہ اور محولہ الفاظ یہ ہیں:

"۔۔۔۔ جو نبی بھی آئے وہ انصاف کے نفاذ کے لیے آئے، ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمام دنیا میں انصاف کا نفاذ کریں لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے یہاں تک کہ ختم المرسلینؐ جو انسان کی اصلاح کے لیے آئے تھے اور انصاف کا نفاذ کرنے کے لیے آئے تھے انسان کی تربیت کے لیے آئے تھے لیکن وہ اپنے زمانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ (بحوالہ اتحاد و یکجہتی امام خمینیؒ کی نظر میں ص ۱۵)"

(خطبات جیل ص ۱۱۳، ۱۱۴)

<u>الجواب</u>:۔ مؤلف نے یہ سمجھا ہے کہ اس عبارت سے انبیاء علیہم السلام کو ناکام بتایا گیا ہے نیز یہ کہ انبیاء علیہم السلام اپنے فرائض منصبی ادا کرنے سے قاصر رہے۔ (معاذ اللہ) حالانکہ اس عبارت سے یہ مطلب اخذ کرنا سراسر گمراہی اور جہالت ہے۔ چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام باتفاق عقلاء و علماء محض [illegible] تبلیغ احکام کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ جب لوگ ایمان لے آئیں اور احکام تسلیم کر لیں

ب اس صحت مندانہ معاشرے میں ان احکام کا نفاذ بھی ان انبیاء علیہم السلام کی ذمہ داری ہے۔ ہی قیام عدل وانصاف ہوتا ہے۔ جن انبیاء ﷺ کو اس کا موقع ملا وہ معدودے چند ہیں۔ اگر چہ ہ بھی پورے کرۂ ارض میں تمام انسانوں پر شرعی واسلامی احکام نافذ نہیں کر سکے۔

جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی ساری عمر تبلیغ اسلام میں گزری مگر اکثر افراد متاثر نہ ہو سکے ئی کہ آپ کی زوجہ بھی نہ صرف کافر کی کافرہ ہی رہی بلکہ آپ کی تبلیغ میں بھی حائل، بالآخر تنگ کر حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں اس نافرمان قوم کے غرق کرنے کی التجا کی جس پر طوفان ح شاہد ہے ان کے علاوہ دوسرے انبیاء کرام ﷺ کا بھی تذکرہ موجود ہے کہ ان کی قوم نے بھی ن کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جس کی قرآن حکیم نے یوں وضاحت فرمادی ہے کہ:

﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ﴾

''پھر ہم نے نوحؑ کے بعد اور رسولوں کو اپنی قوم کے پاس بھیجا جو ان کے پاس واضح و وشن معجزے لے کر آئے اس پر بھی جس چیز کو وہ لوگ پہلے جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان نہ لائے ہم بھی حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد موسیٰ و رون کو اپنی نشانیاں (معجزے) دے کر فرعون اور اس (کی قوم) کے سرداروں کے پاس بھیجا تو وہ گ اکڑ بیٹھے اور یہ لوگ تھے ہی قصوروار۔'' (سورۂ یونس، آیت ۷۴،۷۵)

موسیٰ علیہ السلام نے منصفانہ شرعی احکام نافذ کیے اگرچہ بنو اسرائیل جا بجا سرتابی کرتے ہے۔ بعد ازاں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے مختصر وقت اور محدود علاقے میں رعی حکومت یعنی انصاف قائم کیا۔ لیکن بعد ازاں بنو اسرائیل کی سرکشی اور بغاوت کی بناء پر وہ کومت انصاف ظالمانہ ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ ﴿کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء﴾ و اسرائیل کی سیاست یعنی حکومتی باگ دوڑ انبیاء کے ہاتھ میں تھی لیکن بنو اسرائیل کے سرکش سردار ں مذہبی منصفانہ حکومت کو پسند نہ کرتے تھے اور آئے دن بھیانک سازشوں میں مصروف رہتے،

بالآخر انہوں نے ملوکیت کا مطالبہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی کا بادشاہ انہیں دے دیا تب بھی انہوں نے طالوت کی حکومت پر اعتراض کر دیا۔ بالآخر انہوں نے انبیاء ﷺ کی پسندیدہ حکومت ہٹا کر ملوکیت قائم کر دی۔ جس کے نتیجے میں انہیں سزا ملی۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام آئے تاکہ دنیا میں عادلانہ اسلامی نظام نافذ کریں۔ صرف اس لیے نہیں آئے تھے کہ لوگوں کو مسجد میں لا کر نماز پڑھائیں اور تعمیر مسجد کے لیے چندہ جمع کریں۔ باقی معاشرے میں ظالمانہ حکومت ہو انہیں اس سے کوئی سروکار نہ ہو۔ یہ تو جاہل اور سرکش افراد کا تصور نبوت ہے۔

لیکن اسلامی نقطہ نظر کچھ یوں ہے کہ انبیاء ﷺ کا حقیقی مقصد کرۂ ارض پر اور اپنے اپنے زمانے اور علاقے میں ان حدود کے اندر اسلامی نظام حکومت قائم کرنا تھا۔ یہی نفاذ انصاف کہلاتا ہے اس لیے کہ اسلامی شریعت کے لیے علاوہ تمام قوانین ظلم اور منافی عدل ہیں۔ عدل و انصاف پر مبنی قوانین اسلامی شریعت کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے نازل کیے ہیں۔ اگر نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء و رسل کی تاریخ کا قرآن کریم سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ پوری جدوجہد اور سعی پیہم کے باوجود سب لوگوں پر اکثر پیغمبر اسلامی شریعت کے نفاذ میں کامیاب نہیں ہوئے اور یہ ان انبیاء کی فرض منصبی میں کوتاہی کا نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ ملاں نے سمجھا ہے بلکہ یہ حالات کی ناموافقت ہے یعنی ان کی اقوام اور ان اقوام کے سرداروں نے انبیاء ﷺ کو کامیاب نہیں ہونے دیا کہ وہ اسلامی شریعت پر مبنی منصفانہ نظام نافذ کرتے۔ یہ جرم ان اقوام اور ان کے ظالم مترف متکبر سرداروں کا ہے۔ چنانچہ ابو شکور سالمی حنفی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

وقال بعض الناس بان الامام اذا لم یکن مطاعا فانه لا یکون اماما لانه اذا لم یکن له القهر والغلبة لا یکون اماما قلنا لیس کذلك لان طاعة الامام فرض علی الناس فلو لم یطیعوا الامام فالعصیان حصل منهم و عصیانهم لا یضربا لامامة ثم ان لم یکن القهر فذلك یکون من تمرد الناس و تمردهم لا یعزله عن الامامة الا تری ان النبیّ ما کان مطاعا فی اول الاسلام و کان لا یمکن له القهر علی اعدائه من طریق الغادة و لکفة قد تمرد و اعن امداده و نصرة دینه وقد کان هذا لا یضره و لا یعزل

عن النبوة فكذلك الامامة لان الامام خليفة النبی لا محالة و كذلك علیؓ ما كان مطاعا من جميع المسلمين و مع ذالك ما صار معزولا،

خلاصہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کا یہ قول غلط ہے کہ جب امام کو غلبہ حاصل نہ ہو اور اس کی کوئی اطاعت نہ کرے تو وہ امام نہیں ہو سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ نظریہ قطعاً غلط ہے کیونکہ امام کی اطاعت لوگوں پر فرض ہے اور اگر لوگوں کی سرکشی و تمرد سے امام کو غلبہ حاصل نہ ہو تو یہ امر امام کو امامت سے معزول نہیں کر سکتا اور امت کی نافرمانی امامت کو مضر نہیں تو نہیں دیکھتا کہ نبی اکرم ﷺ ابتدائے اسلام میں باوجود نبی ہونے کے لوگ ان کی متابعت نہیں کرتے تھے اور نہ کفار اور دشمنوں پر رسول اللہ ﷺ کو قہر و غلبہ حاصل تھا تاہم اس بات سے آپ کی نبوت میں کچھ نقص نہیں آیا تھا اور نہ وہ نبوت سے اس باعث معزول ہوئے تو امام بھی چونکہ خلیفہ نبی ہے اگر تمام مسلمان فرمانروا اس کے نہ ہوں تو یہ امر اس کو امامت سے معزول نہیں کرتا جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام تمام مسلمانوں کے مطاع نہیں ہوئے تھے، امام تھے۔ (التمہید فی بیان التوحید ص ۱۸۶، ۱۸۷ مطبوعہ فاروقی دہلی)

لہٰذا انبیاء علیہم السلام کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ نہ ہی امام خمینیؒ کی یہ غرض تھی۔ لیکن مُلاں کی ذہنی رسائی ہی اتنی ہے۔ جسے صحیح اور غلط میں تمیز کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ جہاں تک انبیاء کی تبلیغی کارکردگی اور فرائض منصبی کی ادائیگی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں واقعی تمام انبیاء علیہم السلام سو فیصد کامیاب ہوئے ہیں اس میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ انبیاءؑ کی طرف سے کوتاہی کا احتمال بھی ناممکن ہے۔

اس امر کا اظہار صرف امام خمینیؒ نے ہی نہیں کیا بلکہ جس شخص نے بھی انسانی تاریخ کا بنظر امعان مطالعہ کیا ہے وہ اسی نتیجے پر پہنچا ہے کہ آج تک اس طرح کا مثالی انسانی معاشرہ قائم نہیں ہو سکا۔ جو مشیت و منشاء الٰہی کا تقاضا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور کے مشہور و معروف ادیب و کالم نگار صحافی نذیر ناجی نے واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''فوجی حکمرانوں نے جو کام اپنے ذمے لیے ہیں بے شک وہ بہت بڑے ہیں۔ جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے بے شمار پیغمبر، اولیاء کرام، امام اور قومی رہنما

دنیا میں بھیجے تاکہ وہ معاشرے کو اس طرح کا بنا سکیں جیسا کہ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشر بنانے کے خواہشمند ہیں لیکن ریکارڈ میں آئی ہوئی انسانی تاریخ کے کم وبیش چھ ہزار سال پورے چکے ہیں لیکن یہ دنیا ابھی تک اس طرح کی بن نہیں پائی۔" (سویرے سویرے، از: نذیر نا عنوان: "سب کچھ ٹھیک" روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۱۱ نومبر ۱۹۹۹ء، اداریہ کا صفحہ لوئر ہاف کالم نمبر

مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ از خود برآمد ہو جاتا ہے کہ امام خمینیؒ نے جس حقیقت بڑے دکھ کے ساتھ بیان کیا تھا اسی حقیقت کو نذیر ناجی نے الفاظ کے قدرے اختلاف سے ظا ہے۔ ان کے اس بیان کا پس منظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبرؑ، امام اور اولیاء کرام کو اس مبعوث کیا کہ وہ عدل وانصاف پر مبنی ایک مثالی اسلامی معاشرہ قائم کریں۔ یہ بھی ایک زندہ حقی ہے کہ ایسا معاشرہ آج تک قائم نہیں ہو سکا۔ ان الفاظ کے ذریعے نذیر ناجی صاحب انبیاء اور ا پر الزام نہیں لگا رہے کہ ان کی کوتاہی اور جدوجہد میں نقص کی وجہ سے ایسا معاشرہ بن نہیں سکا۔ صاف ظاہر ہے کہ معاشرے کو منصفانہ بنیادوں پر استوار کرنے کی راہ میں رکاوٹ وہ لوگ جنہوں نے انبیاء، ائمہ اور اولیاء کرام کی اس سعی کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ امام خمینیؒ بھی اس کی وضاحت کر رہے تھے لیکن:

غیر کی آنکھوں کا تنکا تجھ کو آتا ہے نظر
اپنی آنکھ کا غافل ذرا شہتیر دیکھ

مؤلف کی نبی اکرمؐ اور حضرت علیؑ کی شان میں گستاخانہ جسارت

مولوی اعظم طارق نے اپنے جاہلانہ خطبات کے ص ۱۱۴ پر لکھا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ حضرت علی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم ایک لحاف میں سوتے تھے۔ ایک شرمناک عبارت۔"

اس عنوان کے تحت مؤلف نے کتاب سلیم بن قیس کے ص ۱۹۷ سے ایک واقعہ لکھا کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک پردے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، جناب مقدادؓ آپؐ کے ساتھ ہوتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہی لحاف تھا۔ رسول اللہ ﷺ علیؑ اور بی بی عائشہ درمیان سوتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ رات کو نماز کے لیے اٹھتے تو رسول اللہ ﷺ لحا

درمیان سے دبا دیتے۔ اس طرح لحاف دبانے سے یہ حضرت علیؓ اور بی بی عائشہؓ کے درمیان حد حائل ہو جاتی تھی۔

الجواب :۔ مُلاں اس واقعہ کو شان رسالت میں گستاخی پر مشتمل قرار دیتا ہے اور یہ راگ الاپتے ہوئے کہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ دنیا کو حیاء کا درس دینے والا اور غیر محرم کی نظر سے منع کرنے والا پیغمبر خود ایسا کام کرے۔

بسوخت عقل ز حیرت
کہ ایں چہ ابو العجبی است

مؤلف کی جہالت اور بے دینی کی حد ہوگئی ہے۔ کیا پردے کا حکم ابتداء وحی کے ساتھ ہی نازل ہوا تھا، معمولی علم والے لوگ بھی جانتے ہیں کہ پردے کا حکم سورۂ احزاب میں یہ سن ۵ ہجری میں نازل ہوا۔ اس سے پہلے ازواج رسول کبھی پردہ نہ کرتی تھیں۔ چنانچہ اہل سنت علماء نے ازواج رسول ﷺ کے لیے پردے کے حکم کے نزول کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی لکھا ہے کہ: ﴿**انہ علیہ السلام کان یطعم و معہ بعض اصحابہ فاصابت ید رجل ید عائشہ فکرہ النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ذلك فنزلت** ﴾حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپؐ کے بعض اصحاب کھانا کھا رہے تھے کہ اسی اثناء میں ایک شخص کا ہاتھ حضرت عائشہؓ کے ہاتھ سے جا لگا۔ تو نبی ﷺ نے اس کو ناپسند کیا۔ چنانچہ پردہ کی آیت نازل ہوئی۔"

(التفسیرات الاحمدیہ، ص ۱۱۴ طبع علیمی دہلی)

آپ ذرا آنکھیں کھول کر اپنے مجتہد فقیہ امام طحاوی کی اس روایت کو بھی دیکھ لیں اور غلط پروپیگنڈے سے باز رہیں۔ ﴿**قال بکیر قالت ام علقمة مولاۃ عائشة تدخل علیها عبید المسلمین وان کان عبید الناس لیرون عائشة بعد ان یحتلم احدهم و انها لتمتشط** ﴾ بکیر نے کہا کہ ام علقمہ حضرت عائشہؓ کی کنیز کہتی ہیں کہ مسلمانوں کے غلام عائشہ کے پاس آیا کرتے تھے اس حال میں لوگوں کے وہ غلام حضرت عائشہ کو دیکھتے تھے۔ بعد اس کے کہ وہ غلام بالغ ہوں۔ درانحالیکہ حضرت عائشہؓ کنگھی کر رہی ہوتی تھیں۔"

(شرح معانی الآ ثار، ج ۲،ص ۳۹۲ مطبوعہ لاہور

کس قدر ستم ظریفی اور ناانصافی ہے کہ کتاب سلیم بن قیس کی روایت کو تو مُلاں حیا س
اور شرمناک قرار دے رہا ہے۔ اب ذرا اس روایت کے بارے میں بھی تبصرہ کر دے۔ کیا ا
مندرجہ بالا روایت میں بھی حیا سوزی کا کوئی سامان ہے یا نہیں؟ تفسیرات احمدیہ میں بیان کردہ سبب
نزول پر بھی کوئی احمقانہ تبصرہ صادر فرمایئے۔

آقائے نامدار ﷺ کی ذات گرامی پر طعنہ زنی کرتے ہوئے مُلاں بزعم خویش بڑے
دار بنتے پھرتے ہیں۔ اپنی صحیح مسلم کی ایک روایت پر بھی تبصرہ فرمایئے۔ جو یہ ہے ﴿و ک
ازواج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یا خذن من روسھم حتیٰ تکون کالوفرۃ ﴾ ابوس
نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں اپنے بال کتراتی تھیں اور کانوں تک بال رکھتی تھیں۔
(صحیح مسلم ج ۱ کتاب الحیض ترجمہ اردو وحید الزمان ص ۴۳۲ طبع لاہو

اس کی شرح میں علامہ نووی وضاحت کرتے ہیں کہ ازواج مطہراتؓ نے نبی ﷺ
وفات کے بعد اپنے بال کتروانا شروع کیا۔ اس لیے کہ اب انہیں لمبے بالوں کی ضرورت نہ تھی
پھر کہتے ہیں ﴿وفیہ دلیل علی جواز تخفیف الشعور للنساء ﴾ اس میں عورتوں کے
بال چھوٹے کرانے کے جواز کی دلیل ہے۔'' (شرح صحیح مسلم نووی ج ۱ ص ۱۴۸ طبع لکھنؤ)

مؤلف اپنی حیا اور ناک کے تصور کے مطابق بات کیا کرے اور ان درج بالا اپنی ک
کی روایات پر تبصرہ کریں۔ کیا آپ موجودہ دور میں مغرب زدہ عورتوں کو کچھ کہہ سکیں گے؟
روایات پر تبصرہ سے پہلے ہر پہلو پر غور و فکر کر لیجئے۔

حضرت علیؑ کی ولایت میں کسی کو شریک کیا تو اعمال ضائع ہو جائیں گے

خطبات جیل کے صفحہ ۱۱۵ پر جو سرخی قائم کی ہے وہ درج ہے ''اللہ نے حضور ﷺ
فرمایا اگر تو نے ولایت علیؑ میں کسی کو شریک کیا تو تیرے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ (معاذ اللہ
''جناب امام محمد باقر سے جو اس آیت کا مطلب دریافت کیا گیا تو حضرت نے فرمایا
اس کی تفسیر یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر تم نے اپنے بعد علی ؑ کی ولایت کے ساتھ کسی

کی ولایت کا حکم دے دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا ﴿لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ کافی میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ ﴿لئن اشرکت﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ولایت میں علیؓ کا شریک کسی اور کو کہا (تو نتیجہ یہ ہوگا یحبطن الخ) پھر فرمایا: ﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ﴾ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اطاعت کے ساتھ بجالاؤ اور اس کا شکر بجالاؤ کہ ہم نے جبرئیل اور تمہارے ابن عم کو تمہارا زور بازو مقرر کیا۔

(ترجمہ مولوی مقبول، ص ۹۲۷)

اس روایت پر غور کریں کہ کس طرح اس آیت قرآنیہ کا نہ صرف معنی تبدیل کیا گیا بلکہ خود حضور اکرمؐ کو کس انداز میں بارگاہ ایزدی سے ولایت علی کے بارے میں ڈانٹے جانے کو ثابت کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو شیعہ کی ناپاک سازشوں سے محفوظ رکھے۔"

(خطبات جیل ص ۱۱۵)

<u>الجواب</u>۔ سورۂ زمر کی ایک آیت کے چند الفاظ ﴿لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ اور ﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ﴾ کی تفسیر بحوالہ ترجمہ مقبول امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے جو نقل کی گئی ہے کہ ولایت علی علیہ السلام کے ساتھ کسی اور کی ولایت کا حکم دے دیا اور کسی دوسرے کو علی علیہ السلام کی ولایت میں شریک کیا تو اس کے نتیجے میں آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

مُلاں نے اس واقعہ کے نقل کرنے میں تدلیس و تلبیس اور دسیسہ کاری سے کام لیا ہے اپنے باطل مقصد کے حصول کے لیے ابتدائی حصہ ترک کر دیا ہے چنانچہ ترجمہ مقبول کے حاشیے پر جہاں اس آیت کی تفسیر درج ہے۔ اس کی ابتداء اس طرح ہے: ﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ تا ﴿وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ﴾ تفسیر قمی میں ہے کہ یہ خطاب جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اور مطلب آنحضرت کی امت ہے اور ایسے ہی مواقع کے متعلق جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس شان کا کلام دے کر بھیجا ہے جسے عرب یوں کہتے ہیں: ﴿ایاك اعنی و اسمعی یا جارة﴾ (مقصود تو میرے کہنے کا تجھ سے ہے اور

پڑوسن سنتی تم رہنا) اور دلیل اس پر خدا تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَ كُنْ مِّنَ
الشّٰكِرِيْنَ﴾ حالانکہ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کا نبی اسی کی عبادت کرتا ہے اور ہر دم اس کا شکرا
کرتا رہتا ہے۔ اس پر بھی جو اس نے اپنے نبی کو عبادت کا حکم دیا تو یہ محض آنحضرت کی امت ک
تادیب کے لیے ہے۔۔۔۔۔“ (ترجمہ مولانا مقبول احمدؒ، ص۶۴۲، طبع دہلی)

اسی نوعیت کی ایک آیت سورۂ بقرہ میں ہے فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿لَئِنِ اتَّبَعْتَ
اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾۔

اے پیغمبر اگر تم اس کے بعد کہ تمہارے پاس علم (قرآن) آ چکا ہے ان کی خواہشوں
چلے تو پھر تم کو خدا کے غضب سے (بچانے والا) نہ کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار۔“

(سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۱۲۰، ترجمہ اردو از ڈپٹی نذیر احمد

سورۃ الرعد کی آیت میں بھی رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح مخاطب کیا گیا ہے: ﴿لَئِنِ
اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ﴾

اگر آپ نے اپنے پاس علم آ جانے کے بعد ان کی خواہشات کی پیروی کی تو پھر اللہ کے
مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حمایتی ہوگا نہ کوئی بچانے والا۔ (سورۃ الرعد آیت ۳۷)

کیا پیغمبر بنائے جانے کے بعد کسی پیغمبر سے یہ امکان باقی رہتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ اپ
منصب سے پھر جائے اور باطل پرستوں کی خواہشات کی پیروی شروع کر دے۔ ہرگز نہیں۔ پھر ا
تعالیٰ نے اپنے آخری رسولؐ کو اس طرح مخاطب کیوں کیا ہے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے ک
مخاطب تو پیغمبر کو کیا ہے لیکن درحقیقت امت کو ڈرانا مقصود ہے۔ یہی مفہوم مؤلف کی پیش کردہ ا
آیت کی تفسیر کا ہے کہ اگر کسی نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت سے انکار کیا یا کسی دوسرے کو یہ مق
عطا کیا تو اس کے لیے یہ وعید ہے۔

بہت سے قابل اعتماد مفسرین اہل سنت کے مطابق سورۂ مائدہ کی آیت ﴿يٰۤاَيُّهَا
الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰ
يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ ولایت علی یعنی حضرت علی علیہ السلام کو اپنے بعد اپنا جانشین اور امت کے

امام نامزد کرنے کے اعلان کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی نظام کے قیام کے بعد اس کا استحکام اور دوام اسی میں ہے کہ قائم کرنے والا شخص اپنے بعد کسی قابل اعتماد اور باصلاحیت فرد کو اپنا قائم مقام اور جانشین بنا دے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو دشمن تاک میں بیٹھے ہوں گے اور اس قائم شدہ نظام کو جلد ہی درہم برہم کر کے رکھ دیں گے۔ چونکہ اسلامی نظام اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا تھا۔ اس لیے اس نظام کو آئندہ چلانے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے جانشین کا اعلان کرنا تھا۔ یہی آخری اور اہم مرحلہ تھا جس سے دین کی تکمیل ثابت ہو جاتی اور اس الٰہی نظام کے استحکام اور دوام پر مہر لگ جاتی۔ یہی مرحلہ منافقین کے منصوبوں اور سازشوں کے لیے زیادہ مناسب اور موزوں تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے رسول جو آپ کی طرف اتارا گیا ہے اس کی تبلیغ کر دیں ﴿وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ اگر آپ نے تبلیغ نہ کی تو گویا آپ نے رسالت کی تبلیغ کی ہی نہیں ہے۔ اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچانے والا ہے۔"

اس کے لیے مزید معلومات درکار ہوں تو تفسیر مظہری از قاضی ثنا اللہ پانی پتی ج ۳ ص ۱۴۳، تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۷۴ فخر الدین رازی فتح القدیر شوکانی ج ۲ ص ۵۷ اور درمنشور از جلال الدین سیوطی وغیرہ میں دیکھ لیجئے۔ اگر شکوک و شبہات پیدا ہوں تو ان کے ازالے کے لیے ﴿وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ﴾ "اور تو چھپاتا تھا اپنے دل میں ایک چیز، جس کو اللہ کھولا چاہتا ہے اور ڈرتا تھا لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ ڈرنا چاہیے تجھ کو۔" سورۂ احزاب آیت نمبر ۳۷ ترجمہ شیخ الہند کی آیت پر غور کیجئے کہ ؎

شاید اتر جائے تیرے دل میں میری بات

کیا یہ چھوٹی سی بات تھی کہ جس کے لیے پیغمبر اکرم ﷺ لوگوں سے ڈر محسوس کر رہے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کو جانشین مقرر کرنا تمام احکام و شرائع سے بالاتر اور تمام دینی امور سے اہم امر تھا۔ جس کی بناء پر عداوت، بغاوت اور سرکشی کا خطرہ موجود تھا بلکہ ان خطرات کی گھنٹیاں پہلے بج چکی تھیں۔ لہٰذا سورۂ زمر کی آیت ﴿وَ لَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَ اِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ

اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ وَ لَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ﴾ بھی آیت ﴿یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ﴾ کی طرح اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا، ہاں نواصب کے اصول قرآن فہمی کے مطابق پوری شریعتِ اسلامیہ ہی اشکالات سے بھری پڑی ہے۔ **معاذ اللہ من ھذہ الضلالۃ**، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو نواصب کی ناپاک سازشوں اور وسوسوں سے محفوظ رکھے۔ **آمین یا الہ العالمین۔**

حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں کیوں رکھا گیا؟

خطبات جاہل کے صفحہ ۱۱۶ پر مُلاں نے ایک طویل روایت بحار الانوار سے نقل کی ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ ''یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں اس لیے رکھا گیا کہ انہوں نے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی امامت، ولایت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کیا۔ تو اس سبب سے انہیں مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی سزا دی گئی۔''

الجواب۔ گزشتہ صفحات میں عنوان کے ضمن میں یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ اکابر علماء اہل سنت مثلاً تفسیر مظہری کے مؤلف کی درج کردہ روایت، مجدد الف ثانی کی تصریحات اور سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے مطابق تمام اولیاء کو ولایت کا جو درجہ ملا وہ حضرت علی علیہ السلام کی معرفت سے ملا۔ یہ امر بھی محتاج بیان نہیں ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام اعلان نبوت سے پہلے لازماً ولی ہوتے ہیں۔ یہی ولایت ان کی نبوت کا پیش خیمہ اور دلیل بنتی ہے جو انہیں مولا علی علیہ السلام کے واسطے سے ملتی ہے۔ اسی طرح جیسے تمام انسانوں سے روز الست کا میثاق لیا گیا اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت اور آپ کے جانشینوں کی ولایت کا عہد و میثاق لیا گیا جس طرح اس مادی دنیا میں آنے کے بعد تمام انسانوں کو وہ عہد بھولا ہوا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و رسل کے ذریعے اس عہد کو یاد دلاتا ہے۔ کچھ لوگ عہد پر قائم ہو جاتے ہیں اور اکثر پھر جاتے ہیں۔ عہد سے پھر جانے والے عوام کو کبھی تو دنیا میں بھی عذاب مل جاتا ہے ورنہ آخرت کا عذاب تو اس طرح کے لوگوں کے لیے یقیناً تیار ہی ہے۔ انبیاء کرامؑ کا معاملہ قدرے مختلف ہے اس عہد کو انبیاء سے بھی تازہ کرایا جاتا ہے۔ اگر بعض انبیاء علیہم السلام سے اس عہد سے متعلق بھول ہوگئی ہو اور ذرا شک و شبہ کا

اظہار ہو تو اللہ تعالیٰ انہیں یاد دلانے کے لیے اسی دنیا میں انہیں تنبیہ کر دیتے ہیں اور وہ انبیاء ﷺ اپنے عہد پر قائم ہو جاتے ہیں۔ جس طرح عوام کا ابتلاء انبیاءؑ کے ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح انبیاءؑ کی آزمائش محمد و آل محمد ﷺ کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ یہ الٰہی نظام کا تقاضا ہے۔ اس پر حیرت و تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ جب آدم علیہ السلام سے تقصیر ہوگئی اور جنت سے نکال دیئے گئے تب بھی انہی حضرات اہل بیت اطہار ﷺ کی وساطت اور معرفت سے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے سوال کیا کہ آدمؑ نے اللہ سے کون سے کلمات سیکھے تھے تو فرمایا: "... **قل اللّٰهم انی اسالك بحق محمد و آل محمد ... الخ** "" اے اللہ میں تجھ سے بحق محمد و آل محمد سوال کرتا ہوں۔۔۔۔" ابن النجار نے روایت کی ہے کہ ابن عباس نے رسول اللہ ﷺ سے اس سلسلے میں سوال کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ﴿**سال بحق محمد و علی و فاطمة و الحسن و الحسین الا تبت علی فتاب علیه**﴾ واسطے محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے میری توبہ قبول فرما۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔" (تفسیر در منثور، ج ۱، ص ۶۰، ۶۱ مطبوعہ میمینہ مصر)

ان ذوات مقدسہ کی شان اقدس میں اہل کمال میں سے کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

علی اللّٰه کل الامور توکلی ۔ وبالخمس اصحاب اعلباء توسلی

محمد المبعوث حقا و بنته ۔ و سبطیه ثم المقتدی المرتضیٰ علیؑ

روایت میں قارون کے دھنسائے جانے کا تذکرہ ہے نہ کہ حضرت یونسؑ کا

اس کے بعد مؤلف نے "خطبات جہل" کے ص ۱۲۰، ۱۲۱ اور ۱۲۲ یونس علیہ السلام کے بارے میں اسی نوعیت کا ایک طویل واقعہ درج کیا ہے کہ "انکار امامت کے باعث یونس علیہ السلام کو زمین میں دھنسا کر قارون سے ملا دیا۔۔۔" (نعوذ باللہ) جس سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس روایت میں اللہ کے نبی یونس علیہ السلام کی توہین ہے۔

الجواب: ۔ ملاں نے قرآن کا مطالعہ کیا ہوتا تو اس طرح کے جاہلانہ اعتراضات نہ کرتا۔ اگر یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں سمندروں کی تہوں میں کسی مقام پر قارون سے اس لیے گفتگو کرتے

ہیں کہ قارون نے ان کی تسبیح کی آواز سن کر عذاب دینے والے فرشتے سے اجازت طلب کی کہ کسی آدمی کی آواز آرہی ہے مجھے مہلت دیں میں اس سے بات کرلوں، تب اسے اللہ کی مرضی سے اجازت مل گئی۔ قارون اپنے لوگوں کے بارے میں سوال کرتا ہے اور یونس علیہ السلام جواب دیتے ہیں۔ ایسے سوال وجواب تو مرنے والے سے پہلے سے فوت شدہ لوگوں کی ارواح بھی کرتی ہیں۔ اسی طرح جہنم میں داخل ہونے والے اپنے بعض واقف کار لوگوں کے بارے میں سوال کریں گے، اور کئی ایک مکالمے جنتی اور جہنمی لوگوں میں ہوں گے جن کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے۔ جب آل عمران میں سے کسی کے باقی نہ رہنے کی خبر قارون نے سنی تو اس پر افسوس کا اظہار کیا چونکہ آل عمران اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ خاندان تھا۔ اس لیے ان کی خاطر افسوس کرنے پر اس سے یہ عذاب قبر کی نوعیت کا عذاب اٹھالیا گیا۔ لیکن آخرت کے دائمی عذاب سے تو وہ بچ نہیں سکے گا۔ اس لیے کہ وہ بھی آل عمران کا ناصبی دشمن تھا جس طرح اموی ناصبی اور ان کی اتباع کرنے والے محمد وآل محمد علیہم السلام کے دشمن ہیں۔

اس روایت میں یونس علیہ السلام کو روزانہ قد آدم دھنسانے کا نہیں بلکہ قارون کے دھنسائے جانے کا ذکر ہے۔ لیکن ملاں کی سمجھ ہی الٹی ہے۔

ہر بات یہاں کی الٹی ہے یاں الٹی گنگا بہتی ہے

قارون کے دھنسائے جانے کا تذکرہ اس روایت میں اس طرح ہے:

﴿وکان قارون هلك في ايام موسیٰ عليه السلام و وكل الله به ملكه يدخل في الارض كل يوم قامة رجل وكان يونس في بطن الحوت يسبح الله و يستغفره﴾

قارون موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہلاک ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنا ایک فرشتہ متعین کر دیا جو ہر روز اسے ایک انسان کے قد کے برابر زمین میں دھنسا دیتا ہے۔ جبکہ یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں اللہ کی تسبیح اور استغفار میں مشغول تھے۔۔۔الخ۔

روایت کے ان الفاظ سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) یونس علیہ السلام کو روزانہ زمین میں قد آدم دھنسایا جاتا ہے۔ وہ تو ظلمات البحر یعنی سمندر کی تہہ کی گہرائیوں میں مچھلی کے پیٹ میں

تھے۔ اس ناسمجھ نے کہاں سے سمجھ لیا کہ یونس علیہ السلام کو دھنسایا جا رہا تھا۔ یہ مؤلف اور اس کے مرشد جناب یوسف لدھیانوی صاحب کی کذب بیانی کا شاہکار ہے کہ جھوٹ پر مبنی پروپیگنڈہ کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکاروں سے متنفر کیا جائے اور اپنے اسلاف کی تقلید میں بلاوجہ صرف ولایت اہل بیتؑ کے جرم میں شیعیان علیؑ کے خون میں ہاتھ رنگین کرنے کا شوق بھی دامن گیر رہے۔

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

مؤلف ص ۱۱۲ پر ایک عنوان قائم کرتا ہے کہ "انبیاء کرام ائمہ کے نور سے روشنی حاصل کرتے تھے۔"

الجواب۔ اس سلسلے میں پہلے تفصیلی بحث کی جا چکی ہے کہ تمام اولیاء کو ولایت بواسطہ آل محمدؐ ملی اور اس مقام تک پہنچانے کے لیے اولیاء کی تربیت کے ذمہ دار منجانب اللہ حضرات محمد و آل محمد علیہم السلام ہیں۔ چنانچہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ تمام انبیاء آپ کی شمع امامت و ولایت سے نور کا اقتباس کرتے رہے۔ یہ الٰہی نظام ہے جو ناسمجھ، سطح بین، خشک مغز لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے اس کے سمجھنے کے لیے دیدۂ بینا چاہیے مگر ع

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

قیامت کے دن حضرت علیؑ سب سے آگے ہوں گے

اس کے بعد خطبات جیل کے صفحہ ۱۲۳ پر عنوان قائم کرتا ہے کہ "قیامت کے دن حضرت علی علیہ السلام تمام انبیاء کرام سے آگے ہوں گے۔"

بحوالہ بحار الانوار جلد ۲۶ ص ۳۱۷ حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت نقل کرتا ہے کہ

"حضرت امیر المؤمنین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فضائل و مناقب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا مجھ سے آگے صرف احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے تمام رسول، ملائکہ اور روح القدس ہمارے پیچھے پیچھے ہوں گے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلایا جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بات کریں گے اور مجھے بھی پکارا جائے گا تو میں بھی اتنی ہی بات کروں گا۔"

الجواب:۔ جب یہ امر دلائل و براہین سے ظاہر ہوگیا ہے کہ تمام انبیاء ﷺ نے ولایت محمد و آ
محمد ﷺ کی معرفت حاصل کی ہے تو پھر اس میں کون سا نامعقول امر ہے کہ وہ تمام انبیاءؑ ۔
متقدم بھی ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث پیش خدمت ہے۔ ﴿عن علی اخبرنی رسو
الله صلی الله علیه وسلم ان اول من یدخل الجنة انا و فاطمة و الحسن و الحسن
قلت یا رسول الله فمحبونا قال من ورائکم﴾

حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بتایا کہ سب سے پہلے جنت ؛
داخل ہونے والے، میں (علیؑ)، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہوں گے۔ میں نے پوچھا یا رسول ا
ہمارے محبین (کا کیا ہوگا؟) فرمایا: وہ تمہارے پیچھے پیچھے (جنت میں داخل) ہوں گے۔"
(الصواعق المحرقہ، ص ۹۱، طبع میمنیہ مص

قیامت کے دن حضرت علیؑ کی کرسی دائیں جانب ہوگی

ان روسیاہ مُلاؤں کا رہنما اپنے جاہلانہ خطبات کے ص ۱۲۴ پر لکھتا ہے:

"قیامت کے دن حضرت علی ﷺ کی کرسی عرش الٰہی کے دائیں جانب اور انبیاء کی کرسیا
بائیں جانب ہوں گی۔"

اس ضمن میں بحار الانوار جلد ۲۷ صفحہ ۱۲۸ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ:

"سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں موجود تھے۔ اتنے میں ا
اعرابی آیا (طویل روایت ہے جس میں حضرت علی علیہ السلام کے فضائل مذکور ہیں اسی سلسلہ میں فر
پانچویں بات جبرئیل علیہ السلام نے یہ فرمائی تمام انبیاء کرام ﷺ عرش کے بائیں جانب (کی کرسیو
پر) ہوں گے اور حضرت علی علیہ السلام کی کرسی ان کے اکرام کی بناء پر آپ ﷺ کے پہلو میں لگ
جائے گی۔"

الجواب:۔ اس ناصبی مُلاں کو حضرت علی علیہ السلام کی ہر فضیلت پر اعتراض ہے۔ اگر اس کے ا
بزرگوں کو اس مرتبہ پر بٹھایا جائے اور ان کے ایسے فضائل بیان کئے جائیں جو اہل سنت کی کتاب
میں یقیناً موجود ہیں تو اس احمق ناصبی کو اعتراض نہیں ہے لیکن حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت سننا گ

نہیں ہے۔ اس لیے اس کو توہین انبیاء کا پہلو نظر آ گیا ہے۔

بطور نمونہ صحاح ستہ میں سے ایک روایت پیش کی جاتی ہے:

﴿قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اول من يصافحه الحق عمر و اول من يسلم عليه و اول من ياخذ بيده فيدخله الجنة﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حق تعالیٰ سب سے پہلے جس شخص سے مصافحہ کریں گے وہ عمر (بن خطاب) ہوگا، اللہ تعالیٰ سب سے پہلے جس شخص کو سلامی دیں گے وہ عمر بن خطاب ہوگا اور عمر بن خطاب ہی وہ پہلے شخص ہوں گے جن کے ہاتھ پکڑ کر اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کر دیں گے۔" (سنن ابن ماجہ باب فضل عمرؓ، ص ۱۱، طبع دہلی)

نیز شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب اپنی تصنیف قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین، ص ۱۸ طبع مجتبائی دہلی میں لکھتے ہیں:

﴿اول کسیکه خدا تعالٰی با او مصافحه و معانقه کند فاروق خواهد بسود از حدیث ابی بن کعب قال رسول اللّٰہؐ اول من یصافحة الحق عمر... ﴾

"اول جس شخص سے حق تعالیٰ مصافحہ و معانقہ فرمائے گا وہ عمر فاروق ہوں گے۔۔۔۔"

اعظم طارق بتائے! کیا اس حدیث سے صراحتاً تمام انبیاء ﷺ کی توہین نہیں ہوتی کہ سب رسولوںؑ اور نبیوںؑ سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ حضرت عمر سے مصافحہ کریں گے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ حضرت عمرؓ تمام انبیاء ﷺ سے افضل ہے۔ (العیاذ باللہ) انبیاء کرامؑ تو کیا آپ کے قاعدے کے مطابق تو اللہ تعالیٰ کی بھی زبردست توہین ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ آگے بڑھ کر حضرت عمرؓ کو سلام کرنے میں پہل کر رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کا جسم بھی ہوگا جس سے وہ مصافحہ اور معانقہ کریں گے۔ اس کے بعد تمام انبیاء و مرسلین ﷺ کو چھوڑ کر سب سے پہلے حضرت عمر کو ہاتھ سے پکڑ کر جنت میں داخل کر رہے ہیں۔ گویا یہ ان تمام انبیاء و مرسلین ﷺ سے زیادہ جنت کے حقدار ہیں؟ مُلاں کے سر میں مغز ہے ہی نہیں وہ کیا غور کریں گے۔ اس احمقانہ ناصبیانہ قاعدے کے مطابق، جسے سامنے رکھ کر شیعیان حیدر کرارؑ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا

ہوا ہے، کیا تم خود ہی صریح کفر کا ارتکاب نہیں کر رہے؟ اسی عداوت اہل بیتؑ نے تمہیں جہنم کی آگ میں ڈال رکھا ہے جس کی بناء پر تم حضرت علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام کی ہر جائز منقبت کو بھی توہین انبیاءؑ پر محمول کر لیتے ہو۔

جب حضرت علیؑ بدر، احد، خندق، خیبر و حنین میں نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے آگے آگے اور ان کے دائیں بائیں ان کی حمایت میں جاںنثاری و سرفروشی کا مظاہرہ کر رہے تھے جبکہ بعض لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے دست بردار ہو کر تتر بتر ہو گئے تھے۔ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ جس کا منظر قرآن کریم یوں پیش کرتا ہے:

﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰکُمْ﴾ (سورۃ آل عمران نمبر ۱۵۳) ﴿وَ ضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ﴾ (سورۂ توبہ، آیت نمبر ۲۵) تب مناسب یہی ہے کہ قیامت کے دن بھی جب مراتب کے مطابق کرسیاں لگائی جائیں گی تو حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہوں گے۔ جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ دین آپؐ پر مکمل ہوا۔ اسی طرح حضرت علیؑ خاتم الوصیین ہیں۔ آدمؑ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام نے جس دین کی تبلیغ کی تھی اس کے دوام و استحکام کے ذمہ دار حضرت علیؑ مقرر ہوئے تھے۔ اس لیے یہ اپنی خدمات کے مطابق مناقب کی حیثیت سے اس مقام و مرتبے کے حقیقی وارث تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عرش کے دائیں جانب مختص کر رکھا ہے۔ نیز بائیں جانب والے کوئی اصحاب الشمال تو نہیں ہیں بلکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے اور اصحاب فضیلت ہیں۔ اسی لیے تو ان کی کرسیاں عرش کے قریب لگائی جائیں گی جبکہ باقی عوام محشر میں کھڑے ہوں گے۔

انبیاء علیہم السلام کو حضرت علی علیہ السلام کا مقتدی شیعہ نے نہیں بنایا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ کر حضرت امام مہدی علیہ السلام کے مقتدی بنیں گے۔ اگر توفیق آپ کے شامل حال ہوتی تو اپنے مرشد یوسف لدھیانوی کے خلیفہ مجاز مفتی نظام الدین شامزئی کے رسالہ "عقیدۂ ظہور مہدیؑ" کے ص ۱۱، ۱۲، کا ہی مطالعہ کر لیا ہوتا سب حقیقت آپ کے سامنے آ جاتی لیکن ناصبیت کے تعصب نے آپ کے

دل و دماغ کو اندھا کر رکھا ہے۔

قواعد ابراہیمی کے مطابق کعبہ تعمیر نہ ہو سکا

''اعظم طارق نے خطبات جیل میں اپنی کم فہمی سے ایک عنوان ان الفاظ سے قائم کیا ہے۔ ''حضور ﷺ نے اصلی قرآن جس میں ائمہ اور منافقین کے نام کی آیات تھیں مصلحتاً چھپا لیا تا کہ کہیں تمام لوگ مرتد نہ ہو جائیں۔''

الجواب۔ مؤلف نے سورۂ مائدہ کی آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو تمام احکام نازل شدہ بلا کم و کاست پہنچا دینے کا حکم تھا۔ جس پر آپؐ نے عمل کیا لیکن شیعہ کے نزدیک ائمہ اور منافقین کے اسماء پر مشتمل آیات ظاہر نہیں کیں۔ اس طرح پیغمبر اکرم ﷺ پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

کاش مؤلف نے اپنے مسلک کی بنیادی کتب اصح الکتب صحیح بخاری کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو نبی اکرم ﷺ کا مصلحت پسندانہ اقدام اس کی سمجھ میں آ جاتا چنانچہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک ترجمۃ الباب قائم کیا ہے اور اس ضمن میں ایک روایت درج کی ہے۔ اپنے کم عقلی کی بناء پر الزام لگانے والے کو اس کے غوامض پر غور کرنا چاہیے لیکن احمق سطح بین کب گہرے حقائق تک رسائی پا سکتے ہیں۔ وہ باب اور روایت حسب ذیل ہے:

﴿باب من ترك بعض الاختيار مخافة ان يقصر فهم بعض الناس عنه فيقعوا فی اشد منه..... عن الاسود قال قال لی ابن الزبير كانت عائشة تسر اليك كثيراً منما حدثتك فی الكعبة قلت قالت لی قال النبی صلى الله عليه وسلم يا عائشة لولا قومك حديث عهدهم قال ابن الزبير بكفر هم لنقضت الكعبة فجعلت لها بابين باب يدخل الناس و بابا يخرجون ففعله ابن الزبير﴾

باب اس بات کا کہ کوئی شخص کسی نیکی کے کام کو اس ڈر اور اندیشے سے چھوڑ دے کہ بعض لوگوں کے فہم اسے سمجھنے سے قاصر رہیں گے چنانچہ اس سے بھی بڑی خرابی و فساد میں پڑ جائیں گے...... اسود سے مروی ہے۔ اس نے کہا: مجھے ابن زبیر نے کہا کہ حضرت عائشہؓ بہت خفیہ

باتیں تمہیں بتاتی تھیں کعبہ کے بارے میں انہوں نے تمہیں کیا بتایا؟ میں نے کہا: مجھے عائشہؓ نے
بتایا کہ نبی ﷺ نے فرمایا اے عائشہ اگر تیری قوم تازہ مسلمان نہ ہوئی ہوتی۔۔ (ابن زبیر نے کہا
نئی نئی کفر سے اسلام میں داخل نہ ہوئی ہوتی) تو میں کعبہ کو گرا دیتا اور اس کے دو دروازے بناتا
ایک جس سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرا جس سے لوگ نکلتے۔ ابن زبیر نے یہ کام کر دیا۔"
(صحیح بخاری، ج ا، ص ۲۴ مطبع عثمانیہ مصر

درج بالا حدیث صحیح بخاری میں آٹھ مقامات پر آئی ہے یہی حدیث صحیح مسلم میں اس
طرح ہے: ﴿**لولا حداثة عهد قومك بالكفر لنقضت الكعبة ولجعلتها على اساس ابراهيم....**﴾ اگر تیری قوم کفر سے قریب العہد نہ ہوتی تو میں کعبہ کو گرا دیتا اور اسے ابراہیم کی
بنیادوں پر تعمیر کرتا۔" (صحیح مسلم ج اول ص ۴۲۹ باب نقض الکعبہ و بنائھا)

اصول فقہ کا قاعدہ ہے ﴿**درع المفاسد يقدم على جلب المصالح**﴾ مصالح کے
حصول کے مقابلے میں مفاسد سے بچنا اور ان کو ٹالنا زیادہ ضروری ہے اسی بنا پر امام نووی اس
شرح میں لکھتے ہیں:

﴿**.... لان النبي صلى الله عليه وسلم اخبر ان نقض الكعبة وردها الى ما كانت عليه من قواعد ابراهيم صلى الله عليه وسلم مصلحة لكن تعارضه مفسدة اعظم منه وهي خوف فتنة بعض من اسلم قريبًا**﴾

نبی ﷺ نے خبر دی ہے کہ کعبہ کو گرانا اور اسے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کرنا مصلحت
لیکن اس سے بڑا مفسدہ (فساد کا خوف) اس پر عمل کرنے کی صورت میں سامنے آ گیا۔ یہ فساد
خوف ان لوگوں کے فتنے میں پڑنے کا تھا جو تھوڑا عرصہ قبل ہی اسلام لائے تھے۔
(نووی شرح مسلم ج ا ص ۴۲۹ طبع لکھ

علامہ شبیر احمد عثمانی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

﴿"**ويستفاد منه ترك المصلحة لامن الوقوع فى المفسدة .. الخ**﴾
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فساد میں پڑنے سے بچنے کے لیے کسی مصلحت (

کے اقدام) کو ترک کرنا جائز ہے۔" (فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۳۶۳ طبع بجنور)

اس باب میں مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نبی ﷺ کعبہ کو گرا کر ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کرتے تو بہت سے نومسلم اور منافقین کے اعلانیہ مرتد ہونے کا خطرہ تھا۔ پیغمبر ﷺ کے اس قدام پر معترض ہوتے اور اسلام کو خیرباد کہہ کر اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ جاتے۔ اگرچہ کعبہ کو درست بنیادوں پر تعمیر کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا منشا تھا۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی بنیادیں اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق نشان زد کی تھیں لیکن مسلمانوں کی اکثریت جو مکہ فتح ہونے کے بعد نئی نئی اسلام میں داخل ہوئی تھی اور ابھی کفر کے خیالات پوری طرح ان کے اذہان سے نکلے نہ تھے۔ اسلام سے ہی روگردانی کر جاتی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مصلحتاً اس منشا الٰہی اور نیکی کے کام کو چھوڑ دیا۔ جس کے نتیجہ میں آج تک مسلمان اصلی کعبہ سے محروم ہیں لیکن اگر پیغمبر ﷺ کعبہ کو گرا کر از سر نو تعمیر کرتے تو ممکن تھا عام بغاوت ہو جاتی اور انسانیت اسلام سے ہی محروم ہوتی۔ اس لیے پیغمبر اکرم ﷺ نے اس معاملہ کے دونوں پہلوؤں پر غور کیا۔ فوائد و ضرر پر سوچ بچار کی اور فیصلہ یہی کیا کہ امت اصلی کعبہ سے محروم رہ جائے تو خیر، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسلام کا نام ہی مٹ جائے۔

یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ بیت اللہ وہ گھر ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ﴾ بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے واسطے ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور ہدایت جہان کے لوگوں کو۔" (سورۂ آل عمران، آیت ۹۶)

مولانا شبیر احمد عثمانی اس مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"حق تعالیٰ نے شروع سے اس گھر کو ظاہری و باطنی، حسی و معنوی برکات سے معمور کیا اور سارے جہان کی ہدایت کا سرچشمہ ٹھہرایا ہے۔۔۔۔۔"

ظاہری مرکز جو ہدایت انسانیت کے لیے مقرر کیا گیا۔ انسانوں کی جہالت اور تعصب کی بناء پر ناقص پڑا ہے۔ لہٰذا مؤلف کی بنیادی کتب میں موجود نظریہ کے مطابق جب ہدایت کے لیے

مقرر کردہ پہلا مرکز ہی ناقص ہے (معاذ اللہ) تو دیگر مراکز ہدایت یعنی قرآن اور قرآن ناطق یا امام کے ساتھ مسلمانوں نے جو سلوک کیا ہوگا وہ کعبے کے ساتھ سلوک سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کا حسی مرکز یعنی کعبۃ اللہ آج تک کیوں پیغمبرؐ کی خواہش کے اور حضرت ابراہیمی قواعد کے مطابق تعمیر نہیں ہو سکا، مسلمان اصلی کعبے سے کیوں محروم ہیں؟ کعبہ اپنی ناقص حالت پر کیوں باقی ہے؟ ہم علی وجہ البصیرت اعلان کرتے ہیں کہ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب دنیائے ناصبیت کے ذمہ ہے لیکن قیامت تک ناصبیت ان کا جواب نہیں دے سکتی۔

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے ۔ یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ امتِ مسلمہ کو عصر حاضر کے نواصب کی شرارتوں اور خباثتوں سے محفوظ رکھے۔ آمین و اللّٰہ المؤفق للھدایۃ الی سبیل الرشاد۔

﴿ باب ٦ ﴾

عقیدۂ امامت دراصل عظمت اہل بیتؑ کا مظہر ہے

مؤلف کا بیان مندرجہ ذیل عنوان سے ہے۔ ''عقیدۂ امامت وتوہین اہل بیت رضی اللہ عنہ، مع مسئلہ امامت کی بدولت خاندان رسالت کی باہم خانہ جنگیاں''۔

مؤلف اس کے بعد یوں رطب اللسان ہوتا ہے کہ:

''آخر اس ''اہل بیت'' سے مراد کون لوگ ہیں؟ شیعہ نے اس آیات مبارکہ اور حدیث نبوی کا مصداق صرف پانچ شخصیات کو قرار دیا ہے اور اس معنی میں وہ ''پنج تن پاک'' کا نعرہ لگاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پھر وہ اس میں مزید دوسرے اماموں کو بھی شامل کر کے ان کی معصومیت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ پنج تن پاک کی دلیل میں وہ حدیث ردا کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ایک چادر میں حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حسن وحسین رضی اللہ عنھم اجمعین کو اپنے ساتھ ڈھانپ کر فرمایا: ﴿اللّٰھم ھو لاء اھل بیتی ... الاخر﴾ دوسری طرف اہل سنت والجماعت کا یہ نظریہ ہے کہ قرآن کریم میں اہل بیتؑ کی پاکیزگی وطہارت کو بیان کرنے والی آیت ہی کو اگر دیکھا جائے تو تمام شکوک وشبہات رفع ہو جاتے ہیں اور ہر سوال کا جواب مل جاتا ہے کیونکہ یہ آیت مبارکہ جہاں واقع ہے وہاں تذکرہ ہی ازواج مطہراتؓ کا ہو رہا ہے۔۔۔۔تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ازواج مطہرات ہی ''اہل بیت رسول'' ہیں پھر اگر اس بات کی مزید دلیل درکار ہو کہ آیا اہل بیت کا لفظ بیوی اور زوجہ کے لئے بولا جا سکتا ہے تو قرآن کریم بارہویں پارہ میں سورہ ھود کی آیت نمبر۷۳ میں صاف طور پر موجود ہے کہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے انہوں نے آپ کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ کو مخاطب کر کے جب بیٹے کی خوشخبری دی تو وہ تعجب کرتے ہوئے فرمانے لگیں (کیا میں اب بچہ جنوں گی جبکہ میں بانجھ ہو چکی ہوں اور یہ میرے شوہر (ابراہیم علیہ السلام) بوڑھے ہو چکے ہیں) تو اس کے جواب میں فرشتوں نے کہا: ﴿اتعجبین من امر اللّٰہ رحمة اللّٰہ

و بر کاتہ علیکم اھل البیت ﴾ (کہ اہل بیت جبکہ آپ پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں جاری ہیں تو پھر کیا آپ اس امر رب پر تعجب کرتی ہیں) تو یہاں پر اللہ کے فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ کے لیے "اہل بیت" کا لفظ استعمال کیا ہے تو اب اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہا کہ "اہل بیت" سے مراد آیت تطہیر میں بھی ازواج مطہرات ہیں باقی رہی حدیث رداء تو بعض کتب احادیث میں اس کی بھی وضاحت ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ نے اپنی چادر میں حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسین رضی اللہ اجمعین کو جمع کر کے فرمایا ﴿ **اللّٰھم ھؤلاء اھل بیتی** ﴾ تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس چادر میں داخل ہونا چاہا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم تو پہلے ہی شامل ہو۔" (خطبات جیل ص ۱۳۱ تا ص ۱۳۳)

<u>الجواب</u>:۔ خاندان رسالتؐ سے بغض کی بناء پر عنوان "خانہ جنگیاں" قائم کیا گیا ہے اور مؤلف نے خاندان رسالتؐ پر بہتان لگاتے ہوئے خطبے کے عنوان میں ہی صریح دھوکہ بازی اور کذب بیانی سے کام لیا ہے۔ پورے ہفوے میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کر سکا۔ جس سے خاندان رسالت میں "خانہ جنگی" ثابت ہو۔ شاید ان جاہل اجڈ مُلاؤں کو معلوم ہی نہیں ہے کہ خانہ جنگی کا مطلب و مفہوم کیا ہے؟ پہلے زمانے کے دیوبندی علماء وغیرہ اردو زبان میں اچھی دسترس رکھتے تھے، لیکن دیوبند مسلک سے تعلق رکھنے والے موجودہ مولوی صاحبان تو سکول میں زیادہ سے زیادہ پرائمری پاس کرنے کے بعد دینی مدارس میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں اردو کی تعلیم برائے نام بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ مُلاں ملوکیت کے بندے ہیں اور ان کے بادشاہوں کے خاندانوں میں بادشاہی اور ولی عہدی کی خاطر خانہ جنگی اور قتل و خونریزی ہوتی رہی ہے۔ اس لیے اس ناسمجھ ملاں نے معمولی اختلاف رائے کو بھی گھناؤنا کر کے دکھانے اور خاندان رسالتؐ سے عوام الناس کو نفرت دلانے کے لیے اس طرح کا عنوان قائم کر لیا ہے۔

<u>اہل بیتؑ کون ہیں؟</u>

صفحہ ۱۳۰ پر مندرجہ بالا عنوان قائم کر کے بعد ازیں صفحہ ۱۳۱ پر "اہل بیت کون ہیں؟" کا عنوان بنایا ہے۔

اس مقصد کے لیے خطبے کی ابتدائی سطور ہی میں مُلاں نے شاید اصل ماخذ میں پوری روایت اور اس کا شان ورود پڑھے دیکھے بغیر ہی عنوان قائم کر لیا اور ادھر اُدھر کی غیر متعلقہ باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ اگر مؤلف آیت تطہیر اور اس روایت کا مطلب سمجھ لیتا، تو شاید سیدھی راہ پر آجاتا۔

چنانچہ صحیح مسلم کی جس حدیث کا ذکر مؤلف نے اپنے خطبے میں کیا ہے اس کو بھی پوری طرح نقل نہیں کیا۔ اس کے بعض حصے کو عمداً چھپانے کی ناپاک جسارت کی ہے تاکہ حقیقت ظاہر نہ ہو جائے۔ انصاف پسند قارئین کے سامنے پوری روایت پیش کی جاتی ہے تاکہ خود بھی کچھ غور وفکر کر لیں۔ مُلاں کی ہر بات پر اعتماد نہ کریں ورنہ متعصب مُلاں عوام مسلمانوں کو بھی گمراہی کے گڑھے میں ساتھ لے جائے گا۔ پوری حدیث یہ ہے کہ چند اشخاص صحابی رسولؐ حضرت زید بن ارقمؓ کے پاس گئے اور فرمائش کی کہ انہیں رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی کوئی ایک حدیث سنائیں تو حضرت زید بن ارقمؓ نے کہا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ طویل زمانہ بیت گیا ہے میں بعض باتیں بھول گیا ہوں اس لیے جو بیان کروں وہ قبول کرو اور جو بیان نہ کروں اس کے جواب کی تکلیف مجھے نہ دینا۔ پھر زیدؓ نے کہا ﴿قام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوما فینا خطیباً بماء یدعٰی خماً بین مکۃ و المدینۃ فحمد اللّٰہ و اثنیٰ علیہ و وعظ و ذکر ثم قال اما بعد الا ایھا الناس فانما انا بشر یوشك ان یاتی رسول ربی فاجیب و انا تارك فیکم ثقلین اولھما کتاب اللّٰہ فیہ الھدی و النور فخذوا بکتاب اللّٰہ واستمسکوا بہ فحث علیٰ کتاب اللّٰہ و رغب فیہ ثم قال و اھل بیتی اذکّرکم اللّٰہ فی اھل بیتی اذکرکم اللّٰہ فی اھل بیتی فقال لہ حصین و من اھل بیتہ یا زید؟ الیس نساوہ من اھل بیتہ قال نساوہ من اھل بیتہ ولکن اھل بیتہ من حرم الصدقۃ بعدہ قال و من ھم قال ھم آل علی و آل عقیل و آل جعفر و آل عباس قال کل ھولاء حرم الصدقۃ قال نعم﴾

ایک روز رسول اللہ ﷺ مکہ اور مدینہ کے درمیان ''خم'' نامی پانی (والی جگہ) کے نزدیک ہمیں خطبہ دینے کھڑے ہوئے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور وعظ و تذکیر کے بعد فرمایا: اے لوگو! سن لو کہ میں

ایک انسان ہوں۔ قریب ہے کہ میرے رب کا رسول میرے پاس آئے پس میں رخصت ہو جاؤں۔ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے اس میں ہدایت اور نور ہے۔ اللہ کی کتاب کو پکڑو اور اس سے تمسک کرو۔ چنانچہ آپ نے اللہ کی کتاب (پر عمل کرنے) کے لیے ابھارا۔ اور اس سلسلے میں خوب ترغیب دی۔ پھر فرمایا: اور میرے اہل بیت ہیں میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے اہل بیتؑ کے سلسلے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔ حصین (راوی) نے زیدؓ سے کہا: اے زید، رسولؐ کے اہل بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی بیویاں آپ کے اہل بیت میں سے نہیں ہیں؟ زیدؓ نے کہا: آپ کی بیویاں آپ کے اہل بیت میں سے ہیں لیکن (یہاں آپ کے) اہل بیت (سے مراد) وہ ہیں جن پر آپؐ کے بعد صدقہ حرام ہے۔ حصین نے کہا: وہ کون ہیں؟ زیدؓ نے کہا: وہ آل علیؑ، آل عقیل، آل جعفر اور آل عباس ہیں۔ حصین نے کہا: ان سب پر صدقہ حرام ہے؟ زید نے کہا: ہاں۔

صحیح مسلم کے اسی باب میں محولہ بالا روایت کے الفاظ قدرے تغیر کے ساتھ اس طرح منقول ہیں:

”..... الا و انی تارک فیکم الثقلین احدھما کتاب اللّٰہ ھو حبل اللّٰہ من اتبعہ کان علی الھدی و من ترکہ کان علی الضلالۃ و فیہ فقلنا من اھل بیتہ نساوہ قال لا ایم اللّٰہ ان المراۃ تکون مع الرجل العصر من الدھر ثم یطلقھا فترجع الی ابیھا و قومھا اھل بیتہ اصلہ و عصبتہ الذین حرموا الصدقۃ بعدہ۔

خبردار! میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑ رہا ہوں ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے۔ یہی اللہ کی رسی ہے۔ جس نے اس کی پیروی کی وہ ہدایت پر ہوا جس نے اس کو چھوڑ دیا گمراہی پر ہوگا۔ اس میں یہ بھی ہے کہ ہم نے پوچھا: آپؐ کے اہل بیت کون ہیں؟ آپ کی بیویاں؟ زیدؓ نے کہا: نہیں، اللہ کی قسم عورت تو ایک زمانہ تک مرد کے ساتھ رہتی ہے۔ پھر وہ اسے طلاق دے دیتا ہے تو اپنے باپ اور قوم کے پاس واپس چلی جاتی ہے۔ آپؐ کے اہل بیت آپ کے اصل اور وہ عصبہ (خاندان کے لوگ) ہیں جن پر آپؐ کے بعد صدقہ حرام ہوا۔“

(صحیح مسلم، ج ۲، ص ۲۷۹، ۲۸۰، طبع نول کشور)

مزید برآں یہ حدیث سنن ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں بھی مروی ہے۔ علاوہ ازیں حدیث کی بے شمار کتب میں متعدد صحابہ کرامؓ سے یہ حدیث مروی ہے۔ ان کتب میں ''اہل بیتی'' کی وضاحت لفظ ''عترتی'' یعنی میری عترت سے کی گئی ہے۔ جس کا معنی اولاد ہے اور نسل ہے حضرت زید بن ارقمؓ صحابی نے واضح لفظوں میں اس لفظ اہل بیت کا مفہوم متعین کر دیا ہے اور کسی اس مرتبے کے صحابی سے اہل سنت کے نزدیک ممکن ہی نہیں کہ وہ ایسا شرعی مفہوم محض اپنے اجتہاد اور خیال سے متعین کر لے اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دے۔ یقیناً یہ مفہوم رسول اللہ ﷺ نے واضح کیا ہے۔ تب ہی اس مرتبے کے صحابی بڑھاپے کے دور میں خصوصی طور پر حدیث غدیر خم (حدیث ثقلین) بیان کرتا ہے اور جب لوگ اس حدیث اور اس کے مفہوم حقیقی سے غافل ہو کر غلط سمت میں چل پڑے تھے تو لوگوں کو اہل بیت کے مرتبہ کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ یاد رہے کہ حضرت زید بن ارقمؓ کی وفات سن ٦٦ ھ میں ہوئی ہے۔ اس وقت آپ بوڑھے تھے جب یہ روایت بیان کر رہے تھے اور کوفہ میں مقیم تھے۔ آپ کی عمر اس زمانے میں ستر سال سے کم نہ ہوگی۔ معاویہ بن ابی سفیان یا اس کے بیٹے یزید کی حکومت تھی اور اہل بیتؑ پر شدید مظالم ہو رہے تھے۔ اس دور میں اس جلیل القدر صحابی نے سیدھی راہ سے ہٹے ہوئے سرکاری مذہب کے پیروکاروں کو راہِ ہدایت دکھائی اسی لیے تو انہوں نے فوراً کہا کیا ازواج رسول اہل بیت نہیں ہیں؟ اموی مذہب کا پروپیگنڈہ یہی تھا کہ ازواج رسول اہل بیت ہیں۔ علی، حسن، حسین اور دیگر بنو ہاشم کا اس اعزاز سے کوئی تعلق نہیں آج تک اموی مذہب کے ماننے والے اس غلط مفہوم پر ڈٹے ہوئے ہیں اور خواہ مخواہ دیگر آیات قرآن سے اس مفہوم کی تائید میں استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ صحابی رسولؐ کی زبانی واضح ہو گیا ہے کہ اہل بیت سے مراد رسول اللہ ﷺ کے خاندان کے لوگ ہیں۔ بالخصوص وہ پنج تن پاک ہیں جنہیں آیت تطہیر کا مصداق قرار دے کر رسول اللہ ﷺ نے اپنا اہل بیت قرار دیا ہے۔

اہل بیت رسولؐ میں ازواج داخل نہیں ہیں

اہل بیتؑ کی تخصیص و تقلید اور ان کے مرتبہ و مقام کو مزید اجاگر کرنے والی احادیث اہل

سنت کی بنیادی اور معتمد علیہ کتب میں حضرت ام سلمہؓ حضرت عائشہؓ اور دیگر جلیل القدر صحابہ کرا
سے بکثرت نقل ہوئی ہیں یہ تمام کی تمام متصل اور صحیح ہیں حتیٰ کہ بعض محدثین نے ان کے متوا
ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ آیت تطہیر کی تفسیر میں اس مضمون کی متعدد روایات لائے ہیں۔ جن میں
یہ وارد ہے کہ ام المؤمنین جناب ام سلمہ کہتی ہیں کہ آیت تطہیر میرے گھر میں اتری۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے
حضرت علی، فاطمہ، حسن، حسین علیہم السلام پر ایک چادر پھیلائی خود بھی اس چادر کے نیچے داخل ہوئے او
فرمایا۔ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے رجس دور فرما دے اور انہیں اس طرح پاک کر
دے جس طرح پاک کرنے کا حق ہے۔ میں نے کہا: کیا میں اہل بیت میں سے نہیں ہوں؟ تو رسول
اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿انك الى خير انك من ازواج النبى صلى الله عليه و آله وسلم﴾
''تیرے لیے بھلائی ہے تو ازواج رسول ﷺ میں سے ہے۔'' (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۸۵، تفسیر
در منثور ج ۵ ص ۱۹۸، تیسیر الوصول ج ۲ ص ۱۶۱۔ معالم التنزیل بغوی ج ۳ ص ۲۱۳)

مؤلف کا یہ کہنا کہ شیعہ کے نزدیک اہل بیتؑ صرف پنج تن پاک ہیں اور اس کا نعرہ شیعہ
لگاتے ہیں مگر معترض کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ نعرہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لگایا ہے۔ اہل بیتؑ نے
لگایا ہے اور صحابہ کرامؓ میں سے ان صحابہؓ نے لگایا جو پیغمبر علیہ السلام سے کیے ہوئے عہد پر قائم اور ثابت
قدم رہے اور ﴿ما احدثوا بعدك﴾ کا مصداق نہیں بنے۔ محدثین بالاتفاق یہ حدیث نقل کرتے
ہیں کہ ابو سعید خدری ﷺ سے مروی ہے کہ ﴿انها نزلت فى خمسة، النبى صلى الله عليه
وسلم و على، و فاطمة، و الحسن، و الحسين﴾ یہ آیت پانچ افراد کے بارے میں نازل
ہوئی۔ نبی، علی، فاطمہ، حسن اور حسین (علیہم الصلوٰۃ والسلام)۔ (المعجم الکبیر طبرانی ج ۳ ص ۵۶
حدیث نمبر ۲۶۷۳، المعجم الصغیر للطبرانی ص ۷۵ طبع دہلی، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱۱ ص ۳۷۱ طبع
ملتان)

مباہلہ کے وقت بھی یہی پانچ مقدس و مطہر ہستیاں نجران کے عیسائیوں کے مقابلے کے
لیے میدان میں نکلی تھیں۔ چنانچہ جس طرح آپ لوگوں نے ''چار یار'' کی اصطلاح گھڑ لی ہے۔ مگر
مسلمانوں نے ''پنج تن پاک'' کی اصطلاح ان آیات و احادیث سے اختیار کی ہے۔ یہ حقیقی مذہب

اسلام کے پیروکاروں کی خود ساختہ بے بنیاد اور من گھڑت اصطلاح نہیں ہے۔ واقعہ مباہلہ کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے آیت مباہلہ کے ضمن میں علامہ شبیر احمد عثانی کی ''تفسیر عثانی'' اور مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر ''بیان القرآن'' کو ہی دیکھ لیجیے۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنی ازواج کو ﴿قومی فتنحی لی عن اهل بیتی﴾ (اٹھ کر میرے اہل بیتؑ سے دور جاؤ) فرما کر اہل بیت کی تخصیص کر دی ہے چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ جب میں نے چادر کے نیچے اہل بیتؑ میں داخل ہونے کی کوشش کی تو آقائے نامدار ﷺ نے مجھے فرمایا: ﴿قومی فتنحی لی عن اهل بیتی﴾ ''اٹھ کر میری اہل بیت سے دور ہو جایئے'' جناب ام سلمہؓ نے کہا: ﴿فقمت فتنحیت فی ناحیة البیت﴾ ''میں اٹھی اور گھر کے ایک گوشے میں ہوگئی۔'' (ملاحظہ فرمائیں: مسند الامام احمد ج ۶ صفحہ ۲۹۷، المعجم الکبیر طبرانی ج ۲۳ صفحہ ۳۹۳، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۶۶، جامع الاحادیث السیوطی ج ۱۸ ص ۱۲۸، مرقاۃ شرح مشکوۃ ج ۱۱ صفحہ ۳۷۱ طبع ملتان)۔

اسی طرح حضرت عائشہؓ سے اس وقت فرمایا جب انہوں نے کہا: ﴿یا رسول الله وانا من اهل بیتك﴾ تو آپؐ نے فرمایا: ﴿فتنحی فانك علی خیر﴾ ''اٹھ جاؤ تو بھلائی پر ہے۔'' (تفسیر ابن ابی حاتم ج ۷ ص ۲۴۰ تفسیر ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۴۸۷)

درج بالا احادیث کی ثقاہت یقینی ہے

ان احادیث کی صحت وثقاہت کو امام ابن تیمیہ حنبلی ایسے متعصب نے بھی تسلیم کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف ''منہاج السنہ'' کے کئی صفحات میں اس امر کی تصریح کر دی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿وقد ثبت انه صلی الله علیه وسلم ادخلهما مع ابویهما تحت الکساء وقال اللهم هؤلاء اهل بیتی فاذهب عنهم الرجس......﴾ (منہاج السنہ، جلد ۲، صفحہ ۱۲۱)

اور بے شک یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام حسن وحسین کو اپنے ماں باپ سمیت چادر کے نیچے داخل کیا اور فرمایا: اے اللہ! یہی میرے اہل بیتؑ ہیں ان سے رجس کو

دور رکھ اور ایسا پاک رکھ جیسا پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔"

ایک مقام پر یوں لکھتے ہیں ﴿و اما حدیث الکساء فھو صحیح رواہ احمد والترمذی من حدیث ام سلمة و رواہ مسلم فی صحیحہ من حدیث عائشة. ... ﴾ (ایضاً جلد ۳ صفحہ ۴)

دوسری جگہ ان الفاظ کے ساتھ لکھا ہے:

﴿ان ھذا الحدیث صحیح فی الجملة فانہ قد ثبت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لعلی و فاطمة و حسن و حسین اللّٰھم ان ھؤلاء اھل بیتی فاذھب عنھم الرجس و طھرھم تطھیراً...... ﴾ (ایضاً ج ۴ ص ۲۰)

"یہ حدیث فی الجملہ صحیح ہے چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے علی، فاطمہ اور حسن و حسین کے لیے فرمایا اے خدا یہی میرے اہل بیت ہیں پس ان سے رجس کو دور رکھ......"

بلکہ شاہ ولی اللہ محدث الدہلوی نے اس حدیث کو متواتر کہا ہے جیسا کہ فرماتے ہیں

﴿و من المتواتر حدیث لما نزلت انما یرید اللّٰہ لیذھب اللّٰہ..... دعا رسول اللہ علیہ وسلم لھؤلاء الخمسة روی ذلك من حدیث بعد و ام سلمة و واثلة و عبد اللہ بن جعفر و انس بن مالك﴾ (ازالۃ الخلفاء، جلد ۲، صفحہ ۲۶۰)

اور متواتر میں سے یہ حدیث ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿انما یرید اللّٰہ لیذھب..... ﴾ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی پانچ کو بلایا، یہ حدیث حضرت سعدؓ، ام سلمہؓ، حضرت واثلہؓ، عبد اللہؓ بن جعفر اور حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے۔

آیت ﴿اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ...... ﴾ میں ﴿اَتَعْجَبِیْنَ﴾ تک صرف حضرت سارہ سے خطاب ہے اور ﴿رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ ﴾ میں تمام اہل بیت نبوت اور حضرت ابراہیمؑ مع سلسلہ انبیاء بنی اسرائیل سب داخل ہیں جیسا کہ تفسیر مظہری ج ۵ ص ۲۹ پر موجود ہے کہ رحمت سے مراد نبوت اور برکات سے مراد انبیاء بنی اسرائیل

ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس آیت میں اہل بیت سے مراد خاندان ابراہیم علیہ السلام کے معصوم افراد قابل رحمت و برکت مراد ہیں نہ صرف زوجہ من حیث الزوجہ آل ابراہیم کے فضائل کی تمام آیات مبارکہ اس امر پر شاہد ہیں۔ ثانیاً یہ کہ حضرت سارہؑ اس لیے اہل بیت میں شامل ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خانوادۂ عالی کا ایک فرد ہیں نہ اس وجہ سے کہ وہ ان کی بیوی تھیں چونکہ جناب سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کی بیٹی، حضرت اسحاق علیہ السلام کی ماں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی دادی تھیں۔

بس قرآن و حدیث سے جو بات پایۂ ثبوت کو پہنچی وہ یہی ہے کہ ازواج رسول ﷺ اہل بیت، عترت رسول میں شامل نہیں ہیں بلکہ عترت اہل بیت سے مراد علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ان کے بعد نو ائمہ اہل بیتؑ ہیں۔ برادران اہل سنت اسی کے قائل ہیں۔ صحابہ کرامؓ کا یہی نظریہ تھا جس کی وضاحت جناب زید بن ارقمؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ نے کی ہے۔ ناصبی پہلے بھی اس مفہوم کے منکر تھے۔ آج بھی منکر ہیں۔ آئندہ کا حال اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ لیکن سادہ لوح مسلمانوں کو ورغلانے کی کوششیں خدا کے لیے ترک کر دیں ۔

عرض خود می بری و زحمت مامیداری

ایک ضروری وضاحت:۔ اہل سنت کے ہاں اصح الکتب صحیح بخاری کے بعد سب سے زیادہ معتمد علیہ اور معتبر ترین کتاب صحیح مسلم ہے جس میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ وغیرہا ازواج نبی کا علیحدہ باب باندھا گیا ہے جبکہ اہل بیت النبیؐ کے فضائل و مناقب کا باب الگ قائم کیا ہے اگر ازواج بھی اہل بیتؑ میں داخل ہوتیں تو امام مسلم ازواج کو اہل بیت کے باب میں ہی شامل کر لیتے؟

اسی طرح کتب صحاح ستہ میں سے سنن ترمذی ہے اس میں بھی ''ازواج النبیؐ'' کا باب الگ ہے اور ''اہل بیت النبیؐ'' کے لیے ایک علیحدہ باب درج کیا ہے اور اہل بیت والے باب میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملتی ہے جس میں اشارۃً بھی ازواج نبی کا ذکر ہو۔ احادیث کی نہایت مستند کتاب مشکواۃ شریف ہے جس مقام پر فضائل کا ذکر ہے وہاں پر ''باب مناقب اھل بیت

النبیؐ" اور پھر "باب مناقب ازواج النبیؐ" آیا ہے یعنی اہل بیتؑ کے فضائل الگ اور ازواج کے فضائل الگ ہیں۔ اہل سنت کی احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ کتاب کنز العمال از علامہ علاؤ الدین علی متقی الھندی ہے اس میں "**الفصل الرابع فی فضل اھل البیت**" کے عنوان سے الگ ذکر ہے اور ازواج نبی کا ذکر ایک علیحدہ باب میں ہے اور اسی طرح کتاب مسند الامام احمد ہے جو ساڑھے سات لاکھ حدیثوں سے صحیح احادیث کا انتخاب ہے جو نہایت اہتمام اور کمال صحت سے لکھی گئی ہے اس میں امام احمد بن حنبل نے ازواجؓ کو علیحدہ لکھا ہے اور اہل بیتؑ کو علیحدہ۔ مسند الامام احمد مطبوعہ المطبعۃ المیمنیہ مصر میرے پیش نظر ہے اس کی جلد اول ص ۱۹۹ پر "مسند اھل البیت رضوان اللہ علیھم اجمعین" ہے جس میں حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ وغیرہما کی ہی حدیثیں ہیں ایک حدیث بھی کسی زوجہ نبی ﷺ سے مروی نہیں ہے بلکہ امام احمد نے آخری جلد نمبر ۶ ص ۲۹ پر "مسند ازواج" کو شروع کیا اسی صفحہ پر "**مسند السیدۃ عائشۃ رضی اللہ عنھا**" موجود ہے اور پھر ص ۲۸۳ پر "مسند حفصہ بنت عمر بن الخطاب" ہے اسی طرح دیگر ازواج نبیؐ کی مسندوں کو درج کیا ہے لہٰذا امام احمد بن حنبل ایسے محدث کا اہل بیتؑ کی حدیثیں علیحدہ اور ازواج نبیؐ کی حدیثوں کو الگ کر کے لکھنا ہی اس امر کی واضح اور قطعی دلیل ہے کہ نہ اہل بیتؑ کسی طرح ازواج میں داخل ہیں اور نہ ہی ازواج، اہل بیت نبیؐ میں شریک ہو سکتے ہیں۔ تمام برادران اہل سنت خطبہ پڑھتے اور لکھتے ہوئے پہلے آل کا ذکر پھر عطف کے ساتھ ازواج کا ذکر کرتے ہیں علم نحو کا ابتدائی طالب علم بھی جانتا ہے کہ عطف تغائر کا مقتضی ہے چنانچہ شرح جامی میں یہ واضح قاعدہ موجود ہے ﴿بخلاف **العطف فان المعطوف یغائر المعطوف علیہ**﴾ (شرح جامی ص ۱۹۹) جب معطوف اور معطوف علیہ باہمی مغائر ہیں تو اس سے ظاہر ہوا کہ ازواج ہرگز اہل بیتؑ میں شامل نہیں ہیں۔

نواصب کتے اور خنزیر کے برابر ہیں

مؤلف جذبۂ مذموم کے زیر اثر اپنے تشدد آمیز لہجہ میں یوں گویا ہوتا ہے کہ:

"چونکہ شیعہ کو انبیاء ﷺ، ازواج مطہرات، اصحاب رسولؐ کی شان اقدس میں گستاخیاں کرنے، تبرا بازی کی مشق کرنے اور اٹھتے بیٹھتے اپنے مزعومہ اماموں کی زبان سے اصحاب رسول

ﷺ و ازواج مطہرات پر لعنت کرنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ وہ بد زبانی اور بد گوئی کے مرض میں مبتلا ہو کر اس پاگل کتے کی طرح ہو گیا جو پاگل ہو کر (یعنی ہلکا ہو کر) پھر اپنے مالکوں ہی کو کاٹنے کے لیے لپکنے لگتا ہے۔" (خطبات جہلم، ص ۱۴۴)

الجواب: ناصبی مؤلف کا یہ کہنا کہ شیعوں کو تبرا بازی کی عادت پڑی ہوئی تھی چنانچہ اس مرض میں پاگل ہو کر اپنے مالکوں کو پاگل کتے کی طرح کاٹنے لگے۔

قارئین محترم! مؤلف نے سطحی جذبات سے مغلوب ہو کر، گری ہوئی اور ناروا زبان استعمال کی ہے۔ بقول حافظ شیرازی ﴿اذا یئس الانسان طال لسانہ کسنور مغلوب یصولی علی الکلب﴾ کہ جب آدمی ہر طرح سے عاجز آ جاتا ہے تو زبان درازی پر اتر آتا ہے ہم تو صرف اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ:

تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

اس طرح مؤلف نے محض تعصب و عناد کی بنا پر زبان درازی کرنے کی جرأت کی ہے ورنہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ان تخریب کار اور فتنہ پرداز نواصب و خوارج کے شر سے آگاہ فرماتے ہوئے ان کی مذمت ان الفاظ میں کی ہے کہ:

﴿الخوارج کلاب النار﴾ "خوارج جہنمی کتے ہیں۔" (سنن ابن ماجہ ص ۱۶ طبع فاروقی دہلی)

دنیاوی کتے مر جانے کے بعد حساب و کتاب سے آزاد ہیں لیکن وہ انسان جو اسلام اور مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کے دشمن ہوں انہیں جہنمی کتے قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ انہیں انسان بنایا گیا تھا لیکن انہوں نے انسانی کردار نہ اپنایا بلکہ کتوں کا کردار اپنا کر انسانوں میں شر و فساد اور نفرت و نفاق پیدا کرتے رہے کیونکہ نواصب نے کلاب النار کا کردار اختیار کر رکھا ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی لکھتے ہیں:

"...... فرقہ اہل سنت کہ شیعہ خاص جناب مرتضوی اند و بدل و جان فدای خاندان نبوی اند و ہمیشہ با نواصب شام و مغرب و عراق مجاہدات سیفی و سنانی و مناظرات علمی و لسانی نمودہ اند و نصرت

شعائر شریعت و ازاله بدعات مروانیه کرده آمده اند، و نواصب را ابد ترین کلمه گویان و همسر کلاب و خنازیر میدانند"

فرقہ اہل سنت حضرت علی علیہ السلام کے خاص شیعہ ہیں۔ دل و جان سے خاندان نبوی پر فدا ہیں اور ہمیشہ شام، مغرب اور عراق کے نواصب کے ساتھ تیر و تلوار سے جنگیں اور علمی و زبانی مناظرے کرتے آئے ہیں۔ شعائر شریعت کی نصرت اور مروانیوں کی بدعات کے ازالہ میں کوشاں رہے ہیں۔ نواصب کو بدترین کلمہ گو، کتے اور خنزیر کے برابر جانتے ہیں۔"

(تحفۂ اثنا عشریہ ص ۸، ۹، طبع لکھنؤ)

تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ نواصب نے شروع سے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ نمائندوں، پیغمبرؐ اور خاندان پیغمبرؐ پر تبرا بازی کا مکروہ دھندہ اختیار کیا اور اس سلسلے میں پاگل کتوں اور خنزیروں کی طرح اہل بیت نبوی پر حملہ آور ہوتے رہے۔ پس انہیں تاریخ کے آئینے میں اپنا مکروہ چہرہ نظر آتا ہے تو الزام دوسروں پر لگانے لگتے ہیں اور کتے کی طرح ہی اپنا ناپاک عکس دیکھ کر بھونکنے لگتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت ایسے مکروہ کردار سے باز آ جائیں ورنہ اہل حق کا قافلہ تو یہ کہتے ہوئے اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں رہے گا۔

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نکند رزق گدارا

محترم قارئین! اگر سطور بالا میں کوئی متشدد لفظ قلم سے نکل گیا ہو تو ہم معذرت خواہ ہیں کیونکہ اس کی وجہ "جواب آں غزل" ہے۔ ع

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ناصبی سادات کا اہل بیت اطہارؑ سے انحراف

مؤلف لکھتا ہے کہ "امام جعفر کا فرمان ــــــ ہم میں ہر ایک کے دشمن اہل بیت ہی میں سے کچھ لوگ ہوتے ہیں۔"

احتجاج طبرسی ص ۱۹۷ سے ایک عبارت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اہل بیتؑ میں سے ہر ایک امام کے دشمن اس کے خاندان میں سے بھی کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ حضرت حسن علیہ السلام کی اولاد کے لوگ ہمارا حق جانتے ہیں لیکن حسد کی وجہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ (خطبات جیل ص ۱۳۴)

الجواب:۔ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے شاید قرآن کریم بھی نہیں پڑھا۔ اس کو اہل بیت دشمنی نے اندھا کر رکھا ہے۔ حل طلب امر یہ ہے کہ کیا انبیاء علیہم السلام کی تمام اولاد نیک کردار ہوتی ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے دوسرے کو قتل کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے اور بیوی نے کفر اختیار کیا اور اسی پر ان کی موت واقع ہوئی۔ یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے باپ اور بھائی کے ساتھ جو سلوک روا رکھا وہ مُلاں صاحب کو شاید معلوم نہ ہو لیکن صرف تراویح پڑھنے والوں کو نہیں بلکہ سمجھنے والوں کو معلوم ہے۔ بنو اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی لیکن انہوں نے اپنے انبیاءؑ اور نیکوکار لوگوں کے ساتھ جو روش اپنائی وہ سب پر ظاہر ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض قریبی رشتہ داروں مثلاً ابولہب کی مذمت قرآن کریم میں موجود ہے۔ یہی حال اہل بیت علیہم السلام یعنی پنج تن پاک کی اولاد کا بھی ہے۔ امام معصوم صرف بارہ ہیں حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمیت معصومین چودہ ہیں۔ ان کی باقی اولاد معصوم نہیں ہے۔ نیک و بد دونوں طرح کے ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب منصب امامت سے سرفراز فرمایا گیا تو ان کی اس استدعا پر کہ ﴿وَ مِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ فرمان رب العزت یوں ہوتا ہے کہ ﴿قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ تو معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں ظالمین کا عنصر بھی موجود ہے۔ چنانچہ تاریخ میں موجود ہے کہ بہت سے سادات فاطمی ناصبی گزرے ہیں اور انہوں نے نواصب سے رشتے اور تعلقات قائم کیے ہیں۔ موجودہ زمانے میں صرف ہمارے برصغیر پاک و ہند میں بنو فاطمہ میں سے سادات خاندان کے بہت سے افراد ناصبی ہیں۔ اگر سادات بنو فاطمہ ائمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے وفادار ہوں گے تو واجب الاحترام ہیں اور ان کی خاندانی شرافت ایک اضافی وجہ اکرام ہے۔ اگر ناصبی ہوں گے تو اپنا احترام ضائع کر بیٹھیں گے۔ اس میں مؤمن ہونا شرط ہے

جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں وضاحت موجود ہے ﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ اور جو لوگ ایمان لے آئے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی، ان کی اولاد کو (جنت میں) ہم ان سے ملا دیں گے اور ان کے عمل میں سے ہم کچھ بھی کم نہیں کریں گے۔ (سورۂ طور، آیت ۲۱)

لہٰذا اگر سید ناصبی ہو گیا ہے تو اس کی بخشش کہاں، اگر ناصبی سید کی نجات مان لی جائے تو امکان کذب لازم آتا ہے جو بالاتفاق محال ہے۔ نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کو دیکھئے کتنا نافرمان نکلا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ حکم دینا پڑا۔ ﴿اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ﴾ تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اس کا کردار نیک نہیں ہے ع

پسر نوح چوں بہ بداں بہ نشست
خاندان نبوتش گم شد

جب وہ برے (کافروں) کے ساتھ بیٹھا (ان کے ہمنوا ہو کر ان میں شامل ہوا) تو اس کا بیٹا ہونے کی حیثیت ختم ہو گئی، سچ ہے کہ ع سید آن ست کہ بر مذہب اسد اللہ باشد

ثانیاً اینکہ یہ روایت ہی ناقابل اعتبار ہے اس کا آغاز صیغہ تمریض "وروی عنہ" سے ہوا ہے جو اس کے ضعیف ہونے کی ایک محکم دلیل ہے۔

ضعیف روایت سے "اولاد البغایا" پر استدلال

مؤلف نے ایک عنوان ان لفظوں سے قائم کیا ہے۔ "امام باقر کا فرمان "۔۔۔۔ ہمارے شیعوں کے علاوہ سب لوگ کنجریوں کی اولاد ہیں۔ روضہ کافی کے صفحہ نمبر ۲۸۵ میں ہے امام باقر علیہ السلام نے فرمایا۔۔۔۔۔ اللہ کی قسم اے ابو حمزہ سب لوگ (کنجریوں) بدکار عورتوں کی اولاد ہیں سوائے ہمارے شیعوں کے۔" (خطبات جیل، ص ۱۳۵)

الجواب:۔ برادران اہل سنت برملا اعلان کرتے ہیں کہ وہ خاندان رسول کے خاص شیعہ ہیں جیسا کہ شاہ عبدالعزیز کے الفاظ میں یہ اعلان چند سطور پہلے گزر چکا ہے۔ باقی رہے نواصب، تو واقعی ایسے ہی ہیں۔ چنانچہ ابن حجر مکی نے فرمان رسول نقل کیا ہے:

﴿من لم یعرف حق عترتی و الانصار و العرب فھو لا حدی ثلاث، اما منافق و اما ولد زانیة اما امر و حملت به فی غیر طھر﴾

جو شخص میری عترت، انصار اور عرب کا حق نہ پہچانے، وہ ان تین میں سے ایک ہوگا۔ یا تو منافق ہوگا۔ یا زانیہ عورت کا بیٹا ہوگا یا اس کا حمل اس کی ماں کو ناپاکی کی حالت میں ہوا ہوگا۔"

(الصواعق المحرقہ ص ۱۷۳ طبع قاہرہ)

اگر اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو ہم مشہور مؤرخ ابن اثیر جزری کی منقول حدیث کا آئینہ بھی دکھا دیتے ہیں تا کہ اس میں اپنا مکروہ عکس دیکھ لیں۔ چنانچہ رقمطراز ہیں:

﴿(وفی حدیث جعفر الصادق رضی اللّٰہ عنه) لا یحبنا اھل البیت المذعذع، قالوا وما المذعذع قال ولد الزنا﴾ "امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ہم اہل بیت سے مذعذع محبت نہیں کرے گا۔ لوگوں نے پوچھا: یا ابن رسول اللہ مذعذع کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ولد الزنا۔" (نہایہ ابن اثیر ج ۲ ص ۴۸ طبع مطبعۃ خیریہ مصر)

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی پیش کردہ روایت راویوں کے لحاظ سے بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہم ایک راوی کے بارے میں علماء رجال اور فن حدیث کے ماہرین کی رائے کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ راوی علی بن عباس الحزاذینی الرازی ہے۔ اس سے متعلق کتب رجال میں درج الفاظ یہ ہیں: "..... رمی بالغلو و غمز علیه ضعیف جداً له تصنیف فی الممدوحین و المذمومین یدل علی خبثه و تھالك مذھبه لا یلتفت الیه و لا یعبا بما رواہ۔"

اس پر غالی ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ نیز اسے انتہائی درجہ ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ اس کی ایک کتاب ممدوحین اور مذمومین کی بابت ہے جو اس کے خبیث ہونے اور اس کے مذہب کی ہلاکت آفرینی پر دلالت کرتی ہے چنانچہ یہ قابل التفات نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی مرویات کو قبول کیا

جائے گا۔" (تنقیح المقال ج ۲ ص ۲۹۴ طبع نجف۔ رجال نجاشی ص ۱۸۰ طبع بمبئی۔ رجال المجلسی ص ۲۶۲ طبع بیروت۔ نقد الرجال ص ۲۳۷ طبع ایران)

مزید برآں علامہ محمد باقر مجلسیؒ مراۃ العقول جلد ۴ صفحہ ۳۷۴ میں اس روایت کی حیثیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ﴿الحادی والثلاثون و الاربع مائۃ ضعیف﴾ چارسو اکتیسویں حدیث ضعیف ہے۔

مؤلف کا امام حسنؑ پر زنا اور شراب نوشی کا الزام (العیاذ باللہ)

خیانت کار مؤلف نے انتہا درجے کی جہالت، خیانت اور خباثت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "امام حسن رضی اللہ عنہ، اگر سود خوری، شراب نوشی اور زنا کی حالت میں مرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔۔۔۔۔(قول امام جعفر صادق)۔"

مؤلف نے اپنے اسلاف سے ورثے میں پائی ہوئی بددیانتی اور خیانت کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عبارت کے الفاظ میں قطع و برید کر کے غلط مفہوم پیش کیا۔ چنانچہ لکھتا ہے: "امام جعفر صادق نے فرمایا: ﴿لو توفی الحسن بن علی علی الزنا و الربا و شرب الخمر کان خیراً مما وفی فیہ﴾ اگر حسن بن علی زنا کاری، سود خوری اور شراب نوشی کی حالت میں مرجاتے اس سے بہتر ہوتا جس حالت میں وہ مرے۔

مسلمانو! کیا اس سے بڑھ کر نواسۂ رسول، شبیہ پیغمبرؐ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی کوئی گستاخی ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ دراصل شیعہ کے نزدیک حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا قصور ہی یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی ان دو بڑی جماعتوں کو حضرت امیر معاویہ کی خلافت پر جمع کر دیا۔۔۔۔۔" (خطبات جیل ص ۱۳۶)

الجواب:۔ مؤلف تارک قرآن وسنت نے یا تو اس روایت کو احتجاج طبرسی سے دیکھ کر نقل نہیں کیا یا دیدۂ دانستہ اپنے قادیانی آقاؤں کی روش پر چلتے ہوئے عبارت کی نقل میں خیانت، قطع و برید اور تحریف لفظی کا ارتکاب کیا ہے۔ احتجاج طبرسی طبع قدیم و جدید ہر دو میرے پیش نگاہ ہیں ان میں یہ روایت اور اس سے متعلقہ واقعہ ان الفاظ میں درج ہے۔

"عن ابی یعقوب قال لقیت انا و معلی بن خنیس الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب علیه السلام فقال: .... و بها الاسناد قال: سمعت ابا عبد الله یقول لو توفی الحسن بن الحسن....."

ابو یعقوب سے مروی ہے، اس نے کہا میں اور معلیٰ بن خنیس، حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب علیہ السلام سے ملے۔ تو اس نے کہا۔۔۔۔ اسی سند سے مروی ہے کہ راوی نے کہا۔ میں نے ابوعبداللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اگر حسن بن حسن فوت ہوتا۔۔۔۔"

(احتجاج طبرسی ص ۲۰۴ طبع قدیم نجف وج ۲ ص ۱۳۸ طبع جدید)

اس روایت میں حسن بن حسن بن ابی طالب علیہ السلام کا ذکر ہے جو امام حسن علیہ السلام کا بیٹا اور حضرت علی علیہ السلام کا پوتا تھا جو کہ درجہ عصمت پر فائز نہ تھا۔ مقام حیرت و افسوس ہے کہ ہمارے مخاطب کم فہم نے خیانت اور بددیانتی کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اسے حسنؑ بن علیؑ درج کر کے امام علیہ السلام کی توہین کا ارتکاب کیا اور پھر اسی سے تمام نتائج اخذ کیے اور شیعوں پر الزامات ثابت کرنے کی گھناؤنی اور منحوس و مکروہ کوشش کی ہے۔ **لعنة الله علی الکاذبین، لعنة الله علی الخائنین**۔ قابل فہم بات یہ ہے کہ جب ان کے رہنماؤں کی یہ علمی حالت ہے تو ان کے عوام کالانعام کا کیا حشر ہوگا؟

گر ہمیں مکتب است و ہمیں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد

نیز اس کا راوی معلیٰ بن خنیس ہے جس کے بارے میں علامہ نجاشی نے لکھا ہے:

".....هو ضعیف جداً... کان اول امره مغیریاً ثم دعی الی محمد بن عبد الله المعروف بالنفس الزکیة.. والغلاة یضیفون الیه کثیراً قال: ولا اری الاعتماد علی شئی من حدیثه....

انتہائی درجہ ضعیف ہے۔۔۔ پہلے پہل مغیری تھا، پھر محمد بن عبداللہ معروف بنفس ذکیہ کا داعی بن گیا۔۔۔ غلاۃ بہت سی چیزیں اس کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ غضائری نے کہا۔ اس کی کسی

حدیث پر میں بالکل اعتماد نہیں کرتا۔۔۔۔۔"

(احتجاج طبرسی، ج ۲ص ۱۳۸ حاشیہ نمبر۲ طبع جدید نجف

یہ امر پہلے واضح و مبرہن کر دیا گیا ہے کہ خاندان رسالت میں بہت سے افراد برادران یوسفؑ اور پسر نوحؑ کی مانند ہوئے۔ ان پر وصف نصب یعنی نفاق کا اطلاق ہوسکتا ہے جبکہ ولد الز اور ناپاک حالت میں حمل ہونے سے متصف دیگر نواصب ہوں گے۔ نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں او نوحؑ کے بیٹے اور برادران یوسفؑ کے بارے میں خوب غور وفکر کر لیں۔ تب معاملہ واضح ہو جا۔ گا لیکن کیا کیا جائے ان کو روایت کا صحیح اور اچھا پہلو تو کبھی سوجھتا ہی نہیں بلکہ اپنی طرف سے تحریف لفظی ایسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر کے الٹا اس پر اعتراض کر دیا سچ ہے۔

بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن

حضرت عبد اللہؓ ابن عباس کے نابینا ہونے والی روایت کا جواب

مؤلف نے خطبات جیل صفحہ ۱۳۷ تا صفحہ ۱۳۹ پر اصول کافی سے جو روایت اس سلسلے ؛ نقل کی ہے جس میں یہ ہے کہ "عبد اللہ بن عباسؓ اس سبب سے نابینا ہو گئے تھے کہ انہوں حضرت علی علیہ السلام کی امامت کو کماحقہ تسلیم نہ کیا تھا" تو اس کا جواب باصواب یہ ہے کہ محولہ روایت اصول کافی کی "کتاب الحجۃ" کے باب فی شان انا انزلناہ کی ہے۔ محقق شیعہ علماء نے روایت اور اس کے راوی پر شدید جرح کر کے اس کو نا قابل اعتماد قرار دیا ہے۔ زیر نظر روایت بنیادی وجوہ کی بنا پر محل نظر ہے اول یہ کہ علامہ شیخ عبد اللہ مامقانیؒ اس روایت کو نقل کر کے اس تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿والجواب عن هذا الخبر انه من الاخبار المجه ضرورة ان مولينا الباقر علیہ السلام ولد سنة سبع او تسع و خمسين و عبد الله بن عب مات سنة ثمان او تسع و ستين فيكون عمر الباقرؑ عندو فاته عشر سنين ﴾ ﴿احدى عشرة او اثنتى عشرة سنة و الائمة عليهم السلام و ان كانوا من ـ ولادتهم اعلم الناس الا انهم حفظاً للناس من الغلو لم يكونوا يخرجون من العادي و لا يعقل عادةً مباحثة ولد عمره دون البلوغ مع شيخ عالم و استضحا كه ... ﴾

اس خبر کا جواب یہ ہے کہ خبر ضرور بضرورِ من گھڑت ہے۔ امام باقر علیہ السلام سن ستاون یا انسٹھ ہجری میں پیدا ہوئے اور عبداللہ بن عباس ۶۷ ھ یا ۶۹ ھ میں فوت ہوئے۔ ابن عباسؓ کی وفات کے وقت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی عمر دس، گیارہ یا بارہ سال ہوگی۔ ائمہ علیہم السلام اگرچہ اپنی ولادت کے وقت سے ہی اعلم الناس ہوتے تھے مگر وہ لوگوں کو غلو سے بچانے کی خاطر عادی امور سے نکلتے نہ تھے۔ عادۃً بھی ایسے بچے کا مباحثہ ایک بوڑھے عالم سے اور اس کے ساتھ ہنسنا معقول نہیں ہے۔ جس کی عمر بلوغت سے کم ہو۔۔۔۔۔۔" (تنقیح المقال ج ۲ ص ۱۹۴ مطبوعہ نجف)

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس روایت کا راوی سہل بن زیاد ہے جس کے بارے میں شیعہ ناقدین اور علماء رجال کی رائے درج ذیل ہے:

﴿سهل بن زياد ابو علي الادمي الرازي كان ضعيفاً في الحديث غير معتمد فيه و كان احمد بن محمد يشهد عليه بالغلو و الكذب﴾

"سہل بن زیاد ابو علی ادمی رازی حدیث میں ضعیف تھا اس سلسلے میں نا قابل اعتماد ہے۔ احمد بن محمد اس کے غالی اور کاذب ہونے پر شہادت دیتے تھے۔" (رجال نجاشی ص ۱۳۲ طبع بمبئی، نقد الرجال ص ۱۶۵ طبع ایران، رجال المجلسی ص ۲۲۴ نمبر ۸۷۳ طبع بیروت)

مزید برآں علامہ باقر مجلسیؒ نے اس کی شرح میں لکھا ہے:

﴿الثاني سنده كما تقدم﴾ دوسری روایت کی سند کے بارے میں وہی رائے ہے جو پہلی روایت کے ضمن میں گزر چکی ہے۔"

اس باب کی پہلی روایت کے بارے میں علامہ مجلسی نے اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے:

﴿الاول ضعيف على المشهور بالحسن بن العباس﴾

"پہلی روایت حسن بن عباس راوی کی بناء پر ضعیف ہے جیسا کہ مشہور ہے۔"

(مراۃ العقول، ج ۱ ص ۱۷۶ طبع ایران)

شیعہ کتب رجال میں اس راوی حسن بن عباس کے بارے میں ماہرین رجال کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیں:

﴿الحسن بن العباس بن الحریش الرازی ابو علی ضعیف جداً له کتاب انا انزلناہ فی لیلة القدر وھو کتاب ردی الحدیث مضطرب الالفاظ روی عن الجواد علیه السلام فضل انا انزلناه في ليلة القدر كتابا مصنفًا فاسد الالفاظ نشهد..... علٰی انه موضوع و ھذا الرجل لا یلتفت الیه ولا یکتب حدیثه﴾

حسن بن عباس بن حریش رازی ابوعلی انتہائی درجہ ضعیف ہے۔ ان کی ایک کتاب ''انا انزلناہ فی لیلة القدر '' کے موضوع پر ہے۔ یہ کتاب ردی الحدیث اور مضطرب الفاظ پر مشتمل ہے۔۔۔ اس نے جواد علیہ السلام سے ''انا انزلناہ فی لیلة القدر '' کی فضیلت میں ایک کتاب تصنیف کی جو فاسد الفاظ پر مشتمل تھی۔ ہم گواہی دیتے ہیں۔۔۔ یہ کتاب (پوری کی پوری) من گھڑت ہے۔ یہ شخص لائق التفات نہیں ہے، نہ ہی اس کی مروی حدیث لکھنے جانے کے قابل ہے۔''

(نقد الرجال از علامہ تفرشی ص ۹۱، رجال نجاشی ص ۴۵ رجال المجلسیؒ ص ۱۸۸ نمبر ۴۸۷

جن روایات کی یہ پوزیشن ہو ان سے استدلال کر کے اہل حق پر توہین اہل بیت کا الزام کیونکر ثابت ہوسکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں رمتنی بدائها و انسلت۔ یعنی ع

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

جناب عبد اللہ بن عباسؓ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے خالص انصار و مددگار لوگوں او محبین میں سے تھے۔ شیعہ سنی تاریخ اور کتب رجال اس امر پر شاہد عدل ہیں لیکن یہ امر تو اسی کو معلوم ہوسکتا ہے جو دل کی آنکھیں کھول کر اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرتا ہو۔ تعصب کے مارے اندھے کو کچھ نظر نہیں آتا سوائے بغض اہل بیتؑ کے۔ مؤلف نے اسی عنوان کے آخر میں ایک جملہ لکھا ہے کہ ''کیا خاندان رسولؐ کے برگزیدہ لوگوں کا ایسا کردار ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں یہ محض ان پر افتراء باندھا گیا ہے'' (خطبات جیل ص ۱۴۰)

ہمیں اس سے مکمل طور پر اتفاق ہے کہ خاندان رسولؐ اور اصحاب رسولؐ میں برگزید لوگوں کا کردار ایسا نہیں ہوسکتا جن کا ایسا کردار ثابت ہو جائے وہ برگزیدہ نہیں ہو سکتے۔ یہی نظر شیعہ کا ہے۔

امام زین العابدینؑ اور محمد حنفیہ کا امامت میں اختلاف؟؟

مؤلف خاندانِ رسالت میں امامت کی خاطر "باہمی خانہ جنگیوں" کا مزعومہ خیال ثابت کرنے کے لیے ایک عنوان "خطبات جیل" کے ص ۱۴۰ پر ان الفاظ میں قائم کرتا ہے۔ "مسئلہ امامت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے امام محمد بن حنفیہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے امام زین العابدین کا اختلاف۔"

"امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب زمانہ امام زین العابدین کی امامت کا آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام زین العابدین کے چچا حضرت محمد بن حنفیہ نے خود اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور اپنے بھتیجے کی امامت تسلیم نہ کی اور بھتیجے سے فرمایا کہ بہ نسبت تمہارے میں زیادہ مستحق ہوں تم ابھی کم سن ہو میں تمہارا چچا ہوں مگر امام زین العابدین نے ایک نہ مانی اور اپنے چچا سے کہا کہ دیکھ میری امامت میں نزاع مت کرو ورنہ تمہاری عمر کم ہو جائے گی۔ غرض کہ چچا بھتیجے میں خوب چلی بالآخر امام زین العابدین نے بزور اعجاز حجر اسود سے اپنی امامت کی گواہی دلوا کر چچا صاحب کو شکست دی۔" (خطباتِ جیل ص ۱۴۰، ۱۴۱)

اس کے بعد اصول کافی اور احتجاج طبرسی ص ۱۶۲ سے ایک طویل واقعہ نقل کر کے چھ صفحات اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کیے اور امام زین العابدین علیہ السلام کی امامت کو مخدوش بنانے پر ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا۔

الجواب:۔ مسطورہ بالا واقعہ سے استدلال و استشہاد درست نہیں ہے کیونکہ خاندانِ رسالت میں کہیں بھی باہمی جنگ اور قتل و قتال کی نوبت اس مسئلہ پر نہیں آئی پھر "خانہ جنگی" کیسے ثابت ہوگئی؟ چونکہ مخالف مذہب اہل بیت والوں کے بانی امویوں اور دیگر موروثی بادشاہی سلسلوں میں خانہ جنگیاں اور قتل و خونریزی اس موضوع پر جاری رہی ہے۔ جس کی تاریخ گواہ ہے۔ تب ہی اس ملوکیت کے بندے اور الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق نے خاندان رسالت پر الزام لگا دیا ہے۔

اگر جناب محمد بن حنفیہؒ نے بالفرض، حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی امامت کا انکار

بھی کیا ہو اور خود مدعی امامت ہوئے ہوں تو اس سے اصل مسئلہ امامت اور امام زین العابدین علیہ السلام کی امامت کو کوئی نقصان اور ہرج نہیں ہوتا۔ کیا سچے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں چھوٹے مدعیان نبوت نہیں ہوئے؟ بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی اور مرزا حسین علی بہاء اللہ تو عصر قریب انیسویں بیسویں صدی میں ہی گزرے ہیں۔ نیز ہم پہلے بھی واضح الفاظ میں بتا چکے ہیں کہ خاندان رسالت کا ہر فرد معصوم نہیں ہے۔ صرف امام ہی معصوم ہوتے ہیں اور ان کی تعداد یکے بعد دیگرے بارہ متعین ہے۔

نیز اسی مذکورہ روایت میں امامت کی نص اور اس کی علامت کو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے محمد بن حنفیہؓ کے سامنے پیش کیا۔ ﴿یا عم ان ابی صلوات اللّٰہ علیہ اوصٰی قبل ان یتوجہ الی العراق و عھد الی فی ذٰلک قبل ان یستشھد بساعۃ و ھذا سلاح رسول اللّٰہ عندی فلا تعرض لھٰذا فانی اخاف علیک بنقص العمر تشتت الحال و ان اللّٰہ تبارک و تعالٰی ابی ان لا یجعل الوصیۃ و الامامۃ الا فی عقب الحسین﴾ اے چچا جان، میرے والد صاحب صلوات اللہ علیہ نے عراق کی طرف رخصت ہونے سے قبل وصیت کر دی تھی اور شہید ہونے سے تھوڑی دیر پہلے اس سلسلے میں مجھے عہد دے دیا تھا چنانچہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسلحہ میرے پاس ہے۔ پس آپ اس مسئلے میں سامنے نہ آئیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی عمر کم ہو جائے گی اور حالات خراب ہو جائیں گے۔ اللہ تعالٰی نے قسم کھائی ہے کہ وصایت اور امامت حسینؑ کی اولاد میں ہی رہے گی۔"

حضرت امام زین العابدینؑ کی امامت پر حجر اسود کی گواہی

بعد ازاں اسی طویل الذیل روایت میں ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام جناب محمد بن حنفیہؓ کو اس امر پر قائل کرنے کے لیے حجر اسود کے پاس لے گئے اور انہیں کہا کہ حجر اسود سے اپنی امامت پر دلیل طلب کریں۔ ان کی دعا پر حجر اسود نے تکلم نہ کیا۔ پھر امام زین العابدین علیہ السلام نے دعا کی کہ پتھر انہیں بتائے کہ امام حسین علیہ السلام کے بعد کون وصی اور امام ہے؟ حجر اسود میں حرکت پیدا ہوئی پھر اللہ تعالٰی نے اسے گویائی دی۔ تو حجر اسود نے واضح عربی زبان میں

کہا: ﴿اللّٰھم ان الوصیة الامامة بعد الحسین بن علی بن ابی طالب الی علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب و ابن فاطمة بنت رسول اللّٰہ ﴾ اے اللہ حسین بن علی بن ابی طالب علیہما السلام کے بعد وصیت اور امامت علی بن حسین بن ابی طالبؑ، فاطمہ بنت رسول اللہ کے بیٹے کے لیے ہے۔ ﴿فانصرف محمد وھو یتولی علی بن الحسین ﴾ پس محمد بن حنفیہؒ لوٹ گئے اس حال میں کہ وہ امام زین العابدین علیہ السلام سے محبت کرتے تھے۔"

امام نے جو علامات یا تحریر دکھائی تو اس سے امامت اور اس کے لوازم کو اپنے لیئے ثابت فرمایا ہے۔ ہمارے مخاطب نے اپنے باطل خیال کا یوں اظہار کیا ہے کہ "امامت ایک الٰہی راز تھا جو اہل لوگوں کے پاس پہنچ دیا گیا۔ محمد بن حنفیہؒ کو بھی پہنچا ہوگا۔" نادان کو یہ معلوم نہیں کہ شک واحتمال کی بناء پر اتنے بڑے فیصلے نہیں کیے جاسکتے۔ جناب محمد حنفیہؒ کو علم ہوا ہو یا نہ اس کا امامت کی حقیقت سے کیا تعلق؟ پھر یہ ظن کہ انہوں نے خود دعویٰ کرنے کا ارادہ کیوں کیا؟ مؤلف اور اس کے اسلاف و اخلاف حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعہ پر غور فرمائیں۔ اس کی تفصیلات کتب تفاسیر میں دیکھ لیں پھر حضرت علی علیہ السلام کی اولاد میں سے ان لوگوں کے حالات پر ان کو منطبق کر لیں۔ اگر عقل سلیم ہوگی تو اس طرح کے نامعقول اور احمقانہ اعتراض سے دست بردار ہوکر حق تسلیم کرلیں گے۔ جس کا امکان بہت ہی کم ہے۔

بنو اسرائیل کی ہدایت کے لیے جو سلسلہ نبوت جاری رہا۔ انبیاء کرامؑ کے ساتھ بنو اسرائیل کا جو رویہ تاریخ کے اوراق میں منقول ہے اس کو مطالعہ کر لینے کے بعد اس امت کا ائمہ اہل بیت ﷺ کے ساتھ سلوک اور خاندان رسالت میں سے بعض لوگوں کے دعوؤں اور حقیقی ائمہؑ سے انحراف کی حقیقت سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن مؤلف اور اس کے اسلاف و اخلاف تعصب سے اندھے ہو چکے ہیں۔

چونکہ جناب محمد بن حنفیہؒ نے اپنے ارادے کو ترک کر دیا تھا اور روایت کے آخر میں یہ الفاظ آ گئے ہیں۔ ﴿فانصرف محمد وھو یتولی علی بن الحسین ﴾ مؤلف کا یہ کہنا کہ اس روایت کے آخری لفظ سے استنباط کر لینا قابل التفات نہیں ہوسکتا بالکل بے بنیاد اور لغو ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے بھی اپنے پیغمبر باپ سے انتہائی بدتمیزی، بدسلوکی اور گستاخانہ رویہ اختیار کیا۔ اپنے پیغمبر باپ کو کہا۔ ﴿اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ﴾ البتہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے۔'' کیا کسی پیغمبر کے بارے میں یہ لفظ کہنا کفر سے کم ہے؟ بعد ازاں ان ہی بھائیوں کی توبہ قبول ہوئی جس کا تذکرہ قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے:

﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ﴾

''وہ بولے بخدا کچھ شک نہیں کہ تم کو اللہ نے ہم پر (بڑی) برتری دی اور بے شک ہم ہی قصوروار تھے۔''

تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: ﴿قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ یوسف نے کہا اب تم پر کچھ الزام نہیں (میں نے معاف کیا) اور خدا (بھی) تمہارے قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے۔ (سورۂ یوسف، آیت ۹۱-۹۲)

شبیر احمد عثمانی ان آیات بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

''یوسف علیہ السلام بھائیوں سے اتنا بھی سننا نہیں چاہتے تھے فرمایا، یہ تذکرہ مت کرو آج میں تمہیں کوئی الزام نہیں دیتا۔ تمہاری سب غلطیاں معاف کر چکا ہوں جو لفظ میں نے کہے محض حق تعالیٰ کا احسان اور صبر و تقویٰ کا نتیجہ ظاہر کرنے کی نیت سے کہے آج کے بعد تمہاری تقصیر کا ذکر بھی نہ ہوگا میں دعا کرتا ہوں کہ تم نے جو خطائیں خدا تعالیٰ کی کی ہیں وہ بھی معاف کرے۔''

(تفسیر عثمانی ص ۳۱۸ فائدہ نمبر ۱۱ طبع بجنور)

اگر تم قرآن کریم کھول کر حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ دیکھنا گوارا کر لیتے تو خانوادۂ رسول کی ان مقدس شخصیات پر ایسے بے بنیاد الزامات عائد کرنے کی ہرگز جرأت نہ کرتے۔

شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

حتیٰ کہ بعض لوگوں کے نزدیک وہ (برادرانِ یوسف) نبی بنائے گئے تھے۔ جیسا کہ تفسیر عثمانی میں شبیر احمد عثمانی نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیا مُلاں احمق اللہ تعالیٰ حضرت

یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کی جانب سے ان گناہگار بھائیوں کی معافی اور مغفرت کو تسلیم نہیں کرتے؟ قرآن کے الفاظ سے ان کا مغفور ہونا ثابت ہے تاہم اس کا انکار کرنا تکذیب کلام الٰہی نہیں؟ کیا قرآن اور اسلام مُلاں اور اس کے اسلاف و اخلاف کے تابع ہے؟

سرکار علامہ مجلسیؒ نے بھی ﴿وھو یتولی﴾ کی شرح میں لکھا ہے ﴿ای یقر بامامته﴾ یعنی جناب محمد حنفیہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی امامت کا اقرار کرتے تھے۔"

(مراۃ العقول ج ۱ ص ۲۵۵ مطبوعہ قدیم تہران)

نامور محدث ملا خلیل قزوینیؒ نے اپنی بیش بہا تصنیف "الصافی شرح اصول کافی جز سوم ص ۴۲۹ طبع لکھنؤ میں اس کی شرح میں یہی لکھا ہے "پس برگشت محمد بن علی و او امام خود می دانست علی بن الحسین را علیہما السلام، یعنی ازیں محمد حنفیہؒ واپس لوٹ گئے اور وہ حضرت امام علیؑ بن حسینؑ کو اپنا امام جانتے تھے۔"

جناب مختار ثقفیؒ اور محمد حنفیہؒ کی امامت کا مسئلہ

"مختار ثقفی حضرت محمد بن حنفیہ کی امامت کا قائل تھا مگر شیعہ کے ہاں نہایت محترم ہے"

شیعہ کی اسماء الرجال کی مستند ترین کتاب رجال کشی (ص ۱۲۷) میں ہے:

"اور مختار وہ شخص ہے جس نے لوگوں کو محمد بن علی بن ابی طالب ابن الحنفیہ کی امامت کی دعوت دی، اس کی پارٹی کو "کیسانیہ" اور "مختاریہ" کہا جاتا ہے کیساں خود اسی کا لقب تھا اور حضرت حسین علیہ السلام کے دشمنوں میں سے کسی شخص کے بارے میں جب اس کو یہ خبر پہنچتی کہ وہ فلاں مکان میں یا فلاں جگہ میں ہے یہ فوراً وہاں پہنچ جاتا پورے مکان کو منہدم کر دیتا اور اس میں جتنی ذی روح چیزیں موجود ہوتیں سب کو قتل کر دیتا کوفہ میں جتنے مکان ویران ہیں یہ سب اسی کے ڈھائے ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں مزید دو روایتیں رجال کشی سے نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:

"حضرات امامیہ کی انصاف پسندی و دانشمندی اور اہلِ بیت اطہار سے اس کی محبت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ امام معصوم حضرت حسن علیہ السلام جس شخصیت سے صلح کرتے ہیں اور ابا بین معصومین

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما جس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں یعنی حضرت امیر معاویہ ﷜ وہ تو ان کے نزدیک "لعنۃ اللّٰہ علیہ" ہے۔۔۔۔۔اور جس ملعون نے نبوت کا دعویٰ کیا اور وہ آئمہ پر جھوٹ طوفان باندھتا تھا یعنی مختار کذاب وہ ان کے نزدیک "رحمۃ اللّٰہ علیہ" ہے اور اسے مقبولان بارگاہِ الٰہی میں شمار کرتے ہیں۔" (خطبات جیل ص ۱۴۶ تا ص ۱۴۹)

الجواب۔ مؤلف نے اپنے دعویٰ کی تائید میں جو رجال کشی اور چند دیگر کتب سے حوالے تحریر کیے ہیں کہ مختار نے لوگوں کو محمد بن علی بن ابی طالب ابن حنفیہ کی امامت کی طرف دعوت دی اور امام حسین ؑ کے دشمنوں کو چن چن کر قتل کیا۔ ساتھ ہی مختار پر یہ الزام ہے کہ وہ امام زین العابدین ؑ کی زبان سے اس کے حق میں "جزاہ اللّٰہ خیراً" کے دعائیہ کلمات صادر ہوئے ہیں۔ حضرت امام محمد باقر ؑ بھی اس کے لیے دعائے رحمت کرتے تھے۔ محقق علی الاطلاق قاضی نور اللہ شوستریؒ نے اس کے لیے رحمۃ اللہ لکھا ہے۔ مذہب اہل بیتؑ کے مشہور فقیہ سرکار علامہ حلی نے اسے اللہ کے مقبول بندوں میں شمار کیا ہے۔

اپنی ناسمجھی اور نادانی سے ان کو یہ تعجب ہوتا ہے کہ شیعہ معاویہ کی مذمت کرتے ہیں حالانکہ امام حسن ؑ، حسین ؑ نے اس کی بیعت (بقول مُلا) کر لی تھی اور نعوذ باللہ اسے امام برحق تسلیم کر لیا تھا اور جس شخص نے ائمہؑ پر جھوٹ باندھا اسے رحمۃ اللہ علیہ اور مقبولان بارگاہ ایزدی بتاتے ہیں۔

مختارؒ کی مدح و قدح میں روایات اور کتاب رجال کشی پر تبصرہ

آیئے ہم پہلے اصل ماخذ کتاب رجال کشی کی حیثیت کو واضح کرتے ہیں جو بقول مؤلف "شیعہ کی مستند ترین کتاب" ہے۔

محمد بن عمر بن عبد العزیز الکشی ابو عمرو کے بارے میں علماء کی یہ رائے ہے کہ ﴿**کان ثقة عیناً، و روی عن الضعفاء کثیراً۔۔۔ له کتاب الرجال کثیر العلم و فیه اغلاط کثیرة**﴾ ثقہ اور بڑے عالم تھے۔ بڑی مقدار میں ضعیف راویوں سے روایت لی ہیں۔۔۔ ان کی ایک کتاب الرجال ہے جس میں بہت علم ہے، لیکن اس کتاب میں کثرت کے ساتھ اغلاط پائی جاتی

ہیں۔'' (رجال نجاشی ص۲۶۳، نقد الرجال ص ۳۲۵)

فاضل محقق شیخ عبداللہ مامقانی'' اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: ﴿والمعروف بین المشایخ ان کتاب رجاله المذکوره کان جامعا لرویات العامة والخاصة خالطاً بعضهم ببعض﴾ جلیل القدر شیعہ علماء کے مابین معروف ہے کہ کشی کی رجال پر مذکور کتاب سنی اور شیعہ راویوں کے ذکر پر مشتمل تھی اور بعض کو بعض سے ملا جلا دیا ہے۔۔۔۔''

(تنقیح المقال ج ۳ ص ۱۶۵ طبع مرتضویہ نجف)

رجال کشی میں صرف دو روایات ایسی ہیں جن سے مختارؒ بن ابی عبیدہ ثقفی کی قدح ظاہر ہوتی ہے۔ ورنہ باقی روایات اس کی مدح و ستائش میں مذکور ہیں۔ غالباً یہ دو روایات تقیہ پر محمول ہوں گی۔ (فهذا الاخبار محمولة على التقية) اس لیے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام قاتلین حسینؑ سے انتقام لینے کی کاروائی میں کھل کر سامنے آنا پسند نہ کرتے تھے۔ اس کی بہت سی سیاسی اور معاشرتی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ آپ کا یہ عمل الٰہی ہدایت کے مطابق تھا لیکن آپ جناب مختار ثقفیؒ کے اس عمل کو پسند کرتے تھے بلکہ سراہتے تھے۔ تب ہی تو اس کے لیے دعائے خیر فرمائی ہے۔

کعب بن اشرف یہودی طاغوت سے رسول اکرم ﷺ نے انتقام لینا چاہا تو محمد بن مسلمہ کو اس کی خواہش پر بعض ایسی باتیں کرنے اور کہنے کی اجازت دی جو بظاہر خلافِ اسلام بلکہ اسلام سے خروج کے مترادف تھیں لیکن خفیہ طریقے سے ایک مفید منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ ظاہری خلاف شرع افعال و اقوال اختیار کرنے کی اجازت دی گئی۔ یقیناً یہی معاملہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اور مختارؒ کا ہوا ہے۔ اگر جناب مختار ثقفیؒ بعض جھوٹ بنا لیتا ہوگا تو اسے ﴿الحرب خدعة﴾ کے تحت اس کی اجازت تھی۔ بظاہر امام زین العابدین علیہ السلام اس منصوبے سے الگ تھلک تھے۔ لیکن غالباً حضرت علی علیہ السلام کے آزاد کردہ غلام جناب کیسان کے ذریعے مختارؒ کے ہاتھوں اس منصوبے کی تکمیل پر راضی اور موید تھے۔

باقی رہا نواصب کے ماموں امیر معاویہ کا معاملہ، تو اس سے حضرت علیؑ، ان کی اولاد اور تمام نیک صحابہ کرامؓ اور تابعین باحسان نے تبراء اور بیزاری اختیار کی ہے اور مسلسل اس پر لعنت کی

ہے، جیسا کہ ابوبکر جصاص رازی نے تفسیر ''احکام القرآن'' میں لا ینال عھدی الظالمین کے تحت مفصل طور پر لکھا ہے۔ معاویہ نے اہل بیت رسول صلوات اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ بغض و عداوت اور جنگ کی تھی۔ مسلسل بر سر منابر اہلبیت رسولؐ پر لعن و تبرا کی مکروہ، منحوس اور منافقانہ و کافرانہ رسم جاری کی۔ شیعیان اہل بیتؑ کو دردناک سزائیں دیں۔ ان پر اتنے تشدد کیے کہ پڑھنے اور سننے والے بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں۔ الا لعنة اللہ علی الظالمین جبکہ مختارؒ نے دشمنان اہل بیتؑ سے انتقام لیا تھا۔ اس پر وہ لائق مدح وتحسین تھا۔ جو اس نے ائمہ ﷺ سے حاصل کی۔

جہاں تک معاویہ کی بیعت کا تعلق ہے تو مؤلف کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب امام حسن علیہ السلام نے مسلمانوں کے جان و مال بچانے کی خاطر نیز حقیقی اسلام کے بقا کی غرض سے حکومت ترک کر دی اور معاویہ حکمران بن گیا۔ تب بھی اہل سنت کے نزدیک مستحق امامت و قیادت حضرت حسن علیہ السلام ہی تھے۔ معاویہ متغلب تھا مصلحتاً انہوں نے معاویہ سے صلح کر لی تھی جس کی بناء پر حقیقی اسلام اور مسلمانوں کو ظالموں اور منافقوں سے بچانا مقصود تھا۔ اگر جنگ جاری رہتی تو اس وقت سرکاری مذہب اور ملوکیت کے پجاری دجال کے پیروکاروں (اسرائیلی و امریکی آلہ کاروں) کے مقابلے میں حقیقی اسلام اور اصلی مسلمان موجود ہیں۔ نابود ہو جاتے اور آج دجالی منصوبہ آسانی سے کامیاب ہو جاتا۔

امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کے بارے میں اپنی رائے کا اس وقت اظہار کیا تھا جب آپ کوفے سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پیچھے سے معاویہ نے آدمی بھیجا کہ خوارج سے جنگ کے لیے آپؑ آئیں اور قیادت کریں۔ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: اگر میں جنگ کرتا تب خوارج سے زیادہ لائق جنگ تُو ہے پہلے تجھ سے جنگ کرتا۔ لیکن میں نے خونریزی سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: ابن اثیر کی تاریخ کامل۔ خدا نے سچ فرمایا ہے ﴿وَ عَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ کہ ان کی آنکھوں پر پردہ ہے پھر اصل حقائق انہیں کیسے دکھائی دیں۔

کیا زید شہیدؒ نے واقعی امامت کا دعویٰ کیا تھا؟

''امام باقر کے بھائی زید شہید نے اپنی امامت کا دعویٰ کر دیا اور امام باقر کی امامت سے

انکار کر دیا"

"امام زین العابدینؒ کے بعد جب امام باقر کا عہد امامت شروع ہوا تو ان کے بھائی حضرت زید شہید نے ان کی امامت سے انکار کر کے خود اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور صرف بھائی ہی کی امامت کا انکار نہیں بلکہ اپنے بھتیجے جعفر صادق کی امامت سے بھی ان کو انکار رہا۔ شیعہ مصنفوں نے حضرت زید شہید کا قصہ خوب رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔"

پھر ایک واقعہ اصول کافی سے بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

حضرت زید بن علی اموی ظالموں سے مخفی تھے اسی اثناء میں احول (صحابی امام) کو بلایا اور حکمرانوں کے خلاف خروج کے لیے اس سے مدد طلب کی۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ امام وقت کی موجودگی میں ان کے حکم کے بغیر و اجازت کے بغیر خروج ناجائز ہے۔ اگر حجۃ اللہ (امام) موجود نہ ہو تب جیسے کسی کی رائے ہو اس پر عمل کرنا روا ہے۔ حضرت زید نے اسے کہا کہ میرے والد مجھ پر بہت مہربان تھے وہ مجھے لقمہ بھی ٹھنڈا کر کے دیتے تھے کہ میں اس کی حرارت سے بچ جاؤں لیکن تمہارا خیال ہے کہ انہوں نے مجھے دین کے بارے میں خبر نہیں دی تاکہ میں دوزخ کی آگ سے بچ جاؤں۔ احول نے کہا وجہ یہی تھی کہ کہیں تم انکار کر کے دوزخ میں نہ چلے جاؤ لیکن میرے بارے میں یہ اندیشہ نہیں تھا۔ (ملخص از خطبات جیل ص ۱۴۹ تا ص ۱۵۳)

جواب:۔ مؤلف نے اپنے نام نہاد خطبے میں اپنی حماقت ثابت کرنے کے لیے مندرجہ بالا عنوان قائم کیا ہے۔ اس بابت جس روایت سے استدلال کیا ہے۔ یہ واقعہ اصول کافی ص ۱۰۰، ۱۰۱ کتاب الحجۃ باب الاضطرار الی الحجۃ سے نقل کیا ہے لیکن اپنی روایتی خیانت کاری سے کام لیتے ہوئے روایت کے آخری حصے کو عمداً حذف کر دیا ہے جس میں مُلاں کے استدلال کی قلعی کھل جاتی تھی۔ احول نے اس کے بعد جس طرح استدلال کر کے حضرت زید کو ساکت اور لاجواب کر دیا وہ یہ ہے ﴿**لا تقصص رؤياك على اخوتك فيكيدوك كيداً، لم يخبرهم حتّٰى كانو لا يكيدونه ولكن كتمهم ذالك فكذا ابوك كتمك لانه خاف عليك قال فقال اما والله لئن قلت ذالك لقد حدثني صاحبك بالمدينة اني اقتل و اصلب بالكناسة و ان عنده**

صحیفة فیھا قتلی و صلبی فحججت فحدثت ابا عبد اللّٰه بمقاله زید و ما قلت له فقال لی اخذته من بین یده و من خلفه و عن یمینه و عن شماله و من فوق راسه و من تحت قدمیه ولم تترك له مسكاً یسلكه﴾

پھر میں نے ان سے کہا: میں آپ پر قربان، آپ افضل ہیں یا انبیاءؑ؟ انہوں نے کہا: بلکہ انبیاءؑ افضل ہیں۔ میں نے کہا: یعقوبؑ نے یوسفؑ کو کہا: اے میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں کو نہ بتانا مبادا وہ تیرے خلاف کوئی سازش نہ بنالیں۔ بتایئے کہ ان بھائیوں کو (خواب کی) خبر کیوں نہ کر دی تا کہ وہ (انکے مرتبے کو پہچان کر) ان (یوسفؑ) کے خلاف سازش تیار نہ کرتے (بلکہ مان لیتے) بلکہ ان سے اس خواب کے واقعہ کو چھپایا۔ اس لیے کہ انہیں تیرا اندیشہ تھا۔ حضرت زیدؒ نے کہا: اللہ کی قسم! جو بات تو نے کہی ہے، تیرے صاحب (امام محمد باقرؑ) نے مجھے مدینہ میں بتایا تھا کہ میں قتل ہو جاؤں گا اور کناسہ (کوفے کے ایک محلے) میں سولی پر لٹکایا جاؤں گا۔ اور یہ کہ ان کے پاس ایک صحیفہ جس میں میرے مقتول اور مصلوب ہونے کی خبر درج ہے۔ احول نے کہا کہ میں بعد ازاں حج پر گیا تو میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں زید اور اپنے مابین ہونے والی گفتگو سے مطلع کیا۔ آپؑ نے فرمایا: تم نے زیدؒ کو سامنے، پیچھے، دائیں، بائیں، اوپر اور نیچے سے اس طرح لاجواب کیا کہ اس کیلئے کوئی راستہ نہ چھوڑا۔" (اصول کافی ص ۱۰۱)

جناب مُلا صاحب یہ بتائیں کہ یعقوب علیہ السلام نے کیوں یوسف علیہ السلام کو منع کر دیا تھا کہ بھائیوں کو خواب نہ بتائیں۔ صاف ظاہر ہے کہ تقدیر کو تو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ لیکن تقدیر مبرم و معلق دو طرح سے ہوتی ہے۔ معلق میں ہی بداء ہوتا ہے۔ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام ماتقدم بالحفظ کے طور پر یوسف علیہ السلام کے لیے نبوت کی بشارت پر مشتمل خواب کو چھپانے کا حکم نہ دیتے تو اندیشہ تھا کہ ان کے بیٹے حسد کی بنا پر حضرت یوسف علیہ السلام کو لازماً قتل ہی کر دیتے۔ لہٰذا دانائی اور حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وقتی طور پر ان سے یہ بشارت مخفی رکھی جائے۔ ایک طرف حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی بچنے کی راہ نکل آئے دوسری طرف دوسرے بیٹے انتہائی درجے کی گمراہی سے بچ جائیں چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ تجویز کامیاب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اپنے منصوبوں کی تکمیل اپنے مخصوص

بندوں کے ذریعے سے اسی طرح کراتا ہے۔ مُلا احمق اور ان کے بے عقل اسلاف و اخلاف کی سمجھ میں یہ امور نہیں آئے۔ اسی لیے شیطان کی قائم کردہ ملوکیت کی حمایت میں سرگرداں رہے ہیں اور اب بھی اسی راہ پر چل رہے ہیں۔ سچ ہے ؏

گلیم بخت کسے کہ ساختہ اند سیاہ
باب کوثر و تسنیم سفید نتواں کرد

حضرت زیدؓ کے سلسلے میں بھی اسی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ انہیں خود بھی اس کا اعتراف ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے خصوصی علم کی بناء پر انہیں ان کے انجام سے آگاہ کر دیا تھا یہ بتا دیا تھا کہ اب یہ خروج جائز نہیں ہے لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔

امامت کی کماحقہ معرفت نہ ہونے اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے عداوت و بغض میں فرق ہے۔ اس سلسلے کی وضاحتی روایت آئندہ پیش کر کے تبصرہ کر دیا جائے گا۔ یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام اور دیگر آئمہ کی احادیث میں اہل بیت علیہم السلام سے بغض رکھنے والوں کو تین انواع میں سے کسی ایک کا قرار دیا ہے۔ ولد الزنا، منافق، ناپاکی کی حالت میں شکم مادر میں نطفہ قرار پایا ہو۔ ضروری نہیں کہ ہر مبغض اہل بیت ولد الزنا ہو صرف منافق بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مراتب بھی مبغضین نواصب و خوارج کے لیے بیان کیے ہیں۔ کم علمی سے امامت کے مقام کی کماحقہ معرفت نہ رکھنے والے افراد کو مسلمان اور قابل مغفرت بتایا گیا ہے لیکن ان کا مرتبہ صحیح معرفت رکھنے والے مؤمنین کے برابر نہیں ہو سکتا۔

مؤلف کو اپنے آخری جملوں کا جواب حضرت یعقوب علیہ السلام کی حکمتِ عملی میں مل گیا ہے۔ مُلا یہ کہتا ہے کہ معلوم ہوا کہ ائمہ معصومین علیہم السلام جس سے محبت رکھتے تھے اس کو مسئلہ امامت کی تعلیم نہ دیتے۔ جناب مُلاں صاحب! یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ اپنی اولاد پر شفقت اور عوام الناس کی خیر خواہی الگ الگ امر ہیں لیکن ان کے لیے حکمت عملی کی بنیاد ایک ہی ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ سامنے ہے۔ نیز حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کو پڑھ لیں۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے ایک نابالغ لڑکے کو قتل کیا کہ بڑا ہو کر کافر ہوگا اور اس کی وجہ سے اس کے والدین کے

گمراہ ہونے کا اندیشہ تھا۔ تو اسے بچپن میں ہی ''اللہ تعالیٰ نے قتل کرا دیا'' شبیر احمد عثمانی نے ا
کے حاشیے نمبر ۸ پر کچھ وضاحت کی ہے وہاں سے دیکھ لیجئے۔

آیت ﴿وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا فَاَرَدْنَ
اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا﴾

اور وہ جو لڑکا تھا تو اس کے ماں باپ دونوں ایمان والے (لوگ) تھے تو ہم کو یہ اندیشہ ہوا کہ (ا
نہ ہو بڑا ہو کر) سرکشی اور کفر سے ان کو ایذا دے لہٰذا ہم نے یہ ارادہ کیا کہ اس کو مار دیں اور ان
پروردگار اس کے بدلے میں ان کو (ایسا فرزند) عطا فرمائے جو پاک نفسی اور پاک قرابت میں ا
سے بہتر ہو۔ (سورۃ الکہف، آیت ۸۰، ۸۱)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور زید شہیدؒ کے مابین مباحثہ

مؤلف نے اس سلسلے میں ''حضرت زید شہید کا امام باقر علیہ السلام سے مباحثہ'' کے عنو
سے اصول کافی ص ۲۲۴ سے روایت کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ چند الفاظ عربی عبارت کے بھی نقل
ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ زید غضبناک ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم میں سے امام وہ شخص نہیں ہو سکت
خانہ نشین ہو جائے، پردہ ڈال لے، جہاد سے دست کش ہو جائے، بلکہ امام وہ ہے جو اپنے حلقے
حفاظت کرے۔ اس طرح جہاد کرے جیسے حق ہے۔ اپنی رعیت کا دفاع کرے اور اپنے حر
دفاع کرے۔

الجواب: ۔ مؤلف خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے لکھتا ہے کہ زید شہید کا یہ فرمان اس قدر مدلل
کہ پھر اس کا جواب نہ ہو سکا۔ مُلّا نے اصل کتاب اصول کافی میں اس روایت کو مکمل طور پر
ہوتا تو شاید اپنے خیانت کار اسلاف کی طرح یہ بات نہ کہتا لیکن بے حیاؤں کو کوئی رکاوٹ نہیں۔
سچ ہے ع

بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن

اس کے بعد جو سوالات امام باقر علیہ السلام نے حضرت زیدؒ سے ان کے دعویٰ سے متعلق
اور ان سے دلائل طلب کیے۔ ساتھ ساتھ ان کے شبہات کے جواب بھی پیش کیے۔ وہ اسی رو

میں تقریباً تین چوتھائی صفحہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے چند الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔ ﴿قال ابو جعفر هل تعرف یا اخی من نفسك شیئاً مما نسبتها الیه فتجی علیه بشاهد من کتاب اللّٰه او حجة من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله او تضرب به مثلاً﴾ ابوجعفرؒ نے فرمایا: تم اپنے آپ کو جس چیز (امامت) کی جانب منسوب کررہے ہو۔ اس میں سے کسی چیز کی معرفت اپنے آپ میں پاتے ہو؟ پس اس (دعویٰ) پر اللہ کی کتاب سے کوئی شاہد، رسول اللہ ﷺ سے کوئی دلیل پیش کریں یا کوئی مثال بیان کریں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۵) ''اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں۔''

وقت کی مصلحتوں اور شرعی تقاضوں کو امام ہی بہتر سمجھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ احمق مُلاں اور ان کے ناسمجھ اسلاف و اخلاف اپنے ہاتھوں سے خود کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ تاہم یہ روایت سند اور رواۃ کے اعتبار سے بھی صحیح درجہ کی نہیں ہے بلکہ علامہ مجلسیؒ اس پر رائے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مجھول . . . یہ روایت مجہول ہے۔ (مراۃ العقول ج ا ص ۲۶۰) مالکم کیف تحکمون۔

علامہ مجلسیؒ کا معقول جواب

علامہ مجلسی مراۃ العقول جلد اول صفحہ ۲۶۲ طبع ایران میں اسی روایت کے ضمن میں دشمنانِ اہل بیتؑ کی جانب سے اٹھائے گئے اشکالات کا جواب نہایت عمدہ پیرائے میں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

والحاصل ان الانسب حسن الظن به و عدم القدح فیه بل عدم التعرض لا مثاله من اولاد الائمة علیهم السلام الکم بکفر هم والبتری منهم کجعفر الکذاب و اضرابه لما رواه الراوندی فی الخرابح کما عن الحسن بن راشد قاله ذکرت زید بن علی فتنقصة عند ابی عبد اللّٰه علیه السلام فقال لا تفعل رحم اللّٰه عمی اتی ابی فقال انی ارید الخروج علی هذا الطاغیة فقال لا تفعل فانی اخاف ان تکون المقتول

المصلوب على ظهر الكوفة اما علمت يا زيد انه لا يخرج احد من ولد فاطمة على احد من السلاطين قبل خروج السفياني الا قتل ثم قال الا يا حسن ان فاطمة حصنت فرجها فحرم الله ذريتها على النار وفيهم نزلت ثم اورثنا الكتاب الذين اصطفينا من عبادنا فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد و منهم سابق بالخيرات فان الظالم لنفسه الذي لا يعرف الامام والمقتصد العارف بحق الامام والسابق بالخيرات هو الامام ثم قال يا حسن انا اهل بيت لا يخرج احدنا من الدنيا حتى يقر لكل ذی فضله بفضله۔

''الحاصل مناسب یہ ہے کہ ان سے حسن ظن لکھا جائے۔ ان کی قدح میں کچھ نہ کہا جائے۔ اولاد ائمہؑ میں سے اس طرح کے افراد پر کفر کا حکم لگانے اور ان سے تبرا کرنے سے باز رہنا چاہیے۔ جیسے جعفر کذاب یا اسی طرح کے دیگر افراد ہیں۔ اسی لیے کہ راوندی نے خرائج میں حسن بن راشد سے روایت کیا ہے۔ اس نے ذکر کیا کہ میں نے ابوعبداللہؑ کے پاس زید بن علی کا ذکر کیا اور ان کی تنقیص کی۔ آپؑ نے منع کر دیا اور کہا میرے چچا پر اللہ رحم کرے۔ وہ میرے والد صاحب کے پاس آئے تھے اور اس طاغیہ پر خروج کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپؑ نے فرمایا: خروج نہ کرو۔ مجھے خوف ہے کہ تم کوفہ میں مصلوب ہو جاؤ گے اے زید! تمہیں علم نہیں ہے کہ سفیانی کے خروج سے قبل بنو فاطمہ میں سے جو بھی ان بادشاہوں کے خلاف خروج کرے گا قتل ہو جائے گا۔ پھر ابوعبداللہؑ نے فرمایا: اے حسن! فاطمہ نے اپنے نفس کو تھام کر رکھا ہے تو اللہ نے اس کی اولاد کو دوزخ پر حرام کر دیا۔ انہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ﴾ (پھر ہم نے اپنے منتخب بندوں کو کتاب کا وارث بنایا، پس ان میں سے کچھ تو اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں۔ کچھ میانہ روی اختیار کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں) اپنے نفس پر ظلم کرنے والا تو وہ ہے جو امام کی معرفت نہیں رکھتا۔ مقتصد امام کے حق کی معرفت رکھنے والا ہے۔ اور سابق بالخیرات سے مراد امام ہے۔ پھر فرمایا: اے حسن! ہم اہل بیتؑ میں سے کوئی بھی اس دنیا سے رخصت نہیں ہوتا جب تک وہ ہر صاحب فضیلت کی فضیلت کا اقرار

نہ کرے۔

محمد نفس زکیہ کی امامت کا مسئلہ

مؤلف نے اپنے اسلاف سے نقل کرتے ہوئے مزید عنوان قائم کیا ہے:

"امام جعفر صادق کے مقابلہ میں ان کے چچا اور بھائیوں نے بھی محمد نفس زکیہ کی امامت کو قبول کیا اور ان کا ساتھ امام ابو حنیفہ و امام مالک نے بھی دیا۔

"حضرت عبد اللہ محض نے بار بار امام جعفر صادق سے جا کر کہا کہ تم میرے بیٹے کی بیعت کر لو مگر امام جعفر صادق نے نہ مانا آخر عبد اللہ کو غصہ آیا اور انہوں نے فرمایا کہ امام حسن نے امامت اپنی اولاد کو نہ دی بلکہ اپنے بھائی حسین کو دی تو حسین کو کیا حق تھا کہ وہ امامت کو اپنی اولاد کی طرف منتقل کریں یہ پورا قصہ اصول کافی مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ میں منقول ہے۔ حضرت عبد اللہ محض کے ساتھ امام حسن رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد متفق تھی اور دوسری طرف امام جعفر صادق اکیلے تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد سب ان کے ساتھ نہ تھی حتیٰ کہ ان کے بھائی اور چچا بھی ان کے خلاف تھے۔۔۔۔۔ شیعہ محبّ اہل بیت ہونے کا دعویٰ تو بہت کرتے ہیں لیکن موقع پر جیسی وفاداری ان سے ظہور میں آتی رہی سب مانتے ہیں ابھی احول صاحب کی اور زید شہید کی گفتگو اوپر نقل ہو چکی لیکن اہل سنت والجماعت نے ہمیشہ ایسے مواقع میں وفاداری اور جان نثاری کا جو منظر پیش کیا ہے وہ صفحات تاریخ میں قیامت تک چمکتا رہے گا چنانچہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک یہ دونوں جلیل القدر امام حضرت محمد ملقب بہ نفس زکیہ کے ساتھ تھے اور اس ساتھ دینے پر دونوں جلیل القدر اماموں نے بہت ایذائیں اٹھائیں۔" (خطبات جیل ص ۱۵۴، ۱۵۵)

<u>الجواب</u>:۔ اس سلسلے میں زیادہ وضاحت اور مطالب بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت زید شہید کے معاملے میں کافی حقائق سامنے آ چکے ہیں۔ عبد اللہ محض اور محمد نفس زکیہ کا معاملہ بھی ان سے کچھ مختلف نہیں ہے بہت سے واقعات و حقائق میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ جس طرح پسران یعقوبؑ اور برادران یوسفؑ نبی کے پوتے پڑپوتے نبی کے بیٹے اور نبی کے بھائی ہو کر بھٹکے۔ اسی طرح خاندان رسالت کے افراد بھی انسان تھے اور ان سے بھی لغزشیں ہوئیں۔ سارے کے

سارے امام معصوم نہ تھے۔ تاہم ان اختلاف کی بناء پر ان بزرگوں نے کوئی اخلاقی بے راہ روی اختیار نہیں کی بلکہ سرکاری مذہب کے علمبردار، نواصب کے موجد و بانی ظالم بادشاہوں کے خلاف جہاد کیا۔

مؤلف کا یہ کہنا کہ ایسے مواقع پر اہل سنت و جماعت نے ہمیشہ جان نثاری اور وفاداری کا منظر پیش کیا ہے۔ یہ مشکوک دعویٰ ہے۔ کیا اس زمانے میں عصر حاضر کی طرح اہل سنت کی اکثریت نہ تھی؟ کیا وہ حکمران اسی مذہب کے حامی اور پشت پناہ نہ تھے؟ تب کیوں اکثریت کے مقابلے میں وہ بے یار و مددگار حکمران اقتدار پر قابض رہے اور ان کے خلاف خروج کرنے والے خاندان رسالت کے افراد قتل ہوتے رہے؟ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اکثریت نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ سرکاری مذہب اسلام کے علمبردار بادشاہوں کا دیا تھا۔ چنانچہ اسی سے ابوحنیفہ اور مالک کی حمایت کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ درحقیقت اہل بیت نبوی کے ان افراد کے حامی تھے تو خود کیوں میدان میں نہ آئے اور ان کے پیروکاروں کی اکثریت نے کیوں ساتھ نہ دیا اور دیا تو اخلاص سے کیوں مقابلہ نہ کیا بلکہ ان افراد کو ظالموں کے ہاتھوں میں دے کر گھروں میں بیٹھ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے خروج کیا یا جنہوں نے شیعہ ہونے کا دعویٰ کر کے ان کا ساتھ دیا، انہیں میں سے ابوحنیفہ اور مالک وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب لوگ حقیقی امام کی معرفت سے قاصر تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کی پیروی کی اور کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے۔ اگر یہ سب لوگ امامت اور امام کے مقام سے واقف ہوتے تو اتنی اکثریت کے ہوتے ہوئے کسی ظالم بادشاہ کی کیا جرأت تھی کہ وہ غاصبانہ طور پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لیتا اور اپنی خواہشات کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو زائل کرتا چلا جاتا۔ خواہ وہ اموی ناصبی ہو یا عباسی ناصبی؛ چنانچہ حقیقی شیعہ وہی تھے جو اصلی امام کی معرفت حاصل کر کے اس کے حکم کے پابند رہتے تھے۔ اپنے خیالات و جذبات ان پر غالب نہیں آتے تھے۔ وقلیل ما ھم ان کی تعداد اتنی قلیل تھی کہ انہیں لے کر خروج کرنے میں کامیابی کے امکانات معدوم تھے۔ اس لیے ائمہ ﷺ نے تا خروج سفیانی اپنے ظہور و خروج کو مؤخر رکھا ہے۔ اس وقت انشاء اللہ تعالیٰ امام علیہ السلام کو کافی تعداد

میں انصار مل جائیں گے اور عالمی سطح پر حالات بھی موافق ہوں گے۔

اس روایت کا دوسرا پہلو سند کے لحاظ سے ہے۔ چنانچہ ملا باقر مجلسیؒ لکھتے ہیں:

"السابع عشر ضعیف، سترہویں حدیث ضعیف ہے۔" (مراۃ العقول ج ۱ص ۲۶۲)

لہٰذا اگر فریق مخالف پر الزام عائد کرنا ہو تو شہادت کمزور نہیں بلکہ قوی ہونی چاہیے۔ کمزور شہادت نا قابل قبول ہوتی ہے۔ بالخصوص جب کسی ملزم کے خلاف انتہائی سزا (موت، ارتداد یا کفر) کا فیصلہ صادر کرنا ہو، دیانت کا تقاضا یہی ہے لیکن بددیانت اور خیانت کار مُلا کو اس سے کیا سروکار۔

"پہلا اختلاف حضرت حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد شیعیان علی پانچ گروہوں میں بٹ گئے، دوسرا اختلاف امام زین العابدین علیہ السلام کے انتقال کے بعد شیعہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ تیسرا اختلاف امام باقر کے شیعہ تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ چوتھا اختلاف امام جعفر صادق کے بعد شیعہ چھ گروہوں میں بٹ گئے۔ پانچواں اختلاف امام موسیٰ کاظم بن جعفر کے بعد شیعہ سات گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ چھٹا اختلاف امام علی رضا بن موسیٰ کاظم کے بعد شیعہ پانچ گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ساتواں اختلاف امام محمد بن علی رضا کے بعد معمولی سا اختلاف ہو، آٹھواں اختلاف امام علی ہادی کی وفات کے بعد شیعہ چار گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔۔۔۔۔"

(خطبات جیل ص ۱۵۶ تا ۱۶۰)

<u>الجواب</u>:۔ اس کے بعد مؤلف ہر امام کی وفات کے بعد امامت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے اختلاف کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے۔ اس اختلاف سے نہ معلوم مُلا کیا ثابت کرنا چاہتا ہے؟ شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ اگر امام اور امامت منجانب اللہ تھی اور ہر امام اپنے بعد والے امام کے حق میں نص اور وصیت کرتا تھا۔ نیز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے نام بنام تخصیص اور وصیت موجود تھی۔ تب ہر امام کی وفات کے بعد شیعہ میں امامت کے باب میں اختلاف کیوں ہوا؟ اور کئی ایک لوگ کیوں مدعی خلافت ہوئے؟ متعدد گروہ کیوں پیدا ہوئے؟

بے عقل مُلا نے شاید قرآن کریم کے اندر پہلی امتوں بالخصوص بنو اسرائیل کے حالات کا

مطالعہ نہیں کیا، بقول اقبال مُلاؤں کو قرآن سے بس اتنا ہی تعلق ہے۔

ترا با آیاتش کارے خبر ایں نیست
کہ از یٰسین او آساں بمیری

قرآن نے پہلی امتوں کے اختلاف کے اسباب بیان کیے ہیں۔ حالانکہ ان میں مسلسل نبوت جاری تھی۔ ان اقوام نے اپنے انبیاء سے جو سلوک کیا وہ بھی قرآن میں مذکور ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ م بَعْدِ مَاجَآءَ تْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا م بَيْنَهُمْ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۲۱۳) اختلاف کا سبب سرکشی، باہمی عداوت اور تکبر ہے۔

﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ م بَعْدِ مَاجَآءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا م بَيْنَهُمْ﴾

(سورۂ آل عمران، آیت ۱۹)

اور کتاب کا اختلاف علم آجانے کے بعد (باوجود واضح علم) کے باہمی عداوت، سرکشی، حسد اور تکبر تھا۔ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۵) تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جن کے پاس کھلی نشانیاں آنے کے بعد (جان بوجھ کر) انہوں نے فرقہ بندی اور اختلاف کیا۔

بنو اسرائیل نے اپنے انبیاء کے ساتھ کیا کیا؟ ﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ م بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری خواہشات کے خلاف کوئی حکم لے کر آیا تو تم نے استکبار کیا۔ پس ان رسولوں میں سے بعض کو تم نے جھٹلا دیا اور بعض کو تو قتل ہی کر دیا۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۸۷)

پہلے لوگوں نے اس امت کے بانی پیغمبر کی وفات پر جو اختلاف کیا وہ بے علمی اور جہالت نہیں بلکہ باہمی عداوت، سرکشی اور تکبر کی بناء پر کیا۔ ان میں سے چند ایک مستکبرین وڈیروں کے اپنے مفاد ہوتے تھے۔ ان کی بناء پر شکوک وشبہات کھڑے کر کے امت میں تفرقہ ڈال دیتے۔ اب اسی تفرقے کو ختم کرنے اور پہلے پیغمبر کی تعلیمات پر عمل کرانے کے لیے جو نئے انبیاء مبعوث ہوتے۔ یہ خواہش پرست افراد پہلے تو انہیں جھٹلا دیتے تاہم اگر دیکھتے کہ ان انبیاء کی تبلیغ سے ان

کے مفادات پر زد پڑنی یقینی ہے تو ان میں سے بعض کو قتل بھی کرا دیتے۔ اس امت میں سے شیعوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ پہلے تو پیغمبر کی وضاحت اور نامزدگی کے باوجود امت نے حضرت علی علیہ السلام کو امام تسلیم نہ کیا، بلکہ اختلاف اور تکذیب کی۔ نوبت قتل کے قریب تک پہنچ گئی۔

بعد ازاں باقی ائمہ علیہم السلام کی وفات پر بھی مفاد پرست عناصر کی طرف سے اختلاف اور تفرقہ سامنے آیا لیکن یہ امامت منصوص ہونے میں کوئی خلل نہیں ڈالتا۔ اس لیے کہ پہلی اقوام مثلاً بنو اسرائیل بھی علم اور کھلی نشانیاں آنے کے بعد محض مفاد پرستی کی بناء پر انبیاء سے اختلاف، تکذیب اور قتل کا اقدام کرتی رہیں۔ یہ امر نہیں تھا کہ انہیں حقائق کا علم نہ ہوتا تھا۔

نتیجۂ کلام

مؤلف زیرِ عنوان ''خلاصۂ بحث'' بطور نتیجہ یوں لکھتا ہے کہ:

''امام حسین علیہ السلام کے بعد صرف شیعہ میں جو پچاس کے قریب گروہ وجود میں آئے ہیں انہیں سامنے رکھیں اور پھر حضرت امام جعفر کی طرف منسوب وہ روایت بھی سامنے رکھیں کہ ہمارے شیعہ اثنا عشری کے علاوہ باقی سب کنجریوں کی اولاد ہیں تو اب خود حساب لگالیں کہ خود کتنے شیعہ گروہ اس کی زد میں آگئے ہیں اور کتنے اماموں کے بھائی بیٹے اس اصول کے تحت ناپاک نسب والے قرار پائے ہیں اور بات صرف ان تک نہیں رکتی کیونکہ ان کی مائیں شیعہ عقیدہ کے مطابق کسی نہ کسی امام کی بیوی یا والدہ ضرور تھیں۔ اب اس اصول کے تحت غور کیجئے اور میں شیعہ کو بھی دعوتِ فکر دیتا ہوں کہ آخر اب اہل بیت کا کون سا فرد یا شخصیت باقی رہ گئی ہے جس کی والدہ تمہارے اس فتویٰ کی زد سے محفوظ ہو رہی ہے۔'' (خطباتِ جیل ص ۱۶۱، ۱۶۲)

الجواب:۔ مؤلف نے یہ انتہائی جاہلانہ اور احمقانہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ جو ان کی کوتاہ اندیشی اور تغافل شعاری کا بدترین نمونہ ہے حالانکہ امام علیہ السلام کی یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ جو شخص بھی شیعہ نہیں ہے وہ بدکار عورت کی اولاد ہے یا ولد الزنا ہے۔ اس کا مفہوم متعین کرنے کے لیے کافی جدوجہد کی ضرورت ہے اور ذہنی کاوش سے ہی اس بات کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے۔

اولاً یہ ہے کہ اس میں اپنے خاندان کو شامل نہیں کیا۔ بلکہ دیگر لوگوں کے بارے میں یہ

حقیقت بیان فرمائی ہے۔ ثانیاً یہ کہ اس سے مراد نواصب ہیں جو اہل بیتِ رسولؐ سے عداوت کو اپنا دین سمجھتے ہیں۔

ثالثاً بغایا سے مراد فاحشہ اور بے حیا عورت ہے جو لازم نہیں کہ زنا کار ہی ہو۔ ہر جگہ لغوی مفہوم اور وہ بھی شدید تر ہی مراد لینا مناسب نہیں ہے۔

رابعاً اس طرح کا لفظ تغلیظاً وتہدیداً اور زجراً یعنی مذمت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت مراد نہیں ہوتی۔ جیسا کہ قرآن کریم میں سرکش اور نافرمان لوگوں کے بارے میں آیا ہے کہ ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ (سورۂ اعراف، آیت ۱۷۹) اس آیت مبارکہ میں ﴿كَالْاَنْعَامِ﴾ بر سبیل المجاز استعمال ہوا ہے یہاں حقیقی چار ٹانگوں والا حیوان مراد نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ معاویہ ایک وتر کیوں پڑھتا ہے؟ تو فرمایا: ﴿من این تری اخذها الحمار﴾ یعنی اس گدھے نے یہ بات کہاں سے لی ہے؟

(شرح معانی الآثار، ج ۱، ص ۱۷۱، باب الوتر، مطبوعہ دیوبند)

کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ یہاں لفظ ''حمار'' سے حقیقی گدھا مراد ہے؟ اسی طرح حضرت ابوبکر نے صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی کو ﴿امصص بظر اللات﴾، (جا اس کا بظر چوس) (صحیح بخاری ج ۲ ص ۴۷ باب الشروط فی الجهاد) کہا تھا حالانکہ حقیقتاً ایسا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ نہ عملاً کوئی ایسا کرتا ہے۔ صرف اس کی توہین اور مذمت مقصود تھی۔ اس لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کیے، عربوں میں شدید مذمت کے لیے اس قسم کی گالی دینے کا رواج تھا۔ اگر آپ اپنے ''صدیق اکبر'' کی اس گالی کو حقیقت پر محمول کر سکتے ہو تو برین فہم ودانش بباید گریست ؏

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ۔۔۔ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

لہٰذا مؤلف کا بزعم خویش ان مبنی بر مجاز الفاظ (جس کے مصداق اہل بیتؑ کے ساتھ بغض وعناد رکھنے والے لوگ ہیں) کو اپنی دلیل بنا کر خانوادۂ عصمت وطہارت کی توہین وتحقیر کرنا بہت بڑے جسارت وگستاخی کا بدترین مظاہرہ ہے اعاذنا اللّٰہ من ذلك۔

باب ۷

عظمتِ قرآن اور تحریفِ قرآن کی حقیقت

اگرچہ قرآن مجید کو متنازع بنانے کی کوششیں نئی نہیں ہیں لیکن آج جبکہ اسلام صحن عالم میں ایک بڑی قوت بن کر ابھرا ہے۔ ایسے میں اسلام دشمن عناصر نے ایک بار پھر اسلام کی بنیاد پر شد و مد سے حملہ کر دیا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ قرآن کو مشکوک بنائے بغیر اسلام دشمنی کے مقاصد پورے نہیں کیے جا سکتے۔ لہٰذا وہ اس سعی نامشکور میں مصروف ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ازلی اور ابدی پیغام اور اسلام کے منشور اساسی کو متنازعہ بنا کر اسلامی عقائد و اعمال کی پوری عمارت کو زمین بوس کر دیں۔

بدقسمتی سے امت اسلامیہ کے بعض احمق اور خود غرض افراد بھی اسلام دشمنی پر مبنی اس سازش کا ادراک نہ کرتے ہوئے محض فرقہ وارانہ تعصب کے باعث اس پروپیگنڈے کو ہوا دے رہے ہیں کہ شیعہ مسلک کے لوگ تحریف قرآن کے قائل ہیں۔ ایسے نادان یہ نہیں سوچتے کہ الزام کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کتاب اللہ ہی مشکوک اور متنازعہ حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح اغیار کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی ماخذ کے بارے میں کہہ سکیں کہ خود مسلمان ہی اس قرآن پر متفق نہیں ہیں۔ چنانچہ اسلام ایک بے بنیاد مذہب ہے۔ (معاذ اللہ)

انہی میں سے ایک مولوی اعظم طارق ہے جس کا زعم باطل یہ ہے کہ شیعہ موجودہ قرآن کو اصل نہیں مانتے۔ چنانچہ اس نے متعدد چھوٹے عنوانات کے تحت اس الزام کو ثابت کرنے کی مذموم اور ناپاک کوشش کی ہے۔ ذیل میں قابل ذکر عنوانات بیان کر کے ان میں مذکور کذب بیانیوں کی قلعی کھولی جاتی ہے۔

مؤلف اپنی زہر آلود زبان سے یوں گویا ہوتا ہے کہ:

''عصمت قرآن کریم پر شیعہ کا ایمان نہ ہونے کی پہلی وجہ:۔

شیعہ کی طرف سے موجودہ قرآن کریم کو اصلی اور غیر محرف شدہ قرآن تسلیم نہ کرنے کی اصل وجہ یہ ہوئی کہ یہ بات شیعہ بلکہ غیر مسلموں تک کو تسلیم ہے کہ اس قرآن کریم کو اصحاب رسول نے لسان نبوت سے سن کر املاء کیا اور اپنے سینوں میں محفوظ کیا ہے پھر حضرات خلفاء راشدین کے دور میں اسے موجودہ کتابی شکل میں لایا گیا ہے۔۔۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ خلفاء راشدین کو مؤمن مسلمان اور پاکباز وراست باز تسلیم کیے بغیر شیعہ اس قرآن کو تحریف سے پاک تسلیم نہیں کرسکتا۔

شیعہ کی طرف سے موجودہ قرآن کو محرف قرار دینے کی دوسری وجہ:۔

بقول شیعہ اصلی قرآن حضرت علیؓ نے جمع کیا تھا جبکہ خود حضرت علی خلفاء ثلاثہ کے دو میں اسے سامنے لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور اپنے دور میں بھی (انہوں نے) اس قرآن کو اِ خدشہ کے پیش نظر ظاہر نہیں کیا کہ کہیں میرے لشکر میں بغاوت نہ پھیل جائے۔ نتیجتاً جو قرآن شیع کے نزدیک معصوم امام نے قلم بند کیا تھا وہ بھی لوگوں کی نظروں سے غائب ہی رہا اور بالآخر اما غائب اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔

شیعہ کی طرف سے موجودہ قرآن کو غیر محرف تسلیم نہ کرنے کی تیسری وجہ:۔

شیعہ اس قرآن کریم کو محرف ومبدل تسلیم کرنے پر اس لیے بھی مجبور ہے کہ وہ جن ائ کرام کو معصوم عن الخطاء والنسیان اور انبیاء سے افضل واعلیٰ اور منصوص من اللہ تسلیم کرتا ہے ان ا کی دو ہزار روایات شیعہ کی کتب میں موجود ہیں جس میں چلا چلا کر کہا گیا ہے اور آیات کی نشاند کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ قرآن بدل دیا گیا ہے جبکہ اس کے برعکس ایک بھی روایت ان ا سے ایسی شیعہ کو ڈھونڈے سے نہیں مل رہی جس میں یہ کہا گیا ہو یہ قرآن کریم ہر قسم کی تحریف و ت سے محفوظ وسلامت ہے لہٰذا اب شیعہ کا اس قرآن کریم کو بدلی ہوئی کتاب تسلیم نہ کرنا بالکل نامم ہے کیونکہ ایسا کرنا اپنے معصوم ائمہ کی تعلیمات کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔''

(خطبات جیل ص ۱۶۸ تا ۱۷

الجواب :۔ مؤلف کا خیال ہے کہ قرآن کریم کو اصحاب رسول نے لسانِ نبوت سے سن کر لکھا ہے۔ اسی کی از سرِ نو تدوین اور نشر و اشاعت شیخین اور حضرت عثمان نے کی جبکہ شیعہ ان صحابہ کے ایمان کے قائل نہیں ہیں۔ اس طرح ان کے جمع و نشر کردہ قرآن پر بھی شیعہ کا ایمان نہیں ہے۔

جہاں تک صحابہ کرامؓ کے ایمان و اسلام کا تعلق ہے تو واضح ہو کہ تمام شیعہ اثناعشریہ قائلِ تکریم و تعظیم اور حضور کائنات ﷺ کا ساتھ دینے والے مخلص صحابہ کرامؓ کے ایمان اور اسلام کے قائل ہیں۔ ان کے فضائل و مناقب کے معترف ہیں مگر ان میں منافقین کا گروہ بھی موجود تھا جس کی نشاندہی کتاب و سنت سے عیاں ہے بلکہ حضور ﷺ نے تو بعض اصحاب کے اسماء اپنے ایک مخلص صحابی حضرت حذیفہ یمانیؓ کو بتا بھی دیئے تھے جن سے بعض صحابی اکثر دریافت کیا کرتے کہ کہیں میرا نام بھی تو اس فہرست میں شامل نہیں؟ ان ہی حقائق کے پیش نظر بلا خوف تردید یہ امر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ﴿الصحابة کلهم عدول﴾ ایک ایسا نظریہ ہے جو قانون فطرت کے بالکل خلاف، عقلیات کے سراسر منافی اور مسلمات سے بھی متعارض ہے۔ اسی بنا پر شافعیہ میں سے ابوالحسین القطان محدث نے اس عموم سے شدید اختلاف کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک صحابہ میں کچھ ایسے ہوئے ہیں جن سے لغزشیں ہوئی ہیں اور محدث مازری نے اس اصول کو صرف ان صحابہ کے لیے مخصوص کیا ہے جو شب و روز آقائے نامدار ﷺ کی صحبت اور آپ کی اعانت میں مصروف رہتے تھے ان کے نزدیک عام صحابہ اس عموم میں داخل نہیں تھے۔

لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ قرآن کریم کی جمع و تدوین کا فریضہ خود پیغمبر اکرم ﷺ نے ادا کر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ سے پورے کا پورا قرآن شریف تحریر کروا دیا تھا۔ وفاتِ پیغمبر ﷺ کے فوراً بعد اس املاء شدہ قرآن کو مدون کرنے کے لیے گھر میں بیٹھ گئے۔ جیسا کہ اہل سنت کی کتب میں واضح ہے چنانچہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

﴿عن محمد بن سیرین قال لما توفی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ابطاء علی عن بیعة ابی بکر فلقیه ابو بکر فقال اکرهت امارتی فقال لا ولکن الیت ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلوة حتی اجمع القرآن فزعموا انه کتبه علی تنزیله فقال محمد

لو اصیب ذلک الکتاب کان فیہ العلم﴾

محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو حضرت علیؑ نے ابوبکر کی بیعت میں تاخیر کی۔ ابوبکر کی ان سے ملاقات ہوئی تو پوچھا: کیا آپؑ کو میری حکومت ناگوار گزری ہے؟ آپؑ نے فرمایا: نہیں، لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ نماز کے بغیر کسی کام کے لیے چادر نہیں اوڑھوں گا حتیٰ کہ قرآن جمع نہ کرلوں۔ چنانچہ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت علیؑ نے قرآن کو اس کی تنزیل کے مطابق لکھا تھا۔ محمد بن سیرین نے کہا ہے۔ اگر وہ کتاب (حضرت علیؑ کا جمع شدہ نسخہ قرآن) مل جاتا تو اس میں بڑا علم ہوتا۔'' (تاریخ الخلفاء ص ۱۳۰۔ کنز العمال، ج ۱ ص ۲۸۳۔ استیعاب بر حاشیہ الاصابہ ج ۲ ص ۲۵۳، صواعق محرقہ ص ۷۶)

سب سے پہلے جامع قرآن حضرت علی علیہ السلام ہیں

اس روایت کے مطابق قرآن کریم کے سب سے پہلے جامع اور مدون حضرت علی علیہ السلام ہیں، علامہ سیوطی حضرت علی علیہ السلام کے حالات میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''.....واحد من جمع القرآن و عرضہ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'

حضرت علیؑ ان افراد میں سے ایک ہیں جنہوں نے قرآن جمع کیا اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔۔۔۔'' (تاریخ الخلفاء ص ۱۷۱ طبع کانپور)

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے مصحف میں منسوخ آیات پہلے اور ناسخ بعد میں رکھیں۔ آپ کا مرتب کیا ہوا قرآن نزول کے مطابق تھا، شروع میں سورۂ اقراء، پھر سورۃ مدثر، پھر سورۃ قلم، اسی طرح پہلے مکی سورتیں، پھر مدنی، برصغیر کے مشہور محدث مولانا احمد علی سہارنپوری صحابہ کرامؓ کے مصاحف کا اجمالی تذکرہ کرتے وقت حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کے مرتب کردہ قرآن سے متعلق صحیح بخاری جلد ۲ باب تالیف القرآن حاشیہ نمبر ۵، ص ۷۴۷ مطبوعہ میرٹھ میں تحریر فرماتے ہیں: ﴿ان مصحف علی رضی اللہ عنہ کان علی ترتیب النزول اولہ اقراء ثم المدثر ثم ن و القلم ثم المزمل ثم تبت ثم التکویر ثم سبح و ھکذا الی اخر المکی ثم المدنی﴾ اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی بھی جناب امیرؑ کا قرآن جمع کرنا بڑے شد و مد سے تسلیم کر چکے انہوں

نے بڑے دکھ بھرے لہجہ میں کہا ہے کہ:

﴿ونصب او از احیاء علوم دینیه آن است که جمع کرد قرآن را بحضور آنحضرت صلی الله علیه وآله وسلم و ترتیب داده بود آں را لیکن تقدیر مساعد شیوع آن نه شد﴾

ترجمہ: ''حضرت علیؑ کا حصہ علوم دینیہ کے زندہ کرنے میں یہ بھی ہے کہ آپ نے آنحضرتؐ کے سامنے قرآن کو جمع و مرتب کیا تھا مگر تقدیر نے اس کے شائع ہونے میں مدد نہ کی۔'' (ازالۃ الخفاء مقصد۲ ص ۲۷۳ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

مندرجہ بالا عبارات سے بہت سے اہم امور کا انکشاف ہوتا ہے:

- رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی جمع، ترتیب اور تدوین قرآن کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔
- اسی ترتیب (نزولی ترتیب) سے حضرت علی علیہ السلام نے قرآن کریم کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے فوراً بعد تحریر کر کے ایک نسخہ بنا دیا لیکن کچھ نامساعد وجوہ کی بنا پر شائع نہ ہو سکا۔
- لیکن محمد بن سیرین کی زندگی میں حضرت علی علیہ السلام کا کتابت شدہ قرآن ملتا نہ تھا۔ اسی لیے محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ کاش وہ نسخہ مل جاتا تو اس میں بڑا علم ہوتا۔
- ﴿کان فیه العلم﴾ کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قرآن میں محمد بن سیرین کے قول کے مطابق ایسی باتیں درج تھیں جو محمد بن سیرین کے دورِ حیات میں موجود قرآن میں نہ تھیں ورنہ کان فیه العلم کہنا فضول بات ہے۔ ابن سیرین کے قول سے اخذ ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے جمع شدہ قرآن میں کچھ باتیں ایسی ضرور تھیں جو عام قرآن میں نہ تھیں۔ نیز ترتیب میں بھی فرق ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے قرآن کو نزولی ترتیب پر کیوں جمع کیا؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ابن سیرین کے عہد میں یہ قرآن ملتا کیوں نہ تھا؟ یہ نسخہ کہاں چلا گیا؟ چونکہ محمد بن سیرین کبار تابعین میں سے ہیں، ان کی عظمت، شان اور رفعت علم کے تمام اہل سنت معترف ہیں۔ (تفصیل کیلئے دیکھئے سیر اعلام النبلاء للذہبی ج ۴ ص ۶۰۶ تا ۶۲۲) بالخصوص تعبیر رویاء کے علم میں تو ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اتنی عظیم شخصیت قرآن کے بارے میں معتقد ہے کہ ایک حضرت

علی علیہ السلام کا جمع شدہ بھی ہے جو نزول ترتیب سے ہے نیز اس میں کچھ ایسی علمی باتیں بھی ہیں جو عام قرآن میں نہیں ہیں۔ اہل سنت علماء میں سے کسی نے آج تک اس قول کی وجہ سے محمد بن سیرین کی مذمت نہیں کی، نہ ان پر کفر کا فتویٰ اور تحریف قرآن کے قائل ہونے کا الزام لگایا نہ ہی اس روایت کو معتبر سمجھ کر نقل کرنے والے علماء مثلاً جلال الدین سیوطی وغیرہ پر کوئی فتویٰ داغا ہے۔

یہ حال تو اہل سنت کے اکابر کا ہے۔ بہر حال شیعہ قرآن کو اصلی اور غیر محرف مانتے ہیں۔ خواہ جمع کرنے والا کوئی صحابی ہو یا تابعی، اہل ایمان کا قرآن ایک ہی ہے۔ اس پر باہمی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان عبارات نے مؤلف کے مفروضہ کو غلط قرار دے دیا ہے کہ قرآن کریم صحابہ نے جمع کیا اور خلفاء راشدین میں سے خلفاء ثلاثہ نے اس کی کتابی شکل میں اشاعت کی۔

مؤلف نے دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بقول شیعہ حضرت علی علیہ السلام نے اصلی قرآن جمع کیا تھا لیکن خلفاء ثلاثہ کے دور میں اسے سامنے نہ لا سکے۔ اپنے عہد خلافت میں بھی عوام میں بغاوت پھیلنے کے خدشے سے سامنے نہ لا سکے۔ اب وہ قرآن غائب ہی ہے۔ آپ غور کر لیں ان سب باتوں کے قائل شیعہ نہیں ہیں بلکہ آپ کے جلیل القدر تابعی محمد بن سیرین ان کے تمام ہمنوا اور معتقدین اور ان سے مندرجہ بالا قول نقل کرنے والے علماء اور اس کو پڑھ کر آج تک خاموش رہنے والے فقہاء و محدثین انہی امور کے قائل ہیں۔ دوسروں پر الزام تراشی کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

"شیعہ پر الزام تراشی کیلئے تیسری وجہ جو مؤلف نے بیان کی ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے دو ہزار روایات شیعہ کتب میں تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی موجود ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ روایات ایک ہزار ہوں یا دو ہزار یا دس ہزار یا صرف ایک روایت ہو مطلب واضح ہے مقصد ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ دیگر روایات کو چھوڑ کر محمد بن سیرین کا قول اوپر گزر چکا ہے۔ آپ یا تو محمد بن سیرین اور اس کے معتقدین اور مداحین کی تکفیر کریں۔ جن علماء، فقہاء محدثین نے اس روایت کو نقل کیا اور کوئی جرح نہیں کی جو درست تسلیم کرنے کی علامت ہے۔ انہیں

بھی کافر قرار دیں۔ پھر شیعہ سے اس قسم کا مطالبہ کریں۔ اگر آپ اس کی کوئی تاویل کرتے ہیں تو اہل حق کے لیے بھی از راہِ انصاف تاویل کا باب کھلا رہنے دیں۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

مُلاں کا یہ کہنا کہ شیعہ کو ڈھونڈے سے ان ائمہؑ سے کوئی ایسی روایت نہیں ملے گی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ موجودہ قرآن اصلی اور غیر محرف ہے۔ سراسر جھوٹ اور فریب پر مبنی ہے۔ شیعہ کتب اسی قرآن کے اصل ہونے کے بارے میں واضح روایات سے بھری پڑی ہیں۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ﴿انا لم نحکم الرجال و انما حکمنا القرآن وھذا القرآن انما ھو خط مسطور بین الدفتین لا ینطق بلسان ولا بدله من ترجمان﴾

ہم نے بندوں کو حاکم نہیں بنایا بلکہ قرآن کو حاکم بنایا ہے اور یہ قرآن وہی ہے جو بین الدفتین مسطور ہے وہ زبان سے نہیں بولتا بلکہ اس کے لیے ترجمان کی ضرورت ہے۔"

(نہج البلاغہ ج ۲ ص ۷ طبع رحمانیہ مصر)

آپؑ کا یہی فرمان ذیشان، کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۱۶۶ طبع قاہرہ میں بھی بعینہا مرقوم ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اسی مسطور بین الدفتین کو اصلی قرآن قرار دیا ہے۔ اس پر تحکیم ہوئی تھی۔ مُلاں نے کبھی اپنی عقل سے حماقت کا پردہ ہٹا کر اصول کافی کو دیکھا ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس میں ایک مفصل "کتاب فضل القرآن" ہے۔ جس میں متعدد ذیلی ابواب ہیں۔ ان ابواب میں قرآن حفظ کرنے، اس کی تعلیم حاصل کرنے، دوسروں کو سکھانے، قرأتِ قرآن پر ثواب، مصحف میں دیکھ کر قرآن پڑھنے کے ثواب، ترتیل سے قرأت اور قاریانِ قرآن کی فضیلت وغیرہ سے متعلق بے شمار ارشاداتِ ائمہ علیہم السلام مذکور ہیں۔ جس تک مخاطبین کی رسائی ہی ممکن نہ ہو؟ مؤلف اور اس کے اگلے پچھلے نادانوں کو عقل سے کام لینا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ یہ روایات اور ارشادات اسی موجودہ قرآن کے بارے میں ہیں۔ اگر یہ قرآن اصلی نہ ہوتا تو اس کی تعلیم و تعلم اور قرأت پر اتنا ثواب اور فضائل کیوں عطا ہوئے؟ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس ناقابل انکار حقیقت کے باوجود عدل و انصاف کا خون ناحق کر کے تحریفِ قرآن کا بہتان آئے دن اہل حق کے

سرتھوپ رہے ہیں و الی اللہ المشتکی۔

دس لاکھ ستائیس ہزار حروف والا قرآن

اس سلسلہ میں قابل غور امر یہ ہے کہ اگر محض روایات کی بنیاد پر اہل حق کو قائل تحریف قرآن قرار دیا جاتا ہے تو ہم جواباً گزارش کریں گے کہ ع

این گناہیست کہ در شہر شا نیز کنند

تو اس کی زد سے آپ کا دامن بھی محفوظ نہیں ہے بلکہ آپ تحریف قرآن کے سب سے بڑے قائ قرار پاتے ہیں کیونکہ ایسی روایات آپ کے ہاں بکثرت موجود ہیں خوف اطناب وطوالت مانع۔ ورنہ آپ کی کتب تفسیر وحدیث سے بہت سی عبارات پیش کر دی جاتیں اب سر دست بطور نمونہ ؛ ایک عبارات کے نقل کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ آپ کے عقیدے کے مطابق پہلے کس قدر قرآن کریم کے حرو تھے جو موجودہ قرآن میں نہیں ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ: ﴿عن عمر بن الخطاب مرفوعا: القر الف الف حرف و سبعة و عشرون الف حرفاً فمن قراء ہ صابراً محتسباً کان بکل حرف زوجة من الحور العین رجاله ثقاة..... الخ﴾

حضرت عمر بن خطاب سے مرفوعاً مروی ہے کہ قرآن دس لاکھ ستائیس ہزار حروف مشتمل ہے، جو کوئی اسے صبر کرتے ہوئے مشقت اٹھا کر ثواب کی نیت سے پڑھے گا تو ہر حرف عوض میں اسے جنت میں ایک حور عین عطا کی جائے گی۔اس کے تمام راوی ثقہ اور معتبر ہیں۔

(جامع الاحادیث للسیوطی ج ۶ ص ۳۸۴ طبع بیروت، المعجم الاوسط طب ج ۵ ص ۴۷ حدیث نمبر ۶۶۱۶ طبع بیروت، کنز العمال ج ۱ ص ۱۳۰، طبع د

مگر طبرانی کے استاد محمد بن عبید بن آدم پر علامہ ذہبی نے اس حدیث کی بناء پر تکل ہے، قرآن کے جس حصے کا لکھنا منسوخ ہو چکا ہے یہ روایت اس پر محمول ہے کہ موجودہ قرآن حروف کی تعداد اس حد تک نہیں پہنچتی۔

اگر یہ روایت قرآن کے منسوخ شدہ حصے سے متعلق ہے تو حضرت عمر اس کے فضائل نبی اکرم ﷺ سے کیوں نقل کر رہے ہیں؟ عام مسلمانوں کو کس وجہ سے شک و شبہ اور حسرت و یاس میں بتلا کر رہے ہیں؟ جب اتنے حروف پر مشتمل قرآن ہی موجود نہیں ہے تو مسلمانوں کو حور عین کے حصول کی ترغیب اور خواہش پیدا کر کے کس لیے تڑپا رہے ہیں۔

اگر تمہارے اکابر کی یہ روایت منسوخ حصے سے متعلق ہے تو ہماری روایات بھی اسی منسوخ التلاوت حصے سے متعلق ہیں جو ابتداء تفسیر کے طور پر ساتھ نازل ہوا لیکن اسے الگ مشخص کیا گیا ہے۔ یہ برائے تفسیر حصہ ہے جسے بعد ازاں تفسیر معلوم ہو جانے کی صورت میں منسوخ کر دیا گیا اور صرف اصلی وحی متلو کا حصہ باقی رہنے دیا گیا۔

جس طرح آپ کے علامہ ذہبی نے جان چھڑانے کے لیے امام طبرانی کے استاد پر جرح کر دی۔ حالانکہ اس سے پہلے کسی شخص نے محمد بن عبید راوی کو مجروح نہیں کیا۔ اس طرح اتنے طویل عرصے بعد ملا ذہبی کی جرح بالکل بے دلیل اور بے فائدہ ہے۔ بہر حال اگر آپ اپنی اس قبیل کی روایات سے راویوں پر جرح کر کے دفاع کر سکتے ہیں تو ہمیں بھی اپنی کتب میں موجود اس طرح کی روایات کے راویوں پر جرح کر کے دفاع کا حق حاصل ہے ذہبی نے تو بے دلیل مبہم جرح کی ہے جبکہ ہمارے رجال کی کتب میں ایسے تمام راوی مجروح اور غیر ثقہ مذکور ہیں۔

آپ کے بزرگ نے اس روایت سے جان چھڑانے کے لیے دو توجیہات پیش کی ہیں۔

ایک: راوی کا متکلم فیہ ہونا اور

دوسری: اس روایت کو منسوخ التلاوت حصے سے متعلق قرار دینا۔

ہمارے علماء نے بھی اس نوع کی توجیہات پیش کی ہیں۔ اپنی توجیہات کو درست قرار دے کر ہماری ویسی ہی توجیہات کو مسترد کر دینا صریحاً ناانصافی اور ظلم ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمر کا تحریف قرآن کے متعلق اعتراف

حضرت عمرؓ کے بعد ان کا بیٹا بھی اعلان کرتا ہے کہ موجودہ قرآن نامکمل ہے۔ بہت سا قرآن ضائع ہو چکا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں: ﴿**لا یقولن احدکم قد اخذت القرآن کله و ما**

يدريه ما كله؟ قد ذهب منه كثير و لكن ليقل قد اخذت ما ظهر منه ﴾

تم میں سے کوئی شخص ہرگز یہ دعویٰ نہ کرے کہ میں نے پورا قرآن حاصل کرلیا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جو کچھ اس میں سے سامنے موجود ملا ہے میں نے وہ حاصل کرلیا ہے۔"

(تفسیر در منثور ج ا ص ۱۰۶ طبع مصر)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اعلانیہ اقرار کر رہے ہیں کہ قرآن میں سے کثیر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ اگر اس قول کو نسخ شدہ حصے پر محمول کیا جائے تو یہ بھی بالکل نامعقول کوشش ہوگی۔ اس لیے کہ ابن عمر واضح طور پر کہتے ہیں کہ کوئی شخص کل قرآن کے حاصل کرنے کا دعویٰ نہ کرے۔ حالانکہ جو منسوخ ہو جائے وہ کل کا حصہ ہی نہیں رہتا۔ جو غیر منسوخ باقی رہ گیا ہے وہی کل ہوتا ہے۔ لہٰذا ابن عمر کا قول واضح دلالت کرتا ہے کہ بہت سا قرآن ضائع ہوگیا ہے۔ منسوخ شدہ حصے کو"﴿قد ذهب من كثير ﴾ کے الفاظ سے تعبیر نہیں کیا جاتا، نہ ہی اسے نہ حاصل کرنے والے کو کل قرآن کے حاصل کرنے کے دعویٰ سے باز رکھا جا سکتا ہے۔

کسی حدیث یا عرب کی لغت میں لفظ "ذهب" کے معنی میں نہیں آیا ہے اگر بفرض محال "ذهب منه قرآن كثير" کا معنی نسخ تلاوت مان لیا جائے تو بتائے کہ حضرت عمرؓ کے فقرہ ﴿انی اخشى ان يستحر القتل بالقراء في المواطن فيذهب كثير من القرآن ﴾ (مجھے خوف ہے کہ تمام قاری کہیں دوسری جنگوں میں نہ مارے جائیں کہ بہت سا قرآن جاتا رہے گا) (بخاری ص ۱۳۹ ج ا طبع مصر) کے کیا معنی ہوں گے جو انہوں نے جمع قرآن کے وقت حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا؟ صاحبانِ فہم و فراست کے لیے دعوت فکر ہے۔

نبی اکرمؐ کے زمانے میں سورۃ الاحزاب دو سو آیات پر مشتمل تھی

اہلسنت کے مشہور اہل علم علامہ سیوطی اپنے اکابر علماء سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿عن عائشه قالت سورة الاحزاب تقراء في زمن النبي صلى الله عليه وسلم مائتا آية فلما كتب عثمان المصاحف لم نقدر منها الا ما هو الآن﴾

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: نبی ﷺ کے زمانے میں سورت احزاب دو

آیات کی پڑھی جاتی تھی، جب عثمان نے مصاحف لکھے تو ہمیں اتنا حصہ ہی مل سکا جواب قرآن میں موجود ہے۔" (اتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۲۵، تفسیر درمنثور ج ۵ ص ۱۸۰۔ فتح البیان ج ۵ ص ۳۴۴ طبع جدید بیروت، تفسیر قرطبی ج ۱۴ ص ۱۱۳)

اس کے بعد تعداد کے طویل ہونے کے بارے میں حضرت ابی بن کعبؓ سے نقل کیا ہے کہ سورۃ الاحزاب سورت بقرہ کے برابر تھی اور اسی سورۃ میں ہم آیت رجم بھی پڑھا کرتے تھے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۴۶۵، تفسیر قرطبی ج ۱۴ ص ۱۱۳ طبع قاہرہ،

تفسیر القاسمی از علامۃ الشام جمال الدین القاسمی ج ۱۳ ص ۴۸۲۱ طبع مصر)

اس روایت کے تحت حافظ ابن کثیر دمشقی نے اسے "حسن" کہا ہے لکھتے ہیں ﴿وهذا اسناد حسن﴾ "یہ روایت از لحاظ سند حسن ہے۔"

لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ یہ سب کچھ تسلیم کر لینے کے بعد بھی ابن کثیر نے نسخ کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے جو بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

علماءِ اہل سنت نے عجیب وغریب اور بے سروپا نظریہ "نسخ تلاوت" کو جنم دیا جو سراسر غلط اور ضلالت وگمراہی کا موجب ہے بعض آیات کو موجودہ قرآن میں نہ ہونے کی وجہ سے انہیں تسلیم کر کے ساتھ یہ باطل نظریہ بنالیا حالانکہ ان کے لیے مناسب اور بہتر یہ تھا کہ ایسی آیات و روایات کو خلاف قرآن قرار دے کر بالکل مسترد کر دیتے، علامہ محمد عبد اللطیف ابن الخطیب ایک معروف مصری جید عالم نے اس نظریہ کا ابطال کرتے ہوئے معقول بات کی ہے فرماتے ہیں ﴿ومن اعجب العجائب ادعاؤهم ان بعض الآيات قد نسخت تلاوتها و بقی حكمها وهو قول لا يقول به عاقل اطلاقاً و ذلك لان نسخ احكام بعض الآيات مع بقاء تلاوتها امر معقول مقبول﴾ "یعنی سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ مطلقاً صادر نہیں ہو سکتا، حکم منسوخ ہو مگر تلاوت باقی رہے یہ ایک معقول اور قابل قبول بات ہے۔"

(الفرقان ص ۱۵۶، مطبعہ دار الکتب المصریہ قاہرہ ۱۹۴۸ء)

مندرجہ بالا عبارت کے چند سطور بعد صفحہ ۱۵۷ پر یوں لکھتے ہیں ﴿اما ما يدعونه من

نسخ تلاوة بعض الایات مع بقاء حکمها فامر لا یقبله انسان محترم نفسه و بقدر ما وهبه اللّٰه تعالٰی من نعمة العقل اذ ما هی الحکمة فی نسخ تلاوة اية مع بقاء حکمه ما الحکم فی صدور قانون واجب التنفیذ و رفع الفاظ هذا القانون مع بقاء العمل باحکامه ﴾ ''مگر جو یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ آیتیں منسوخ اور حکم برقرار رہتے ہیں ایک ایسی بات ہے جسے کوئی ایسا انسان قبول نہیں کرسکتا جو احترام نفس رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل کی نعمت کی کچھ قدر جانتا ہو، کیونکہ اس بات میں کیا حکمت پوشیدہ ہوسکتی ہے کہ حکم تو برقرار رہے اور صرف تلاوت منسوخ ہوجائے، اس قانون نے صادر ہونے کے باوجود جس کا نفاذ ضروری ہے اس کے الفاظ کو اٹھانے میں کیا حکمت ہوسکتی ہے جبکہ اس کے احکام پر عمل بدستور باقی ہو۔''

اس طرح کی روایات کو نسخ پر محمول کرنا قطعاً درست نہیں ہے اس لیے کہ قرآنی آیات میں نسخ خبر واحد سے نہیں ہوسکتا، جبکہ اتنی بڑی سورتوں کے بڑے اجزاء کو نسخ کرنے کی کوئی متواتر دلیل موجود نہیں ہے بلکہ حضرت عثمانؓ کے مصحف پر بے شمار صحابۂ کرامؓ کو اعتراض تھا۔ یہ تو محض ریاستی جبر تھا جس کے سامنے وہ لوگ پرزور احتجاج نہ کرسکے، صرف اپنے نظریات کے اظہار پر ہی اکتفا کیا، حضرت عائشہؓ صاف لفظوں میں کہہ رہی ہیں کہ نبی ﷺ کے زمانے میں جو (آپؐ کی وفات تک ہے) سورۃ احزاب دوسو آیات پر مشتمل تھی، یہ اسی حال پر باقی رہی حتیٰ کہ جب حضرت عثمانؓ نے مصاحف لکھے تو پھر ہمیں اس سورۃ کا اتنا حصہ ہی دیا جواب باقی ہے، باقی حصے کو حضرت عائشہؓ کے نزدیک عثمانؓ بن عفان نے ناجائز طور پر حذف کردیا۔

اہل سنت کے علماء نے ایک روایت حمیدہ بنت ابی یونس سے درج کی ہے جو یہ ہے۔

﴿حمیدة بنت ابی یونس قالت قراء علی ابی وهو ابن ثمانین سنة فی مصحف عائشة ان اللّٰه و ملائکته یصلون علی النبی یا ایها الذین آمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیمًا وعلی الذین یصلون الصفوف الاول، قالت قبل ان یغیر عثمان المصاحف﴾

''حمیدہ بن ابی یونس نے کہا کہ ان کے والد نے مصحف عائشہ سے اس وقت یہ آیت اس طرح پڑھی جب ان کی عمر اسی سال تھی ﴿ان اللّٰه و ملائکته ... و علی الذین یصلون الصفوف

الاول ﴾ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی نبی پر درود و سلام بھیجو اور ان لوگوں پر بھی درود و سلام بھیجو جو پہلی صفوں میں نماز پڑھتے ہیں۔ حمیدہ نے کہا: یہ میرے والد نے عثمان کے مصاحف میں تغیر کرنے سے پہلے پڑھا تھا۔"

(اتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۲۵، روح المعانی آلوسی بغدادی ج ا ص ۲۴)

اس روایت سے بھی صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لوگ عمومی طور پر حضرت عثمانؓ کو قرآن میں تغیر و تبدل کرنے کا ذمہ دار اور ملزم گردانتے تھے۔ عام مسلمانوں اور بڑے بڑے علماء اور صحابہؓ و صحابیات حتیٰ کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بھی حضرت عثمان ؓ کو قرآن میں تغیر و تبدل کا ذمہ دار ٹھہراتی تھی۔ جیسا کہ گزشتہ روایت سے ثابت ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے منسوخ ہونے کے سرکاری دعوے کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن طاقت نہ ہونے کے سبب حکومتی اقدام کے خلاف قیام ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ علامہ شمس الدین ذہبی نے ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے اس امر کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ:

حضرت عمر بن خطاب ایک نوجوان کے پاس سے گزرے جو مصحف میں دیکھ کر پڑھ رہا تھا۔ ﴿**النبی و اولٰی بالمؤمنین من انفسهم و ازواجه امهاتم و هو اب لهم**﴾

(سورۃ احزاب نمبر ۶)

حضرت عمرؓ نے اس نوجوان کو کہا: اے لڑکے: ان الفاظ ﴿**وهو اب لهم**﴾ کو مٹا دو۔ اس نوجوان نے کہا: یہ ابی بن کعبؓ کا مصحف ہے، حضرت عمر فوراً ابی بن کعبؓ کے پاس گئے اور ان سے ان الفاظ کے بارے میں تفتیش کی تو ابی بن کعب نے کہا ﴿**انه یلهینی القرآن و یلهیك الصفق بالاسواق**﴾ میں قرآن پڑھنے اور سیکھنے میں مشغول تھا جبکہ تم بازاروں میں تالیاں بجانے میں مشغول تھے (ابی بن کعبؓ کی مراد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ تجارت پیشہ آدمی تھے، لہٰذا بازاروں میں اشیاء کی خرید و فروخت کیلئے بولی دینے اور قیمتیں طے کرنے میں مشغول رہتے تھے، انہیں قرآن کا علم نہیں ہے)۔ (سیر اعلام النبلاء، ج ا ص ۳۹۷ ترجمہ ابی بن کعب، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۲۸ طبع دمشق، کنز العمال ج ۶ ص ۳۷۹ طبع دکن)

اگرچہ حضرت عمرؓ اس وقت بظاہر خاموش ہو گئے، لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ موجودہ قر
میں وہ الفاظ نہیں ہے جن کے مٹانے کا حکم انہوں نے جاری کیا تھا، حکمرانوں کی خواہش اور فر
سے ہی قانون بنتے اور نافذ ہوتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی بات پر عمل نہ ہو سکا حالانکہ حض
ابیؓ قرآن کے جید اور ثقہ عالم تھے جبکہ حضرت عمر بازار میں تالیاں بجانے والے تھے۔

مذکورہ بالا روایات و واقعات اور انہی جیسے دیگر بے شمار دلائل کا مطالعہ کرنے کے بعد دیوبند کے سرمایہ فخر امام العصر علامہ انور شاہ محدث کشمیری نے جو فیصلہ صادر فرماتے ہوئے لکھا۔ وہ ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

علامہ انور شاہ محدث کشمیری قرآن میں لفظی تحریف کے معترف تھے

مسلک دیوبند کے سرمایہ افتخار علامہ انور شاہ کشمیری دینی اور علمی حلقوں میں کسی تعار
کے محتاج نہیں ہیں۔ دیوبندی مکتب فکر کے عوام و خواص کو ان کی ذات پر فخر ہے کہ ان جیسی شخصیہ
اسی مکتب کی نشر و اشاعت میں نہ صرف حصہ دار رہی ہے بلکہ اس مکتب والوں کو ان جیسا کوئی شخص
ہی نہیں۔ مصر کی معروف شخصیت علامہ رشید رضا صاحب المنار جن کے علم و فن اور خصوصی نگارشا
سے پوری دنیا واقف ہے مفتی الدیار مصر شیخ عبدہ کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں، ندوۃ العلماء
جشن علمی میں علامہ رشید رضا کو مدعو کیا گیا تو ایک مختصر وقت کے لیے دیوبند بھی تشریف لائے تو ا
شاہ صاحب نے انہیں سپاسنامہ پیش کیا تھا۔ چنانچہ علامہ انور شاہ سے ملاقات کے بعد وہ یہ کہنے
مجبور ہوئے کہ:

"واللّٰہ ما رائیت مثل ھذا العالم جلیل قط "

"بخدا میں نے اس جلیل القدر عالم کی مثل کوئی عالم نہیں دیکھا"

اور اس کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر انور شاہ صاحب سے میری ملاقات نہ ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ برصغ
میں کسی عالم دین سے میری ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ تفصیلات کے لیے ڈاکٹر یوسف الیش کی کتا
"رحلات الامام محمد رشید رضا" مطبوعہ بیروت دیکھی جا سکتی ہے۔

دیوبند کے امام العصر علامہ انور شاہ محدث کشمیری پہلے دیوبند پھر ڈابھیل میں شیخ الحدیث

کے منصب پر فائز رہے۔ صحیح بخاری کی تدریس کے دوران کتاب الشہادت باب ''لا یسئل اهل الشرك عن الشهادة '' کی تشریح کرتے ہوئے علامہ محمد انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ:

''کتب ساویہ میں واقعہ تحریف کے بارے میں اہل سنت کے تین نظریات ہیں۔ پہلا خیال یہ ہے کہ بعض اہل سنت اس امر کے قائل ہیں کہ کتب ساویہ میں لفظی اور معنوی دونوں طرح کی تحریف ہوئی ہے، ابن حزم اندلسی وغیرہ کا یہی نظریہ ہے۔

دوسرا نظریہ اس طرح ہے کہ یقیناً لفظی و معنوی تحریف ہوئی ہے مگر انتہائی قلیل مقدار میں، اس سلسلے میں تیسرا نظریہ یوں ہے لفظی تحریف واقع نہیں ہوئی، البتہ معنوی تحریف یقینی طور پر ہوئی ہے۔''

اس کے بعد قرآن کریم میں تحریف کے بارے میں اپنا تحقیقی عقیدہ اس طرح بیان کرتے ہیں: ﴿قلت يلزم على هذا المذهب ان يكون القرآن ايضا محرفًا فان التحريف المعنوى غير قليل فيه ايضًا والذى تحقق عندى ان التحريف فيه لفظى ايضًا اما انه عن عمد منهم او لمغلطه﴾ ''میں کہتا ہوں کہ اس نظریہ کی بنیاد پر یہ لازم آتا ہے کہ قرآن میں بھی تحریف کی گئی ہے۔ اس لیے کہ معنوی تحریف تو اس میں بھی بہت زیادہ ہوئی ہے، لیکن جو بات میرے نزدیک تحقیق سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ قرآن میں لفظی تحریف بھی واقع ہوئی ہے، یا تو یہ تحریف انہوں (جامعین قرآن صحابہ) نے جان بوجھ کر کی ہے یا کسی غلطی کی بنیاد پر (انہوں نے تحریف کر دی ہے)۔'' (فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۳ ص ۳۹۵ طبع ڈابھیل)

عالی قدر قارئین!

دیکھا آپ نے کہ علامہ انور شاہ محدث دیوبند نے اپنے وسیع مطالعہ اور گہرے غور و فکر کے بعد تحقیقی فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ قرآن کریم کے جامعین اور ناشرین لوگوں نے اس میں یا تو جان بوجھ کر تحریف کر ڈالی ہے یا انہوں نے کسی غلطی کی بنیاد پر تحریف کی ہے لیکن غلطی سے تحریف قرآن کا امکان بہت کم ہے۔ اصل بات یوں ہے کہ قرآن میں تحریف بقول انور شاہ کشمیری بعض اغراض فاسدہ کی بناء پر عمداً کی گئی ہے۔ قرآن کریم کی جمع و تدوین کے متعلق جتنی احتیاط اور اہتمام

کا ذکر کیا جاتا ہے اس کی موجودگی میں غلطی سے تحریف کے وقوع کا قول عقلاً نا قابل تسلیم ہے، لہٰذ یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ تحریف جان بوجھ کر اپنی اغراض فاسدہ کی بناء پر کی گئی تھی۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ قرآن اور اپنی عترت اہل بیتؑ جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ ی دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔ حتیٰ کہ حوض کوثر پر میرے پاس اکٹھی آئیں گی۔ چونکہ امت نے اہل بیتؑ سے تمسک یعنی ان کی پیروی سے پیغمبر ﷺ کی وفات کے بعد انحراف اختیار کر لیا، لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن سے بھی امت الگ ہوگئی۔ جس طرح اصلی رہنم اور امام سے امت منحرف ہوئی اسی طرح اصل قرآن سے بھی جدا ہوگئی۔ علامہ انور شاہ صاحب نے اپنے تمام تلامذہ کے مجمع میں اپنے نظریہ کا اظہار کیا۔ فیض الباری کے جامع اور مدون دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث علامہ بدر عالم میرٹھی نے بھی شاہ صاحب کے اس نظریہ کو لکھ کر اس پر کوئی تردیدی تبصرہ نہیں کیا۔ بلکہ فیض الباری کے حاشیہ ''بدر الساری'' میں اس بارے میں بالکل خاموشی اختیار کی۔ چنانچہ السکوت فی الحکم الاقرار کی بناء پر ان کے شاگرد بدر عالم میرٹھی بھی اپنے استاد انور شاہ کے ہم نظریہ ہیں اور جتنے تلامذہ اس وقت شیخ الحدیث کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے ہوئے تھے، سب کے سب اسی نظریہ کے حامل قرار پاتے ہیں۔

ھٰکذا انزلت، نزلت وغیرہ الفاظ سے مؤلف کا احمقانہ استدلال

مؤلف نے اپنے ناصبی گرو عبد الشکور لکھنوی کی خوشہ چینی کرتے ہوئے شیعہ کتب سے بہت سی چند ایسی روایات جمع کر دی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ آیت اس طرح نازل ہوئی، ی اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے، جواب قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں۔ اپنے خیال میں بڑا تیر مار لیا ہے کہ اب شیعہ ان روایات کا انکار نہیں کر سکتے۔ موجودہ قرآن پر ان کا ایمان نہیں ہے وغیر ذالک من الھفوات

حالانکہ اسی طرح کے الفاظ سنی کتب میں جابجا موجود ہے۔ غرضیکہ ع

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

چنانچہ مستدرک الحاکم میں مروی ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ سورۂ نساء کی آیت ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ﴾ کو ﴿اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ کے الفاظ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ان سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا ﴿لا نزلها اللّٰه تعالیٰ کذالك﴾ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اسی طرح اتارا تھا۔ امام حاکم نے نقل کرنے کے بعد اس روایت کے بارے میں بالتصریح لکھا ہے ﴿هذا حديث صحيح على شرط مسلم و لم يخرجاه﴾ یہ حدیث سند شرط مسلم کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ (مستدرک مع تلخیص ذہبی ج ۲ ص ۳۰۵ طبع دکن)

مزید اسی بات کو ابوحیان اندلسی نے اس طرح لکھا ہے ﴿و قال ابن عباس لابی نضرة هکذا انزلها اللّٰه﴾ اللہ تعالیٰ نے اس آیت متعہ کو اسی طرح ﴿﴿مِنْهُنَّ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ نازل فرمایا ہے۔ (تفسیر البحر المحیط جلد ۳ ص ۲۱۸ طبع دار الفکر بیروت)

جب سند کے اعتبار سے بھی حدیث صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس آیت کو نازل بھی اسی طرح کیا تھا لیکن موجودہ قرآن میں یہ آیت ﴿اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ کے بغیر ہے۔ تب یا تو انور شاہ صاحب کی طرح تحریف کے واقع ہونے کو تسلیم کر لو یا اگر منسوخ ہونے کی بات کرتے ہو تو پھر از راہِ انصاف شیعہ کو نسخ کی تاویل کے ذریعے معذور سمجھیں اور معاندانہ پروپیگنڈے سے باز آجائیں۔

بعض روایات میں جو مضمون حدیث اس طرح ہے ﴿نزلت فی فلان هکذا نزلت﴾ وغیرہ تمام علماءِ علام پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ جو بھی از طریق وحی رسول خداﷺ پر نازل ہوتا ہے۔ سب کا قرآن ہونا ضروری نہیں ہے لہٰذا روایت میں یہ کہنا۔ یہ آیت یوں نازل ہوئی یا فلاں ہستی کے بارے میں ان الفاظ کے ساتھ خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرمان الٰہی ہے اور بطور وحی نازل ہوئی ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ یہ قرآن کا حصہ ہے کیونکہ ہر وحی قرآن نہیں ہے چنانچہ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں: ﴿کان ثابتا منزلا و ان لم یکن من جملة کلام اللّٰه تعالیٰ الذی هو القرآن المعجز﴾ اگرچہ نازل ہوا ہے لیکن وہ منجملہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے جو قرآن معجزہ ہے۔ (اوائل المقالات ص ۵۵ طبع نجف) اسی طرح رئیس المحدثین

شیخ صدوق اپنے رسالہ اعتقادیہ ص ۷۵ میں ایک حدیث کا مفہوم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں ﴿بلنقول انہ قد نزل من الوحی الذی لیس من القرآن مالو جمع الی القرآن لکان مبلغہ مقدار سبع عشرۃ الف آیۃ (الیانقال) ومثل ھذا کثیر کلہ وحی لیس بقرآن.....﴾

یہ وحی کے طور پر نازل ہوا تھا قرآن کا حصہ نہ تھا کہ اسے اگر قرآن کے ساتھ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ستر ہزار آیات بن جاتی ہیں اس میں اس قسم کے مفہوم کی روایات بہت ہیں یہ سب وحی ہیں قرآن نہیں ہیں۔

جری و تطبیق:۔

قرآن کریم ایک ابدی دستور ہونے کے اعتبار سے حال نزول جس امر پر جاری اور منطبق ہوتا تھا آنے والے ہر اس امر پر بھی جاری و منطبق ہوگا جس میں حال نزول کے حالات و شرائط موجود ہوں۔ اگر زمان نزول کسی آیت میں کسی کی مدح ہوتی ہے تو اس قسم کے اوصاف رکھنے والے سب لوگوں پر یہ مدح منطبق ہوتی اگر کسی آیت میں کسی فرد کی قدح ہوئی ہے تو یہ اس قسم کے تمام اشخاص پر مدح منطبق ہوگی۔ مفسرین یہاں پر ایک کلیہ قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں ﴿العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب﴾ "یعنی شان وسبب نزول پر انحصار نہیں ہوسکتا بلکہ لفظ کے عموم کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے" مثلاً بعض روایات میں ہے ﴿وسیعلم الذین ظلموا (حق آل محمد) ای منقلب ینقلبون﴾ اس آیت کے وسط میں (حق آل محمد) صرف منطبق ہونے کے اعتبار سے مذکور ہے وہ جزو قرآن ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔

قرآن کریم کی بعض آیات میں حضرت علیؑ کا نام پڑھا جاتا تھا

﴿عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: کنا نقراء علی عھد رسول اللہ ؐ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیا مولی المؤمنین وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ﴾

عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے

عہد میں اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے۔ ﴿**یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك ان علیا مولی المؤمنین...... الخ**﴾

اے رسول، اس امر کی تبلیغ کردو جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کی طرف بھیجا گیا ہے علیؑ مؤمنوں کا مولیٰ ہے، اگر آپ نے یہ نہ کیا تو آپ نے اپنی رسالت کا حق ادا ہی نہیں کیا۔"

(تفسیر درمنثور، ج ۲ص ۲۹۸، تفسیر فتح القدیر ج ۲ص ۵۷

تفسیر مظہری ج ۳ص ۱۵۳، فتح البیان للقنوجی ج ۲ص ۲۹۳ طبع بیروت)

اور اسی طرح کی ایک روایت ابن مسعودؓ ہی سے مروی ہے کہ ﴿**انہ کان یقرا ھذا الحرف و کفی اللّٰہ المؤمنین القتال بعلی بن ابی طالب و کان اللّٰہ قویا عزیزاً**﴾

یہ آیت اس طرح پڑھی جاتی تھی: **و کفی اللّٰہ المؤمنین القتال بعلی بن ابی طالب و کان اللّٰہ قویا عزیزاً** اللہ کافی ہوگیا مؤمنوں کی طرف سے قتال میں علی بن ابی طالب کے ذریعے اور اللہ ہے طاقتور غالب۔"

(روح المعانی ج ۲۱ص ۱۵۷ طبع مصر، درمنثور ج ۵ص ۱۹۲)

ان ہی عبارات کے نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے اس لیے کہ ؏

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم   انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

حضرت ابن عباسؓ بھی اس آیت مبارکہ کو اسی طرح تلاوت کیا کرتے تھے۔ مُلاں یہ بتائیں کہ ان کی معتبر کتب بانگ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تو ان آیات کی تلاوت اس طرح کی جاتی تھی۔ پھر رسول ﷺ سے بعد جو قرآن صحابہ کرامؓ نے جمع اور تدوین کر کے حضرت عثمانؓ کے عہد میں شائع کیا۔ اس میں تو ان الفاظ کا نام ونشان نہیں ہے۔ کس نے پیغمبرؐ کے بعد ان الفاظ کو حذف کیا؟ منسوخ کرنا تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے جو پیغمبر ﷺ کی زندگی میں ہی ہوسکتا تھا۔ جب آپؐ نے وفات پائی تو وحی قرآن منقطع ہوگئی۔ اب نسخ نہیں ہو سکتا۔ اب مؤلف اپنے ان علماء اور راویوں سے پوچھیں کہ ان آیات میں سے یہ الفاظ کیوں نکالے گئے؟ اگر یہ کہتے ہو کہ یہ الفاظ تفسیری تھے، جو آیات کا حصہ نہ تھے تو شیعہ کتب میں موجود اس طرح

کی روایات کا مفہوم بھی یہی ہے کہ الفاظ تفسیری تھے، جو وحی غیر متلو کی صورت میں آیات کے ساتھ نازل ہوتے تھے، اور لوگوں کو سمجھائے جاتے تھے لیکن اصل قرآن کا حصہ نہ تھے۔ حضرات ائمہ اہل بیت ﷺ اسی اصلی تفسیر کے چھپائے جانے اور اسے ترک کرنے پر امت کو متنبہ کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہؓ ابن عباسؓ کی طرح آئمہ اہل بیت ﷺ نے مسلسل عوام، مؤمنین اور مسلمین کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کا فریضہ ادا کیا، اس لیے کہ اصل حاملین قرآن، عترت رسول حضرات اہل بیتؑ ہی تھے۔

جن مقامات اور روایات کی نشاندہی ہم نے کی ہے، یہ بطور نمونے تو مشتے از خروارے ہیں ورنہ اس نوع کی بے شمار روایات موجود ہیں۔ ہم نے اختصار کے پیش نظر انہیں ترک کر دیا ہے۔

''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے''

محترم قارئین! از راہِ انصاف غور کریں کہ ایک طرف تو مؤلف کے فخر المحد ثین و رئیس المتاخرین امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری اپنے وسعت مطالعہ کی بناء پر برملا اعلان اور اقرار کرتے ہیں کہ اہل سنت کی کتب معتبرہ اور روایات مشہورہ متواترہ سے یہ تحقق ہو چکا ہے کہ قرآن کریم میں انہوں نے جان بوجھ کر یا غلطی سے تحریف یعنی کمی اور زیادتی کی ہے۔ بموجب ﴿**فـــان اقــرر العقلاء علی انفسهم مقبول**﴾ یعنی ''مقرر کا اقرار اس پر حجت ہوتا ہے۔'' ان روایات اور کتب میں سے چند ایک کا ذکر ہم نے گزشتہ صفحات میں کر دیا ہے لیکن نہ معلوم انور شاہ صاحب کے سامنے کونسی رکاوٹ تھی؟ کس چیز کا خوف ان پر طاری تھا کہ اپنے تلامذہ کی بھری مجلس میں دیوبند یا ڈابھیل کے دار الحدیث میں قرآن مجید میں تحریف واقع ہونے کے اعلان کے باوجود ''منهم'' کہہ کر بات کو گول کر گئے اور تحریف قرآن کے جرم عظیم کے عمداً مرتکب افراد کی نشاندہی نہیں کی۔ نہ معلوم انہیں ایسے مجرمین کے نام بتانے میں کیا چیز مانع تھی؟ حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ ان قومی مجرموں کو نامزد کر کے ان کی مذمت کرتے اور واضح طور پر بتاتے کہ تحریف قرآن کے مرتکب یہ افراد کھلم کھلا کافر اور مرتد ہیں۔ اگر یہ نہیں بتا سکے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تحریف قرآن کے

گھناؤنے اور عظیم جرم کے مرتکب کچھ ایسے لوگ ہیں جن کو انور شاہ اور ان کے ہم مسلک لوگ اپنے محبوب رہنما اور قائد سمجھے بیٹھے ہیں۔ اگر انور شاہ صاحب محرفین قرآن یعنی قرآن میں کمی بیشی کے مرتکب افراد کا نام نہیں بتا سکتے تھے تو اس کفریہ جرم کا اقرار کیوں کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ انور شاہ اور ان کے ہم مذہب لوگ بھی اس جرم میں شریک چلے آئے ہیں۔ اسی لیے اعتراف جرم کے باوجود مجرمین کی نشاندہی نہیں کی ورنہ انہیں چاہیے تھا کہ ان مرتدین کی نشاندہی کر کے ان پر کفر کا فتویٰ نام بنام لگاتے تاکہ عوام مسلمان ان کے شر سے بچ جاتے اور اصل قرآن اور حقیقی رہنما تلاش کرتے۔

جن روایات کی بناء پر انور شاہ صاحب نے تقریباً تیرہ سو سال بعد ہی سہی، اعتراف جرم کیا ہے۔ وہ سبائی یا جعلی و مصنوعی نہیں بلکہ اہل سنت کی معتبر کتب اور مستند علماء کی روایات اور بیانات ہیں جن کی روشنی میں انور شاہ نے یہ تلخ فیصلہ کیا ہے۔ کاش انور شاہ محدث ان مجرمین کے کفر و ارتداد کا حکم بھی جاری کر دیتے تو ہمارے مخاطب کی کمر ٹوٹ جاتی لیکن ایک معلوم مصلحت کی وجہ سے انہوں نے اس سے آگے اپنی زبان روک لی۔ اس لیے کہ خطرہ تھا کہ اس سے آگے بڑھتے تو خود انور شاہ محدث پر احمق مُلّوانے کفر کا فتویٰ صادر کر دیتے۔ تاہم یہ انور شاہ صاحب کی جلالت علمی کا رعب ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک تمام مُلّاں ان کے خلاف زبان نہ کھول سکے بلکہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

کیا شراب خور خلفاء کی خاطر قرآن بدل دیا گیا؟؟

مندرجہ بالا عنوان کے تحت مؤلف لکھتا ہے کہ:

''مترجم اور محشی مقبول احمد دہلوی ''قول مترجم'' کا عنوان قائم کر کے لکھتا ہے: ''معلوم ہوتا ہے کہ جب قرآن میں اعراب لگائے گئے ہیں تو شراب خور خلفاء کی خاطر ﴿یعصرون﴾ کو ﴿یعصِرون﴾ سے بدل کر معنی زیر و زبر کیا گیا ہے یا مجہول کو معروف سے بدل کر لوگوں کے لیے، ان کے کرتوت کی معرفت آسان کر دی ہم اپنے امام کے حکم سے مجبور ہیں کہ جو تفسیر یہ لوگ کر دیں، تم اس کو اس کے حال پر رہنے دو اور تفسیر کرنے والے کا عذاب کم نہ کرو ہاں جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو اصل حال سے مطلع کر دو۔۔۔۔۔'' (خطبات جیل ص ۱۹۹)

الجواب۔ یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے جس کا الزام صرف شیعہ پر لگایا جائے، اگر سات قاریوں کی قرائتوں کا حال پڑھ لیا جائے، تو عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح کے الزامات کسی پر لگانا ہی غلط معلوم ہو جاتا ہے۔ اختلاف قرأت میں بعض اوقات کلمات ہی مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی معروف و مجہول کا فرق ہوتا ہے اسی طرح اور متعدد اقسام کے اختلاف ہی اسی قرأتی اختلاف کے تحت آتے ہیں۔ اعراب میں اختلاف بھی اسی نوعیت کا ہے۔ چونکہ اعراب بنا برقول معروف عوام الناس حجاج بن یوسف ثقفی ناصبی نے لگائے تھے جو واقعی شراب خور خلفاء کا دست راست تھا، اس لیے اس سے کوئی بعید نہیں کہ اس نے اس طرح کی حرکت کی ہو۔ چنانچہ امام ابن جریر طبری نے تاریخ کبیر میں سنہ ۲۸۴ ہجری کے واقعات بیان کرتے ہوئے بنوامیہ کے خلاف عباسی حکمران معتز باللہ کا خط درج کیا ہے جس میں ایک جملہ یہ بھی ہے ﴿... الی ما کان من بنی مروان من تبدیل کتاب اللہ...﴾

''اس کے علاوہ بنو مروان نے اللہ کی کتاب کو بھی تبدیل کر دیا تھا۔۔۔''

(تاریخ الامم والملوک لابن جریر الطبری ج ۱۱ ص ۳۵۹)

اسی طرح مُلاں نے سورۃ احزاب کے سورۃ البقرہ جتنے طویل ہونے کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالے سے نقل کر کے اہل اسلام پر الزام تحریف عائد کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ گزشتہ صفحات میں ان کی کتب معتبرہ کے حوالے سے بتایا جا چکا ہے کہ ابی بن کعبؓ اسی امر کے قائل تھے۔ یہ مؤلف کی علمی بے مائیگی کا منہ بولتا ثبوت ہے جسے چھپا کر وہ عالم اور محقق ہونے کا مدعی بنا بیٹھا ہے۔ گھر کا علم ہی نہیں اور دوسروں پر الزام عائد کیے جا رہے ہیں، اسے ہی کہتے ہیں ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے''۔ نعوذ باللہ من سوء الفھم و التعصب

مؤلف کو اپنے کفر کا اعتراف کرنا چاہئے

منصف مزاج قارئین کو غور کرنا چاہیے کہ جب ہم یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچا چکے ہیں کہ مؤلف کے معتمد علماء اور مستند روایات سے تقریباً تواتر کے ساتھ یہ منقول ہے کہ موجودہ قرآن کریم میں اسے ابتداً جمع اور تدوین کرنے والوں نے عمداً تحریف یعنی کمی بیشی کی ہے اور تحریف قرآن پر مؤلف اور اس کے اسلاف نواصب کا پختہ ایمان ہے لیکن تقیہ نہیں بلکہ منافقت سے اپنے اس عقیدہ

کو عام مسلمانوں سے چھپاتے ہیں اور اس گھناؤنے اور قبیح ناقابل معافی جرم کا الزام الٹا مسلمانوں پر لگاتے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں درج ناقابل تردید حوالہ جات اور بیانات کی موجودگی میں احمق ناصبی مُلاں کے لیے اس جرم کے الزام سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے نہ ہی اس کے جھوٹے بہانے درخور اعتناء ہو سکتے ہیں۔ ہاں! ان جرم کی سزا یعنی کفر وارتداد کے فتویٰ سے اسی صورت مؤلف اور اس کے اسلاف بچ سکتے ہیں جب قرآن کریم میں تحریف کے مرتکب اور قائل اپنے تمام اسلاف کے کفر و ارتداد کا اعلان و اقرار کریں اور ان سے بیزاری کا اظہار کریں۔ جنہوں نے نہ صرف تحریف قرآن کا ارتکاب کیا ہے بلکہ تحریف شدہ قرآن کو ہی اصلی قرآن بتا کر پوری امت کو گمراہ کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ اگر نواصب میں عقل ہو تو وہ ضرور ہمارے مطالبہ کو مان کر اس پر عملدرآمد کریں لیکن عقل و انصاف کی ایک رتی بھی انہیں نصیب نہیں ہوئی ورنہ یہ کیوں عمداً اپنی عاقبت خراب کر کے جہنم کا ایندھن بنتے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اہل بیت ﷺ اور ان کے پیروکاروں کو چودہ سو سال سے قرآن کی حفاظت اور اصل اسلام کی اشاعت کی خدمت کا موقع فراہم کیا۔ ماضی میں بھی قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے انہوں نے شمع حق کو روشن رکھا اور عصر حاضر میں جدید ناصبیت اور یہودیت کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت کے لیے انہیں ہی منتخب کیا ہے۔ دنیائے ناصبیت نے چودہ سو سال سے قرآنی احکام کو معطل کر کے اپنی خواہشات کی پیروی کی، اصلی قرآن اور حاملین قرآن یعنی اہل بیتؑ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ منبروں سے سب وشتم کی بوچھاڑ کی، اہل بیتؑ کے پاک نفوس پر ایسے حملے کرنا کتنی جسارت اور جرأت کا کام ہے اللہ تعالیٰ ایسے گستاخوں اور بے ادبوں سے محفوظ رکھے۔

بے ادب محروم ماند از فضل رب تعالیٰ

ستم ظریفی بے ادب کی انتہا ہے کہ ع

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد

بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

محترم قارئین! ناصبی ہزار کوشش کریں لیکن یہ قرآن اور اہل بیتؑ کو ختم نہیں کر سکتے نہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کر سکتے ہیں۔ خالق کائنات نے اصلی قرآن اور حاملین قرآن کی حفاظت کا وعد فرمایا ہے اس لیے نواصب کی تحریفاتی کوششیں اور قتل و غارت گری کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح یہ گروہ نواصب تحریف قرآن کا معتقد و مرتکب ہو کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو جھٹلاتے ہیں ان کے زعم باطل میں اللہ و رسولؐ نے قرآن اور اسلام میں کوئی کمی چھوڑ دی تھی بعض بے فائدہ باتیں شامل کی تھیں۔ (معاذ اللہ) اسی لیے نواصب اور ان کے اسلاف تحریف قرآن کے مرتکب ہوئے۔ ان نواصب نے ابتداء ہی سے یہودیوں کا آلۂ کار بن کر اسلام او قرآن کی بیخ کنی کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اسلام کی حفاظت ابدی بندوبست کر دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

رمز قرآن از حسینؑ آموختیم ز شرر او شعلہ ھا اندوختیم

مؤلف کے مغالطات اور ان کے جواب

دوسرے مکاتب فکر کی معتبر کتابوں کی طرح بعض شیعہ کتب میں بھی ایسی روایات پا جاتی ہیں جن میں بعض سے بادی النظر میں تحریف مفہوم ظاہر ہوتا ہے مگر شیعہ ان روایتوں کے تحت کوئی نظریہ قائم نہیں کرتے بلکہ ان روایتوں کی یا توجیہ کرتے ہیں کہ ان سے مراد تحریف نہیں ہے او اگر قابل توجیہ نہیں ہیں تو ایسی روایات کو مخالف قرآن سمجھ کر یکسر مسترد کرتے ہیں۔ اہل تشیع کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور متحرک اجتہاد ہونے کی وجہ سے کوئی کتاب حرف آخر نہیں ہے کتاب ہر روایت قابل بحث و تحقیق ہے اور تمام اسلامی نصوص تحقیق و تدقیق کے قابل ہیں۔ چنا اصول کافی اگرچہ کتب شیعہ میں سے مشہور کتاب سمجھی جاتی ہے مگر اس میں مختلف احادیث موج ہیں بعض احادیث اگر کچھ مجتہدین کے نزدیک صحیح السند ہیں تو ضروری نہیں کہ دوسرے مجتہدین نظر میں بھی صحیح السند ہوں۔ اہل تشیع قرآن کریم کے ہر حکم کو من حیث الصدور صحیح سمجھتے ہیں۔ قرآ کریم کے علاوہ ہر کتاب کی ہر روایت اور بات کو اس وقت صحیح تصور کرتے ہیں کہ جب وہ سند ا متن کے لحاظ سے بھی درست ہو۔ ہم اصول کافی کی ہر حدیث کو صحیح نہیں مانتے بلکہ اس میں بعض

ضعیف اور مرسل روایات بھی موجود ہیں۔ اسی بنا پر اہل تشیع نے اپنی چار کتابوں کو ہمیشہ کتب اربعہ کے نام سے موسوم کیا ہے جس طرح اہل سنت اپنی چھ بنیادی کتابوں کو ''صحاح ستہ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں اہل تشیع نے کبھی بھی اپنا کتب کو صحاح اربعہ کے الفاظ سے تعبیر نہیں کیا چنانچہ محقق علی الاطلاق علامہ السید حامد حسین لکھنویؒ نے اصول کافی کو اصح الکتب کہنا ممنوع قرار دیا ہے اور اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''استقصاء الافحام'' کے تقریباً آٹھ صفحات پر مشتمل طویل بحث میں اپنے اس مدعا کو مدلل توضیحات سے مبرہن اور ثابت کیا ہے لکھتے ہیں:

﴿اطلاق اصح الکتب مطلقاً بے تقیید بعدیت قرآن بر کافی هم ممنوع است یعنی این هم مدعاء غیر ثابت است که اهل حق کافی را به اصح الکتب تعبیر می کنند﴾

''اصول کافی کو بغیر کسی قید کے مطلقاً قرآن کریم کے بعد اصح الکتاب کہنا بھی ممنوع ہے اور اہل حق یعنی شیعہ کی جانب سے اصول کافی کو اصح الکتب سے تعبیر کرنا ہرگز ثابت نہیں ہے۔''

(استقصاء الافحام ج ا ص ۱۷ مطبوعہ لدھیانہ)

شیعہ کا متفقہ اصول ہے کہ جو حدیث یا روایت قرآن مجید کے اصول پر پوری اترتی ہے اسے لے لیں اور جو مخالف قرآن ہوں انہیں رد کر دیں کیونکہ وہ قابل عمل نہیں رہیں۔

<u>پہلا مغالطہ</u>

مؤلف نے چند پُر فریب مغالطے اور بے سر و پا خدشات و شبہات پیش کیے ہیں جن کا ازالہ از حد ضروری سمجھا گیا ہے بنا بریں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان شکوک و اوہام اور مغالطات کا قطعی دلائل سے قلع قمع کرتے ہیں۔ چشم انصاف کھول کر ملاحظہ کیجیے اور اصل حقائق سننے کے لیے گوش بر آواز رہنے کی ہمہ طور کوشش کریں کہ ؏

شاید تر جائے تیرے دل میں میری بات

مگر نہ ماننے کا علاج تو دنیا کے کسی حکیم کے پاس بھی نہیں ہے چنانچہ مؤلف یوں رطب اللسان ہوتا ہے کہ:

''قرآن جو جبرائیل لائے تھے وہ سترہ ہزار آیات پر مبنی تھا'' اصول کافی صفحہ ۶۷۱ می
ہے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو قرآن جبرئیل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پا
لائے تھے اس میں سترہ ہزار آیتیں تھیں۔ اب قرآن مجید میں چھ ہزار چھ سو سولہ آیتیں ہیں شیعو
کے امام جعفر صادق کے ارشاد عالی سے معلوم ہوا کہ دس ہزار تین سو چوراسی آیتیں نکال ڈالی گئیں
(خطباتِ جیل ص ۷۵

<u>الجواب</u>۔ اصول کافی طبع لکھنؤ ۱۳۰۲ھ میرے پیش نظر ہے مندرجہ بالا روایت اس باب
ستائیسویں روایت ہے۔ اس کے بارے میں علامہ مجلسیؒ نے مراۃ العقول جلد دوم ص ۵۳۶ مطبو
قدیم ایران میں لکھا ہے:

﴿السابع العشرون مجھول﴾ ''اس باب کی ستائیسویں روایت مجہول ہے۔''

ایک مجہول روایت کو مورد استدلال ٹھہرانا اصول روایت اور درایت کے سراسر خلاف
ہے۔

ثانیاً: قرآن کریم کی آیات کی تعداد بغیر بسم اللہ کے ۶۲۳۶ اور بسم اللہ سمیت ۶۳۵۰
بیان کی جاتی ہے جبکہ ابن عباسؓ کے نزدیک آیات کی تعداد ۶۶۱۶ مروی ہے اور عبد اللہؓ بن مسع
کے نزدیک ۶۲۱۸ آیات ہیں اور یہ تعداد جو بتائی جاتی ہے اس پر بھی سب کا اتفاق نہیں ہے چنا
علامہ سیوطی نے مختلف اقوال و آراء اپنی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' جلد اول صفحہ ۶۷ پر تحر
کیے ہیں کہ:

- مدنی قاریوں کے مطابق ۶۲۱۴ آیات ہیں۔
- مکی قاریوں کے مطابق ۶۲۱۲ آیات ہیں۔
- شامی قاریوں کے نزدیک ۶۲۵۰ آیات ہیں۔
- بصریوں کے نزدیک ۶۲۱۶ ہیں۔
- عراقیوں کے نزدیک ۶۲۱۴ آیات ہیں۔

یہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ آیاتِ قرآن کی تعداد میں قدیم الایام سے اختلاف چلا آر

ہے جس میں پہلا اختلاف تو اس میں ہے کہ آیت کہتے کسے ہیں؟ علماء نے آیت کے کئی معنی بیان کیے ہیں۔ علامہ سیوطی نے آیت کے چھ معنی درج کیے ہیں جن میں سے آیت کا ایک معنی جملہ بھی ہے اور صرف لفظ ''قل'' بھی ایک آیت ہے بلکہ ابوعمر کا یہ قول ہے کہ ''مدھامتان'' بھی ایک آیت ہے علماء اہل سنت نے ''والنجم'' اور ''والعصر'' وغیرہ کو بھی آیت شمار کیا ہے اور یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آیتوں کے ساتھ یہ گول گول نشان نہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے لگائے گئے ہیں اور نہ ہی اس تعداد سے متعلق نبی کریم ﷺ سے کوئی حدیث مروی ہے۔

دوسرا مغالطہ

(الف) ''ابوبصیر امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے ﴿**من یطع اللّٰہ و رسولہ فی ولایۃ علی و ولایۃ الائمۃ من بعدہ فقد فاز فوزاً عظیماً**﴾ اسی طرح نازل ہوا ہے اب قرآن مجید میں ﴿**فی ولایۃ علی و ولایۃ الائمۃ من بعد**﴾ کے الفاظ نہیں ہیں ان الفاظ کے بغیر آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ کامیاب ہوگا مگر ان الفاظ کے اضافہ کے ساتھ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کامیابی کا وعدہ صرف ان احکامات سے متعلق ہے جو حضرت علیؓ اور دیگر ائمہ کی امامت سے تعلق رکھتے ہیں۔

(ب) امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ جبرئیل اس آیت کو محمد ﷺ پر اس طرح لے کر آئے تھے ﴿**بہ انفسھم ان یکفروا بما انزل اللّٰہ (فی علی) بغیا**﴾۔

(اصول کافی ص ۴۱۶ جلد ۱)

اب قرآن مجید میں ''**فی علی**'' کے الفاظ نہیں ہیں بغیر اس لفظ کے اس آیت میں خدا کی ہر نازل کی ہوئی چیز کے انکار کی مذمت تھی مگر اس لفظ کے ساتھ صرف امامت علیؓ کے انکار کی مذمت ہوئی۔

(ج) اسی کتاب کے باب مذکور میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے اللہ تعالیٰ کا قول ہے ﴿**سال سائل بعذاب واقع الکافرین (بولایۃ علی) لیس لہ دافع**﴾ اسی طرح اللہ کی قسم جبرئیل محمد ﷺ پر لے کر نازل ہوئے تھے۔ (صفحہ ۴۲۲ جلد ۱) ''**بولایۃ علی**'' کا لفظ اس

وقت قرآن کریم کی آیت میں نہیں ہے۔" (خطباتِ جیل ص ۱۷۸ تا ۱۸۲)

الجواب۔ معلوم ہونا چاہیے کہ محولہ بالا یہ سب روایتیں اصول کافی کے ایک ہی باب ﴿فیہ نکت و نتف من التنزیل فی الولایۃ﴾ کی ہیں۔

اولاً ان روایات میں سے کوئی ایک روایت بھی صحیح السند نہیں ہے بلکہ یہ سب کی سب ضعیف اور مجہول روایات ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: مراۃ العقول شرح اصول کافی جلد اول صفحات ۵۱۳، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۵ اور ۳۲۹ مطبوعہ قدیم ایران۔

لہٰذا ایسی روایات سے استدلال کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے کیونکہ یہ روایات اپنے ضعف کی وجہ سے قابل استدلال نہیں ہیں۔ نیز ان روایتوں کے بالمقابل وہ روایات جو عدم تحریف قرآن پر دلالت کرتی ہیں اپنے راویوں اور تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہیں اور عند الفقہاء قاعدہ اور ضابطہ ہے کہ جس روایت کے راوی کثیر تعداد میں ہوں اس کو ترجیح دی جائے گی اور قبول کیا جائے اور اس کے بالمقابل (قلیل راویوں والی) روایت کو متروک قرار دیا جائے گا۔

(معالم الاصول المطلب التاسع صفحہ ۱۴۱ طبع لکھنؤ

کاش کہ آپ اپنی ہی فقہ کی مشہور کتاب "رد المختار علی الدر المختار" جلد اول ص ۲ "مطلب لا یجوز العمل بالضعیف حتیٰ لنفسہ" کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا کر لیتے ان روایات ضعیفہ سے استدلال کی ہرگز جرأت نہ کرتے مگر ع

جنہیں ہو ڈوبنا وہ ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

علی سبیل التنزل: اگرچہ ان روایات کے مختلف گوشوں سے جوابات دیئے جاسکتے ہیں ا سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ان کو تسلیم کر ہی لیا جائے تو جن روایا میں یہ موجود ہے کہ فلاں آیت اس طرح نازل ہوئی تھی ایسی روایات کو اختلاف قرأت پر محمول جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ کی قرأت کے مقابل دیگر قاریوں کی قرأت اس طرح۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ سورہ جمعہ کی آیات میں بجائے ﴿فاسعوا الی ذکر اللّٰہ﴾ کے ﴿فامض الی ذکر اللّٰہ﴾ پڑھا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری جلد ۳، صفحہ ۱۲۵) اور بقول علامہ سیوطی کے مر۔

دم تک ﴿فامضوا﴾ ہی پڑھتے رہے۔ (کذا فی کنز العمال جلد ا صفحہ ۲۸۵ طبع دکن)

جن روایات میں یہ وارد ہے کہ فلاں آیت یوں نازل ہوئی تھی تو ایسی روایات کو تفسیر و تاویل پر محمول کیا جائے گا۔ اس قسم کے الفاظ مثلاً **ھکذا نزلت** بطور تفسیر بیان کیے گئے ہیں اور اس طرح کے تفسیری الفاظ صحابہ کرامؓ کے مصاحف میں موجود تھے۔ چنانچہ اس موضوع پر ابن ابی داؤد السجستانی نے کتاب المصاحف کے نام سے ایک مستقل کتاب تالیف کی ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے اور علاوہ ازیں ان روایات لفظ "**فی**" بطور تفسیر اور بیان کے لیے آیا ہے جو اجزائے آیات میں نہیں ہے۔ اگر بطور تفسیر واقع نہیں ہے تو ان حسب ذیل عبارتوں کا جواب دیجئے۔

(۱) عبد اللہؓ بن مسعود اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے۔ ﴿**و کفی باللّٰہ المؤمنین القتال بعلی بن ابی طالب**﴾ (تفسیر در منثور جلد ۵ صفحہ ۱۹۱ طبع مصر) اس آیت میں "**بعلی ابن ابی طالب**" بطور تفسیر واقع ہوا ہے یا اصل آیت میں داخل تھا؟ اور ابن عباسؓ کے نزدیک یہ آیت اس طرح تھی۔ ﴿**النبی اولی بالمؤمنین انفسھم و ھو اب لھم و ازواجہ امھاتھم**﴾ (کنز العمال صفحہ ۲۷۹ طبع دکن، سیر اعلام النبلاء ج ا ص ۳۹۷ طبع بیروت) اس آیت میں موجود الفاظ "**ھو اب لھم**" بطور تفسیر ہے یا تنزیل؟

(۲) آیت ﴿**وما یعلم تاویلہ الا اللّٰہ و یقول الراسخون فی العلم آمنا بہ**﴾ (اتقان فی علوم القرآن جلد ۲، صفحہ ۳ طبع مصر) اس آیت میں لفظ "**یقول**" بطور تفسیر ہے یا تنزیل؟ اور پھر سورۃ فتح کی آیت "**اذ جعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیۃ الحمیۃ الجاھلیۃ ولو حمیتم کما حموا نفسہ لفسد**" (کنز العمال جلد ا صفحہ ۲۷۹) فقرہ "**ولو حمیتم کما حموا نفسہ لفسد**" کا اضافہ کیونکر ہوا؟

(۳) بقول مولانا محمود الحسن دیوبندی ﴿**فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللّٰہ والرسول والی اولی الامر منکم**﴾ میں اضافہ جملہ "**و الیٰ اولی الامر منکم**" تحریف ہے یا تفسیر ہے؟ (ایضاح الادلہ ص ۲۹۷ مطبع قاسمی دیوبند)

ان کے علاوہ اور کئی مثالیں موجود ہیں۔ اب فرمایئے ایسے الفاظ اجزائے قرآن ہیں یا بطور تفسیر کے واقع ہوئے ہیں؟ اگر سب کچھ بطور تفسیر وارد ہوئے ہیں تو اصول کافی کی یہ روایات بھی محمول بہ تفسیر ہیں۔

بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

تیسرا مغالطہ

مؤلف نے جناب غفران ماب سید دلدار علیؒ کی کتاب ''عماد الاسلام'' کے حوالے سے درج ذیل عنوان باندھا ہے:

''متاخرین علماءِ شیعہ کے مجتہد اعظم مولوی دلدار علی کا دعویٰ تحریف قرآن اس کے بعد یہ سرخی لگائی ہے کہ

''حضور ﷺ نے مصلحت کے طور پر اصلی قرآن چھپادیا۔'' (خطباتِ جیل، ص ۱۹۵)

الجواب:۔ جناب رئیس المحققین غفران مابؒ کی مشہور عالم تصنیف عماد الاسلام فی علم الکلام طبع قدیم لکھنؤ جو تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اس کی جلد سوم کتاب النبوۃ میرے سامنے موجود ہے۔ محولہ عبارت اس کے ص ۳۸ پر موجود ہے حالانکہ سید مرحوم نے یہ عبارت بطور احتمال تحریر کی ہے تو بموجب اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، جب احتمال پیدا ہوا تو استدلال باطل ہو گیا ہے اور ہمارے مخاطب نے بعد والی عبارت بھی حذف کر دی ہے جو یہ ہے:

﴿**اما الرويات العامية الدالة على بعض التصرف العثماني فيه فقد مر شطر منها**﴾

اہل سنت کی روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عثمان نے قرآن میں تصرف کیا ہے۔ (عماد الاسلام، ج ۳، ص ۳۸، طبع لکھنؤ)

سرکار غفران مابؒ نے اسی کتاب جلد سوم ۲۶ تا ۸۷ صفحات پر عقلی و نقلی دلائل سے عدم تحریف اور دیگر آسمانی کتب پر قرآن کریم کی آفاقیت و برتری کو اجاگر کر کے ملحدین اور دشمنان اسلام کی طرف سے اٹھائے گئے شبہات کی دھجیاں بکھیر دی ہیں اور قرآن کریم کی عدم تحریف کے

بارے میں شیعہ نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿فذا الذی تلونا علیك من كلام الاصحاب یشهد علی ابین الوجوه ان ما قلنا بتواتر ما بین الدفتین من وقت الرسول صلی الله علیه و آله وسلم الی زماننا هذا هو المطابق للحق و الصواب﴾

علماءِ شیعہ کے اقوال جو ہم نے بیان کئے ہیں نہایت بدیہی طور پر اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ موجودہ قرآن کریم بالکل درست اور حق کے مطابق ہے جو دونوں دفتیوں میں موجود ہے اس کا تواتر رسول اللہ ﷺ کے عہد سے ہمارے زمانہ تک ثابت ہے۔"

(عماد الاسلام، ج ۳، ص ۳۳، طبع لکھنؤ)

خلاصۂ بحث:۔ مندرجہ بالا حقائق سے معلوم ہو گیا کہ علماءِ اہل حق کی انظار عالیہ میں وہ روایات جو موہم تحریف ہیں وہ ضعیف السند یا موؤل ہیں اس لیے وہ ناقابل التفات ہیں شیعہ دشمن عناصر نے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف یہودیوں کے اشارے اور تائید کے ساتھ ایک خطرناک مہم شروع کر رکھی ہے اسی لیے تمام مسلمانوں پر خواہ شیعہ ہوں یا اہل سنت تحریف قرآن اور دیگر بے بنیاد الزامات عائد کر کے اسلام کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں اپنے مکروہ عقائد کو چھپانے اور مسلمانوں کی توجہ اپنی سازشوں سے ہٹانے کے لیے انتہائی سرعت کے ساتھ دوسروں پر باطل اور جھوٹے بہتان لگاتے ہیں۔ تعلیمات آل رسولؑ کے مقابل ان توہمات کو سقیم العقل شخص ہی درخور اعتناء سمجھ سکتا ہے مگر سلیم العقل انسان انھیں قابل اعتبار و التفات کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مولانا جلال الدین رومی نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا ؏

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

گذشتہ صفحات پر کی گئی بحث سے معلوم ہوا کہ اہل سنت پر تحریف قرآن کا الزام عائد کرنے کے لیے بہت مواد موجود ہے لیکن ہم ان پر اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ الزام عائد کر کے مکتب قرآن کو مخدوش کرنا نہیں چاہتے۔ اس کے برعکس اہل تشیع نے ایسی روایات کو قطعی طور پر مسترد کیا

ہے لیکن ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ پھر بھی شیعہ کو تحریف قرآن کا قائل قرار دے کر مسلسل مطعون کیا جاتا ہے اور نہ ہی کسی نظریہ کے قائم کرنے سے پہلے ان کے موقف کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا کی جاتی ہے۔ صرف چند روایات پر نظر پڑی تو پورے مذہب پر الزام عائد کر دیا جبکہ مذہب اس روایت کے مطابق موقف نہیں رکھتا۔

علماءِ اہل سنت سے شیعہ نقطۂ نظر کی تائید

مندرجہ بالا تحقیقاتِ انیقہ سے معلوم ہوا کہ تحریف قرآن کے بارے میں جمہور شیعہ کا عقیدہ واضح ہے کہ وہ قطعاً کسی قسم کی اس میں کمی و زیادتی کے ہرگز قائل نہیں ہیں اس میں وہ سب کچھ ہے جو بذریعہ جبریل بطور وحی پیغمبر اسلام ﷺ پر نازل ہوا لہٰذا جمہور شیعہ کی طرف تحریف قرآن کی نسبت دینا ہی ایک غلط لایعنی تخیل ہے بلکہ ان کا ایمان بالقرآن ایک ایسی نا قابل انکار حقیقت ہے کہ جس کا اہل سنت کے اہل انصاف جید محقق علماء بھی اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکے چنانچہ مصر کے جلیل القدر اہل سنت کے محقق اور جامع الازہر مصر کے بڑے عالم شیخ محمد غزالی شافعی مصری اہل تشیع پر تحریف قرآن کی جھوٹی تہمت لگانے والوں کی اس غیر شرعی حرکت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

﴿اننی آسف لان بعض من یرسلون الکلام علی عواهنه لا بل بعض من یسوقون التهم جزافا غیر مبالغین بعواقبها دخلوا فی میدان الفکر الاسلامی بهذه الاخلاق المعلولة فاساء وا الی الاسلام و امته شر اساء ة سمعت واحدا من هولاء من یقول فی مجلس علم ان للشیعة قرانا آخر یزید و ینقص عن قراننا المعروف فقلت له این هذا القرآن؟ ان العالم الاسلامی الذی امتدت رقته فی ثلاث قارات ظل من بعثة محمد صلی الله علیه وسلم الی یومنا هذا بعد ان سلخ من الزمن اربعة عشر قرنا لا یعرف الا مصحفا واحدا مضبوط البدایة والنهایة معدود السور والآیات والالفاظ فاین هذا القرآن الاخر؟ ولماذا لم یطلع الانس والجن علی نسخة منه خلال هذا الدهر الطویل؟ لماذا ایساق هذا الافتراء؟ و لحساب من تفتعل هذا الاشاعات و

تلقى بين الاغرار ليسوء ظنهم باخوانهم و قد يسوء ظنهم بكتابهم؟ ان المصحف واحد يطبع فى القاهرة فيقدسه الشيعة فى النجف او فى طهران و يتداولون نسخة بين ايديهم و فى بيوتهم دون ان يخطر ببالهم شئ بتة الا توقير الكتاب و منزله جل شانه و مبلغه صلى الله عليه وسلم فلم الكذب على الناس و على الوحى؟﴾

''مجھے بعض لوگوں پر سخت افسوس ہوتا ہے جو بلا تحقیق بات کر جاتے ہیں اور نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تہمتیں ہانک دیتے ہیں۔ یہ لوگ فکر اسلامی کے میدان میں داخل ہو گئے مگر انہوں نے اسلام اور امت مسلمہ کے حق میں سخت گستاخی کی ہے۔ میں نے ایک محفل میں ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیعوں کا ایک اور قرآن ہے، جو ہمارے معروف قرآن سے کم و بیش ہے۔ میں نے اس سے کہا: وہ قرآن کہاں ہے؟ عالم اسلام تین براعظموں پر پھیلا ہوا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے لے کر آج تک چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور لوگوں کو صرف ایک ہی قرآن کا علم ہے جس کا آغاز و اختتام اور سورہ و آیات کی تعداد معلوم ہے۔ یہ دوسرا قرآن کہاں ہے؟ اس طویل عرصے میں کسی انسان اور جن کو اس کے کسی ایک نسخے پر بھی اطلاع یا آگاہی کیوں نہیں ہوئی اس سے اپنے بھائیوں اور اپنی کتاب کے بارے میں بدگمانیاں پھیلتی ہیں۔ قرآن ایک ہی ہے جو اگر قاہرہ میں چھپتا ہے تو اسے نجف اشرف اور تہران میں بھی مقدس سمجھا جاتا ہے اور اس کے نسخے ان کے ہاتھوں اور گھروں میں ہوتے ہیں۔ اس کتاب کو نازل کرنے والے اور اس کے مبلغ کے بارے میں سوائے عزت و توقیر کے کوئی اور بات ان کے ذہن میں نہیں آتی پھر ایسے بہتان لوگوں اور وحی پر کیوں باندھے جاتے ہیں۔''

(دفاع عن العقیدۃ والشریعہ، صفحہ ۲۶۴، ۲۶۵، طبع مطبعہ حسان قاہرہ، ۱۹۷۵ء)

(۲) اہل سنت کے عالم محقق مولانا رحمت اللہ کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ سعودی عرب کی معرکۃ الآرا تصنیف ''اظہار الحق'' جو مسلمانوں کی جانب سے رد عیسائیت اور ابطال تثلیث میں لکھی جانے والی کتب میں سے ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہے وہ اس کتاب میں مستشرقین کی جانب سے شیعہ پر تحریف قرآن کے عقیدے کے بارے میں اٹھائے گئے سوال کا جواب دیتے

ہوئے اس کتاب کی جلد۲،ص ۸۹،۹۰ "الفصل الرابع فی دفع شبہات القسیسی الواردة علی الاحادیث النبویة" مطبوعہ قسطنطنیہ میں یوں رقمطراز ہیں:

﴿فلان القرآن المجید عند جمہور علماء الشیعة الامامیة الاثنی عشریة محفو عن التغییر و التبدیل ومن قال منہم بوقوع النقصان فیہ فقولہ مردود غیر مقبو عندہم﴾

"قرآن مجید جمہور علماءِ شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کے تغیر اور تبدیل نزدیک سے محفوظ ہے شخص شیعوں کی طرف تحریف قرآن کی نسبت دیتا ہے اس کی بات علماءِ امامیہ کے نزدیک مردود نا قابل قبول ہے۔"

اس کے بعد عدم تحریف کے سلسلے میں شیعہ کے جلیل القدر اور نامور علماء کے اقوال تصریحات نقل کرنے کے بعد بطور نتیجہ کلام لکھتے ہیں:

﴿فظہر ان المذہب المحقق عند علماء الفرقة الامامیة الثنا عشریة ان القرآن الذ انزلہ اللّٰہ علی نبیہ ہو ما بین الدفتین وہو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذلك و کان مجموعا مولفا فی عہد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم و حفظہ و نق الوف من الصحابة و جماعة من الصحابة کعبد اللّٰہ بن مسعود و ابی بن کعب غیرہما ختموا القرآن علی النبی عدہ ختمات و یظہر القرآن و یشہر بہذا الترتی عند ظہور الامام الثانی عشر رضی اللّٰہ عنہ و الشر ذمة القلیلة التی قالت بوقو التغیر فقولہم مردود... و بعض الاخبار الضعیفة التی رویت فی مذہبہم لا یرج بمثلہا عن المعلوم المقطوع علی صحتہ (الی ان قال) وقد قال اللّٰہ تعالیٰ انا نح نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون فی تفسیر الصراط المستقیم الذین ہو تفسیر مع عند علماء الشیعة ای و انا لہ لحافظون لہ من تحریف و التبدیل و الزیادة النقصان﴾

"اس سے معلوم ہوا کہ وہ مسلک جو علماءِ شیعہ امامیہ اثنا عشری کے نزدیک ثابت ہے

یہی ہے کہ قرآن جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا تھا وہ یہی ہے جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور یہ رسول خدا ﷺ کے زمانے میں خود ان کے اہتمام سے جمع کیا جا چکا تھا اور مرتب ہو گیا تھا اسے عبد اللہؓ بن مسعود اور ابیؓ بن کعب کے علاوہ لاتعداد صحابہؓ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے کئی مرتبہ ختم قرآن کیا حفظ اور نقل کیا۔ قرآن اسی ترتیب کے ساتھ بارہویں امام (حضرت مہدی علیہ السلام) کے ظہور کے وقت نمایاں اور مشہور ہوگا۔ اور وہ بعض ضعیف روایات جو ان کے مذہب میں مروی ہیں وہ اس قابل نہیں کہ ان کی وجہ سے ایک ثابت شدہ صحیح حقیقت سے دست برداری کی جائے وہ (شیعہ) اس پر زور دیتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا ہم نے قرآن اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ تفسیر صراط المستقیم میں جو شیعوں کے ہاں معتبر تفسیر ہے، لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قرآن کو تحریف و تغیر اور کمی و بیشی سے محفوظ رکھنے والے ہیں۔

علمی بد دیانتی اور خیانت کا ارتکاب

ہم اپنے قارئین کی توجہ حکومت سعودی عرب کے ایک موقر ادارہ "الرئاسة العامة الادارات البحوث العلمية و الافتاء و الدعوة والارشاد الرياض المملكة العربية السعودية" کی جانب سے شائع کردہ کتاب "اظہار الحق" کی طرف دلانا چاہتے ہیں۔ عربی میں تحریر کی گئی حضرت علامہ رحمت اللہ کیرانوی کی اس معرکۃ الآراء تصنیف کا پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۲۸۴ھ ہجری مطبوعہ عامرہ سلطانیہ استانہ (قسطنطنیہ) سے شائع ہوا اور بعد ازاں ترکی، فرانسیسی، انگریزی اور گجراتی میں اس کے ترجمے بھی مختلف اوقات میں سامنے آتے رہے اور حال ہی میں کراچی سے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی اعظم دار العلوم دیوبند کی نگرانی میں اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے جبکہ عربی کتاب بھی متعدد بار مختلف اسلامی ممالک سے شائع ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی رہی تاہم کسی بھی ایڈیشن میں ناشرین کی جانب سے اس میں کسی خیانت اور تحریف جیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب نہیں کیا گیا۔

لیکن یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ سعودی عرب کی جانب سے اس کتاب کے تازہ

ایڈیشن میں انتہائی علمی بد دیانتی اور فرقہ وارانہ تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے تقریباً اڑھائی صفحات پر مشتمل وہ متن حذف کر دیا گیا ہے جس میں فاضل مصنف نے اس بات کو ثابت کیا تھا کہ اہل شیعہ عدم تحریف قرآن کے قائل ہیں جبکہ اصل کتاب اور اس کے تمام تراجم میں یہ متن مسلسل شائع ہوتا چلا آ رہا ہے۔

سعودی اشاعتی ادارے کی جانب سے کی گئی اس سعی لامشکور کا واحد مقصد مسلمانوں کے ایک بڑے اور مسلمہ مسلک (اہل تشیع) سے نفرت اور عناد کے اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے چنانچہ اس محدود فرقہ وارانہ اور غیر شرعی مقصد کے حصول کے لیے وحی الٰہی کو مشکوک اور متنازعہ بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا جو ایک ناقابل برداشت جرم ہے۔

ہمیں علماءِ کرام اور سکالروں سے توقع ہے کہ اسلام دشمنی اور علم کشی پر مبنی اس طرز عمل پر اپنے جذبات متعلقہ سعودی اشاعتی ادارے تک ضرور پہنچائیں گے تاکہ فرقہ وارانہ تعصّبات کے زیر اثر اسلام کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے مذموم روش کی روک تھام ہو سکے۔

کتاب "اظہار الحق" کے شائع شدہ وہ نسخے جن میں حذف شدہ متن موجود ہے

۱۔ مطبعہ عامرہ سلطانیہ استانبہ (قسطنطنیہ)، محرم الحرام ۱۲۸۴ھ ہجری۔

۲۔ مطبعہ الحجر الفاخر قاہرہ، ربیع الثانی ۱۲۹۳ھ ہجری۔

۳۔ دار الطباعۃ العامرہ استنبول، ربیع الاول ۱۳۰۵ھ ہجری۔

۴۔ المطبعۃ الخیریہ مصر بادارۃ السید عمر حسین الخشاب، ۱۳۰۹ھ ہجری۔

۵۔ المطبعۃ العلمیہ قاہرہ بادارۃ السید عمر ہاشم الکتبی، ۱۳۱۶ھ ہجری۔

۶۔ المطبعۃ المحمودیہ بشارع الصنادقیہ قاہرہ بادارہ الشیخ محمد موسیٰ، جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ ہجری۔

۷۔ مکتبۃ الوحدہ العربیہ الدار البیضاء المغرب، ربیع الاول ۱۳۸۳ھ ہجری۔

۸۔ مطابع منارۃ اظہار الحق بمصر، ۱۳۹۸ھ ہجری۔

۹۔ مطبع دار التراث العربی للطباعۃ والنشر قاہرہ، ۱۳۷۸ھ تحقیق ڈاکٹر احمد حجازی السقاء۔

۱۰۔ (بائبل سے قرآن تک اردو ترجمہ اظہار الحق) مکتبہ دار العلوم کراچی نمبر ۱۳، پوسٹ کوڈ

۱۸۰ھ۔

(۳) بالکل اسی طرح بغداد کے ایک معروف محدث نعمان ابن محمود آلالوسی البغدادی صاحب تفسیر روح المعانی نے بھی اپنی مشہور کتاب "الجواب الفسیح لما لفقه عبد المسیح" جلد۲، صفحہ۱۳۴ تا ۱۳۷ "الفصل الثانی" مطبوعہ دار الجیل بیروت میں یہ امر واضح لکھا ہے کہ شیعہ امامیہ ہرگز ہرگز تحریف قرآن کے قائل اور معتقد نہیں ہیں اور جو شخص بھی ان پر تحریف قرآن کا الزام لگاتا ہے وہ جھوٹا اور کذاب ہے۔

(۴) مصر کی مشہور اسلامی درسگاہ الازہر یونیورسٹی کے شعبۂ کلیۃ شریعۃ کے سرپرست علامہ شیخ محمد المدنی المصری اہل تشیع سے عقیدۂ تحریف کی نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿و اما ان الامامية يعتقدون نقص القرآن فمعاذ الله و انما هي روايات رويت في كتبهم كما روي مثلها في كتبنا و اهل التحقيق من الفريقين قد زيفوها و بينوا بطلانها و ليس في الشيعة الامامية او الزيدية من يعتقد ذلك كما انه ليس في السنة من يعتقده و يستطيع من شاء ان يرجع الى مثل كتاب "الاتقان" للسيوطي السني ليرى فيه امثال هذه الروايات التي نضرب عنها صفحا و قد الف احد المصريين في سنة ۸۹ ء كتابا اسمه "الفرقان" حشاه بكثر من امثال هذه الروايات السقيمة المدخولة المرفوضة ناقلالها عن الكتب المصادر عند اهل السنة (الى ان قال) افيقال ان اهل السنة ينكرون قداسة القرآن او يعقدون نقص القرآن لرواية رواها فلان او لكتاب الفه فلان؟ فكذالك الشيعة الامامية انما هي روايات في بعض كتبهم كالروايات التي في بعض كتبنا﴾

"شیعہ امامیہ کے بارے میں یہ کہنا کہ معاذ اللہ شیعہ قرآن میں کمی کے قائل ہیں تو ان روایتوں کی بناء پر جو شیعوں کی کتابوں میں موجود ہیں جیسا کہ ہماری کتابوں میں بھی موجود ہیں لیکن شیعہ سنی دونوں محققین نے ان روایتوں کے ناقابل انکار رد اور ان کے بطلان کو واضح کیا ہے۔ شیعہ امامیہ اور زیدیہ میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو۔ جیسا کہ اہل سنت میں بھی ایسا نہیں

جس کا عقیدہ قرآن میں تحریف کا ہو۔ شیعہ پر تحریف کی تہمت لگانے والوں کو علامہ سیوطی کی تفـ
اتقان جیسی کتاب کو پڑھنا چاہیئے کہ اس میں تحریف پر دلالت کرنے والی روایات کو دیکھیں اگر
ہم اس قسم کی روایات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ایک مصری عالم (محمد عبد اللطیف ابن الخطیب) نے ۱۹۴۸
میں ''الفرقان'' نام کی کتاب لکھی ہے جس میں اس قسم کی بہت سی روایات کو اہل سنت کی کتابو
سے نقل کیا ہے۔۔۔۔۔ تو کیا اس بناء پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اہل سنت قرآن کے تقدس ـ
منکر ہیں؟ یا ان روایات کی بناء پر جسے فلاں نے نقل کیا ہے یا فلاں کتاب جسے فلان نے لکھا ہـ
اہل سنت نقص قرآن کے قائل ہوگئے؟ یہی بات شیعوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے ا
لیے جیسے ہماری بعض کتابوں میں ایسی روایتیں موجود ہیں اسی طرح شیعوں کی بھی بعض کتابوں ـ
ایسی روایتیں موجود ہیں۔'' (رسالۃ الاسلام، جلد ۱۱، شمارہ نمبر ۴، صفحہ ۳۸۲ و صفحہ ۳۸۳ طبع مصر)

(۵) برصغیر کے مشہور محقق حکیم نجم الغنی خان رامپوری نے اپنی کتاب ''مذاہب الاسلام صفحہ ۸
طبع لکھنؤ میں جہاں اہل تشیع کے عقیدہ قرآن کا ذکر کیا ہے وہاں بڑی صراحت سے لکھتے ہیں:

''اثنا عشریہ کمی وبیشی کے قائل نہیں اور یہ جو مشہور ہے کہ شیعہ اثنا عشریہ کہتے ہیں کہ صـ
نے دس پارے قرآن مجید کے گم کر دیئے اور بعض شیعہ حسنین اور سورۂ فاطمہ وسورۂ علی پڑھا کر
ہیں یہ جہلاء کی گپ ہے آج تک سلف سے خلف تک کوئی محقق اثنا عشری یہ عقیدہ نہیں رکھتا ہے۔
چنانچہ علمائے اثنا عشری اس خیال کی برأت اپنی کتابوں میں بڑی شد و مد سے کر
ہیں۔ شیخ صدوق ابو جعفر محمد بن علی بابویہ اپنے رسالہ عقائد میں کہتے ہیں کہ جو قرآن اللہ نے حضـ
رسول کو دیا تھا وہی ہے جو اب لوگوں کے پاس موجود ہے نہ اس میں کچھ کم ہوا ہے نہ زیادہ۔ تفسیـ
البیان میں ہے کہ جو اثنا عشریوں کے نزدیک معتبر تفسیر ہے سید مرتضی کہتے ہیں کہ جو قرآن عہد ـ
علیہ السلام میں تھا وہی اب بھی ہے بلا تفاوت، قاضی نور اللہ شوستری اپنی کتاب مصائب النوا
میں لکھتے ہیں کہ یہ بات جو شیعہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ وہ قرآن میں تغیر و تبدل کے
ہیں سو یہ غلطی ہے محققین شیعہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں اور جو کوئی کہے کہ اس کا کیا ا
ہے؟ علامہ صادق شرح کافی کلینی میں لکھتے ہیں کہ یہ قرآن اسی طرح امام مہدی تک سالم رہـ

محمد بن الحسن آملی کہتے ہیں کہ جو روایات پر ذرا بھی نظر کرے گا یقینی طور پر جان جائے گا کہ قرآن میں بچند وجوہات کمی، زیادتی ناممکن ہے۔

(کذا فی مزیل الغواشی شرح اصول الشاشی، صفحہ ۹، طبع ملتان)

(۶) جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے تاریخ اور دیگر علوم اسلامیہ کے استاد پروفیسر محمد اسلم جیراجپوری اپنی کتاب ''تاریخ القرآن'' میں بذیل عنوان ''شیعہ اور قرآن'' عدم تحریف کے بارے میں علماءِ شیعہ کی تصریحات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ ان علماءِ امامیہ کے اقوال ہیں جو اہل تشیع میں مقبول اور مستند ہیں اور ان اقوال میں نہ کسی تاویل کی گنجائش ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے تقیہ سے کہا ہے کیونکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے علماءِ اہل سنت کی تردید میں رسائل لکھے ہیں ان کی نسبت تقیہ کا گمان نہیں کیا جا سکتا اور ابو جعفر قمی کی کتاب ''الاعتقاد'' اور ملا محسن کی ''تفسیر صافی'' یہ دونوں کتابیں شیعہ کے نصاب درس میں داخل ہیں اس لیے یہ خیال نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے عقیدہ کے خلاف اپنے فرقہ کو تعلیم دیں گے۔ (تاریخ القرآن، صفحہ ۶۲ تا صفحہ ۶۷، طبع کراچی)

(۷) شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل حضرت علامہ شمس الحق افغانی علماءِ دیوبند میں بلند مقام رکھتے ہیں پاک و ہند میں جن علماءِ دیوبند کے علم پر اعتماد کیا جاتا ہے اور جن کو عوام و خواص میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان میں آپ بھی سرفہرست ہیں۔ آپ جامعہ عباسیہ بہاولپور میں شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز رہ چکے ہیں۔ ''علوم القرآن'' کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی ہے۔ یہ کتاب پشاور یونیورسٹی میں ایم اے کے نصاب میں شامل کر لی گئی ہے۔ اپنی اسی کتاب میں عنوان ''شیعہ اور تحریف قرآن'' کے تحت رقمطراز ہیں:

''مستشرقین جب ہر طرح قرآن کی تحریف ثابت کرنے میں عاجز آ گئے تو بڑے زور و شور سے یہ لکھ دیا کہ مسلمانوں کا بڑا فرقہ تحریف قرآن کا قائل ہے اور وہ شیعہ ہے اور اس انداز سے لکھا ہے کہ گویا تحریف قرآن شیعوں کا مسلم عقیدہ ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے شیعوں کا مذہب وہی ہے جو سنیوں کا ہے کہ قرآن مکمل طور پر محفوظ ہے اس میں ایک کی کمی بیشی نہیں ہوئی جس کے لیے

شیعوں کی متعدد کتابوں کے حوالہ جات پیش کرتا ہوں۔۔۔الخ۔“

اس کے بعد علماءِ شیعہ کے اقوال نقل کیے اور پھر بطور نتیجہ تحریر کیا کہ:

”ان مستند حوالہ جات شیعہ کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شیعہ میں چند نا قا
اعتبار افراد کے سوا کوئی بھی تحریف یا قرآن میں کمی و بیشی ہونے کا قائل نہیں۔ مزید تفسیر نعم
آلوسی کی کتاب ”الجواب الفسیح لما لفقه عبد المسیح “ میں ملاحظہ کی جائے۔ قرآن ح
تحریری اور دماغی دونوں طرح محفوظ ہے اور الفاظ قرآن اور مطالب قرآن دونوں معجزہ ہیں۔“

(علوم القرآن، صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۶، طبع لاہ

(۸) مشہور مفسر علامہ عبد الحق حقانی دہلوی جن کی سب سے اہم تصنیف فتح المنان فی تن
القرآن المعروف تفسیر الحقانی جو ضخیم آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور برصغیر کے اردو تفسیری سرمایہ
اہل سنت کے نزدیک یہ تفسیر ایک امتیازی شان رکھتی ہے اور بالخصوص اس کے مقدمہ کی توصی
میں علامہ انور شاہ کشمیری نے یہ الفاظ تحریر کیے کہ:

”اگرچہ اس کی نظیر ممکن ہے لیکن واقع نہیں“

موصوف نے شیعہ کے نظریہ عدم تحریف سے متعلق اپنے موقف کو بڑے واضح الفاظ
اس طرح پیش کیا ہے کہ:

”آج تک سلف سے لے کر خلف تک کوئی محقق شیعہ بلکہ کوئی اہل اسلام بھی یہ ع
(کہ قرآن میں کمی، زیادتی و تحریف ہوئی) نہیں رکھتا چنانچہ علماءِ شیعہ اس خیال کی برأت
کتابوں میں بڑی شد و مد سے کرتے ہیں۔۔۔۔الخ۔“

(مقدمہ تفسیر حقانی، جلد ۱، صفحہ ۶۳، مطبوعہ دیو

(۹) عالم اہل سنت اور اخوان المسلمین کے عظیم مفکر علامہ استاد محمد سالم النبہانی مصری
کرتے ہیں:

﴿ان المصحف الموجود فی مساجد و بیوت اسنة هو نفسه الموجود
مساجد و بیوت الشیعة ﴾

''جو قرآن ہم اہل سنت کے پاس موجود ہے بالکل وہی شیعہ مساجد اور گھروں میں موجود ہے۔'' (السنة المفتری علیها، صفحہ ۶۰، طبع مصر)

پھر صفحہ نمبر ۲۶۳ پر لکھتے ہیں:

﴿ان الشیعة الجعفرة (الاثنی عشریه) یرون کفر من خرف القرآن الذی اجمعت علیه الامة منذ صدر الاسلام﴾

''فقہ جعفریہ اثنا عشریہ اس قرآن مجید میں تحریف کے قائل کو کافر سمجھتے ہیں جن کے بارے میں صدر الاسلام سے لے کر آج تک امت کا اجماع ہے۔''

(۱۰) شاہ عبد العزیز محدث دہلوی شیعہ کتابوں میں موجود ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی عدم تحریف قرآن سے متعلق روایات کے بارے میں اپنی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ صفحہ ۲۱۵ مطبوعہ لکھنؤ میں لکھتے ہیں:

﴿پس در جمیع روایات امامیه موجود است که همه اهل بیتؑ همین قرآن را می خوانند و بعام و خاص و دیگر وجوه نظم و تمسك می کردند و بطریق اشتهاد می آوردند و آیات او را تفسیر می کردند تفسیرے که منسوب است به امام حسن العسکری رضی اللّٰه عنه که همین قرآن است لفظ به لفظ و صبیان و جواری و خدم و اهل و عیال خود را همین قرآن می فرمودند بخواندن در نماز امری کردند و بنا بریں امور شیخ ابن بابویه در اعتقادات خود ازین عقیده کاذبه دست بردار شده و فارغ خطی داده ازین جهت اگر او را صدوق نامند بجا است﴾

پس تمام روایات امامیہ میں موجود ہے کہ تمام اہل بیتؑ اسی قرآن کو پڑھتے تھے اسی عام و خاص اور وجوہ نظم سے تمسک فرماتے اور اسی قرآن مجید سے اشتہاد دلاتے رہے وہ فقط اسی قرآن کی تفسیر فرماتے اور جو تفسیر شیعہ امام حسن عسکریؑ کی جانب منسوب ہے وہ فقط اسی قرآن کی تفسیر ہے اور اپنے بچے اور بچیوں، غلاموں اور اہل و عیال کو اسی قرآن کی تعلیم فرماتے۔ نماز میں اسی کے پڑھنے کا حکم دیا ہے انہی امور کی بناء پر شیخ ابن بابویہؒ اپنی کتاب ''الاعتقادات'' میں تحریفِ قرآن

کے عقیدہ کاذبہ سے دستبردار ہوئے اور اسے فارغ خطی دے دی اسی بناء پر اگر انہیں صدوق کہہ جائے تو درست اور بجا ہے۔"

اسی طرح شاہ صاحب اسی تحفہ کے صفحہ نمبر ۵۶۲ پر مزید اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿قرآن مجید که بلاشبه از حضرات ائمه نزد ایشان منقول بالتواتر است و همیشه آن حضرات او را به نیت عبادت و دیگر ائمه او را تفسیر کرده اند و در کلام خود استشهاد بآیات و الفاظ آن می آوردند﴾

قرآن مجید بلاشبہ حضرات ائمہ اہل بیتؑ سے تواتر کے ساتھ نقل ہوا ہے اور ہمیشہ سے یہ حضرات اسی قرآن کو نماز میں اور نماز کے علاوہ تلاوت فرمایا کرتے تھے اور حضرت امام حسن عسکریؑ اور دیگر ائمہ اہل بیتؑ نے اسی قرآن کی تفسیر کی ہے اور اپنی گفتگو میں اسی قرآن کی آیات اور الفاظ سے استشہاد لایا کرتے تھے۔

(۱۱) زمانۂ قریب کے ایک مشہور سیرت نگار علامہ شبلی نعمانی نے اخبار الضیاء لاہور ۹ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں اپنے ایک مضمون "قرآن کا خدا حافظ ہے ترتیب قرآنی" کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کی حالت اور ان کی روایات قرآن مجید کے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ علامہ طبرسی جو مشہور اور مستند شیعی مفسر ہیں تفسیر مجمع البیان میں لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ اور متعدد موقعوں پر لکھا ہے کہ قرآن کی صحت کا علم ایسا ہی ہے جیسا کہ شہروں کا علم بڑے بڑے واقعات اور مشہور کتابوں اور عرب کے رون اشعار کا علم کیونکہ قرآن کی نقل و حفاظت کے اسباب غایت کثرت سے تھے اور اس حد تک پہنچے تھے کہ اور کسی چیز کے سنے نہیں گئے اس لیے کہ قرآن نبوت کا معجزہ اور علوم شرعیہ اور احکام دینیہ کا ماخذ ہے اور علمائے اسلام نے اس کی حفاظت اور جماعت میں انتہا درجہ کی کوشش کی یہاں تک کہ قرآن کے اعراب، قرأت، حروف آیات کے اختلاف تک انہوں نے محفوظ رکھے اس لیے کیونکر قیاس ہوسکتا ہے کہ اس احتیاط شدید کے ہوتے اس میں نقصان یا تغیر آنے پائے۔ سید مرتضیٰ نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت

ﷺ کے زمانہ میں پڑھا جاتا تھا اور لوگ اس کو حفظ کرتے تھے اور آنحضرتؐ کو سناتے تھے۔"

پھر ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے اخبار لاہور کے صفحہ ۶ کالم نمبر ۱ میں لکھتے ہیں:

"موجودہ قرآن کو محفوظ چلے آنے کے متعلق تمام اہل اسلام کی روایتیں پہلے نقل ہو چکی ہیں۔ اہل تشیع کے معتقدات کی تشریح بھی گزشتہ نمبر میں ان کی سب سے مشہور تفسیر (مجمع البیان علامہ طبرسی) کے حوالہ سے ہو چکی ہے۔"

(۱۲) اہل سنت کے ایک ممتاز دانشور جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک مقالہ "شیعہ سنی مفاہمت کی اہمیت کی اساس" کے عنوان سے روزنامہ پاکستان ۲۰ مئی ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا اور ان کے اپنے "ادارہ مرکزی خدام القرآن لاہور" کی جانب سے کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں بھی شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکا ہے جو تقریباً ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں موصوف نے پاکستان میں نظام خلافت کے قیام اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب شیعہ سنی محاذ آرائی کو قرار دیا اور انہوں نے شیعہ سنی مفاہمت کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا "شیعہ سنی مفاہمت بڑی اہمیت کی حامل ہے اس لیے کہ اگر ملک میں شیعہ سنی مفاہمت ہو جائے تو یہ اسلام کی جانب ایک بہت بڑی پیش رفت ہوگی۔" اسی مقالے میں ایک جگہ وہ اہل تشیع کے ایمان بالقرآن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے تو اگر اہل سنت کے ہاں اہل تشیع کے بارے میں یہ شکوک و شبہات موجود ہیں کہ وہ قرآن کو بھی صحیح نہیں مانتے، بعض کتابوں میں اس کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں لیکن اہل تشیع کا عمومی موقف یہ ہے کہ ہم اسی قرآن مجید کو برحق مانتے ہیں۔ ہمیں ان کا یہ موقف تسلیم کرنا چاہئے۔ چنانچہ "کتاب (قرآن پاک) اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین مشترک اساس ہے اہل تشیع کا مستند موقف بہرحال یہی ہے کہ وہ بھی اسی قرآن کو تسلیم کرتے ہیں۔"

(۱۳) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع سابق مفتی دار العلوم دیوبند کی زیر نگرانی، شیخ اکبر سہارنپوری استاذ الحدیث دار العلوم کراچی کے ترجمہ اور جسٹس محمد تقی عثمانی کے حواشی و شرح اور تحقیق کے ساتھ

ایک علمی کتاب ''اظہار الحق'' کا اردو ترجمہ بنام ''بائبل سے قرآن تک'' جس کا ابتدائیہ خود مفتی محمد شفیع صاحب نے تحریر کیا ہے اور حال ہی میں مکتبہ دار العلوم کراچی سے شائع ہوئی ہے جو انہی بزرگوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں عنوان ''قرآن کی حقانیت پر شیعہ علماء کے اقوال'' کے ذیل میں بڑی صراحت کے ساتھ لکھا ہے۔

''تحقیقی جواب یہ ہے کہ قرآن مجید تمام اثنا عشری علماء کے نزدیک تغیر و تبدل سے محفوظ ہے اور اگر کوئی شخص قرآن میں کسی کمی اور نقصان کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا قول ان علماء اثنا عشری کے نزدیک مردود اور ناقابل اعتبار ہے۔''

(بائبل سے قرآن تک جلد ۳ صفحہ ۹ طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)

اس کے بعد صفحہ ۱۰ سے صفحہ ۱۳ تک عدم تحریف قرآن پر اہل تشیع کے جید علماءِ اعلام کے اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ بعد ازیں یوں فیصلہ دیتے ہیں کہ:

''ان گزشتہ شہادتوں کے پورے طور پر یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ محققین علماء شیعہ کا صحیح مذہب یہی ہے کہ وہ قرآن جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر نازل کیا تھا وہ بالکل وہی ہے جو اس زمانے میں مجموعے کے طور پر لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے اس سے زائد بالکل نہیں ہے اور یہ کہ حضور ﷺ کے مبارک دور میں جمع اور مدون ہوگیا ہے اور ہزاروں صحابہؓ نے اس کو یاد اور نقل کیا صحابہؓ کی بڑی جماعت نے جن میں عبد اللہ بن مسعودؓ اور ابی کعبؓ بھی شامل ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پورا قرآن سنایا اور بارہویں امام کے ظہور کے وقت بھی قرآن اسی ترتیب کے ساتھ ظاہر اور پورا ہوگا اور جو بعض ضعیف روایتیں تحریف کی نسبت ملتی ہیں وہ ان قطعی اور یقینی روایات کے مقابلے میں قطعی اعتبار نہیں رکھتیں جو قرآن محفوظ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔''

(۱۴) حضرت خواجہ حسن نظامی نے منادی دہلی ۲۷ اگست ۱۹۳۷ء پر نہایت عمدہ الفاظ میں اپنے نظریہ کا اظہار کیا ہے کہ:

''تمام جمہور شیعہ موجودہ قرآن مجید کو کامل و اکمل مانتے ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ کے ایک مجتہد صاحب (علامہ علی نقیؒ) کی ایک واضح کتاب موجودہ ترتیب کی تائید میں پڑھی ہے جو اردو زبان میں

ہے اور اس کے مصنف بھی موجود ہیں اور کتاب بھی موجود ہے۔''

(۱۵) حضرت مولانا مظہر الدین بلگرامی فاضل جامعۃ الازہر اور فاضل مظاہر علوم سہارنپور جو عرصۂ دراز سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور اب کئی سال سے اس شعبہ کے مستقل صدر ہیں۔ انہوں نے اپنی تالیف ''عیون العرفان فی علوم القرآن'' صفحہ ۸۱ تا ۸۳ مطبوعہ کراچی عنوان ''حفاظت قرآن کے بارے میں مشہور شیعی علماء کے دلائل'' کے ذیل میں شیعہ کے عدم تحریف کو واضح کیا ہے۔ اور اس کتاب کی ابتداء میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ندوۃ المصنفین اور پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی فاضل دار العلوم دیوبند سابق ڈین فیکلٹی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اس کتاب کی تعریف و توصیف میں گرانقدر تقاریظ اور آراء موجود ہیں جو اس کتاب کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتی ہیں۔

(۱۶) علامہ ڈاکٹر حامد حنفی داؤد استاذ ادب عربی قاہرہ، سابق پروفیسر جامعہ عین الشمس مصر، حال پروفیسر الجزائر یونیورسٹی الجزائر لکھتے ہیں:

﴿ان الشیعة و هم اتباع المذهب الجعفری لا یکفرون الصحابة و لا یدعون الربوبیة لآل البیت (الی ان قال) ولم یغیر و انصوص القرآن او یحرفوا الکلم عن مواضعه ولم یبتدعوا مذاهب خارجة عن مفاهیم الاسلام﴾

''بے شک جو شیعہ مذہب جعفری کے پیروکار ہیں وہ صحابہ کی تکفیر نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اہل بیتؑ کی ربوبیت کے قائل ہیں اور وہ نصوص قرآن کے تغیر و تبدل اور تحریف قرآن کے ہرگز قائل نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے اسلام کے مفاہیم سے جدا کسی اور مفہوم کو ایجاد کیا ہے۔''

(الصحابۃ فی نظر الشیعہ، صفحہ ۲۵، طبع مصر)

(۱۷) معروف سکالر اور دانشور مصنف مولانا وحید الدین خان جو دہلی میں قیام پذیر ہیں آپ کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں اپنی تصنیف ''عظمت قرآن'' کے ''باب حفاظت قرآن'' کے ذیل میں قرآن کی حفاظت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ان علینا جمعه (قیامۃ) شیعہ و سنی دونوں کے نزدیک بالاتفاق قرآن کی آیت

ہے۔۔۔ آج جو قرآن مسلمانوں کے درمیان رائج ہے اس کی صحت میں کسی فرقہ کا کوئی اختلاف نہیں حتیٰ کہ محقق شیعہ علماء بھی اس معاملہ میں متفق ہیں۔۔۔''

(عظمت قرآن، صفحہ ۸۰، طبع دار التذکیر لاہور)

ان کے علاوہ اہل سنت کے درج ذیل جید علماء مثلاً

احمد ابراہیم بیگ استاد شیخ شلتوت در ''تاریخ التشریح اسلامی'' صفحہ ۲۱، طبع قاہرہ۔

علامہ سمیع عاطف الدین در ''المسلمون من ھم'' صفحہ ۹۸، طبع مصر۔

علامہ محمد علی ایم اے لاہور در ''جامع القرآن'' صفحہ ۱۱۱، طبع لاہور۔

مولانا غلام دستگیر آنجہانی در ''امام البرھان'' صفحہ ۵، طبع لاہور۔

غلام احمد پرویز در ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں'' صفحہ ۱۱۴، طبع لاہور۔

امام محمد ابو زہرہ مصری در ''الامام الصادق'' صفحہ ۲۰۶، طبع مصر نے اس حقیقت کا دوٹوک الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ شیعہ قطعی طور پر تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں۔ وھذا ھو المقصود فی ھذا المقام۔

باب ۸

ناصبیت نے امت کو قرآن کے بدلے کیا دیا؟

گزشتہ صفحات میں دی گئی وضاحت سے محترم قارئین کو معلوم ہو چکا ہے کہ نواصب نے اپنی اغراض فاسدہ کی بناء پر قرآن کریم کو تغیر و تبدل اور تحریف کا نشانہ بنایا، دوسری طرف عترت رسول ﷺ کے خلاف دہشت گردی اور جنگ و جدل کی پالیسی اپنائی، اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ان ظالم اور خونخوار سفاک نواصب نے برسر منبر عترت رسولؐ کے خلاف لعن طعن اور تبرا بازی کی غلیظ مہم شروع کی، تاکہ عام مسلمان عترت رسول ﷺ سے منحرف ہو کر نواصب کے ساتھ ہی وارد جہنم ہو جائیں۔

جب نواصب تحریف قرآن کی نشر و اشاعت میں مصروف تھے اور اہل بیت علیہم الصلوٰۃ و السلام کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ بھی پوری شدت سے جاری تھا تب انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات کے بالمقابل جعلی احادیث تیار کر کے ان کی بنیاد پر ایک فقہ کو رواج دیا۔ اپنے باطل مقاصد کی خاطر مولویوں اور درویشوں کو خریدا۔ جنہوں نے ان نواصب حکمرانوں کی خواہشات کی تکمیل کے لیے روایات وضع کیں اور فتاویٰ جاری کیے۔ انہیں مسائل و احکام کے مجموعہ کو ڈاکٹر اسرار احمد نے "فقہ ملوکیت" قرار دیا ہے۔ یعنی یہ سارا مجموعہ فقہ ناصبی بادشاہوں کی زیر نگرانی ان کی خواہشات کے مطابق وجود میں آ کر مروج ہوا۔

اسی طرح ائمہ نواصب کے فضائل میں بے شمار روایات وضع کر کے اطراف و اکناف عالم میں مشہور کی گئیں تاکہ اصلی رہنماؤں کی جگہ جعلی رہنماؤں کو متعارف کرایا جائے۔ ان امور کی مزید وضاحت کے لیے تو الگ ایک کتاب کی ضرورت ہے تاہم یہاں صرف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ایک اعترافی بیان نقل کر دیا جاتا ہے تاکہ قارئین کو اطمینان ہو جائے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

«جناب مرتضویؑ و سائر ائمہ اطہار در حق نواصب اشقیا بملاحظہ

شرارت و بد ذاتی و خباثت و بد طینتی آنها و نظر بغلبه ظاهری آنها کرده کلمات لعن آمیز در ضمن اوصاف عامه مثل غصب و ظلم و بغض اهل بیت و تغیر سنت رسولؐ و احداث بدعات و اختراع احکام مخالفه شریعت و امثال این صفات می فرمودند﴾

حضرت علی المرتضیٰؑ اور تمام ائمہ اطہارؑ نے بد بخت نواصب کی شرارت بد ذاتی، خباثت اور پلیدی کو ملاحظہ کر کے اور ان کے ظاہری غلبہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے عمومی مذموم اوصاف مثلاً غصب، ظلم، بغض اہل بیتؑ، تغیر سنت رسولؐ، بدعات کی ترویج، شریعت کے مخالف احکام کی ایجاد اور اس طرح کے دیگر مکروہ اصاف کے ضمن میں نواصب کے حق میں لعن آمیز کلمات ارشاد فرمائے۔" (تحفۂ اثناعشریہ، ص ۸، طبع ثمر ہند)

جس طرح نواصب نے ابتدائی عہد اسلام میں فریب کاری اور تطفیف و تلبیس سے کام لیتے ہوئے خود ساختہ مذہب رائج کر دیا اور حقیقی رہنماؤں کے مقابل میں جعلی رہنما کو ظل اللہ بنا کر پیش کر دیئے۔ اسی طرح آج بھی نواصب اپنی ان خبیث اور ناپاک حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ مؤلف اپنے اسلاف کی طرح حق کو مٹانے اور باطل کی ترویج اور نشر و اشاعت کے لیے دروغ بافی اور کذب بیانی سے جھوٹے پروپیگنڈے میں مصروف ہے، حسب سابق اس کی پشت پناہی موجودہ دور کے یہودی کر رہے ہیں۔

مؤلف کی بد دیانتی اور کج فہمی

مؤلف نے "خطبات جیل" کے صفحہ ۲۱۲ پر ایک عنوان قائم کر کے اپنی حماقت اور جہالت کا اظہار کیا ہے۔ ان کا قائم کردہ عنوان اس طرح ہے:

"اسلامی تعلیمات کے برعکس تعلیمات پر مبنی اونٹ کی ران کے برابر موٹی کتاب علی کا تعارف شیعہ کی زبانی"۔

اس کے ذیل میں اصول کافی کی ایک طویل روایت پیش کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

زرارہؒ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے دادا کی وراثت کے باب میں سوال کیا تو آپؑ نے

فرمایا کہ اس سلسلے میں تمام لوگوں نے اپنی رائے سے شریعت سازی کی ہے سوائے امیر المؤمنین علیہ السلام کے، اس سے امام نے فرمایا کہ میں تمہیں کتاب سے یہ مسئلہ پڑھ کر سناؤں گا، دوسرے دن زرارہؓ آپؑ کے پاس گیا تو آپؑ نے اپنے بیٹے جعفر صادقؑ کو حکم دیا کہ زرارہؓ کو صحیفہ فرائض پڑھ کر سناؤ، پھر امام جعفر صادقؑ نے اسے پڑھ کر سنایا، یہ کتاب اونٹ کے ران کے برابر موٹی تھی۔ زرارہؓ پہلے سے میراث کے مسائل (سرکاری مذہب کے مطابق) جانتا تھا، لیکن اسی کتاب میں سرکاری مذہب کے مخالف احکام و مسائل سن کر حیران ہوا اور جب امام محمد باقر علیہ السلام نے اس سے اس کتاب کے بارے میں رائے لی تو اس نے کہا کہ یہ تو عام لوگوں کے مذہب کے بالکل خلاف ہے، امامؑ نے فرمایا ﴿**فان الذی رائیت واللّٰہ یا زرارۃ ھو الحق الذی رائیت املاء رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم خط علی علیہ السلام بیدہ**﴾ اے زرارہؓ جو تو نے دیکھا ہے وہ بالکل حق ہے تو نے رسول اللہؐ کے املاء اور علی علیہ السلام کے ہاتھ کی تحریر دیکھی ہے۔"

پہلے تو زرارہؓ کو اس کتاب میں شک ہوا لیکن پھر ندامت ہوئی اور افسوس کیا کہ کتاب کا باقی حصہ بھی دیکھ لیتا تو بہتر تھا۔ (خطباتِ جیل، ص ۲۱۲ تا ۲۱۶)

الجواب:۔ مؤلف نے روایتی خیانت کاری سے کام لیتے ہوئے روایت کا آخری حصہ ترک کر دیا ہے۔ جس میں جناب زرارہؓ کی ندامت اور کتاب کے بقیہ حصہ کو نہ دیکھتے ہوئے افسوس کا اظہار ہے۔ جس طرح دیگر مسائل میں نواصب نے صراطِ مستقیم کو ترک کیا ہے اسی طرح میراث کے مسائل میں بھی اپنے بے علم حکمرانوں کی پیروی کی اور اپنی رائے سے جعلی احکام مخالف اسلام گھڑ کر نافذ کئے۔ جناب زرارہؓ بھی پہلے ان جعلی مسائل میراث کے عالم بنے ہوئے تھے۔ اسی لیے جب انہوں نے اس کتاب میں پیغمبر اسلام ﷺ کے املاء کردہ اور حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسائل ملاحظہ کئے تو عام لوگوں (نواصب) کے مسائل سے مختلف نظر آئے تو اسے تعجب ہوا لیکن بعد ازاں وہ مطمئن ہوگیا۔ یہ پوری کتاب ہی فرائض (مسائل میراث) پر مشتمل تھی یا دیگر مسائل بھی اسی میں موجود تھے، انہی میں سے ایک صحیفۃ الفرائض ایک باب کے طور پر شامل تھا۔

مؤلف کے لیے اونٹ کی ران کے برابر موٹی کتاب باعث حیرت ہے۔ لیکن ان احمقوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانے میں دور حاضر کی طرح کاغذ اور پریس مشینیں نہ تھیں بلکہ چمڑوں ہڈیوں، درختوں کے چھلکوں وغیرہ پر لکھ کر انہیں باہم جوڑ کر کپڑے کے تھان کی طرح کسی ایک لکڑی کے ڈنڈے یا پھٹے پر لپیٹ لیتے تھے۔ اس کی موٹائی اونٹ کی ران جیسی یا کم و بیش ہو سکتی ہے اسی طرح اس چمڑے وغیرہ کی لمبائی کھولنے پر کئی گز مثلاً ستر گز یا اس سے کم و بیش ہو سکتی ہے۔ جاہل بے عقل ملاں ان تاریخی حقائق سے قطعاً نابلد بالکل ناخواندہ اعرابیوں کی مانند ہیں، علم کی ہوا بھی ان کے پاس سے نہیں گزری۔

دیگر مسائل کی طرح مواریث میں بھی نواصب کے حکمرانوں نے اپنی رائے سے احکام جاری کئے، اسی لیے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے جناب زرارہؓ سے کہا تھا کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے علاوہ سب لوگوں نے اس سلسلے میں اپنی رائے سے شریعت سازی کی ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں:

﴿عن الشعبی قال سئل ابو بکر عن الکلالة فقال انی ساقول فیها برئای اراه ما خلا الوالد فلما استخلف عمر قال الکلالة ما عدا الولد فلما طعن عمر قال انی استحی اللّٰہ ان اخلاف ابا بکر.....﴾

شعبی سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ سے کلالہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا "میں جلد ہی اس بارے میں اپنی رائے سے کوئی فیصلہ کروں گا، پھر کہا کہ کلالہ وہ وارث ہیں جو باپ کے علاوہ ہوں جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو کہا: بیٹے کے علاوہ وارث کلالہ ہے، جب حضرت عمر زخمی کیا گیا تو کہا: مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ کلالہ کے بارے میں ابو بکر کی رائے کے خلاف فتویٰ دوں۔" (ازالۃ الخفاء مقصد اول ص ۷۴ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

عالیقدر قارئین! آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ کس طرح اپنی آراء کو دین بنا دیا گیا اور حقیقی شریعت اسلامیہ سے بے بہرہ حکمرانوں نے سرکاری مذہب کو عوام کے ذہنوں میں راسخ کر دیا جناب زرارہؓ بھی پہلے پہلے ایسے ہی جعلی مسائل و فرائض کے عالم بنے ہوئے تھے جب حقیقت

منکشف ہوئی تو انہیں حیرت ہوئی لیکن ذرا تردد کے بعد ندامت کا اظہار کر کے اصلی شریعت اسلامیہ کے مطابق فرائض و مسائل کو تسلیم کر لیا۔

جناب زرارہؒ کا تعارف کراتے ہوئے مؤلف نے اپنی حماقت کا پورا زور صرف کر دیا ہے، انہیں معلوم نہیں ہے کہ جناب زرارہؒ پیدائشی شیعہ نہ تھے بلکہ پہلے عامۃ الناس میں سے یعنی سرکاری مذہب کے پیروکار تھے لیکن بعد میں انہوں نے مذہب تشیع اختیار کیا، جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے اسی روایت کی تشریح کرتے ہوئے مراۃ العقول کی جلد ۲ ص ۲۷۴ پر اس کے اصل محرکات کو لکھا ہے۔۔۔

جب امام علیہ السلام نے ان کے اس نظریہ کی تردید کی لیکن اشارہ سے کام لیا تو اس نے دل میں یہ سوچا کہ یہ بوڑھا شخص تو مناظرے کے طریقے سے ناواقف ہے، لیکن اس کے بعد امامؑ نے اسکے سامنے ایک ایسی دلیل پیش کی جس سے وہ مبہوت ہو گیا اور اپنے موقف کی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

مؤلف نے اپنی روایتی اور نسلی بد دیانتی، خیانت کاری اور فریب کاری کو بروئے کار لاتے ہوئے روایت کے اس حصے کو ذکر ہی نہیں کیا۔ چنانچہ "**لا علم انه بالخصومة**" کے بعد متصل ہی مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

﴿قال لی فقال یا زرارة ما تقول فیمن اقر لك بالحکم اتقتله ما تقول فی خدمکم و اهلیکم اتقتلهم قال فقالت انا و اللّٰه لا علم لی بالخصومة﴾

راوی کہتا ہے کہ امامؑ نے فرمایا: اے زرارہ! جو شخص تیرے حکم کا اقرار کرے اس کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟ تو اسے قتل کرے گا؟ تم اپنے خادموں اور گھر والوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کیا تم انہیں قتل کرو گے؟ زرارہ کہتا ہے کہ اب میں نے کہا: میں ہی ہوں جسے مناظرے کے فن کا کوئی علم نہیں ہے۔" (اصول کافی، ص ۵۵۷، طبع لکھنؤ)

مراۃ العقول میں علامہ مجلسیؒ نے افادہ فرمایا ہے کہ زرارہ کا قول "**لا علم لیـ انه بالخصومة**" قول نفسی ہے یعنی ان کے دل میں یہ خیال گزرا، لیکن جب امام محمد باقر علیہ السلام کے استدلال سے مطمئن ہو گیا تو اپنے دل میں ہی کہا کہ مناظرے کا علم تو دراصل مجھے نہیں ہے۔ چنانچہ

دل میں اس طرح کے خیال کا گزرنا کوئی گناہ نہیں ہے بالخصوص جبکہ ابھی تک زرارہ نے نیا نیا تشیع اختیار کیا تھا ابھی وہ مسائل سیکھ رہا تھا اور پرانے مسائل کو چھوڑنے کی کوشش میں تھا۔

مؤلف کی انتہائی حیا سوز خیانت اور تحریف

مؤلف نے صرف نقل روایت سے مطلب برآری کی ناکام کوشش کی ہے جیسا کہ اپنے باطل مدعا کے اثبات کے لیے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے خاص صحابی جناب زرارہؒ کی مذمت میں یہ روایتیں نقل کی ہیں کہ

"رجال کشی میں روایت ہے کہ زرارہ صاحب نے امام جعفر صادق پر لعنت کی۔ الفاظ روایت یہ ہے کہ **عن محمد بن عیسٰی عن یونس بن عبد الرحمٰن عن ابن مسکان قال سمعت زرارة بقلو رحم اللّٰہ ابا جعفر و اما جعفر ففی قلبی علیه لعنت. ... الخ**

محمد بن عیسٰی سے روایت ہے وہ یونس بن عبد الرحمٰن سے وہ ابن مسکان سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں میں نے زرارہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اللہ ابو جعفر یعنی امام باقر پر رحم کرے مگر جعفر پر تو میرے دل میں لعنت بھری ہوئی ہے۔۔۔۔۔"

"اسی رجال کشی میں امام جعفر صادق کا زرارہ پر لعنت کرنا بھی منقول ہے۔ امام موصوف کے الفاظ روایت میں یہ ہے کہ **کذب علی و اللّٰہ علی لعن اللّٰہ زرارة** ۔ زرارہ میرے اوپر افترا کرتا ہے اللہ کی قسم اس نے میرے اوپر افتراء کیا ہے اللہ لعنت کرے زرارہ پر"

(خطبات جیل، ص ۲۱۸، ۲۱۹)

الجواب۔ رجال کشی کے حوالے سے خیانت کار مؤلف کا یہ نقل کرنا کہ زرارہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام پر (معاذ اللہ) تبرا بازی اور لعنت کی ہے سراسر غلط ہے حالانکہ رجال کشی کی اصل عبارت میں یہ لفظ نہیں ہے بلکہ "لفتة" ہے چنانچہ روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں ﴿**سمعت زرارة یقول رحم اللّٰہ ابا جعفر و اما جعفر فان فی قلبی علیه لفتة**﴾ میں نے سنا کہ زرارہ یہ کہہ رہا تھا اللہ رحم کرے ابو جعفرؑ پر لیکن جعفرؑ تو ان کے بارے میں میرے دل میں کچھ میل ہے۔"

(رجال کشی، ص ۱۳۱، مطبوعہ کربلا، ص ۹۶، مطبوعہ بمبئی

جس طرح مؤلف کے اسلاف نے قرآن وسنت میں تحریف کا ارتکاب کیا اسی طرح اس نے بھی ''لفتة'' کے لفظ کو تبدیل کر کے لعنت بنا دیا۔ الا لعنة الله علی الکاذبین لیکن سچ کہا گیا ہے کہ:

بے حیا باش و ھرچہ خواھی کن

یعنی بے حیا بن جاؤ پھر جو جی میں آئے کرتے چلے جاؤ

جناب زرارہؓ کے بارے میں مؤلف نے دوسری روایت رجال کشی سے ہی نقل کی ہے بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ عبدالشکور لکھنوی کے رسالہ سے خوشہ چینی کی ہے اس نے جناب زرارہؓ کی مذمت کے لیے جو روایت نقل کی ہے اس کی سند اس طرح ہے: ﴿حدثنی ابو جعفر محمد بن قولویه قال: حدثنی محمد بن ابی القاسم ابو عبد الله المعروف بما جیلویه عن زیاد بن ابی الحلال قال قلت لابی عبد الله "ع"﴾... اس روایت اور اس قسم کی دوسری روایات پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے علامہ مامقانی نے ان کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں چنانچہ تنقیح المقال جلد دوم ص ۴۴۳ مطبوعہ مرتضویہ نجف میں بڑی تفصیل سے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿الجواب عن هذه الاخبار مامر من کون ذالك و نحوه من مولینا الصادق علیه السلام تقیة حفظاً لزرارة و عرضه کما بینه لابینه الحسن و الحسین علی ان فی ذیل الخبر الاول ما یشهد بکونه من المجعولات و کیف ینکر زراره و بصیرته و الحال ان جلالته و غزارة علمه مما یعترف بها الموالف و المخالف حتی ابو حنیفة و اشباهه و ربما ناقش ابن طاوس فی سند الخبر الاول بقوله الذی یظهر ان الروایة غیر متصلة لان محمد بن ابی القاسم کان معاصراً لابی جعفر محمد بن بابویه سنة احدی و ثمانین و ثلاث مائة و مات الصادق علیه السلام سنة مائة و ثمان و اربعین و یبعد ان یکون زیاد بن ابی الحلال عاش من زمان الصادقؑ حتی لقی محمد بن القاسم معاصر ابی جعفر محمد بن بابویه بل ذکر شیخنا فی کتاب الرجال ان زیاد بن ابی الحلال من رجال محمد بن علی الباقر علیه السلام و مات الباقر علیه السلام

سنة مائة و اربع عشرة و هذا اكد فی کون السند مقطوعاً﴾

ان روایات کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ یہ خبر اور اس طرح کہ دوسری روایات اما صادق علیہ السلام سے تقیۃً وارد ہوئی ہیں ان کا مقصد زرارہ کی جان اور عزت کی حفاظت تھا جیسا آپؑ نے اس کے دو بیٹوں حسن اور حسین پر اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا تاہم پہلی روایت کے ضم میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ یہ روایات من گھڑت ہیں آپؑ کس طرح زرارہؓ اور اس کی بصیرت کی مذمت کر سکتے ہیں حالانکہ اس کی جلالت اور وسعت علمی اس تک پہنچی ہوئی ہے کہ ہر موافق و مخالف کو اس کا اعتراف ہے حتیٰ کہ ابو حنیفہ اور اس جیسے لوگ بھی جناب زرارہؓ کی جلالت علمی کے معترف ہیں ابن طاوؤسؒ نے پہلی روایت کی سند پر جرح کی ہے ان کا کہنا ہے کہ ظاہر ہے کہ یہ روایت غیر متصل یعنی منقطع ہے اس لیے کہ محمد بن ابی القاسم تو ابو جعفر محمد بن بابویہ متوفی ۳۸۱ھ کا معاصر تھا جبکہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ۱۴۸ھ میں فوت ہوئے امر عقل سے بعید ہے کہ زیاد بن ابی الحلال امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے سے لے کر زندہ ہو کہ (چوتھی صدی ہجری میں) ابو جعفر محمد بن بابویہ کے معاصر محمد بن القاسم سے ملاقات کی ہو، ہمارے شیخ نے کتاب الرجال میں ذکر کیا ہے کہ زیاد بن ابی الحلال حضرت امام محمد بن الباقر علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھا اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی وفات ۱۱۴ھ میں ہوئی، یہ با سند کے منقطع ہونے میں زیادہ قوی ہے۔

صحیفہ، جفر، جامعہ اور مصحفِ فاطمہؑ کا تعارف

مؤلف کی حماقت اور بے حیائی کا ایک اور مظاہرہ ملاحظہ کیجیے۔

"قرآن کے مقابلہ میں علم و عرفان کے نایاب گوہروں پر مشتمل شیعہ کا تصوراتی خز صحیفہ، جفر، ستر گز کے جامعہ اور مصحف فاطمہ کا تعارف" (خطبات جیل، ص ۲۱۹)

الجواب:۔ مؤلف اپنی وسعت حماقت کی اور کئی بناء پر علم کی باتوں کو سمجھنے سے قطعاً قاصر ہے گزشتہ جہلاء و حمقاء کی طرح علم اور اہل علم کا تمسخر اڑانا ان کا محبوب مشغلہ ہے اسی غباوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مندرجہ بالا عنوان کے تحت اصول کافی کی روایت نقل کر کے بزعم خویش

ثابت کرنا چاہتا ہے کہ گویا یہ علم کے خزانے قرآن کے مقابل میں ہیں۔ حالانکہ یہی علمی گوہر قرآن کی حقیقی تشریح وتفسیر ہیں۔ چنانچہ اصل روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ شیعوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو ایسا علم کا دروازہ تعلیم دیا تھا جس سے آگے ہزار دروازے کھلتے ہیں آپؑ نے اس امر کی تصدیق کی، اس شخص نے اتنے علم پر حیرت کا اظہار کیا تو آپؑ نے فرمایا: یہ تو کوئی بات ہی نہیں، پھر فرمایا کہ ہمارے پاس الجامعہ ہے جس کی لمبائی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ سے ستر ہاتھ ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے یہ کتاب لکھوائی اور حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے لکھی، اس میں تمام حلال وحرام اور انسانوں کی ضروریات کے تمام مسائل کی تفصیل ہے حتیٰ کہ فراش کی دیت بھی اس میں مذکور ہے، پھر آپؑ نے اس شخص کی اجازت سے اسے چٹکی بھری اور فرمایا حتیٰ کہ اس کی دیت بھی اس جامعہ میں مذکور ہے یہ کہتے ہوئے آپ غصے کی حالت میں تھے، پھر آپؑ نے فرمایا: ہمارے پاس جفر بھی ہے، یہ چمڑے کا ایک ظرف ہے جس میں انبیاء اور اوصیاء کا علم ہے اور بنو اسرائیل کے گزشتہ علماء کا علم ہے، پھر فرمایا کہ ہمارے پاس مصحف فاطمہ علیہا السلام بھی ہے، یہ ایسا مصحف ہے جس میں تمہارے قرآن سے تین گنا زیادہ مواد ہے، لیکن اس قرآن کا ایک حرف بھی اس میں نہیں ہے، پھر فرمایا کہ علم ما کان وما یکون بھی ہمارے پاس ہوتا ہے، اس شخص نے اس پر بھی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہی تو علم ہے، لیکن آپؑ نے فرمایا: یہ کوئی خاص علم نہیں ہے تو اس نے کہا: پھر علم ہے کیا؟ فرمایا: علم اسے کہتے ہیں جو لیل و نہار میں، امر کے بعد امر، واقعہ کے بعد واقعہ حتیٰ کہ قیامت تک ہر ساعت کے اور ہر لحہ ظاہر ہونے والے امور کو کہتے ہیں (ان سب کا علم بھی ہمارے پاس ہے)۔ (اصول کافی، ص ۱۴۶، مطبوعہ لکھنؤ)

ملاں کی حماقت تو اس حد تک بڑھی ہے کہ اس کی وجہ سے ملاں جہالت کی گہری پستیوں میں جا گرا ہے، ورنہ بہت سے علماءِ اہل سنت پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے حضرت علی علیہ السلام کو علم کا ایسا دروازہ تعلیم دینے کی روایت مروی ہے جس سے مزید ہزار ابواب مفتوح ہوتے ہیں مثلاً فخر الدین رازی نے سورۂ آل عمران کی آیت ۳۳ کے ذیل میں حضرت علی علیہ السلام کا ایک ارشاد نقل کیا ہے جس میں آپؑ نے فرمایا: ﴿اعلمنی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الف باب من

العلم و استنبطت من كل باب الف باب ﴾ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے علم کے ہر
ابواب تعلیم فرمائے پھر میں نے ہر باب سے مزید ہزار باب استنباط کیے۔''
(تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۲۳، مطبوعہ قدیم مص

جہاں تک ستر گز لمبائی والی کتاب الجامعہ کا تعلق ہے، تو اس میں کوئی حیرت یا تعجب بات نہیں ہے، پیغمبر اکرم ﷺ نے امت کی بھلائی کے لیے چھوٹے چھوٹے معاملے میں شرعی بیان کر کے حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں تحریر کروا دیا تھا تا کہ یہ امام امت کی رہنمائی کرے گا، لیک امت کی بدقسمتی کہ اس نے اصل امام اور اصلی اسلام سے انحراف اختیار کر لیا، ورنہ دنیا کے قانون میں چٹکی بھرنے اور ناخن کی خراش کی دیت کا ذکر موجود ہے؟؟ مسلمانوں کے پاس قانون نام کی کوئی شئے مذکور ہی نہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے امت کو آخری حد تک عدل انصاف پر مبنی قانون عطا کیا، لیکن جاہل حکمرانوں نے اپنی خواہشات کو قانون بنا لیا اور امت کو حقیقی عدل و انصاف سے محروم کر دیا۔ لمبائی ستر گز ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں اس دور میں کتا چمڑوں، درختوں کے چھلکوں وغیرہ پر لکھ کر لپیٹ لی جاتی تھیں اس کتاب جامعہ کو کھولنے پر اس لمبائی ستر گز ہو سکتی ہے۔ موجودہ زمانے کی کمپیوٹر کتابت والی کسی کتاب کے اوراق کو منتشر کر طوالت میں جوڑا جائے تو اس کی لمبائی میلوں تک جا سکتی ہے۔ یہ جلد بندی کا کمال ہے کہ کاغذ کے ٹکڑوں کو تھوڑی سے ضخامت میں جمع کر دیتی ہے۔ واضح ہو کہ روایت میں ''ستر گز'' کے ا نہیں بلکہ ﴿صحیفة طولها سبعون ذرعاً بذراع رسول الله ﴾ ''ایک صحیفہ جس کی ا رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ سے ستر ہاتھ ہے۔''

کتاب الجفر کے بارے میں علماءِ اہل سنت کی واضح تصریحات

جفر کے بارے میں اہل سنت کے جید اہل علم محققین نے بڑی شد و مد سے اس کتا بالاجمال تذکرہ کیا ہے ہم صرف چند علماء کے نقطۂ نگاہ سپردِ قرطاس کرنے کی سعادت حاصل کر ہیں چنانچہ علامہ ابن خلدون مغربی اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ﴿واعلم ان كتاب الجفر اصله ان هارون بن سعيد العجلي وهو راس الزيدية كان له كتاب يرويه عن -

الصادق وفيه علم ما سيقع لاهل البيت على العموم و لبعض الاشخاص منهم على الخصوص وقع ذالك لجعفر و نظائره من رجالاتهم على طريق الكرامة و الكشف الذى يقع لمثلهم من الاوصياء و كان مكتوبا عند جعفر فى جلد ثور صغير فرواه عنه هارون العجلى و كتبه و سماه الجعفر باسم الجلد الذى كتب فيه لان الجفر فى اللغة هو الصغير و صار هذا الاسم علما على هذا الكتاب عندهم و كان فيه تفسير القرآن و ما فى باطنه من غرائب المعانى مروية عن جعفر الصادق و هذا الكتاب لم تتصل روايته و لا عرف عينه و انما يظهر منه شواذ من الكلمات لا يصحبها دليل ولو صح السند الى جعفر الصادق لكان فيه نعم المستند من نفسه او من رجال قومه فهم اهل الكرامات وقد صح عنه ان كان يحذر بعض قرابته بوقائع تكون لهم فتصح كما يقول وقد حذر يحيى ابن عمه زيد من مصرعه و عصاه فخرج و قتل بالجوزجان كما هو معروف و اذا كانت الكرامة تقع لغيرهم فما ظنك بهم علما و دينا و آثارا من النبوة و عناية من الله بالاصل الكريم تشهد لفروعه الطيبه.....﴾

جاننا چاہیئے کہ کتاب جفر کی اصل یہ ہے کہ ہارون بن سعید جو زیدیہ کا رہنما تھا کے پاس ایک کتاب تھی جسے وہ جعفر صادقؒ سے روایت کرتا تھا اس میں اہل بیت کو پیش آنے والے واقعات کا عمومی علم بھی تھا اور ان میں سے خاص اشخاص کے بارے میں ہونے والے واقعات کا علم بھی تھا، جیسا کہ اس میں خصوصی طور پر امام جعفر صادقؒ اور ان جیسے بزرگوں کا وہ علم ہے جو انہیں بطریق کشف و کرامت حاصل ہوا جو ایسے اولیاء کو حاصل ہوا کرتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس یہ علم جفر ایک چھوٹے بیل کی کھال میں لکھا ہوا تھا۔ آپؑ سے ہارون عجلی نے اسے روایت کیا، اسے لکھا اور اس کا نام جلد کے نام پر جفر رکھ دیا، اس لیے کہ جفر لغت میں صغیر کو کہتے ہیں چنانچہ یہ نام اس کتاب کا عنوان بن گیا، اس کتاب جفر میں قرآن کی تفسیر اور اس کے غرائب معانی امام جعفر صادق سے مروی تھے۔ اس کتاب کی روایت متصل میں ہے نہ اصل کتاب دیکھی گئی ہے اس کے بعض کلمات ہی ظاہر ہوئے ہیں جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، اگر امام جعفر صادقؒ تک اس کی سند

صحیح ثابت ہو جائے، تو یہ کتاب ان کے نام یا ان کے خاندان کے بعض افراد کی وجہ سے مستند ہو اس لیے آپ لوگ اہل کرامات ہیں، امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ آپؑ اپنے بعض اقرباء کو آئندہ کے بعض واقعات سے بچنے کی تلقین کرتے تھے، چنانچہ جیسا آپؑ کہتے اسی طرح درست ہو جاتا آپؑ نے اپنے چچا زید کے بیٹے یحییٰ کو قتل ہو جانے سے ڈرایا تھا اس نے آپؑ کی بات نہ مانی، خروج کیا تو جوزجان میں قتل ہو گیا جیسا کہ معروف ہے، جب کرامت دوسرے لوگوں کے لیے واقع ہو سکتی ہے تو ان لوگوں کے بارے میں آپؑ کی کیا رائے ہے جن کا علم دین اور آثار نبوت اور عنایتِ الٰہیہ سے ماخوذ ہے یہ بزرگوار تو اصلی کریم سے متعلق ہیں جو اپنی پاکیزہ فروع پر گواہی دے رہی ہے۔" (مقدمہ ابن خلدون، ص ۳۳۴، مطبوعہ قاہرہ)

اب بھی کوئی بصیرت و بصارت سے عاری انسان دن کو رات کہنے پر مصر ہو تو اس کا علاج جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ علامہ دمیری شافعی نے اس کتاب جفر کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿**قال ابن قتیبة فی کتابه (ادب الکتاب) و کتاب الجفر جلد جفر کتب فیه الامام جعفر الصادق بن محمد الباقر رضی الله عنه لآل البیت کل ما یحتاجون الی علمه و کل ما یکون الی یوم القیامة**﴾

ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ادب الکاتب میں کہا ہے کہ کتاب جفر اہل بیتؑ میں سے امام جعفر صادق بن محمد باقرؑ کی لکھی ہوئی ہے، اس میں ہر وہ چیز ہے جس کے علم کی قیامت تک ضرورت ہو سکتی ہے۔" (حیات الحیوان، ج۱، ص ۲۷۹، طبع قاہرہ، نور الابصار، ص ۱۴۵، مطبوعہ مصر)

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سورۂ بقرہ کی ابتداء ﴿**الٓمٓ ذالك الکتاب**﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿**فمعنی الآیة الٓمٓ ذالك الکتاب الموعود ای صورة الکل الموعود الیها بکتاب الجفر و الجامعة المشتملة علی کل شی الموعود بان یکون مع المهدی فی آخر الزمان لا یقراه کما هو بالحقیقة الا هو و الجفر لوح لقضاء الذی هو عقل الکل و الجامعة لوح القدر الذی هو نفس الکل فمعنی کتاب الجفر و الجامعة المحتویان علی کل ما کان و یکون**﴾

ذالک الکتاب کے معنیٰ "الموعود" وعدہ کی گئی کتاب ہے کہ ہر مؤمن کی صورت جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ کتاب جفر اور جامعہ ہے جو ہر اس چیز پر مشتمل ہے جس کے ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے یہ کتاب آخری زمانے میں امام مہدیؑ آخر الزمانؑ کے پاس ہوگی، اس کو اس کی حقیقت کے ساتھ صرف وہی پڑھیں گے۔ جفر لوح قضاء ہے جو عقل کل ہے اور جامعہ وہ لوح قدر ہے جو نفس کلی ہے، بس کتاب جفر اور جامعہ کا معنی یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں ما کان وما یکون کے علم پر مشتمل ہیں۔" (تفسیر ابن عربی بھامش عرائس البیان، ص ۱۲، طبع نولکشور)

مؤلف کو حماقت کے دبیز پردوں سے نکل کر دیکھنا چاہئے کہ یہ اس روایت میں مذکور علمی گوہر نایاب شیعوں کا تصوراتی خزانہ ہے یا ایک زندہ حقیقت ہے جسے محقق علماء و صوفیاء اہل سنت تسلیم کرتے ہیں۔

مزید برآں کتاب نسیم الریاض شرح شفا للخفاجی ج ۱، ص ۱۳۱، طبع مدینہ منورہ، قلیوبی للشیخ احمد شہاب الدین قلیوبی ص ۱۱۹، طبع نول کشور، اور کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون للحاجی خلیفہ ج ۱ ص ۳۹۵ مطبوعہ در سعادت قسطنطنیہ میں بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ مصحف فاطمہؑ اور جفر و جامعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فلیراجع الیھا۔

فروع کافی کی عبارت سے اغماض "جہالت یا بد دیانتی"

مؤلف کا عنوان "ابو بصیرؓ کے کمالات و حالات" کے زیر عنوان یوں عذر لنگ پیش کرتا ہے کہ "ابو بصیر صاحب ایک بڑے بھاری بزرگ ہیں یہ صاحب بزرگان اہل بیت پر افترا پردازی میں بڑے مشاق تھے فروع کافی جلد دوم ص ۱۸۱ میں ہے کہ یہ صاحب شراب میں پانی ملا کر نوش فرماتے تھے اور کہتے تھے آل محمدؐ نے ہمیں اجازت دی ہے رجال کشی مطبوعہ ایران ص ۱۶۷ میں ہے کہ ایک مرتبہ یہ صاحب جناب امام جعفر صادقؑ سے ملنے گئے انہوں نے جب اندر آنے کی اجازت نہ دی تو ابو بصیر نے فرمایا کہ میرے ساتھ کھجوروں کا بھرا طبق ہوتا تو یقیناً اجازت مل جاتی اس پر ایک کتا آیا اور ابو بصیر کے منہ میں پیشاب کر گیا پھر امام جعفر صادقؑ کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کے ایک فتویٰ کو غلط بتایا اور کہا کہ ابھی ان کا علم کامل نہیں ہوا۔" (خطبات جیل، ص ۲۲۳، ۲۲۴)

الجواب ۔ مؤلف کا یہ لکھنا کہ ابو بصیرؒ بزرگان اہل بیتؑ پر افترا پردازی میں بہت مشاق تھا بہت بڑا دجل ہے حقیقت یہ ہے کہ خود ملاں انتہا درجہ کا مفتری اور کاذب ہے، اسے غلط اور صحیح، جھوٹ اور سچ میں تمیز ہی نہیں ہے حالانکہ فروع کافی کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: ﴿کان ابو بصیر و اصحابه یشربون النبیذ و یکسرونه بالماء فحدثت بذالك ابا عبد الله علیه السلام فقال لي و کیف صار الماء یحلل المسکر مرهم لا یشربوا منه قلیلا و کثیراً قلت انهم یذکرون ان الرضا من آل محمد یحلله لهم فقال و کیف کان یحلون آل محمد المسکر و هم لا یشربون منه قلیلا و لا کثیرا ففعلت فامسکوا عن شربه فاجتمعنا عند ابی عبد الله صلوت الله علیه فقال له ابو بصیر ان ذا جاء نا عنك بکذا و کذا فقال صدق یا ابا محمد ان الماء لا یحلل المسکر فلا تشربوا منه قلیلا ولا کثیراً﴾

جناب ابو بصیرؒ اور اس کے ساتھی نبیذ پیتے تھے، اس کی شدت کو کم کرنے کے لیے اس میں پانی ملا لیا کرتے تھے، میں نے یہ بات ابو عبداللہ علیہ السلام کو بتائی تو آپ نے فرمایا: پانی کس طرح مسکر کو حلال کر سکتا ہے، انہیں حکم دو کہ اس میں قلیل یا کثیر مقدار میں نہ پئیں، میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ آل محمد میں سے ایک پسندیدہ شخصیت نے اسے ان کے لیے حلال قرار دیا ہے، آپؑ نے فرمایا: آل محمد نشہ آور چیز کو کس طرح حلال قرار دے سکتے ہیں حالانکہ وہ خود اس کی تھوڑی یا زیادہ مقدار نہیں پیتے، میں نے انہیں جا کر بتایا، تو انہوں نے اسے پینا ترک کر دیا، بعد ازاں ہم ابو عبداللہ علیہ السلام کے پاس اکٹھے ہو گئے تو ابو بصیرؒ نے آپؑ سے پوچھ لیا کہ یہ شخص آپ کی طرف سے یہ حکم لایا تھا، آپؑ نے فرمایا، اس نے سچ کہا ہے اے ابو محمد! پانی مسکر کو حلال نہیں کر سکتا، اس میں سے تھوڑی یا زیادہ مقدار مت پیو۔"

(فروع کافی کتاب الاشربہ باب ان رسول اللہ حرم کل مسکر قلیلاً و کثیرۃ، ج ۲، ص ۱۸۱، مطبوعہ لکھنؤ)

دیکھا آپ نے مؤلف نے کس قدر دجل و فریب اور دھوکہ دہی سے اس کی نقل میں خیانت کی ہے جو ان کی سرشت میں شامل ہے حالانکہ جناب ابو بصیرؒ لاعلمی میں ایک عمل کر رہے۔

جب انہیں واضح حکم ملا تو انہوں نے نبیذ ہی پینا چھوڑ دیا لیکن ذرا مؤلف اپنے بزرگوں کا عمل ملاحظہ کرنے کے لیے امام محمد شیبانی کی فقہی مسائل پر مشتمل کتاب الآثار کا آئینہ دیکھ لیتے تو یہ بے بنیاد الزام لگانے کی ہرگز جسارت نہ کرتے، چنانچہ مروی ہے ﴿اخبرنا ابو حنیفة عن حماد عن ابراھیم ان عمر اتی باعرابی قد سکر فطلب له عذراً فلما اعیاه ذھاب الا عقل قال احسبو فاذا صحا فاجلدوه و دعا بفضلة فضلت فی اداوته فذاقھا فاذا بنبیذ شدید ممتنع فدعا بماء فسکره وکان عمر یحب الشراب الشدید فشرب و سقی جلساءوه ثم قال ھذا اکسرو بالماء اذا غلبکم شیطانه﴾

حضرت عمرؓ کے پاس ایک اعرابی کو لایا گیا جو نشے کی حالت میں تھا، اس نے معذرت کی کہ ابھی اس کی عقل ٹھکانے نہیں ہے، حضرت عمرؓ نے کہا: اسے قید کر دو، جب یہ صحیح حالت پر آ جائے تو اسے کوڑے لگاؤ، حضرت عمرؓ نے اس کے برتن میں سے بچا ہوا شراب منگوایا، اسے چکھا تو پتہ چلا کہ یہ ممتنع قسم کا نبیذ شدید ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے پانی منگوا کر اسے پتلا کر لیا، حالانکہ خود حضرت عمرؓ گاڑھے قسم کے شراب کو پسند کرتے تھے پس حضرت عمرؓ نے خود بھی پیا اور اپنے ہم مجلسوں کو بھی پلایا پھر کہا کہ جب اس کا شیطان تم پر غالب آ جائے (زیادہ گاڑھا ہو) تو اس کو پانی سے توڑ لیا کرو۔" (کتاب الآثار امام محمد، ص ۱۴۷، مطبوعہ لکھنؤ)

ملاں صاحب غور کر لیں آئمہ اہل بیت ؑ نے تو اسے حرام قرار دیتے ہوئے اپنے پیروکاروں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کی اور جناب ابوبصیرؒ نے آپؑ کے حکم سے آئندہ پینا چھوڑ دیا، لیکن آپ کے حضرت عمرؓ اس کو بڑے شوق سے پیتے تھے، بلکہ انہیں تو گاڑھے قسم کی شراب (نبیذ) سے محبت تھی، خود پیتے اور دوسروں کو بھی پلاتے تھے، محولہ عبارت کے متصل ہی لکھا ہے: ﴿قال محمد ھذا قول ابی حنیفة﴾ حضرت عمرؓ کی پیروی میں امام ابوحنیفہ نے بھی آپ کو یہی حکم دیا ہے کہ خود پیو اور دوسروں کو پلاؤ دوستو۔ لیکن بے حیائی اور ڈھٹائی سے ائمہ اہل بیت ؑ اور ان کے متقی پیروکاروں پر الزام تراشی کر رہے ہو۔

شرم تم کو مگر نہیں آتی

جناب ابوبصیرؒ کی مذمت والی روایت کا مدلل جواب

ملاں نے جناب ابوبصیرؒ کا ایک اور واقعہ لکھ کر ان کی مذمت کی ناپاک کوشش کی۔ اس واقعہ کا مفصل و مدلل جواب علامہ مامقانیؒ نے تحریر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿و الجواب عن ذلك اولا انه لم يعلم كون ابى بصير هذا هو البخترى بل ة سمعت من صاحب المعالم الجزم بوروده فى الضرير و ثانياً انه لم يعلم رجو الضمير فى قوله الاذن الى الامام عليه السلام لم يعلم كونه غرضه الطعن بل لع غرضه امر صحيح و هو التاسف على عدم تقديم هدية نظرا الى قوله سبحانه يا اي الذين امنوا اذا ناجيتم الرسول فقدموا بين يدى نجويكم صدقة الاية و الى بعض ذكرناه اشار المولى الوحيد(") بقوله لعل غرضه التعريض بالبواب او المزاج اياه شعر الكلب لما كان فيه من سوء ادب فى الجملة او وقع اتفاقاً هذا هو الكلام ف كل واحد و احد من الاخبار الذامة و الجواب الاجمالى عن الجميع ان هذه الاخبا لا تبلغ فى الذم مبلغ الاخبار الذامة الواردة فى حق زرارة من اللعن و الطعن نحوهما فكما رفعنا اليد عن تلك و حملناها على محامل ولو بعيدة نظرا الى جلا زرارة و عدم مقاومتها للاخبار المادحة فكذا الحال فى هذه الاخبار فطرحها ا تاويلها ولو بالحمل على خلافها و امرها متعين و كون البخترى فى اعلى درجا الثقة امر واضح مبين﴾

اس کا جواب یہ ہے کہ **اولاً** تو اس مذکور ابوبصیر کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ ابوبصیر بختری ہی ہے۔ یا کوئی اور ہے؟ بلکہ میں نے صاحب معالم سے جزماً یہ سنا ہے کہ یہ واق ضریر کے ساتھ پیش آیا تھا، **ثانیاً**: اس کے قول ''الاذن'' میں ضمیر کا رجوع امام کی طرف ہ معلوم نہیں ہوسکا، نہ ہی اس کی غرض طعن کرنا معلوم ہو سکی ہے، بلکہ شاید اس لفظ کے کہنے کا مقص ایک درست امر ہو، جو اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُو بَيْنَ يَدَیْ نَجْوٰكُمْ صَدَقَةً﴾ (سورۂ مجادلہ، آیت ۱۲) کی طرف نظر کر کے ہدیہ پیش نہ کرنے

تأسف کے طور پر اس کلمہ کا اظہار کیا ہو، علامہ مجلسیؒ نے انہی بعض امور کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہم نے ذکر کیے ہیں کہ شاید اس کی غرض دربان پر تعریض کرنا ہے اس سے مذاح کرنا ہو، ﴿شعر الکلب﴾ (کتے کے پیشاب کرنے) سے مراد یہ ہو کہ اس لفظ میں بے ادبی کا پہلو تھا یا یہ عمل اتفاقاً واقع ہو گیا ہو، یہ تو ہر ایک مذمت کرنے والی روایت کا علیحدہ علیحدہ جواب ہے، لیکن اجمالی جواب یہ ہے کہ یہ خبریں اس حد تک نہیں پہنچتی جس حد تک جناب زرارہؓ کی مذمت میں وارد اخبار ہیں، ہم نے ان کے بھی درست محامل تلاش کر لئے ہیں، جبکہ بختری کے ثقاہت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، یہ امر بالکل واضح اور متعین ہے...."

(تنقیح المقال، ج ۲، ص ۴۶، من ابواب الفاء)

مولوی عبدالشکور لکھنوی بددیانتی اور خیانت میں شہرۂ آفاق تھا اسی کی پیروی کرتے ہوئے بدلگام مؤلف نے جھوٹ اور گمراہی پھیلانے کی کوشش کی ہے اگر راویوں پر جرح ہونے سے دین کی بنیادیں کمزور ہوتی ہیں تو آپ کے محدثین وفقہاء میں سے کوئی ایک بھی سلامت نہیں ہے اس لئے اس طرح کی جرح کی طرف التفاف نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص جب اچھے اور عمدہ محامل تلاش کئے جا سکتے ہوں۔

ہر سال شب قدر احکام کے اترتے پر اعتراض

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسے ایسے لوگ مذہبی قائد بن بیٹھے، جنھوں نے قرآن کریم کا مطالعہ بھی نہیں کیا، بس اوپر اوپر سے الفاظ قرآن کی صورت دیکھی ہے معانی تک ان احمقوں کو رسائی کی صلاحیت ہی نہیں ہے، ان ہی میں سے ایک ہمارے مخاطب مؤلف ہیں اگر یہ غبی ناصبی قرآن کریم کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا اور اس میں علمی صلاحیت ہوتی تو اس عنوان کو مورد طعن نہ بناتا۔

مؤلف نے اصول کافی فضائل شب قدر کے باب ص ۱۵۱ میں سے ایک روایت کا ٹکڑا نقل کیا ہے جو یہ ہے: ﴿انہ لینزل فی لیلۃ القدر الی ولی الامر نفسہ بکذا و کذا و فی امر الناس بکذا و کذا﴾۔ لیلۃ القدر میں خود ولی امر (امامؑ) کی طرف یہ سب امور نازل کئے

جاتے ہیں اور عوام الناس کے بارے میں سب حوادث کی تفصیل اتاری جاتی ہے۔"

الصافی کی عبارت نقل کرنے میں دجل وفریب

اس کے بعد مؤلف نے علامہ خلیل قزوینی کی کتاب الصافی شرح اصول کافی سے ایک عبارت خود تو نقل نہیں کی۔ شاید اس نے یہ کتاب دیکھی تک نہ ہو اور یقیناً اپنے گزشتہ خیانت کار اور دغا باز ملاؤں سے عبارت یوں نقل کرتا ہے:

"اور علامہ خلیل قزوینی صافی شرح کافی کتاب الوحید مطبوعہ نول کشور، ص ۲۲۷ میں لکھتے ہیں:

﴿برای هر سال کتابی علیحده است مراد کتابی ست که دران تفسیر احکام حوادث که محتاج الیه امام است تا سال دیگر نازل شوند بان کتاب ملائیکه و روح در شب قدر بر امام زمان اللّٰه تعالی باطل میکند بان کتاب آنچه را که می خواهد اعتقادات امام خلائق و اثبات میکند در آنچه میخواهد از اعتقادات﴾

"ہر سال کیلئے کتاب علیحدہ ہے مراد اس سے وہ کتاب ہے جس میں ان احکام حوادث کی تفصیل ہوتی ہے جن کی حاجت امام کو سال آئندہ تک ہوتی ہے اس کتاب کو لے کر فرشتے اور روح شب قدر میں امام وقت پر نازل ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کتاب میں امام کے جن عقائد کو چاہتا ہے باطل کر دیتا ہے اور جن عقائد کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔" (خطبات جیل، ص ۲۲۴، ۲۲۵)

الجواب:۔ الصافی شرح اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ میرے پیش نظر ہے چنانچہ علامہ قزوینیؒ کی مندرجہ بالا عبارت کتاب الوحید نہیں بلکہ کتاب التوحید میں ہے، نیز صفحہ ۲۲۷ پر نہیں ہے بلکہ صفحہ ۲۲۹ پر موجود ہے، بہر حال یہ تو معمولی اغلاط ہیں جن سے درگزر کیا جا سکتا ہے لیکن مؤلف اور اس کے اسلاف نے ایک انتہائی قبیح شرارت کی ہے، ان کے مذہب ناصبیت کے اصل بانی یہود بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، یہ سبق ان نواصب نے اپنے کرم فرما اساتذہ یہود سے ہی حاصل کیا ہے، چنانچہ ان بے ایمان خائنین نے "بر امام زمان" تک فارسی عبارت نقل کر کے اس کے بعد تقریباً تین سطریں عمداً باطل مقصد کو پورا کرنے کے لئے ترک کر دیں اور پھر "اللّٰہ تعالی باطل میکند" سے

آگے عبارت کو پچھلی عبارت سے جوڑ دیا۔ جس سے اصل عبارت کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، یہی کام یہودی مولوی کیا کرتے تھے ان کے پیروکار ناصبی بھی ان سے کچھ پیچھے نہیں ہیں، مؤلف نے اپنے سابقہ رہنماؤں سے آنکھیں بند کر کے اس خیانت کارانہ حرکت کو قبول کرتے ہوئے نقل کردیا، ہم الصافی شرح کافی کی وہ عبارت نقل کرتے ہیں جسے نواصب نے اپنے منفی عزائم کی تکمیل کے لئے ترک کردیا ہے اور اتنی بڑی خیانت اور مکروہ حرکت کی کہ جس کے آگے ابلیس کی گردن بھی خم ہو جائے چنانچہ اصل عبارت درج ذیل ہے:

﴿برای هر سال کتابی علیحده هست مراد کتابی است که در آن تفسیر احکام حوادث که محتاج الیه امام است تا سال دیگر میشود و نازل میشوند بان کتاب ملائکه و روح در شب قدر بر امام زمان نه بعنوان وحی و الا لازم می آید که هر امام بنی باشد بلکه بعنوان تحدیث بمعنی تذکیر مقدمات معلومه بترتیب منتج تا استنباط از قرآن شود چنانچه در سورة الدخان و سورة القدر است و بیان می شود در کتاب الحجه "در حدیث هشتم" باب چهل و یکم که باب فی شان انا انزلناه فی لیلة القدر و تفسیر باست چه الله تعالیٰ باطل میکند بان کتاب آنچه را که می خواهد از اعتقادات امام خلائق که پیش ان استنباط از قرآن داشته و اثبات میکند در او انچه را که میخواهد از اعتقادات بوسیله استنباط از قرآن چنانچه گفته در سورة نساء لعلمه الذین یستنبطونه منهم خواه آن اعتقادات منافی محو باشدد خواه نه.....﴾

(الصافی شرح اصول کافی کتاب التوحید باب البداء، جز دوم، ص ۲۲۹، طبع لکھنؤ)

الصافی کی اصل عبارت میں سے نشان زدہ عبارت کے علاوہ باقی ساری عبارت مؤلف نے عمداً حذف کردی ہے۔ ان کے پیر و مرشد یوسف لدھیانوی نے "شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم" کے ص ۱۳۰، مطبوعہ مکتبہ بینات، بنوری ٹاؤن کراچی، میں بھی اس عبارت کو اسی طرح قطع و برید کرتے ہوئے نقل کیا ہے مولوی یوسف لدھیانوی نے یقیناً یہ عبارت اہلحدیث مسلک سے تعلق

رکھنے والے مولوی احتشام الدین مراد آبادی کی کتاب ''نصیحة الشیعه '' سے نقل کی ہے کتاب ''نصیحة الشیعه ''مطبوعہ مکتبہ صدیقیہ ملتان ہمارے پیش نظر ہے، اس کتاب کی تصحیح اور حواشی و تخریج کا کام مولوی عبد الشکور لکھنوی نے انجام دیا ہے۔ اس کتاب کے ص ۴۳۷، ۴۳۸ پر اسی طرح خیانت کاری کے ساتھ قطع و برید کر کے الصافی شرح اصول کافی کی یہی عبارت نقل کی ہے جسے بعد ازاں مؤلف نے اپنے اسلاف پر اعتماد کرتے ہوئے نقل کر دیا ؎

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

اس بے چارے ناخواندہ بے علم کو کیا معلوم تھا کہ اسکے ساتھ اسکے اسلاف نے کتنی بڑی خیانت اور دھوکہ بازی کی ہے جس شخص کی عمداً ایک بھی خیانت کاری ثابت ہو جائے وہ دائمی طور پر نا قابل اعتماد اور جھوٹا ثابت ہو جاتا ہے، کوئی بھی حق پرست اور دیانت دار انسان ایسے لوگوں پر اعتماد نہیں کر سکتا، بلکہ ان کا پورا دین ہی نا قابل اعتماد ہو جاتا ہے، اگر مؤلف اور اسکے ہمنواؤں میں ذرا بھر بھی دیانت موجود ہے تو انہیں چاہیئے کہ وہ ان خائن ملاؤں سے تبرا و بیزاری کا اعلان کرتے ہوئے حق کی جانب رجوع کریں، ورنہ آنکھیں بند کر کے ملاں احتشام الدین اور ملاں عبد الشکور لکھنوی سے اپنے بانیان مذہب یہود اکار پر تو لہب کے ساتھ جہنم میں جانے کیلئے تیار رہیں۔

توضیح مرام :۔ علامہ قزوینیؒ اپنی کتاب میں یہ بتا رہے ہیں کہ فرشتے اور روح شب قدر میں امام زمان عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف پر ان حوادث کے احکام لاتے ہیں جو حوادث دنیا میں دوسرے سال تک وقوع پذیر ہوتے ہیں لیکن یہ وحی نہیں ہوتی، بلکہ یہ یاد دہانی ہوتی ہے، اور گزشتہ سال کے بعض احکام و حوادث میں تغیر و تبدل ہوتا ہے، یہ تشریعی احکام نہیں بلکہ تکوینی امور ہوتے ہیں سورۃ دخان اور سورۃ القدر میں اسی امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، بعض حوادث اور امور کے باب میں امامؑ نے کچھ اور سوچ رکھا ہوتا ہے کہ شاید فلاں واقعہ اس طرح پیش آئے گا یا مثلاً فلاں آدمی کی زندگی ابھی طویل ہے، یہ رائے گزشتہ سال کے نازل شدہ حوادث کی روشنی میں ہوتی ہے لیکن نئے سال میں اس میں تبدیلی آجاتی ہے۔

جبکہ جاہل ملاؤں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالی ہر سال شریعت کو تبدیل

کرتے ہیں، اس طرح انہوں نے اہل حق پر الزام تراشی اور بہتان طرازی کی کوشش کی ہے جس سے ان کے اپنے مکروہ و خائن چہروں سے نقاب الٹ گئے ہیں۔

اگر عوام الناس میں غیرت ایمانی کی کوئی رمق ہو تو اتنی کھلی خیانت اور کذب بیانی کے ظاہر ہو جانے پر ان ملاؤں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے حق کی طرف رجوع کر لیں۔ اس لئے کہ اتنے بڑے خائن و منافق لوگ کسی طرح بھی قابل اعتماد نہیں ہیں، ان ملاؤں کا اسلام اور ایمان سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے، یہ دانستہ یا نادانستہ یہود کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔

علماء اہل سنت کا اعترافِ حق

اہل سنت مفسرین نے بھی سورۃ الدخان اور سورۃ القدر کی تفسیر میں اسی سے ملتا جلتا مفہوم اور روایات بیان کی ہیں، چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی سورۃ الدخان کی آیت ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ﴾ (ہم نے اس کو اتارا برکت والی رات میں، ہم ہی ڈرانے والے ہیں۔ سارے انتظام جو حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں اسی رات کو ان کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یہ فیصلہ ہماری طرف سے ہوتا ہے) کی تفسیر میں ''اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا'' کے تحت لکھتے ہیں کہ ''یعنی سال بھر کے متعلق قضاء و قدر کے حکیمانہ اور اٹل فیصلے اسی عظیم الشان رات میں ''لوح محفوظ'' سے نقل کر کے ان فرشتوں کے حوالے کئے جاتے ہیں جو شعبہ ہائے تکوینیات میں کام کرنے والے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعبان کی پندرھویں رات ہے جسے شب براۃ کہتے ہیں۔ ممکن ہے وہاں سے اس کام کی ابتداء اور شب قدر پر انتہا ہوتی ہو'' و اللہ اعلم''

مشہور مفسر علاؤ الدین علی بن محمد بغدادی المعروف بالخازن اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿ کل امر حکیم ای محکم قال ابن عباس یکتب من ام الکتاب فی لیلة القدر ما هو کائن فی السنة من الخیر و الشر و الارزاق و الآجال حتی الحجاج یقال یحج فلان و یحج فلان و قیل هی لیلة النصف من شعبان یبرم فیها امر السنة و ینسخ الاحیاء من الاموات و روی البغوی بسنده ان النبی صلی اللہ علیه و سلم قال تقطع

الاجال من شعبان الى شعبان حتى ان الرجل لينكح و يولد له وقد خرج اسمه فى الموتى و عن ابن عباس ان اللّٰه يقضى الا قضية فى ليلة النصف من شعبان و يسلمها الى اربابها فى ليلة القدر﴾ ''کل امر حکیم یعنی محکم امر کا فیصلہ ہو جاتا ہے (جس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا) ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ پورے سال میں جو اچھے برے واقعات ہونے والے ہوں، لوگوں کے رزق اور ان کی عمریں وغیرہ لیلۃ القدر میں ام الکتاب سے لکھ لئے جاتے ہیں حتی کہ یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ فلاں فلاں شخص حج کریں گے یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شعبان کی نصف رات ہے اس میں سال کے تمام حوادث کا قطعی فیصلہ ہوتا ہے، مرنے والوں اور زندہ رہنے والوں کی علیحدہ فہرستیں تیار ہو جاتی ہیں۔ بغوی نے اپنی سند سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک شعبان سے آئندہ شعبان تک کے لئے لوگوں کی عمروں اور زندگیوں کا قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ ایک شخص شادی کرتا ہے اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے لیکن اسی سال اس کا نام مردوں میں درج کیا جا چکا ہوتا ہے ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ شعبان کی نصف رات کو تمام فیصلے کر لیتے ہیں اور لیلۃ القدر میں ان فیصلوں کے احکام و تفاصیل نافذ کرنے والوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔'' (تفسیر خازن، ج ۶، ص ۱۲۰، مطبع التقدم العلمیہ مصر۔ معالم التنزیل بغوی بھامش خازن، ص ۱۲۰، تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۱۳۷، ۱۳۸، طبع مصطفیٰ البابی مصر۔ تفسیر مظہری ج ۸، ص ۳۶۸، طبع ندوۃ المصنفین دہلی)

شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں کہ یہ فیصلے تکوینی امور پر متعین فرشتوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں، پھر یہ فرشتے سال بھر انہیں موقعہ بموقعہ نافذ کرتے ہیں، عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ان امور کے ارباب یعنی جو لوگ ان کے نافذ کرنے پر مقرر ہیں ان کے سپرد یہ فیصلے کر دیئے جاتے ہیں۔ اس امر پر صرف فرشتے ہی مقرر نہیں ہیں بلکہ جو انسان کامل فرشتوں سے بھی افضل ہیں، وہ ان تکوینی و تقدیری امور کے نافذ کرنے اور ان کی تفصیلات جاننے میں فرشتوں کے اوپر نگران مقرر ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا سالانہ بجٹ ہے، جسے نافذ کرنے کے لئے اس کا نمائندہ یعنی چیف

ایگزیکٹو فرشتوں اور دیگر ارواح سعیدہ کی فوج کے لئے مستعد ہوتا ہے اور سال بھر ان الٰہی فیصلوں پر اپنی نگرانی میں عملدرآمد کراتا ہے۔

اس امر کی تفصیلی بحث تو ہم نے امامت اور اس سے متعلقہ اختیارات کے باب میں کر دی ہے لیکن یہاں پھر یاددہانی کے لئے ایک دو حوالے پیش کر دیتے ہیں، چنانچہ شاہ اسمٰعیل دہلوی اپنے پیرو مرشد سید احمد دہلوی سے نقل کرتے ہیں کہ "اسی طرح انسانی افراد میں سے کامل لوگ تدبیر کرنے والے فرشتوں کی ساری خدمتوں کا مصدر ہو سکتے ہیں مثلاً جہاد یا دعا کے ساتھ کفار کے ہلاک کرنے کی خدمت جو فرشتگان غضب سے متعلق ہے جہاد اور دعا کے ذریعے اس کامل انسان سے ظاہر ہو جاتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے منافع پہنچانے کی خدمت جو فرشتگان رحمت کے متعلق ہے اس سے حاصل ہوتی ہے اور تسبیح و اذکار اور بجا آوریٔ عبادت کی جو خدمت فرشتگان مسبحین کے متعلق ہے اس سے صادر ہوتی ہے اور پڑھنے پڑھانے اور ارشاد و تلقین کی جو خدمت فرشتگان خدام وحی سے متعلق ہے اس سے درست ہوتی ہے اور سلطنت عادلہ اور خلافت کبریٰ کے قائم کرنے اور امامت باطنہ اور نبوت اور رسالت اور اولوالعزم اور خاتمیت کے عہدوں اور مرتبوں کے مرتب کرنے کی جو خدمتیں ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں سے متعلق ہیں اس سے ہوا کرتی ہیں اور باقی خدمتوں کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہیئے۔" (صراط مستقیم ص ۱۰۰، ۱۰۱ مطبوعہ دیوبند)

ایک اور مقام پر اسی امر کو مزید واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "حاصل کلام اسی راستے کے امام اور اس گروہ کے بزرگ ان فرشتوں کے زمرے میں شمار کیے ہوئے ہیں جن کو ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے تدبیر امور کے بارے میں الہام ہوتا ہے اور وہ اس کے جاری کرنے میں کوشش کرتے ہیں پس ان بزرگوں کے حالات کو بزرگ فرشتوں کے احوال پر قیاس کرنا چاہیئے۔"

(صراط مستقیم ص ۳۸)

مؤلف اور اس کے پیشرو اپنی نادانی سے اس معاملے کو غلط رنگ دے کر پیش کرتے ہیں اور عوام الناس کو گمراہ کرنے کی سعی نافرجام کرتے ہیں حالانکہ مندرجہ بالا شرعی حقائق کی روشنی میں صراحت کے ساتھ معلوم ہو گیا ہے کہ لیلتہ القدر کو آئندہ سال میں پیش آنے والے تمام حوادث کی

تفصیلات طے کر دی جاتی ہیں اور پھر انہیں امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے سپرد کر دیا جاتا ہے، جو اپنے ماتحت فرشتوں سے سال بھر ان احکام کی تعمیل کراتے ہیں، اہل سنت علماء اس کا اعتراف کرتے ہیں سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل دہلوی نے اس امر کو اجمالی نہیں بلکہ تفصیلی طور پر بیان کر دیا ہے، ہماری مندرجہ بالا کاوش صرف اس غرض سے ہے کہ حق سامنے آ جائے اور یہود کے آلۂ کار ناصبی ملاؤں کے دجل و فریب کا پردہ چاک ہو جائے، تاکہ عام مسلمان ان کے دھوکہ میں نہ آئیں اور یہ سمجھ لیں کہ ان ناصبی ملاؤں کا مذہب اور سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اسلام اور ایمان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

خانوادۂ نبوت یا جوتشی گھرانہ (معاذ اللہ)

مؤلف نے جہالت، بے ادبی اور گستاخی پر مبنی درج بالا عنوان کے تحت اپنے پیشرو ناصبی ملا احتشام الدین کی قے چاٹتے ہوئے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے علم نجوم کے بارے میں ارشادات کو مورد طعن و تشنیع بنایا ہے، حالانکہ یہ تو ایک علمی اور سائنسی بحث و تحقیق ہے، جاہل اور گنوار ملاں کو اس سے کیا تعلق؟

مؤلف نے احتشام الدین مراد آبادی کی نقل بغیر عقل مارتے ہوئے اصول کافی کی کتاب الروضہ ص ۱۵۳ سے اس سلسلے میں ایک روایت درج کی ہے جس کا ترجمہ بھی ملاں نے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معلّی بن خنیس سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے علم نجوم کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا: یہ علم حق ہے، اللہ تعالیٰ نے مشتری سیارے کو انسانی شکل میں زمین پر بھیجا تو اس نے پہلے عجم کے ایک شخص کو علم نجوم کی تعلیم دی، لیکن وہ شخص کامل نہ ہو سکا، پھر ہندوستان کے ایک شخص کو یہ علم سکھایا تو وہ کامل ہو گیا، اب یہ علم ہندوستان میں ہے۔'' اسکے بعد ایک روایت درج کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ علم نجوم کماحقہ کوئی نہیں جانتا سوائے عرب کے ایک خاندان اور ہندوستان کے ایک خاندان کے۔

(خطبات جیل، ۲۲۷، ۲۲۸)

<u>الجواب</u>:۔ اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ نبی حضرت ادریس علیہ السلام تھے جو حضرت نوح علیہ السلام سے ایک

ہزار سال پہلے ان کے اجداد میں سے تھے مبعوث برسالت ہوئے ان کے متعلق قرآن مجید میں بالتفصیل تذکرہ موجود ہے چنانچہ ارشاد ہوا: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ (اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا ذکر کیجیے یقیناً وہ سچے نبی تھے اور ہم نے انہیں اعلیٰ مقام پر بلند کیا) (سورۂ مریم، آیت ۵۶ و ۵۷) اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی ورسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے نازل فرمائے کتب تفاسیر میں یہ مذکور ہے کہ آپ علم نجوم اور علم حساب کے موجد ہیں جیسا کہ اس آیت مبارکہ کے ذیل میں ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں:

﴿وهو اول من نظر في النجوم و الحساب و جعله الله من معجزاته. ...﴾

''اور ادریس علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم نجوم اور حساب بطور معجزہ عطا کیا۔'' (تفسیر البحر المحیط ج ۶ ص ۱۹۹ طبع بیروت)

مؤلف یہ سمجھا ہے کہ علم نجوم کوئی قابل مذمت اور مکروہ علم وفن ہے حالانکہ یہ بھی مفید علوم میں سے ایک ہے، اس عالم میں قوائے کواکب و نجوم کے ظاہری آثار سے روشناس کرانا ازحد ضروری ہے تاکہ مشکلات ونوائب کے وقت ان قوائے نجوم اور آثار کواکب سے کس طرح سے فائدہ اٹھایا جائے ان ہی وجوہات کی بنا پر حضرت عمر نے علم نجوم سیکھنے کا حکم دیا کہ ﴿تعلموا من النجوم ما تعرفون بنا القبلة و الطريق ثم امسكوا﴾ ''علم نجوم سیکھو جس سے قبلہ اور راستہ معلوم کرو پھر رک جاؤ۔'' (ازالۃ الخفا مقصد دوم من ابواب شتیٰ ص ۱۳۹ طبع لاہور)

علم کا مقابل جہل ہے اور جہل فی نفسہ نقص وعیب ہے تو لامحالہ علم فی نفسہ حسن وکمال ہوگا۔ دیکھئے شاہ عبدالعزیز دہلوی نے تفسیر فتح العزیز ج ۱ ص ۴۴۵ طبع دہلی میں لکھا ہے:

﴿درین جا باید دانست که علم فی نفسه مذموم نیست هر چونکه باشد﴾

''یہاں جاننا چاہئے کہ علم جیسا بھی ہو فی نفسہ برا نہیں ہوتا۔''

اس کے بعد انہوں نے ان اسباب کا تفصیلی بیان کیا ہے جن کی وجہ سے کسی علم میں برائی آسکتی ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) توقع ضرر۔ (۲) استعداد عالم کا قصور۔ (۳) علوم شرعیہ میں

ہے جا غور کرنا۔ من شاء التفصیل فلیراجع الیھا۔

جہاں تک آئمہ اہل بیت ؑ کا تعلق ہے، تو وہ شرعی علوم میں سند کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے منصوص امام خلائق تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاضیات فلکیات، ارضیات، حیوانیات، نباتات، حیاتیات، طبعیات، کیمیا، طب اور دیگر علوم وفنون مفیدہ میر بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں کامل طور پر نوازا تھا، ائمہ اطہار ؑ علوم اولین و آخرین کے وارث تھے علم نجوم نقصان دہ علوم میں سے نہیں ہے، جیسے سحر، کہانت اور اس طرح کے بعض دیگر علوم ہیں، عل نجوم فلکیات کا ہی ایک حصہ ہے، جس سے آئندہ کے حوادث اور واقعات پر استدلال کیا جاتا ہے کیا مؤلف کو علم نہیں ہے کہ سورج ہماری زندگی کو کس طرح متاثر کرتا ہے، قرآن حکیم نے بھی بار اس طرف متوجہ کیا ہے، چاند زمین سے کئی گنا چھوٹا ہے اور زمین سے کئی لاکھ میل کے فاصلے پر ہ لیکن سمندر پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ اس پانی کے عظیم ذخیرے میں مد و جذر پیدا کر دیتا ہے یہ اثرات اس نے خود پیدا نہیں کئے یہ تمام صلاحیتیں اور اثرات اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھی ہیں

علامہ مجلسی اعلیٰ اللہ مقامہ 'فرادیس الجنان' میں اس روایت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿وفی کتاب منتھی المطلب التنجیم حرام" و کذا تعلم النجوم مع اعتقاد انھا موثر او ان لھا مدخلا فی التاثیر بالنفع و الضرر و بالجملة کل من یعتقد ربط الحرکا النفسانیة و الطبیعیة بالحرکات الفلکیة و الاتصالات الکوکبیة کافر، و اخذ الاجر علی ذالك حرام و اما من یتعلم النجوم لیعرف قدر سیرا لکواکب و بعده و احوا من التربیع و الکسف و غیرھما فانه لاباس به﴾ کتاب منتھی المطلب میں ہے کہ تنجیم حرا ہے، اس طرح اس اعتقاد سے علم نجوم سیکھنا کہ یہ تاثیر رکھتا ہے یا نفع اور نقصان کے لئے اثر اند ہونے میں اسے کوئی دخل حاصل ہے حرام ہے جو شخص بھی یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ نفسانی اور طبعی حرکتو اور کرداروں کا فلکی چالوں اور کواکب کو منازل سے اتصال ہے تو ایسا شخص کافر ہے، اس (کے سیکھے سکھانے اور اس کے ذریعے خبریں بتانے) پر اجرت لینا حرام ہے، لیکن جو شخص اس لئے علم نجو سیکھے کہ وہ کواکب کے چلنے کی مقدار اور ان کے حالات جان لے کہ کب یہ اکٹھے ہوتے ہیں ا

کب کسوف وغیرہ ہوتا ہے تو مقصد کے لئے اتنا سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

(مراۃ العقول، ج ۴، ص ۴۰۹، طبع قدیم ایران)

اس کے بعد سرکار علامہ مجلسیؒ نے ص ۴۱۰ پر حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک واقعہ، نہج البلاغہ سے نقل کیا ہے جس میں آپؑ نے ایک منجم کے مشورے کو مسترد کر دیا اور فرمایا: ﴿**فمن صدقك بهذا فقد كذب القرآن و استغنى عن الاستعانة بالله ثم اقبل على الناس فقال ايها الناس اياكم و تعلم النجوم الا ما يهتدى به فى بر او بحر فانها تدعوا الى الكهانة المنجم كا الكاهن و الكاهن كالساحر و الساحر كالكافر و الكافر فى النار ......**﴾

جس نے تیری تصدیق کی اس نے قرآن کی تکذیب کی اور اللہ کی استعانت سے لاپرواہ ہوگیا، پھر حضرت علیؑ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے لوگو، علم نجوم سیکھنے سے بچو، مگر اتنا جس سے خشکی اور سمندر میں راہ تلاش کی جاسکے، اس لئے کہ اس کا نتیجہ کہانت ہے، منجم کاہن کی طرح کاہن کی مانند ہے اور کاہن جادوگر کی طرح ہے اور جادوگر کافر کی مثل ہے اور کافر دوزخی ہے"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے سائل کے سوال کہ: ﴿**سالت ابا عبد الله عليه السلام عن النجوم احق هى؟**﴾ کے جواب میں فرمایا: نعم، (کیا علم نجوم حق ہے؟) فرمایا: ہاں (حق) ہے۔ مؤلف کی پیش کردہ اس روایت کی شرح میں علامہ باقر مجلسیؒ نے لکھا ہے: ﴿**السابع والخمسمائة ضعيف قوله احق هى فقال نعم يدل على ان النجوم علامات للكائنات يعرفها اهله و لا يدل على انه يجوز تعليمه و تعلمه و استخراج الاحكام منه لساير الخلق**﴾، یہ حدیث نمبر ۵۰۷ ضعیف ہے۔ سائل کا کہنا، کیا یہ حق ہے؟ آپ کا ارشاد ہاں یعنی حق ہے، یہ دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ نجوم کائنات کی علامات ہیں جنہیں ان کے جاننے والے جانتے ہیں، آپ کا اثبات میں جواب اس کے تعلیم و تعلّم اور سب مخلوق کے لیے اس سے احکام اخذ کرنے کے جواز پر دلالت نہیں کرتا۔ (مراۃ العقول ج ۴، ص ۴۰۸)

نہیں معلوم کہ مؤلف نے کون سے الفاظ سے اخذ کیا ہے کہ ہندوستانی پنڈتوں نے خاندان ائمہ اہل بیت ﷺ سے علم میں بڑھے ہوئے ہیں نعوذ باللّٰہ من سوء الفهم والتعنت یہ اس لئے اس کی اپنی غباوت اور جہالت کا شاخسانہ ہے، اس کے دل میں بغض اہل بیتؓ کی پلید بھری ہوئی ہے اسی لئے اس قسم کے نازیبا الفاظ استعمال کر رہا ہے اس کے اپنے آباء و اجداد مجبور سے ہندومت چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے، یہ اپنے ہندو اسلاف کا بدلہ اصل مسلمانوں سے لینا چاہتا ہے، اس لئے اب یہود و ہنود کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ان کا آلۂ کار بن کر اسلام او مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف ہے۔ اس کا خفیہ تعلق اب بھی تلمود اور گرنتھ سے ہے اسی لئے قرآن اور حاملین قرآن کے خلاف زہر افشانی میں دن رات ایک کر دیئے ہیں۔

باب ۹

رجعت کا مفہوم اور اس کی حقیقت

مؤلف نے اپنے نام نہاد خطباتِ جیل کے ص ۲۳۰، ۲۳۱ پر ان الفاظ کا عنوان قائم کیا ہے: ''شیعہ کا عقیدہ رجعت اور بارھویں امام کا تعارف:...... شیعہ کا عقیدہ رجعت''

ابتداء میں کہتا ہے کہ ''موت اور قیامت کے دوران صرف عالم برزخ ہی ہے اور اس کے علاوہ دوسرا عالم نہیں ہے اور پھر خاص طور پر موت کے بعد کسی شخص کا قیامت سے قبل دوبارہ زندہ ہوکر پھر دوبارہ فوت ہوکر عالم برزخ کی طرف لوٹ جانا ہرگز ممکن نہیں ہے ....''

بعد ازاں ''شیعہ کے عقیدہ رجعت کا تعارف'' عنوان کے تحت اس بارے میں، ''احسن الفوائد فی شرح العقائد'' سے ایک اقتباس پیش کیا ہے جو یہ ہے: ''یعنی آیات متکاثرہ اخبار متواترہ اور بہت سے شیعہ علماء متقدمین و متاخرین کے کلام سے تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ اصل رجعت برحق ہے اس میں ہرگز کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اور اس کا منکر زمرہ اسلام میں سے خارج ہے کیونکہ یہ عقیدہ ضروریات مذہب امامیہ میں سے ہے۔ صراط و میزان وغیرہ امور اخرویہ جن پر ایمان رکھنا واجب ہے کے متعلق جو روایات وارد ہیں وہ ان روایات سے جو عقیدہ رجعت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں نہ سند کے لحاظ سے زیادہ معتبر ہیں نہ عدد کے لحاظ سے زیادہ ہیں اور نہ دلالت کے لحاظ سے واضح ہیں۔ رجعت کی بعض خصوصیات کا اختلاف اصل رجعت کی حقانیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتا جس طرح کے صراط و میزان وغیرہ امور کی خصوصیات میں اختلاف موجود ہے۔ لہٰذا اصل رجعت پر ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اس میں بعض مخلص مومن اور بعض خالص کافر دوبارہ زندہ ہوں گے اور اس کی باقی تفصیلات کو ائمہ اطہار کے سپرد کرو۔ احسن الفوائد فی شرح العقائد شیخ ابوجعفر بن علی بن حسین ص ۳۲۲''''... تحفۃ العوام میں ہے اور ایمان لانا رجعت پر بھی واجب ہے یعنی جب امام مہدی ظہور و خروج فرمائیں اس وقت مومن خالص اور کافر و منافق مخصوص زندہ ہوں گے اور

ہر ایک اپنی داد و انصاف کو پہنچے گا اور ظالم سزا و تعزیر پائے گا (تحفۃ العوام ص ۵) .... شیعہ کی مستند کتب عقائد کے ان دو سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہے کہ جو لوگ عقیدہ رجعت کے منکر ہیں وہ زمرہ اسلام سے خارج ہیں اب تحریر کرنے کی بات یہ ہے کہ ہم سب مسلمان تو قطعاً قطعاً رجعت کے عقیدہ سے انکاری ہیں اور ہمارے آباء و اجداد نے تو شاید اس عقیدہ کا زندگی بھر نام بھی نہ سنا ہوگا ...'' (خطبات جیل ص ۲۳۲، ۲۳۳)

<u>الجواب</u>:۔ جیسا کہ مؤلف نے اپنے ہفوات جہل میں حوالہ دیا ہے کہ شیعہ رجعت پر ایمان رکھتے ہیں، قرآن و حدیث سے اس عقیدہ کے حق میں بے شمار دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں، اس کی حقیقت یہی ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بعد سے رجعت کا عمل شروع ہوگا۔ بڑے بڑے ظالمین کو دوبارہ اس دنیا میں لایا جائے گا تا کہ وہ اپنی سزا کو پہنچ جائیں اس طرح بڑے بڑے مظلومین اور مؤمنین کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا تا کہ ان کی دادرسی اسی دنیا میں ہو جائے۔ یہ عقیدہ قرآن و حدیث کی بناء پر صرف شیعہ مؤمنین کا ہی نہیں ہے بلکہ پہلی امتیں بھی اس عقیدہ کی قائل رہی ہیں، چنانچہ بائبل کی کتاب دانیال کے آخر میں ہے کہ جب آسمانی بادشاہت کے قیام کا وقت آئے گا تب بڑے بڑے نیک لوگ اور بڑے بڑے بدکار افراد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، تا کہ اس دنیا میں اپنا بدلہ لیں اسی طرح انجیل کے مکاشفۂ یوحنا کے غالباً باب ۱۹ میں ہے کہ جب آرمیگڈون یعنی آخری عالمی جنگ کے دوران میں مسیح علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو پہلی قیامت قائم ہوگی، بعض مخصوص نیکوکار افراد اور انتہائی ظالم و بدکار اشخاص کو دوبارہ زندہ کرکے دنیا میں لایا جائے گا، تا کہ بڑی قیامت کا ایک نمونہ اسی دنیا میں دکھلا دیا جائے، اگرچہ متقدمین یہود رجعت پر الہامی کتب میں بیان شدہ حقیقت کے مطابق ایمان رکھتے تھے، لیکن بعد میں بعض متاخرین یہود نے اسلام دشمنی اور ذاتی اغراض کی بناء پر رجعت سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالکریم شہرستانی یہود کے تذکرے میں ان کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ....

﴿ومسائلهم تدور على جوٰاز النسخ و منعه و على التشبيه و نقبه و القول بالقدر و الجبر و تجويز الرجعة واستحالتها... و اما جواز الرجعة فانما وقع لهم من امرين

احدهما حدیث عزیر علیہ السلام اذ اماته الله مائة عام ثم بعثه و الثانی حدیث ھارون علیه السلام .....﴾ان یہود کے مسائل جواز اور عدم جواز نسخ، اثبات تشبیہ اور اس کی نفی، قدر و جبر کے اثبات و نفی اور رجعت کے جواز اور محال ہونے کے ارد گرد گردش کرتے ہیں ..... جواز رجعت کا قول دو وجہ سے سامنے آیا ہے۔ ایک تو حدیث عزیر علیہ السلام ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں سو سال کے لئے موت دے دی، پھر انہیں زندہ کر دیا، دوسرا واقعہ ہارون علیہ السلام کا ہے..... ''(الملل والنحل ج ۱، ص ۲۱۱، ۲۱۲، طبع قاہرہ)

شاید عبدالکریم شہرستانی نے بائبل کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ورنہ اگر کتاب دانیال دیکھ لیتے تو اپنے خیال سے صرف عزیرؑ اور ہارونؑ کے واقعات کو استدلال کے طور پر پیش نہ کرتے، بلکہ ان واقعات کو اس اصل کی تائید میں دلیل بناتے۔

مؤلف کی مغالطہ آفرینی اور خیانت

مؤلف نے شیعہ دشمنی میں اندھے ہو کر اپنے تعصب اور عناد کے سبب علمی خیانت سے کام لیا ہے کتاب ''احسن الفوائد فی شرح العقائد'' کی عبارت میں الفاظ ''اس (رجعت) کا منکر زمرہ ایمان سے خارج ہے'' سے لفظ ''ایمان'' کو حذف کر کے اپنی طرف سے لفظ ''اسلام'' لکھ کر دیدہ دانستہ اپنی بددیانتی کا ثبوت پیش کیا ہے جبکہ احسن الفوائد کے فاضل مصنف حضرت العلام مدظلہ نے سرکار علامہ سید عبداللہ شبرؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''حق الیقین'' سے عقیدہ رجعت کے متعلق عربی عبارت نقل کر کے اس کا اردو ترجمہ درج کیا ہے جس میں ''زمرہ ایمان'' کے الفاظ موجود ہیں لیجئے ہم احسن الفوائد ص ۳۲۱، ۳۲۲ کی اصل عربی مع اردو عبارت نقل کئے دیتے ہیں:

''علامہ سید عبداللہ شبر (جنہیں مجلسی ثانی کہا جاتا ہے) اپنی کتاب حق الیقین عربی جلد ثانی میں مکمل اڑتالیس صفحات تک مباحث رجعت لکھنے کے بعد بعنوان ''تنبیہ'' رقمطراز ہیں:

﴿**قد عرفت من الآیات المتکاثرۃ والاخبار المتواترۃ و کلام جملة من المتقدمین والمتاخرین من شیعة الائمة الطاهرین ان اصلا لرجعة حق لا ریب فیه و لا شبة تعتریه و منکرها خارج من ربقة المومنین فانها من ضروریات مذهب الائمة**

الطاہرین.....﴾

''یعنی آیات متکاثرہ، اخبار متواترہ اور بہت سے شیعہ علماء متقدمین و متاخرین کے کلام سے تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ اصل رجعت برحق ہے اس میں ہرگز کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور اس کا منکر زمرہ ایمان سے خارج ہے کیونکہ یہ عقیدہ ضروریات مذہب امامیہ میں سے ہے.....''

محترم قارئین! یہ تھی اصل عبارت جسے مؤلف نے قطع و برید کر کے پیش کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ اب آپ ہی اندازہ لگائیں کہ کیا اس سے بڑھ کر بھی دھوکہ دہی اور فریب کاری ہوسکتی ہے؟ اور پھر اسی عبارت کو مدار استدلال ٹھہرا کر اس سے غلط نتیجہ اخذ کر کے شیعیانِ حیدر کرارؑ کے خلاف زبان درازی کرنا حد درجہ بے ایمانی اور محض اموی ذہنیت اور سوچ وفکر کا مظہر ہے اعاذنا اللّٰہ ذلک۔

اثبات رجعت کے دلائل

صحابہ کرامؓ میں سے ایک معروف اور اہم شخصیت اس عقیدہ کی قائل تھی، چونکہ سپاہِ صحابہ اور اس کے جرنیل اکثر صحابہ صحابہ کی رٹ لگائے رکھتے ہیں اور **اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم** (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، تم ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے) کے عموم سے استدلال کرتے ہیں اس لئے ان کے زبان بند کرنے کیلئے ایک صحابی کا حوالہ ضروری اور زیادہ مؤثر ہوسکتا ہے یہ معروف صحابی حضرت ابوالطفیلؓ ہیں، علامہ ابن قتیبہ الدینوری ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں: ﴿**ھو ابو الطفیل عامر بن واثلة رای النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم و کان آخر من رآہ و مات بعد سنة مائة و شھد مع علی المشاھد کلھا و کان مع المختار صاحب رایته و کان یومن بالرجعة**﴾ حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، ان میں سب سے آخر میں وفات پانے والے ہیں، آپ ۱۰۰ ہجری کے بعد فوت ہوئے، تمام جنگوں میں حضرت علیؑ کے ساتھ شریک ہوئے، مختار کے ساتھ اس کے علمبردار تھے، آپ

رجعت پر ایمان رکھتے تھے۔" (کتاب المعارف، ص ۱۴۹، مطبوعہ مصر)

حضرت عامر بن واثلہ ابوالطفیل رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں، صحابیت کا مرتبہ اور شرف انہیں بھی دیگر صحابہؓ کی مانند حاصل ہے، بحیثیت صحابی اسی اعزاز و اکرام کے مستحق ہیں جس کے دیگر صحابی استحقاق رکھتے ہیں، لہٰذا ان کا عقیدہ رجعت بے دلیل اور محض اجتہاد نہیں ہے، یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے کہ جس میں قیاس سے کوئی ایمان وعقیدہ قائم کرلیا جائے لازماً اس سلسلے میں انہوں نے قرآن کریم سے استنباط کیا ہوگا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہوگا، تب ہی رجعت پر ایمان رکھتے تھے اسے اجتہادی خطا قرار نہیں دیا جاسکتا "**اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم**" کے مطابق اس صحابی کا یہ عقیدہ بھی عین ایمان اور اسلام ہے جو ان کی اقتداء میں اس ایمان وعقیدے کا حامل ہو وہ بھی خالص مومن اور ہدایت یافتہ ہے، اس عقیدے کو قرآن و سنت کے منافی قرار دینا بالکل غلط اور حماقت ہے، بلکہ صحابی کی توہین اور گستاخی ہے، اگر اس صحابی پر شیعہ ہونے کا الزام لگا کر اسکے ایمان وعقیدے کو گمراہی قرار دوگے تو **اصحابی کالنجوم** کا نظریہ اپنے عموم پر باقی نہیں رہ سکتا، اگر ایک صحابی گمراہ ہوسکتا ہے تو دیگر بے شمار بھی ہوسکتے ہیں، جب سپاہ صحابہ ہی صحابہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوجائے تو پھر ان صحابہؓ کا دفاع کون کرے گا؟ "سنت" کے علمبرداروں نے اس صحابی کو شیعہ قرار دیا ہے اس کے ایمان بالرجعت کا ذکر کیا، لیکن اس سے آگے بڑھ کر کوئی فتویٰ داغنے کی ہمت نہ کرسکے لیکن اب سپاہ صحابہ جو جدید اسلحہ سے لیس ہے سے یہ توقع ہے شاید فائر کھول دے، اس جلیل القدر صحابی رسول کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ ذہبی لکھتے ہیں ﴿**اسم ابی الطفیل عامر بن واثلة بن عبد اللہ بن عمر و اللیثی الکتانی الحجازی الشیعی، کان من شیعة الامام علی**﴾، حضرت ابوطفیل کا نام عامر بن واثلہ بن عبداللہ بن عمر لیثی کنانی حجازی ہے، جو شیعی ہے، حضرت ابوطفیلؓ امام علیؑ کے شیعوں میں سے تھا۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۴۶۸ طبع بیروت، ھدی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۴۱۰ طبع بولاق مصر)

یہ شیعہ صحابی تھے، حضرت علی علیہ السلام کو دیگر تمام صحابہ سے افضل قرار دیتے تھے، رجعت پر ایمان رکھتے تھے، یہ سب کچھ اپنی طرف سے خود ساختہ سبائی تعلیم کا اثر نہ تھا بلکہ خلیفہ

راشد حضرت علیؑ کی تعلیم اور صحبت کا اثر تھا، لہٰذا شیعہ کا یہ عقیدہ قرآن وسنت کے عین مطابق ہے۔

محقق اہلسنت کا اقرار رجعت

جب امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا ظہور ہوگا تو اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ بعض دیگر انبیاء کرامؑ اور آئمہ اہل بیتؑ کے علاوہ دوسرے کامل الایمان لوگوں کو بھی دوبارہ اس دنیا میں زندہ کیا جائے گا تا کہ وہ امام مہدیؑ کی زیارت سے شرف یاب اور ان کی معیت میں دشمنان خدا سے انتقام لے سکیں اور یہ عقیدہ صرف اہل تشیع کا ہی نہیں بلکہ اہل سنت کے جید اور مستند علما نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کے معروف شاگرد ملا محمد معین السندی اس عقیدے کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿ولقد اخبرت من بعض اهل العلم انه قال من مات على الحب الصادق لامام العصر عليه السلام ولم يدرك او انه، اذن الله سبحانه ان يحييه فيفوز فوزاً عظيماً فى حضوره من بخوره فى نوره وهذه هى الرجعة فى عهده عليه السلام ... ﴾

بعض اہل علم کی جانب سے مجھے یہ خبر ملی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جو شخص امام زمانہؑ کی سچی محبت پر مرے گا اور آپؑ کا ظہور اس کی زندگی میں نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ کریں گے تا کہ وہ آپؑ کے حضور میں آپ کے نور کے سمندر میں سے عظیم کامیابی حاصل کرے، امام مہدیؑ کے عصر میں رجعت اسی کو کہا جاتا ہے ... (دراسات اللبیب ص ۲۱۹، ۲۲۰ طبع قدیم لاہور)

اہل سنت میں سے منصف محقق نے بھی رجعت کی حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس کے بعد بھی اسے بعید از عقل ونقل کہنے والے اپنی عقل کا معائنہ کرائیں، شاید ان کے سر میں مغز کی جگہ بھوسہ بھرا ہوا ہو......!

امام مہدی علیہ السلام کی ولادت باسعادت اور غیبت کا انکار

مؤلف نے بعنوان ''بارہویں امام غائب کی پیدائش وغیبت کا عجیب قصہ خاندان والوں کا ان کی پیدائش ہی سے انکار'' ذیل میں مولوی منظور احمد نعمانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''اثنا عشریہ کے نزدیک جو بارہ امام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نامزد ہیں اور جن پر ایمان لانا ضروری اور شرط نجات ہے ان میں گیارھویں امام حسن عسکریؒ بن علی ہیں جو اصول کافی کے بیان کے مطابق رمضان ۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۶۰ھ میں صرف اٹھائیس سال کی عمر میں فوت ہوئے ان کے حقیقی بھائی جعفر بن علی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ یہ حسن عسکری لاولد فوت ہوئے اور حکومت کے ذمہ داروں کو بھی تحقیق و تفتیش سے یہی ثابت ہوا اس بناء پر ان کا ترکہ شرعی قانون کے مطابق ان کے بھائی اور دوسرے موجود وارثوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے یہ بھی اصول کافی ہی کی روایات میں بیان کیا گیا ہے۔ (اصول کافی ص ۲۰۶) اثنا عشریہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تیسرے امام حسین علیہ السلام کے بعد امام کا بیٹا ہی امام ہوتا، اصول کافی میں ایک مستقل باب ہے **باب اثبات الامامة فی الاعقاب** (ص ۱۷۵) اس میں ائمہ معصومین کی متعدد روایات ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ امام کا بیٹا ہی امام ہوتا ہے کوئی دوسرا عزیز تر قریب بھی نہیں ہوسکتا انہی روایات پر اس عقیدہ کی بنیاد ہے اس عقیدہ کی وجہ سے عوام اثنا عشریہ کو یہ مشکل پیش آئی کہ گیارھویں امام حسن عسکری کے بعد ''امامت'' کا سلسلہ کیسے چلے اور بارھواں اور آخری امام کس کو قرار دیا جائے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے یہ دعویٰ کیا گیا اور مشہور کیا گیا کہ امام حسن عسکری کی وفات سے چار یا پانچ سال پہلے (ایک روایت کے مطابق ۲۵۵ھ میں اور دوسری روایت کے مطابق ۲۵۶ھ میں) ان کے ایک صاحبزادے ان کی ایک کنیز کے بطن سے پیدا ہوئے تھے جن کو عام نظروں سے چھپا کے رکھا جاتا تھا اس لئے کوئی ان کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔'' (خطبات جیل ص ۲۳۵، ۲۳۶)

<u>الجواب</u>:۔ ہمارے مخاطب مؤلف اور ان کے اسلاف اس امر میں ہمیشہ شک و تردد میں مبتلا رہے ہیں کہ اتنی اہم شخصیت جس نے ''روئے زمین پر اسلامی عادلانہ نظام حکومت قائم کرنا ہو اس کی ولادت غیر معروف طریقے سے کیونکر ہو سکتی ہے اور بعد ازاں اتنے طویل عرصے تک انسانوں کی نظروں سے کس طرح اوجھل رہ سکتی ہے، آپؑ کے قریبی رشتہ داروں نے بھی آپ کی ولادت کا انکار کیا ہے، حتیٰ کہ آپ کے چچا جعفر اور خاندان کے دوسرے افراد نے کہا کہ امام حسن عسکری علیہ السلام لاولد فوت ہوئے ہیں، حکومتی تحقیق سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ حسن عسکری علیہ السلام

نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔(الی آخر الهفوات الضالة)

حضرت امام مہدیؑ اور انبیاء کرامؑ کی ولادت میں مماثلت

جہاں تک غیر معروف طریقے سے ایسی اہم شخصیت کی ولادت اور عام لوگوں حتیٰ قریبی رشتہ داروں سے اس امر کے مخفی رہنے کا تعلق ہے تو مؤلف اور اس کے اسلاف پر ظاہر ہ چاہئے کہ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے بلکہ ظالم بادشاہوں کی بادشاہی کے خاتمہ کے لئے جو نبیؑ بھ مبعوث ہوا اس کی ولادت اسی طرح مخفی طریقے سے ہوئی، نمرود کو اس کے نجومیوں نے اس ۔ ایک خواب کی بناء پر پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اسی سال تیرے ملک میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ۔ جس کا نام ابراہیم ہوگا وہ فلاں مہینے میں تیرے خود ساختہ سرکاری مذہب اور تیری ملوکیت کا خاتمہ دے گا، چنانچہ نمرود نے احتیاطی تدابیر کے طور پر اس سال پیدا ہونے والے ہر بچے کو ذبح کرد۔ کا حکم دیا اور تمام حکومتی وسائل اس مقصد کے لئے استعمال کیے، مردوں کو عورتوں سے الگ رکھ بندوبست کیا، باوجود اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ حاملہ ہوگئیں، لیکن ان کا حمل تعالیٰ کی قدرت سے حکومت کی مقرر کردہ دائیوں پر ظاہر نہ ہو سکا، اسی طرح جد الانبیاء حضر ابراہیم علیہ السلام نے بھی ایک ظالم اور بڑے زور آور بادشاہ کی سلطنت کو منہدم کرنا تھا جن پیشگوئی ہو چکی تھی چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کے لئے بھی اسی طرح کا خفیہ انتظام کیا جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بعد ازاں ہوا، پیدائش بھی مخفی طریقے سے ہوئی کسی کو کا کان خبر نہ ہو سکی۔ علامہ ابن اثیر الجزری نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات بیان کر ہوئے لکھا ہے:

﴿فلما دخلت السنة التی ذکروا جس نمرود الحبالی عنده الا ام ابراه فانه لم یعلم بحبلها لانه لم یظهر علیها اثره فذبح غلام ولد فی ذلك الوقت ف وجدت ام ابراهیم الطلق خرجت لیلا الی مغارة کانت قریبة منها فول ابراهیم .....﴾

جس سال کا ذکر نجومیوں نے کیا تھا جب وہ آ گیا تو نمرود نے تمام حاملہ خواتین کو ا

زیر نگرانی محبوس کر دیا لیکن ابراہیم علیہ السلام کی والدہ کو محبوس نہ کیا۔ اس لئے کہ اسے ان کے حمل کا علم ہی نہ ہو سکا اس سبب سے کہ ان پر حمل کی کوئی علامت ظاہر نہ تھی۔ چنانچہ اس وقت جتنے لڑکے پیدا ہوئے سب کو اس نمرود نے قتل کرا دیا جب ابراہیم علیہ السلام کی ماں کو درد زہ شروع ہوا تو وہ رات کے وقت ایک غار میں چلی گئی جو وہاں سے قریب تھی پس ابراہیم پیدا ہوئے...... **الی آخر القصہ**'' (کامل ابن اثیر ج ۱، ص ۵۴، طبع ادارہ الطباعۃ المنیریہ مصر)

نمرود کا خیال یہ تھا کہ اس طرح وہ بچہ دنیا میں آتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور وہ خود ہلاکت سے بچ جائے گا ظاہر میں نگاہیں متحیر تھیں اور حکم و مصالح الٰہیہ سے نا آشنا دنیا اپنا سر پیٹ رہی تھی لیکن کسی کو کیا خبر تھی کہ جس کی حفاظت خود خالق دو جہاں فرمائے اسے کون صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا ہے ع

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی غار میں کتم عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوئے آپ کی والدہ ماجدہ نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اپنی گود سے اتار کر انہیں غار میں لٹا دیا اور اکیلی گھر کی طرف واپس آ گئیں پھر چند روز کے بعد آپ دوبارہ اسی غار میں تشریف لائیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ آپ بالکل صحیح و سلامت ہیں۔ جب کچھ بڑے ہوئے تب انہیں غار سے گھر لائے گئے، اس وقت یہ خدشہ باقی نہ تھا کہ کوئی شخص انہیں پہچان لیتا کہ اسی سال کا مولود ہے جس سال نمرود نے فیملی پلاننگ کا حکم دیا تھا۔ اس کی تفصیل ملاحظہ کرنی ہو تو دیگر تفاسیر کے علاوہ تفسیر ابن کثیر دمشقی جلد دوم، تفسیر کبیر فخر الدین رازی جلد چہارم اور اسی طرح دیگر تفاسیر کا مطالعہ کریں لیکن جن لوگوں نے حماقت و جہالت کی موت مرنے کا عہد کر لیا ہو وہ مطالعہ کیوں کریں، حقائق سمجھنے کی زحمت کس لئے کریں؟

یہی حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ہے، فرعون نے بھی خواب دیکھا اور معبریوں نے اس کی تعبیر یہ دی کہ اس سال بنو اسرائیل میں وہ لڑکا پیدا ہوگا جو تیری حکومت ختم کر دے گا۔ نمرود کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے فرعون نے حکم جاری کر دیا کہ اس سال بنو اسرائیل کے

ہاں پیدا ہونے والا ہر بچہ ہلاک کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے حکومتی جاسوس مرد اور عورتیں ہر گھر میں جا کر عورتوں کے پیٹ کا معائنہ کرتی تھیں، جہاں حمل کا علم ہوتا وہاں کی نگرانی کر کے نومولود کو قتل کر دیتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ماں کے پیٹ میں بھی معائنہ کرنے والی جاسوس دائیوں سے مخفی رکھا، حافظ ابن کثیر دمشقی کے الفاظ درج ذیل ہیں:

﴿**فلما حملت ام موسیٰ به علیه السلام لم یظهر علیها فحایل الحمل کغیرها ولم تفطن لها الدایات**﴾ جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو ان کا حمل ہوا، تو ان کی ماں پر دیگر عورتوں کی مانند حمل کے آثار و علامات ظاہر نہیں ہوئیں، اور نہ ہی دائیوں کو ان کے حمل کا علم ہو سکا۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۳۸۰، البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۱، ص ۲۳۹، طبع جدید بیروت روح البیان للبروسی، ج ۶، ص ۳۸۲، طبع قسطنطنیہ)

اسی طرح نواب صدیق حسن خان سورۂ قصص کی آیت مبارکہ ﴿و اوحینا الی ام موسیٰ﴾ کی تفسیر میں رقمطراز ہیں کہ "جب موسیٰ ﷺ کی والدہ حاملہ ہوئیں تو ان پر حمل کے علامات ظاہر نہ ہوئے جیسے اور عورتوں پر حمل کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور نہ دایوں نے معلوم کیا لیکن جب انہوں نے موسیٰ ﷺ کو جنا تو ان کا دل تنگ ہوا تو اس کے دل میں یہ الہام ہوا او القا ہوا" (ترجمان القرآن للطائف البیان ج ۱۰ ص ۲۲۵ مطبع صدیقی لاہور)

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن شخصیات کو اللہ تعالیٰ نے آمریت اور ظالمانہ بادشاہتوں کے خاتمہ کے لئے پیدا کرنا ہوتا ہے، ان کی ولادت کو انتہائی مخفی رکھا جاتا ہے، نہ ہی ان کے رشتہ داروں کو ان کی ولادت کا علم ہوتا ہے نہ ہی حکمران ان کی ولادت سے باخبر ہو سکتے ہیں اس لئے کہ خاندانی، موروثی اور جمہوری ملوکیت ہی اللہ تعالیٰ کے عادلانہ نظام حکومت کی اصل مدمقابل ہے، اسے ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ مخفی طریقے سے اپنے نمائندے پیدا کرتا ہے، بعد ازاں ان کی پرورش بھی عجیب وغریب طریقے سے کرتا ہے، یہی روش سرکار مذہب کے دعویدار بادشاہوں کی ملوکیت کے خاتمے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنائی ہے، چونکہ اب بار پورے کرۂ ارض سے موروثی خاندانی اور جمہوری ملوکیت کا خاتمہ مقصود ہے اس لئے اس مقصد

کے لئے تیار کئے گئے دونوں الٰہی نمائندوں کی پیدائش اور غیبت میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بھی غیر معمولی طریقے سے ہوئی، پھر پرورش بھی ایسے ہی ہوئی۔ بعد میں غیبت (رفع سماوی) بھی بادشاہوں کے فرمانِ قتل کی وجہ سے واقع ہوئی۔ اس طرح امام مہدی علیہ السلام کی ولادت بھی نام نہاد اسلامی جمہوری ممالک کے جمہوری بادشاہوں کی ملوکیت ان سب سے بڑھ کر صیہونی و دجالی ملوکیت کو کرۂ ارض سے ختم کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ اس لئے اسے انتہائی مخفی رکھا گیا، حتیٰ کہ مخلصین مؤمنین کو بھی اس کا فوری علم نہ ہو سکا، یہ طریقۂ ولادت ہی ان حالات میں عین سنت الٰہیہ ہے، مشاہدہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لاشعوری طور پر صحیح بات کو غلط کہہ دیتے ہیں حالانکہ وہ غلط نہیں ہوتی بلکہ دراصل ان کا دماغ غلط ہوتا ہے کم فہم نہ پہلے سمجھے نہ آئندہ سمجھیں گے۔ بقول متنبی ؎

و کم من عائب قولاً صحیحا

و افتہ من الفهم السقیم

مؤلف اور اس کے مرشد پیر لدھیانوی نے اصول کافی کی ایک روایت کو اس سلسلے میں توڑ موڑ کر پیش کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے کہ امام مہدیؑ پیدا ہی نہیں ہوئے، اگر اس سلسلے میں خاندان رسالت مآبؐ کے بعض افراد مثلاً جعفر بن علی وغیرہ لوگوں نے اپنی بے علمی سے کوئی بات کہی ہو تو وہ دلیل نہیں بن سکتی، جعفر اور ان جیسے لوگ امام معصوم نہیں ہیں کہ ان کی رائے وزنی اور یقینی ہو، ان کی علمی و عملی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اور حکمرانوں کی منصوبہ بندی کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اپنے نمائندے کی ولادت کو مخفی رکھا، اصول کافی کی اس سلسلے میں ایک روایت یہ ہے:

﴿......فان الامر عند السلطان ان ابا محمد مضی ولم یخلف ولداً و قسم میراثهٔ و اخذه من لاحق لهٔ فیه و هو واعیا له یجولون لیس لا جدیجسر ان یتعرف الیهم ادینیلهم شیئا و اذا وقع الاسم وقع الطلب فاتقو الله و امسکوا عن ذالك﴾

"بادشاہ (حکومت) کے نزدیک معاملہ یہ ہے کہ ابو محمد حال میں وفات پا گئے ہیں کہ ان کی پیچھے کوئی اولاد نہیں ہے، اس نے آپ کی میراث تقسیم کر دی ہے، اور جن کا حق نہیں ہے انہوں نے لے لی

ہے، بادشاہ ان کی تلاش میں ہے، ہر طرف آدمی دوڑتے پھرتے ہیں کسی کو یہ جسارت نہیں کر
چاہئے کہ ان کے سامنے پہچانا جائے یا کوئی بات ان کے تک پہنچائے، (تم جو نام پوچھ رہے
جب نام ظاہر ہو گیا تو تلاش آسان ہو جائے گی چنانچہ اللہ سے ڈرو اور امام کا نام پوچھنے سے
رہو۔" (اصول کافی ص ۲۰۵، ۲۰۶، طبع لکھنو)

اس بارے میں ایک اور روایت سے بھی مفہوم اخذ کیا ہے، جو یہ ہے: ﴿**عن علی ب**
قیس عن بعض جلاوزة السواد قال شاهدت سیما انفاً بسر من رای وقد کسر با
الدار فخرج علیه و بیده طبرزین فقال له ما تصنع فی داری فقال سیما ان جعف
زعم ان اباك مضی ولا ولد له فان کانت دارك فقد انصرفت عنك فخرج عن الد
قال علی بن قیس فخرج علینا خادم من خدم الدار فسالته عن هذا الخبر فقال لی م
حدث بهذا فقلت له حدثنی بعض جلاوزة السواد فقال لی لا یکاد یخفی علی النا
شی﴾، "علی بن قیس نے ایک ملٹری پولیس والے سے روایت کیا ہے، اس نے کہا کہ میں نے ا
سر من رای میں سیما (جعفر کے غلام) کو دیکھا ہے کہ اس نے امام حسن عسکریؒ کے گھر کے درواز
کو توڑا، اندر سے ایک آدمی نکلا جس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑا تھا، اس نے اسے کہا: تم میرے
میں کیا کرتے ہو؟ سیما نے کہا: جعفر کا خیال ہے کہ آپ کے والد صاحب لاولد فوت ہو گئے
اگر یہ آپ کا گھر ہے تو میں واپس جاتا ہوں، پس وہ گھر سے نکل گیا، علی بن قیس کہتے ہیں کہ
کے فوراً ہی بعد گھر کے خادموں میں سے ایک خادم ہماری طرف نکل کر آیا۔ میں نے ان سے
خبر کے بارے میں سوال کیا اس نے پوچھا: تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے؟ میں نے کہا: ا
ملٹری پولیس والے نے بتایا ہے اس غلام نے کہا: عنقریب لوگوں پر کوئی شئے بھی مخفی نہیں رہے گ
(اصول کافی باب فی تسمیہ من راہ علیہ السلام ص ۲۰۶)

ان دونوں روایات سے تو مؤلف اور اس کے سرکاری مذہب کے حامل بادشاہو
کذب بیانی، فریب کاری اور دجالیت سامنے آتی ہے۔ ان روایات میں جعفر کے موقف کو
ثابت کیا گیا ہے، چونکہ وہ عباسی بادشاہوں کا آلہ کار بنا ہوا تھا اور شیعہ میں تفریق پیدا کر۔

منصوبہ پورا کرنا چاہتا تھا، نیز بادشاہ امام مہدی علیہ السلام کو قتل کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ فرعون و نمرود حضرت موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کو قتل کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ اس بارھویں امام کے ہاتھ سے ان ظالم بادشاہوں کا خاتمہ بہت پہلے سے مشہور چلا آ رہا تھا، لہٰذا وہ بھی ان کی پیدائش کی ٹوہ میں لگے ہوئے تھے، تا کہ ان کو پیدا ہونے کے بعد ٹھکانے لگا دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے منصوبے کو مکمل کرنا تھا لو کرہ الکافرون چنانچہ سنت الٰہیہ کے مطابق ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً﴾ امام علیہ السلام کے حمل و ولادت کو پوشیدہ رکھا گیا۔

مؤلف کو یہ امر تعجب میں ڈال رہا ہے کہ پانچ سال کا بچہ کس طرح تن تنہا سب تبرکات لے کر غائب ہو گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بچپن میں نبوت عطا کی، یحییٰ علیہ السلام کو اتیناہ الحکم صبیا (سورۂ مریم، آیت ۱۲) ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نمائندے بوڑھے یا بالغ ہی ہوں، کبھی بوڑھے اور جوان میدان چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے ہیں اور چھوٹے بچے اللہ کی نمائندگی کا حق ادا کرتے ہیں۔

جہاں تک غار میں روپوشی کے تمسخر کا تعلق ہے تو ملاں اور اس کے اخلاف نے حقیقت جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی، سرداب گھر کا تہہ خانہ تھا، کسی پہاڑ کا غار نہ تھا ایسے ہی سرداب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی چھپا کر رکھا گیا، حتیٰ کہ جب کچھ بڑے ہوئے تو ان کے والد انہیں گھر لے آئے۔ جیسا کہ چند اوراق پہلے گزر چکا ہے مزید تشفی کے لئے دوبارہ ملاحظہ فرمالیجیے۔ فخر الدین رازی میں دیکھ لیں، یہ امر محقق نہیں ہے کہ مستقل طور پر اب تک اسی سرداب میں مقیم اور مخفی ہیں، عیسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے حالات پر قیاس کر لیں۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے بھائی حضرت جعفر کا معاملہ برادران یوسف علیہ السلام جیسا ہے آخرکار انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور معافی طلب کی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں معاف کر دیا اسی طرح حضرت جعفر کو بعد میں اپنی غلطی تسلیم کرنی پڑی چنانچہ خود حضرت امام مہدی علیہ السلام نے اپنے نائب خاص حضرت محمد بن عثمان العمری کے ذریعے تحریراً ارشاد فرمایا: ﴿واما سبیل عمی جعفر و ولدہ فسبیل اخوۃ یوسف علیہ السلام﴾ ''لیکن میرے چچا جعفر اور ان کی اولاد کا

راستہ وہی ہے جو کہ برادران حضرت یوسفؑ کا راستہ تھا۔"

(بحار الانوار، ج ۵۳، ص ۱۸۰، کتاب الغیبۃ للشیخ الطوسیؒ، ص ۱۸۸، طبع نجف

یہی وجہ ہے کہ جعفر کذاب توبہ کرنے کے بعد جعفر تواب کے نام سے مشہور ہوئے جس کا

ذکر اہل سنت کے علماء نے بھی کیا ہے۔

مؤلف اور اس کے اسلاف کا خیال ہے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی کوئی اولاد ہی نہ تھی

شیعوں نے امام غائب کا ڈھکوسلا اپنے نظریۂ امامت کو جاری رکھنے کے لئے اپنے پاس سے گھڑا

ہے، یہ محض احمقانہ خیال ہے، اہل سنت کے محقق علماء بھی اسی نظریے کے قائل ہیں۔ چنانچہ مولوی

عبدالعزیز فرہاروی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿الرابع مذهب بعض اهل السنة من المكاشفين من انه حي و نقل عن الشيخ عبد الوهاب الشيخ الشعراني قال مولد المهدي ليلة نصف شعبان سنة خمس و خمسين و مائتين و هو باق الى ان يجتمع بعيسى عليه السلام هكذا اخبرني الشيخ العراقي و كان قد اجتمع به﴾

"چوتھا مذہب (امام مہدی کے بارے میں) بعض اہل سنت مکاشفین کا یہ ہے کہ وہ زندہ

ہیں شیخ عبد الوہاب شیخ شعرانی سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا امام مہدیؑ نصف شعبان کی رات

۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے وہ اب تک زندہ ہیں حتیٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اکٹھے ظاہر ہوں گے

مجھے اسی طرح شیخ عراقی نے خبر دی ہے، ان کی امام مہدیؑ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

(النبراس شرح شرح العقائد، ص ۲۴

ابن حجر مکی ہیتمی نے امام حسن عسکری علیہ السلام کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد ا

ابوالقاسم محمد الحجۃ کے بارے میں لکھا ہے: ﴿ولم يخلف غير ولده (ابي القاسم محمد الحجة) و عمره عند وفاة ابيه خمس سنين لكن آتاه الله فيها الحكمة و يسمى القاسم المنتظر قيل لانه ستر بالمدينة و غاب فلم يعرف اين ذهب﴾،

امام حسن عسکری نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی سوائے ایک بیٹے ابوالقاسم محمد

کے، ان کی عمر اپنے باپ کی وفات کے وقت پانچ سال تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی عمر میں حکمت عطا کی آپ کو قاسم (صحیح قائم ہے) اور المنتظر کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ آپ شہر میں مخفی اور روپوش ہو گئے چنانچہ کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کہاں چلے گئے۔"

(الصواعق المحرقہ، ص ۱۲۴، طبع قاہرہ)

دشمنوں اور ان کے آلۂ کار ملاؤں کو کیا پتہ چلتا کہ کہاں گئے ہیں؟ یہ تو چند خواص کو ہی علم ہو سکتا ہے چنانچہ وہ علم ہوا اور ان کے نمائندے عام مومنین تک ان کے احکام پہنچاتے رہے، حتیٰ کہ غیبت کبریٰ شروع ہوئی لیکن نگرانی پھر بھی آپ ہی کر رہے ہیں۔

حضرت امام مہدی علیہ السلام انبیاء کرام علیہم السلام کے تبرکات ساتھ لائیں گے

مؤلف لکھتا ہے کہ:

وہ تمام چیزوں اور سارے سامان جو حضرت علی سے منتقل ہو کر ہر امام کے پاس رہتے تھے اور آخر میں امام حسن عسکری کے پاس تھے مثلاً حضرت علی کا جمع کیا اور لکھا ہوا اصلی اور کامل قرآن اور اس کے علاوہ قدیم آسمانی کتابیں، تورات، انجیل، زبور اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے صحیفے اپنی اصل شکل میں اور مصحف فاطمہ اور الجفر اور الجامعہ والا بورا اور انبیاء سابقین کے معجزات، عصائے موسیٰ، قمیص آدم اور سلیمان علیہ السلام کی انگشتری وغیرہ کے متعلق روایات (اصول کافی میں ہیں)۔"

(خطبات جیل ص ۲۳۶)

الجواب:۔ آپ کو یہ بات بھی عجیب اور بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کے پاس سابقہ انبیاء کے تبرکات ہیں اور وہ تبرکات بھی ہیں جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھوڑے ہیں، اگر آپ نے قرآن کریم اور اپنے اسلاف کی مسلمہ روایات کا بغور مطالعہ کیا ہوتا تو اس طرح حماقت کا اظہار نہ کرتے اور نہ ہی خود فریبی میں مبتلا ہو کر اتنی بڑی حقیقت کے انکار کی نوبت آتی مگر افسوس ع

پڑیں پتھر سمجھ پہ ایسی وہ سمجھے تو کیا سمجھے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

''اور ان (بنی اسرائیل) سے ان کے نبی (حضرت شموئیل علیہ السلام) نے فرمایا کہ بے شک اس (طالوت) کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا اس میں تمہارے رب کی طرف سے سکون ہوگا اور وہ تبرکات ہوں گے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی آل نے چھوڑا اس تابوت کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے بے شک اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم مؤمن ہو۔'' (سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۸)

مفسر قرطبی اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اس تابوت کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر اتارا اور وہ آپ کے پاس رہا حتیٰ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچا پھر وہ بنی اسرائیل کے پاس رہا اور وہ اس تابوت کی برکت سے اپنے مقابل لڑنے والوں پر غالب آتے یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو وہ مغلوب ہوگئے اور قوم عمالقہ نے ان پر غالب آ کر ان سے تابوت چھین لیا۔

(الجامع لاحکام القرآن، ج ۲، ص ۲۴۷، طبع بیروت

حافظ ابن کثیر مذکورہ بالا آیات کے ذیل میں رقمطراز ہیں:

﴿و بقية مما ترك آل موسى يعني عصا موسى و عصا هارون ولوحين من التوراة و المن..... ثياب موسى و ثياب هارون و رضاض الالواح﴾

یعنی اس تابوت میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے عصا مبارک، توریہ کی تختیاں اور حضرت موسیٰ و ہارون کے کپڑے اور الواح کے اجزاء تھے۔

(تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۳۰۱، طبع مصر

چنانچہ ابن حجر ہیتمی مکی حضرت امام مہدی علیہ السلام کے حالات میں لکھتے ہیں:

﴿ و يستخرج ما اخذ من بيت المقدس و التابوت الذى فيه السكينة و مائدة بنى اسرائيل، و رضاضة الالواح و حلة آدم و عصى موسى و منبر سليمان، و قفيزين من المن الذى انزل الله عزوجل على بنى اسرائيل اشد بياضاً من اللبن ...... ﴾

''امام مہدیؑ وہ اشیاء نکالیں گے، جو بیت المقدس سے لی گئی تھیں وہ تابوت سکینہ کو بھی نکالیں گے۔ مائدہ بنی اسرائیل بھی ان کے پاس ہوگا، موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی جانے والی الواح کے اجزاء بھی ساتھ لائیں گے، آدم علیہ السلام کا لباس ساتھ لائیں گے، موسیٰ علیہ السلام کا عصا، سلیمانؑ کا منبر اور اس من کے دو قفیز، جو اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل پر نازل کیا تھا اور وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا ساتھ لائیں گے۔''

(القول المختصر فی علامات المھدی المنتظر ، ص۴۲، طبع الریاض، سعودی عرب)

علامہ ابن حجر مکی ہیتمی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

﴿ فيستخرج تابوت السكينة من غار الطاكية ﴾ ''حضرت امام مہدی علیہ السلام غار الطاکیہ سے تابوت سکینہ نکالیں گے۔'' (الفتاوی الحدیثیہ، ص۶۲، طبع بیروت)

مؤلف کے پاس اگر ذرا بھر عقل ہو تو اسے اعلانیہ توبہ کرنی چاہیئے یا ان علماء اہل سنت کو بھی تقریر و تحریر میں اعلانیہ کافر اور رافضی قرار دینا ہوگا ؏

شیخ مکتب کم سواد و کم نظر
از رموز علم و حکمت بے خبر

امام مہدیؑ کی والدہ کا امام حسن عسکریؑ کے ساتھ ازدواج کا قصہ

حضرت امام مہدی علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے بارے میں مؤلف نے اپنی حماقت اور جہالت سے حیرت استعجاب کا اظہار کیا ہے، اس کے خیال میں محترمہ نرجس خاتونؑ کے پورے واقعہ میں کوئی صداقت نہیں ہے، بلکہ ایک افسانہ ہے، جو شیعوں نے اپنی تسلی خاطر کے لئے گھڑ لیا ہے۔ (معاذ اللہ)

حالانکہ اگر اس بے علم ملاں نے اسلامی تاریخی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہوتا بالخصوص قصص الانبیاء اور قصص الاولیاء پر مشتمل کتب نیز دیگر تذکرے پڑھے ہوتے تو کبھی اس طرح واقعہ کو بعید از عقل اور افسانہ قرار نہ دیتا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کی والدہ مریم علیہا السلام کا واقعہ ان کی زندگی کی ابتداء سے انتہا تک، عجائب وغرائب کا مجموعہ ہے۔ اگر قرآن کریم میں اس کی بعض تفصیلات نہ ہوتیں، تو اس طرح کے خشک دماغ ملاں اس کو محض افسانہ قرار دیکر مسترد کر دیتے، اس وقت کے یہودی ناصبی ملاؤں نے بھی حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔

ملاں اگر ایسے واقعات کو افسانہ اور ڈرامہ قرار دیتا ہے تو اپنی متفق علیہ روایات کو بھی اسی طرح افسانہ کہنا پڑے گا جس کے بعد اپنے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے گی اور اپنے مذہب کو خلا میں تلاش کرنا پڑے گا۔ انہی میں سے بطور نمونہ صرف ایک روایت درج کی جاتی ہے ﴿**عن عائشه قالت لی قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم اریتك فی المنام ثلاث لیال یجی بك الملك فی سرقة من حریر فقال لی هذه امراتك فکشفت عن وجهك الثوب فاذا انت هی فقلت ان یکن هذا من عند الله یمضه**﴾، حضرت عائشہ سے مروی ہے کہتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم مجھے خواب میں تین رات تک دکھائی جاتی رہیں فرشتہ ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر تمہیں لاتا تھا پھر مجھے کہتا یہ آپ کی بیوی ہے۔ میں نے تیرے چہرے سے کپڑا اٹھایا، چنانچہ تم ہی وہ تھیں اس وقت میں نے کہا اگر یہ اللہ کی طرف سے ہے تو یہ کام ہو کر رہے گا۔" (مشکوۃ ص ۵۷۳، صحیح بخاری ج ۳، ص ۱۵۱، صحیح مسلم، ج ۲، ص ۲۸۵)

ملاں صاحب! اگر اس روایت پر تمہاری زبان سے تبصرہ کیا جائے تو پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جبرائیلؑ اور اللہ تعالیٰ کی اس کاروائی کو افسانہ ہی کہنا پڑے گا۔ بہت سے احمقانہ اعتراضات وارد کئے جاسکتے ہیں۔ شاید تمہاری ذہنیت سے کام لیتے ہوئے سلمان رشدی اور اس طرح کے لوگوں نے ایسی روایات کو پہلے بھی شان رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام میں بے ادبی اور گستاخی کے لئے استعمال کیا ہے لیکن انسانی ذہن اس طرح کے واقعات کو درست اور شان انبیاء

و اولیاء کے مطابق قرار دیتا ہے۔

امام مہدی علیہ السلام کے تین سو تیرہ خصوصی نمائندے

جاہل ملا نے امام محمد تقی علیہ السلام کا ایک ارشاد نقل کیا ہے کہ: ﴿ ... یجتمع مع الیه من اصحابه عدة اهل بدر ثلاثة مائة و ثلاثة رجلاً من اقاصی الارض فاذا اجتمعت له هذه العدة من اهل الاخلاص اظهر الله امره ﴾، آپ کے اصحاب میں سے اہل بدر کی تعداد کے برابر تین سو تیرہ شخص کرۂ ارض کے مختلف حصوں سے آپ کے پاس جمع ہو جائیں گے..... جب آپ کے مخلصین میں سے اتنی تعداد میں لوگ آپ کے پاس جمع ہو جائیں گے تو اللہ آپ کو ظاہر کر دے گا...۔“ (خطبات جیل، ص ۲۴۳، بحوالہ احتجاج طبری ۲۳۰)

الجواب:۔ اس روایت سے ملاں اپنی ناسمجھی، کم فہمی اور جہالت کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ امام کے مخلص شیعہ کی تعداد جب تین سو تیرہ ہو جائے گی تو ظہور ہوگا چونکہ ظہور ابھی تک نہیں ہوا لہٰذا ثابت ہوا کہ کسی زمانے میں بھی مدعیان تشیع میں اتنی تعداد کے مخلص شیعہ نہیں پائے گئے۔ بلکہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شیعہ غیر مخلص ہیں اور اوپر اوپر سے مدعی شیعیت ہیں حقیقی شیعہ نہیں ہیں۔ بے عقل و بے علم ملاؤں کو معلوم نہیں ہے کہ مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں ہوتا، اگر مفہوم مخالف کا اعتبار کیا جائے تو ”یقتلون الانبیاء بغیر حق“ کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ انبیاء کو قتل کرنے کا حق بھی ہو سکتا ہے ای الفریقین احق بالامن زیادہ حقدار تو مومن ہیں لیکن مفہوم مخالف کا اعتبار درست مان کر امن کا کچھ نہ کچھ حق کفار کا بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے لہٰذا مفہوم مخالف کا اعتبار حماقت اور جہالت ہے۔

محولا بالا روایت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آپ کے اصحاب صرف تین سو تیرہ ہوں گے باقی جھوٹ کے دعویدار ہوں گے، آپ کے مخلص شیعہ صرف تین سو تیرہ ہوں گے اور یہ تعداد بھی ظہور کے قریب ہی پوری ہوگی، مفہوم مخالف کا احمقانہ اعتبار کرنا قطعاً بے عقلی اور حماقت ہے، اس طرح استدلال تو بالکل ان پڑھ ہی کر سکتا ہے کوئی پڑھا لکھا سمجھدار آدمی نہیں کر سکتا۔

اس روایت کے الفاظ ”من اصحابه“ اور ”من اهل الاخلاص“ میں من تبعیض کے لئے ہے یعنی اصحاب اور مخلص شیعہ تو لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ہوں گے، لیکن یہ منتخب افراد

اعلیٰ درجہ کے عالم اور متقی آپؑ کے خصوصی نمائندے ہوں گے جو عالمی اسلامی حکومت میں آپ کی طرف سے نمائندہ اور گورنر مقرر ہوں گے۔ ملاں عقل سے کام لاتے ہوئے بتائیں کیا تمام صحابی مرتبہ میں برابر تھے؟ تم نے بھی تو سابقین مہاجرین، بدریین، انصار، صلح حدیبیہ تک دائرۂ اسلام میں آنے والے، پھر فتح مکہ کے وقت آنے والے اور اس کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کے مراتب اور طبقات بنا رکھے ہیں۔ اگر ملا اور اس کے پیروکاروں میں سوجھ بوجھ کی رمق باقی ہے تو اب پشیمان ہو کر توبہ کرنی چاہئے لیکن افسوس انہوں نے عقل سے کام نہ لینے کی قسم اٹھا رکھی ہے، وہ یہ نہیں سوچتے کہ آخر دجال اور سفیانی سے برسرِ پیکار ہو کر اس کے بڑے لشکر کو شکست کون دے گا؟ امام مہدیؑ کی قیادت میں ان کا عظیم لشکر ہی تو ہوگا، جو مخلص شیعوں پر مشتمل ہوگا، ناصبی ملاں اور ان کے اتباع تو سفیانی اموی اور دجال کا ساتھ دیں گے جیسا کہ اب موجودہ عالمی صورت حال سے معلوم ہو رہا ہے۔

رسول اللہؐ اور حضرت علیؑ امام مہدی کی بیعت کریں گے؟

مؤلف کا قائم کردہ عنوان: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؑ امام مہدیؑ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ کے تحت لکھا ہے کہ علامہ باقر مجلسی نے اپنے کتاب ''حق الیقین'' میں امام باقر سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ﴿چوں قائم آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیرون اید خدا اور ایاری کند بملائیکہ و اول کسے کہ با او بیعت کند محمد باشد بعد ازاں علی﴾ (حق الیقین مطبع ایران ص ۱۳۹) ''جب قائم آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (یعنی مہدی) ظاہر ہونگے تو خدا فرشتوں کے ذریعہ ان کی مدد کرے گا اور سب سے پہلے ان سے بیعت کرنے والے محمد ہوں گے اور آپ کے بعد دوسرے نمبر پر علی ان سے بیعت کریں گے۔'' (خطبات جیل ص ۲۶۶)

<u>الجواب</u>:۔ جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے تو عرض ہے کہ اس نوع کی تمام روایات کمزور درجے کی ہیں ان کے راوی مجروح اور ضعیف ہیں اس لئے ان سے استدلال کرنا قرین انصاف نہیں ہے، لیکن قابل وضاحت امر یہ ہے کہ مؤلف نے اپنی روایتی حماقت سے کام لیتے ہوئے اس

روایت سے بھی غلط استدلال کیا ہے اس کے خیال میں اس طرح امام مہدیؑ رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؑ سے بھی افضل قرار پاتے ہیں حالانکہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ یہ امر تو احمق اور اس کے ہم مسلک لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ امام مہدی علیہ السلام کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے نیز آپ کی فوج میں شامل ہو کر دجال کو قتل کریں گے کیا مؤلف اور اس کے ہم مسلک لوگوں نے کبھی ان روایات سے یہ استدلال کیا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں اس لئے کہ امامت و قیادت امام مہدیؑ کے ہاتھ میں ہوگی اور عیسیٰ علیہ السلام ان کے معاون ہوں گے۔ اگر نہیں کیا اور یقیناً نہیں کیا تو اس نوع کی شیعہ روایات سے اس طرح کا استدلال کرنا اور غلط نتیجہ اخذ کر کے شیعیان حیدر کرارؑ کو مورد الزام ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے؟

مبایعت کا معنی باہمی دیگر معاہدہ ہوتا ہے امام نووی نے شرح مسلم ص ۱۲۵ مطبوعہ لکھنؤ میں لکھا ہے کہ: ﴿المراد بالمبایعة المعاهدة﴾ یعنی مبایعت سے مراد آپس میں معاہدہ اور عہد و پیمان کرنا ہے۔ (کذافی مفردات امام راغب ص ۵۹)

بیعت رضوان والی آیت مبارکہ میں ''اذ یبایعونك'' سے جو بیعت مراد ہے وہ تعاون اور موافقت کا عہد کرنا ہے کیونکہ اسلام لانے کی بیعت تو وہ پہلے کر ہی چکے تھے لہٰذا یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں صحابہؓ سے تعاون کا مقصد جنگ کے دوران فرار کی راہ اختیار نہ کرنے کا عہد و پیمان ہی ہے اس لئے علامہ مجلسیؒ کی اس روایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضور اکرم ﷺ اور حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام جناب امام مہدی علیہ السلام سے مفضول قرار پاتے ہیں بلکہ اس بیعت کا مطلب حضرت امام مہدی علیہ السلام سے موافقت اور تعاون کا اظہار ہے۔ لہٰذا یہی معنی متبادر الی الذہن اور اقرب الی الفہم کے ہیں علاوہ بریں مبایعت باب ''مفاعلۃ'' میں سے ہے جس میں دو افراد کی فعل میں مشارکت بیان ہوتی ہے ان میں سے ہر ایک فاعل بھی ہوتا ہے اور مفعول بھی، اگرچہ ظاہری طور پر ایک فاعل اور دوسرا مفعول کی صورت میں آتا ہے یہ مبایعت چونکہ اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان ہوتی ہے لہٰذا اگر ظاہری حیثیت سے فاعل ادنیٰ ہو تو اس کا معنی بیعت کرنا ہوتا ہے اور اگر فاعل اعلیٰ ہو تو اس کا معنی بیعت لینا ہوتا ہے یہاں بھی یہی صورت حال ہے کہ حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ و

التسلیم اور مولائے کائنات علی المرتضیٰؑ، اعلیٰ ہیں اور حضرت امام مہدیؑ ادنیٰ، لہٰذا ادنیٰ کا اعلیٰ سے بیعت لینا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

علامہ باقر مجلسیؒ نے یہ روایت محمد بن ابراہیمؒ کی کتاب ''الغیبۃ'' ص۲۳۴ سے نقل کی ہے جو سند کے اعتبار سے انتہائی ضعیف اور کمزور ہے آیئے دیکھتے ہیں کہ اس روایت کے بعض راویوں کے بارے میں شیعہ علماء کا کیا خیال ہے، اس روایت کا سلسلہ سند یوں ہے:

﴿اخبرنا احمد بن محمد بن سعید قال حدثنا یحیی بن زکریا بن شیبان قال حدثنا یوسف بن کلیب قال حدثنا الحسن بن علی بن ابی حمزۃ عن عاصم بن حمید الحناط عن ابی حمزۃ الشمالی قال سمعت۔ ۔ الخ﴾

اس روایت کا ''یوسف بن کلیب'' نامی راوی قطعی طور پر مجہول الحال ہے جیسا کہ شیعہ کتب رجال میں اس کا کہیں بھی نام ونشان تک موجود نہیں ہے۔

ایک راوی حسن بن علی بن ابی حمزہ البطائنی ہے اس کے بارے میں علامہ تفرشی نے لکھا ہے: **﴿کذاب ملعون رویت عنہ احادیث کثیرۃ و کتب عنہ تفسیر القرآن کلہ عن اولہ الی آخرا الا انی لا استحل ان اروی عنہ حدیثاً واحداً﴾** ''یہ کذاب اور ملعون ہے اس سے بہت سی احادیث اور پوری تفسیر قرآن اول سے آخر تک روایت کی گئی ہیں لیکن میں اس سے ایک حدیث بھی روایت کرنا حلال نہیں سمجھتا'' (نقد الرجال ص۹۲، طبع ایران، تنقیح المقال للمامقانی، ج۱ص۲۹۰، طبع نجف، رجال کشی، ص۴۶۲، مطبوعہ کربلا)

اسی نوع کی دیگر روایات ملاں کی سمجھ سے بالاتر ہیں اس لئے کہ خشک مغز ملاں اسلامی شریعت کے حقائق کو نہ سمجھنے کی بناء پر ہر ایک روایت کو قابل اعتراض سمجھ رہا ہے اس کے اسلاف بھی اسی روش پر چلتے رہے ہیں ان میں سے بعض روایات کا تعلق رجعت سے ہے جس کی حقیقت پہلے بیان کر دی گئی ہے بعض کا علم تصوف سے، شیخ عبد الرزاق القاشانی فصوص الحکم لابن عربی کی شرح میں اس حقیقت کو اس طرح آشکار کرتے ہیں: **﴿... ان خاتم الاولیاء قد یکون تابعاً فی حکم الشرع کما یکون المهدی الذی یجئی فی آخر الزمان، فانہ یکون فی**

الاحكام الشرعية تابعاً لمحمد صلی الله علیه وسلم و فی المعارف و العلوم و الحقیقة تکون جمع الانبیاء و الاولیاء تابعین له کلهم، ولا یناقض ما ذکرناه، لان باطنه باطن محمد علیه الصلوٰة و السلام و لهذا قیل انه حسنة من حسنات سید المرسلین و اخبر علیه الصلاة و السلام بقوله ان اسمه اسمی و کنیة کنیتی فله المقام المحمود﴾، یہ کہ خاتم الاولیاء حکم شرع میں تابع ہوتے ہیں جیسا کہ مہدی آخر الزمان ہوں گے، چنانچہ آپؑ شرعی احکام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے لیکن معارف، علوم اور حقیقت میں تمام انبیاء اور اولیاء آپ کے تابع ہوں گے جو ہم نے ذکر کیا ہے یہ مناقض نہیں ہے اس لئے کہ آپ کا باطن محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا باطن ہے لہٰذا یہ کہا گیا ہے کہ آپؑ سید المرسلین کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد کے ذریعے خبر دی ہے کہ ان کا نام میرا نام اور ان کی کنیت میری کنیت ہوگی، چنانچہ وہی مقام محمود پر فائز ہوں گے۔"

(شرح القاشانی علی فصوص الحکم، ص ۴۲، ۴۳، طبع قاہرہ)

اس سلسلے میں مزید شرح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جس طرح نبوت کے علوم تمام انبیاء نے خاتم النبیین سے لئے ہیں۔ اس طرح تمام انبیاء اور اولیاء نے اپنی ولایت خاتم الاولیاء سے اخذ کی ہے **﴿فکل نبی من لدن آدم الی آخر نبی منهم احد یاخذ الا من مشکاة خاتم النبیین صلی الله علیه وسلم و ان تاخر وجود طینته فانه صلی الله علیه وسلم بحقیقة موجود وهو قوله کنت نبیاء و آدم بین الماء والطین وغیره من الانبیاء ما کان نبیا الا حین بعث و کذالك خاتم الاولیا کان ولیا و آدم بین الماء والطین﴾** آدم سے آخر تک تمام انبیاء نے خاتم النبیینؐ کی شمع نبوت سے اخذ فیض کیا ہے اگرچہ آپ کا وجود متاخر ہی ہوا ہے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حقیقت کے لحاظ سے موجود تھے، آپ کے فرمان، میں نبی تھا جبکہ آدم ابھی پانی اور مٹی کے درمیان تھے دیگر انبیاء نبی نہ تھے مگر اس وقت نبی بنے جب وہ مبعوث ہوئے یہی حال خاتم الاولیاء کا ہے وہ بھی ولی تھے درانحالیکہ آدم ابھی پانی اور مٹی میں تھے۔"

(شرح القاشانی علی فصوص، الحکم، ص ۴۳، ۴۴)

اگر مؤلف کو کفری مشین گن چلانے کا زیادہ ہی شوق ہے تو پہلے ان محقق صوفیاء اہل سنت اور انکے مداحین مثلاً اشرف علی تھانوی وغیرہ کو نشانہ بنائے جنہوں نے تمام انبیا کو بلحاظ ولایت خاتم الاولیاء (حضرت علیؑ تا امام مہدیؑ) کا تابع اور ان سے نور ولایت اخذ کرنے والا قرار دیا ہے۔

امام مہدیؑ ناصبی و خارجی قاریوں کو قتل کریں گے

مؤلف کو اعتراض ہے کہ امام مہدی علیہ السلام بعض ایسے افراد کو بھی قتل کر دیں گے جن کے گلے میں قرآن حمائل ہوں گے۔ (خطبات جیل، ص ۲۴۷)

الجواب:۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ اس سے حقیقی قرآن نہیں بلکہ خوارج و نواصب کی طرح قرآن قرآن کی رٹ لگانے والے نام نہاد ناصبی خارجی ہوں گے، جن کے تلاوت قرآن کے عمل کو در خور اعتنا قرار نہ دیتے ہوئے قتل کر دیا جائے گا کیونکہ یہ لوگ اسلامی لشکر میں پھوٹ ڈالنے کا سبب بن رہے ہوں گے، اگر حقیقی قرآن ان کے گلے میں ہوں تب جنگ صفین کا معرکہ یاد کر لیں جب معاویہ کے لشکر والوں نے اصلی قرآن کو دھوکہ دہی کے لئے نیزوں پر اٹھا لیا تھا اور حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا: ان سے جنگ جاری رکھو میں انہیں خوب جانتا ہوں یہ لوگ بچپن میں شریر تھے اور اب بڑے ہو کر بدمعاش بن گئے ہیں۔ نہ یہ قرآن کو مانتے ہیں نہ ان کا کوئی دین اسلام سے تعلق ہے اپنے حق پر جنگ جاری رکھیں۔ تفصیل کے لئے تاریخ ابن خلدون ج ۴ ص ۳۶۴ طبع ہند پریس الہ آباد، ملاحظہ کیجئے۔

اب اگر کوئی شخص جنگ کی حالت میں مارا جائے اور قرآن اس کے گلے میں لٹکا ہوا ہو تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے اور اسی نے قرآن کی توہین کی ہے امام برحق پر اس کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔

امام مہدی کافروں سے پہلے سُنیوں اور انکے عالموں سے کاروائی کرینگے؟

مؤلف واویلا کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ علامہ مجلسیؒ کی تصنیف ''حق الیقین'' کے صفحہ ۵۵۶ پر یہ روایت بھی ہے جس وقت مہدی علیہ السلام ظاہر ہوں گے تو وہ کافروں سے پہلے سنیوں اور خاص کر ان کے عالموں سے کاروائی شروع کریں گے اور ان سب کو قتل کر کے نیست و نابود کریں

گے۔'' (خطبات جیل، ص ۲۴۸)

الجواب ۔ ناصبیت کا غلغلہ اور ولولہ صرف پہلی صدی ہجری تک ہی محدود و منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اموی عہد کے خاتمے کے بعد عباسی عروج کے زمانے میں بھی ناصبیت کا دوز دورہ تھا۔ حتیٰ کہ متوکل عباسی امویوں سے بھی دو قدم بڑھا ہوا ناصبی تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ناصبیت، سنیت کے لباس میں ملبوس ہو کر بر سر عام آئی۔ پس اس کے بعد نواصب نے اہل سنت کا بھیس اختیار کر لیا۔ ان کا کم از کم مقصد یہ تھا کہ عام مسلمان اہل بیت رسول علیہم السلام سے منحرف رہیں۔ اس کے برعکس معاویہ اور دیگر اموی خلفاء کے ساتھ حسن عقیدت رکھتے ہوئے ان کا دفاع کریں۔ چنانچہ یہ نواصب اپنی اس سعی مسموم میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ چنانچہ آٹھویں نویں صدی ہجری کے ایک محقق اہل سنت اور اعتدال پسند عالم دین کو بڑے دکھ کے ساتھ اس امر کا اعتراف ان الفاظ میں کرنا پڑا۔

﴿فانی لما رایت اکثر الناس فی حق آل البیت مقصرین و عمالهم من الحق معرضین و لمقدارهم مضیعین و بمكانتهم من الله تعالىٰ جاهلين ....﴾

جب میں نے لوگوں کی اکثریت کو آل البیت کے حق میں کوتاہی کرتے ہوئے، ان کے حق سے روگردانی کرتے ہوئے، ان کی قدر و قیمت کو ضائع کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ان کے مقام و مرتبہ سے نادان دیکھا تو ''**اجبت ان اقید فی ذالك نبذة تدل علىٰ عظيم مقدارهم**'' میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس سلسلے میں چند دلائل جمع کر کے پیش کر دوں جو ان کی قدر و قیمت کی عظمت ظاہر کرتے ہوں ....'' (**معرفته ما یجب لال البیت النبوی من الحق علی من عداهم**، تالیف تقی الدین المقریزی، ص ۱۷)

علامہ مقریزی مسلمانوں کی اکثریت کے بارے میں آٹھویں نویں صدی ہجری میں جو دہائی دے رہے ہیں۔ بعد ازاں بھی امت کی اکثریت اسی راہ پر گامزن رہی اور آج تک اسی راستے پر دوڑی چلی جا رہی ہے، جن سنگدلوں پر اللہ اور رسولؐ کے وعظ و نصیحت کا اثر نہیں ہوا ان پر مقریزی کی چند ناصحانہ باتوں کا کیا اثر ہوتا؟

مؤلف نے اپنی ناصبیت کو چھپانے کے لئے لفظ ''سنی'' سے عوام کو دھوکہ دینے کی ناکام کوشش کی ہے حالانکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دراصل ناصبی ہوں گے لیکن اپنے آپ کو اہل سنت کے پردے میں چھپایا ہوا ہوگا پہلے دور میں بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جو درحقیقت ناصبی تھے لیکن اپنے آپ کو ''سنی'' کہلاتے تھے، ایسے افراد کی ایک بڑی اور واضح مثال عباسی خلیفہ متوکل ہے۔ علامہ شمس الدین ذہبی اس سے متعلق لکھتے ہیں:

﴿قلت و المتوكل سنی لكن فيه نصب ﴾، ''میں کہتا ہوں کہ متوکل سنی تھا لیکن اس میں ناصبیت تھی۔'' (سیر اعلام النبلاء، ج ۱۲، ص ۱۳۵، طبع بیروت)

عصر حاضر کے مشہور سکالر ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے متوکل کے حالات میں لکھا ہے:

﴿و كان المتوكل يميل الى اهل السنة، و يعمل على نصرتهم و ضرب بالسياط رجلا سب ابا بكر و عمر و عائشة و حفصة .. و امر الشيوخ المحدثين بالتحديث و اظهار السنة و الجماعة﴾، متوکل اہلسنت کی طرف میلان رکھتا تھا اور ان کی امداد و نصرت کے لئے کام کرتا تھا اور جو شخص ابوبکرؓ، عمرؓ، عائشہؓ اور حفصہؓ کو سَبّ کرتا اسے کوڑوں سے مارا کرتا تھا اور شیوخ محدثین کو حدیثوں کی نشر و اشاعت اور اہلسنت والجماعت کو پھیلانے اور غالب کرنے کا حکم دیا۔'' (تاریخ الاسلام السیاسی الجزء الثالث ص ۵۰۴، طبع مصر)

متوکل کا ناصبی ہونا اظہر من الشمس ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے فتاویٰ عزیزیہ، ج ۱، ص ۱۰۹، طبع دیوبند، اور علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۱، طبع کانپور، اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر علماء اہلسنت نے اسے ناصبی لکھا ہے بلکہ ابن اثیر الجزری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ﴿و انما كان ينادمه و يجالسه جماعة قد اشتهر و ابا لنصب و البغض لعلی رضی الله عنه ﴾ ''اس (متوکل) کے ہم نشین اور ہم مجلس ایسے لوگوں کی جماعت تھی جو ناصبیت اور بغض علیؑ میں اشتہاری تھی۔'' (کامل ابن اثیر، ج ۷، ص ۱۹، ۲۰) اس طرح ناصبی اہل سنت میں داخل ہو کر ان کے خیالات و نظریات پر چھا گئے۔ متوکل کے قابل اعتماد وزیر علی بن جہم کے بارے میں مؤرخ شمس الدین خلکان لکھتے ہیں: ﴿و كان مع انحرافه عن علی بن ابی طالب رضی الله عنه

و اظهار التسنن مطبوعاً مقتدرا علی الشعر﴾،

''حضرت علی بن ابی طالبؑ سے انحراف کے باوجود اپنے آپ کو''سنی'' ظاہر کرتا تھا شعر کہنے کی طرف طبعًا مائل اور قادر تھا۔'' (وفیات الاعیان، ج ا،ص ۳۴۱، طبع بولاق، مصر)

شاہ عبدالعزیز دہلوی نے بھی ابن خلکان کے بیان کی مزید تائید کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿بعضی علمائے ایشاں این لفظ را از علی بن الجهم بن بدر بن الجهم القرشی روایت کرده اند و او از اشرار نواصب بود که بنا بر مصلحت تسنن ظاهر می کرد و تسترمی نمود و مقصد او تابود تحریف مردم از امیر المومنینؑ بود﴾،

''ان کے بعض علماء نے اس لفظ کو علی بن الجہم بن بدر الجہم القرشی سے روایت کیا ہے حالانکہ وہ شریر ترین ناصبی تھا اور مصلحتًا اپنے آپ کو''سنی'' ظاہر کرتا اس طرح اپنی ناصبیت پر پردہ ڈالتا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منحرف کر دے۔'' (تحفۂ اثنا عشریہ،ص ۹۶،طبع لکھنؤ)

لیکن ناصبی ہونے کے باوجود اپنے تئیں ''سنی'' کہلاتا رہا ہے۔اسلامی تاریخ میں بے شمار ایسے افراد کا تذکرہ موجود ہے جو اپنے آپ کو''سنی'' ظاہر کرتے تھے لیکن دراصل وہ خالص ناصبی تھے۔

شیعہ کے امام مہدی ننگے ظاہر ہوں گے؟

نواصب کی جانب سے شیعہ خیر البریہ کے خلاف عموماً یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ:

علامہ باقر مجلسی نے حق الیقین ص ۳۴۷ طبع ایران پر لکھا ہے کہ:

''علامات ظهور حضرت قائم آنست که بدن برهنه ای در پیش قرص آفتاب ظاهر خواهد شد و منادی ندا خواهد کرد که این امیر المومنین است برگشته است که ظالمان را هلاك كند''

یعنی امام مہدیؑ سورج کے سامنے ننگے بدن ظاہر ہوں گے اور ایک منادی ندا دے گا کہ یہ امیرالمومنین ہیں ..... ''لہٰذا شیعہ کا امام مہدی ننگا ظہور فرمائے گا۔

الجواب:۔ سرکار علامہ مجلسیؒ نے مندرجہ بالا روایت شیخ طوسیؒ اور نعمانیؒ کے حوالے سے نقل کی ۔
لیجئے ہم اصل روایت سند کے ساتھ درج کر کے اس کی وضاحت کئے دیتے ہیں۔ چنانچہ شیخ الطائفہ
ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ نے اپنی تصنیف ''کتاب الغیبۃ باب علائم ظہور الحجۃ'' ص ۲۶۸ طبع
نجف اشرف میں اور محمد بن ابراہیم نعمانیؒ نے بھی اپنی تالیف ''کتاب الغیبۃ الباب العاشر حدیث
۲۸ ص ۱۸۱، طبع تبریز میں یہ روایت نقل کی ہے۔

(الف) کتاب الغیبۃ للشیخ الطوسیؒ میں یہ روایت یوں ہے:

﴿سعد بن عبد اللّٰہ عن الحسن بن علی الزیتونی و عبد اللّٰہ بن جعفر الحمیدی ع احمد بن ھلال العبرتائی عن الحسن بن محبوب عن ابی الحسن الرضا علی السلام فی حدیث طویل اختصر نامنہ موضع الحاجۃ . . و الصوت الثالث یرو بدناً بارزاً نحو عین الشمس ھذا امیر المومنین قد کر فی ھلاك الظالمین﴾

(ب) کتاب الغیبۃ للنعمانیؒ کی عبارت اس طرح ہے:

﴿حدثنا محمد بن ھمام قال حدثنا احمد بن مانبداذ و عبد اللّٰہ بن جعفر الحمیر قالا حدثنا احمد بن ھلال قال حدثنا الحسن بن محبوب الزراد قال قال لی الر علیہ السلام . قال ثلاثۃ صوت فی رجب اولھا الا لعنۃ اللّٰہ علی الظالمین و الثا ازفت الازفۃ یا معشر المومنن و الثالث یرون یداً بارزاً (او ابدناً بارزاً) مع قر الشمس ینادی الا ان اللّٰہ قد بعث فلانا علی ھلاك الظالمین﴾

ان دونوں روایتوں کا معنٰی یہ ہے کہ ''لوگوں کو نظر آئے گا کہ سورج کے عین سامنے آ
بدن ظاہر ہے'' اصل عربی عبارت میں لفظ ''بارزاً'' آیا ہے نہ کہ عریاناً اور بارز کا معنی ننگا نہ
بلکہ ''باہر والا'' ہوتا ہے جیسے ھذا البارز یعنی باہر والا، چنانچہ انور شاہ محدث کشمیری نے لکھا۔

﴿و رایت ان کل اھل بلدۃ یقول للآخر بارزاً فالعرب تقول للعجم بارزاً و ک بالعکس﴾ ''دیکھا گیا ہے کہ ہر شہری دوسرے شہر والے کو باہر والا کہا کرتا ہے مثلاً عرب عجم باہر والا کہتا ہے اسی طرح عجمی عربی کو کہتا ہے۔'' (فیض الباری ج ۴، ص ۵۷، باب بدء الخلق

﴿کان علیه السلام یوماً بارزاً للناس﴾ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ کتاب الایمان ج ۱ ص ۴۹)

قرآن کریم میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً ﴿فَـاِذَا بَـرَزُوْا مِـنْ عِـنْدِكَ﴾ ''پھر جب وہ باہر گئے تیرے پاس سے۔'' (سورۃ النساء، آیت ۸۱) ﴿لَبَـرَزَ الَّـذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ﴾ ''البتہ باہر نکلتے جن پر لکھ دیا تھا مارا جانا۔'' (سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۴) ﴿وَ بُـرِّزَتِ الْـجَـحِیْـمُ لِـلْغٰوِیْنَ﴾ ''اور باہر نکالیں دوزخ کو سامنے بے راہوں کے۔'' (سورۃ الشعراء، آیت ۹۱) وغیرھم۔ اگر بفرض محال مان ہی لیا جائے کہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ننگے ظاہر ہوں گے تو اس سے مراد مما عدا العورۃ لیا جا سکتا ہے جیسا کہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ فصل ثانی (قبل از کتاب الدعوت) ج ۵ ص ۷ مطبوعہ ملتان میں ہے: ﴿عـن ابـی سـعیـد الـخدریؓ قال جلست فی عـصابـتـه مـن الـضـعـفاء المهاجرین و ان بعضهم یستر ببعض من العری﴾، اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے: ﴿الـمـراد العری مما عدا العورۃ﴾ جبکہ حضرت امام مہدی علیہ السلام لباس امامت میں ظہور فرمائیں گے۔ (ملاحظہ ہو: کتاب الغیبۃ نعمانی، باب ۱۳، ص ۱۴۳، حدیث نمبر ۴۲، باب ۱۹ حدیث نمبر ۴، ص ۳۰۸) و غیر ذلك من الكتب المعتبرۃ،

جہاں تک علامہ مجلسیؒ کی فارسی عبارت سے لفظ ''برھنہ'' کے متعلق اس ملاں نے پھبتی اڑا کر اپنی موروثی جہالت کا ثبوت دیا ہے تو ہم اس عقل و خرد سے بے گانہ کو صرف اور صرف یہی مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے کسی علمی کتب خانہ سے ''فتاوی برھنہ'' کی اگر زیارت کر لیں شاید اس کے زنگ زدہ عقل کے خانہ کی آلودگی دور ہو سکے۔

ثانیاً:۔ اس روایت کا راوی احمد بن ہلال العبرتائی ہے۔ روضۃ الکافی کے حاشیہ ص ۲۵۸ جلد ۸ طبع جدید ایران میں ''حـدیـث جـاریة الـزبـیـر'' کے ضمن میں اس کے متعلق لکھا ہے: ﴿مـلـعون علی لسان العسکری علیه السلام﴾ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے اس پر لعنت کی اور اس سے دور رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ حضرت امام مہدی علیہ السلام نے اپنے نائب حسین بن روح کے نام ارسال کردہ توقیع میں اس کو ملعون قرار دیا اور اس سے بیزاری اختیار فرمائی۔ شیخ صدوق نے لکھا ہے کہ کوئی شیعہ ہو کر پھر ناصبی نہیں ہوا سوائے احمد بن ہلال کے۔

(تنقیح المقال ج ا، ص ۱۰۰، طبع نجف، نقد الرجال، ص ۳۶، رجال نجاشی، ص ۲۰، طبع بمبئی وغیر
اور خود علامہ محمد باقر مجلسیؒ نے بھی بحار الانوار، ج ۵۲، ص ۳۶۸، میں اسے مذموم اور ملعون ومعزو
قرار دیا ہے۔

نبی اکرمؐ اور فاطمہ الزہراؑ کی قبریں کھودنے والا معاویہ کا پوتا ہوگا

"شیعہ کے امام مہدیؑ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو قبروں سے نکال کر سوکھے درخت
لٹکائیں گے اس کے بعد انہیں زندہ کر کے ان کے مظالم شمار کریں گے اور انہیں جلا دیں گے۔"
(خطبات جیل ص ۲۴۹، ص ا

الجواب:۔ گذشتہ زمانے کی طرح ہی نواصب نے عصر حاضر میں بھی رائے عامہ کو گمراہ کرنے
لئے بعض خود ساختہ روایات کا سہارا لیا ہے چنانچہ ان کے اکاذیب میں سے ایک گھناؤنا جھوٹ
روایت بھی ہے اس بحولہ بالا روایت کا سلسلہ روایوں کا اس طرح ہے:

﴿.....عن ابی شعیب و محمد بن نصیر عن عمر بن الفرات عن محمد بن المفض
عن المفضل بن عمر قال سالت سیدی الصادق علیه السلام .. .. ﴾
(بصائر الدرجات و بحار الانوار و

اس سند میں تین راوی محمد بن نصیر نمیری، عمر بن فرات اور مفضل بن عمر کذاب اور غی
ہیں چنانچہ علامہ مامقانی محمد بن نصیر نمیری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿ولا شبهة فی ضعف الرجل وزندقة و کان یدعی انه نبی و رسول و ان علی
محمد العسکری ارسله و یقول فیه بالربوبیة و یقول بالاباحة للمحارم .. ﴾

محمد بن نصیر کے ضعیف اور زندیق ہونے میں ذرا بھر بھی شک نہیں ہے اور یہ نبی او
ہونے کا دعویدار تھا (معاذ اللہ) کہ حضرت امام علی بن محمد عسکریؑ نے اسے بھیجا ہے اور یہ
ربوبیت کا قائل تھا اور حرام کی ہوئی عورتوں کی اباحت کا قائل تھا اور یہ نصیری فرقہ کا بانی تھا
شیعہ نے بالاتفاق کافر قرار دیا ہے اور حضرت امام علی بن محمد عسکری نے اس پر لعنت کر کے ا
برأت کا اظہار فرمایا ہے۔ (تنقیح المقال، ج ۳، ص ۱۹۵، نقد الرجال ص ۳۳۶، ۳۳۷ مطبوعہ

دوسرے راوی عمر بن فرات کے متعلق علامہ مجلسی لکھتے ہیں: ﴿عمر بن فرات ضعیف﴾ (رجال مجلسی، ص ۲۷۰، طبع بیروت) اور علامہ تفرشی نے اسے غالی تحریر کیا ہے۔

تیسرا راوی مفضل بن عمر ہے علامہ تفرشی نے لکھا ہے کہ:

﴿**المفضل بن عمر ابو عبد اللّٰه و قیل ابو محمد الجعفی کوفی فاسد المذهب مضطرب الروایة لایعبا به و قیل انه کان خطابیا و قد ذکرت له مصنفات لا یعول علیها...... روی عنه ابو شعیب المحاملی ضعیف منها**﴾

''مفضل بن عمر ابو محمد جعفری کوفی فاسد المذہب اس کی روایت مضطرب ہوتی ہے قابل اعتماد نہیں ہے بروایت دیگر یہ مذہب کے لحاظ سے خطابی تھا اور اس کی تصنیفات کا ذکر ہوا جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، اس سے ابوشعیب محاملی ضعیف روایت بیان کرتا ہے۔''

(نقد الرجال، ص ۳۵۱)

دراصل نواصب نے کمال ہوشیاری اور چالاکی سے اپنے گذشتہ اور آئندہ جرائم کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر کے اسلامی لٹریچر میں شامل کر دیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بڑے قائدین شروع سے ہی اس طرح کے وحشیانہ مظالم اور بربریت کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ حضرت حمزہؓ سید الشہداء غزوہ احد میں معاویہ بن ابی سفیان کی درندہ صفت ماں ہند بنت عتبہ کی سازش کے نتیجہ میں شہید ہوئے جیسا کہ علامہ ابن اثیر الجزری فرماتے ہیں کہ:

﴿**و جعل نسآء المشرکین و صواحباتها یجد عن انف المسلمین و اذا انهم و یبقرون و بقرت هند بطن حمزةؓ فاخرجت کبد فجعلت تلوکها فلم تسغها فلفظتها**﴾ ''اور مشرکین کی عورتیں ہند اور اس کی سہیلیاں مسلمانوں کے ناک، کان کاٹنے اور پیٹ شگافتہ کرنے لگیں اور ہند نے حمزہؓ کا پیٹ شگافتہ کیا اور آپ کا جگر نکالا اور اسے چبانے لگی لیکن حلق سے نہ اتر سکا تو پھینک دیا۔'' (اسد الغابہ، ص ۴۸، ج ۳، طبع قاہرہ)

اگر اب بھی تسلی نہ ہوئی ہو تو مزید سنئے مادرِ معاویہ کے اس وحشیانہ کارنامہ کی

داستان، ﴿لما كان يوم احد جعلت هند بنت عتبة و النساء معها يجد عن انف المسلمين و يبقرن بطونهم و يطعن الاذانا لا حنظلة فان اباه كان مع المشركين و بقرت هند بطن حمزةؓ فاخرجت كبده و جعلت تلوك كبده ثم لفظتها﴾

(الاستیعاب فی اسماء الاصحاب برحاشیہ الاصابہ، ص ۲۷۴، ج ۱، مطبوعہ مصر)

یعنی "احد کے دن ہند بنت عتبہ اور اس کے ساتھ کی عورتیں شہداء کے ناک کان کاٹنے اور پیٹ پھاڑنے لگیں سوائے حنظلہ کے کیونکہ اس کا باپ مشرکین کا ساتھی تھا اور ہند نے حمزہؓ کے پیٹ کو چیرا پھر آپ کا کلیجہ باہر نکالا اور آپ کے کلیجے کو چبانے لگی پھر اسے پھینک دیا۔"

مذکورہ بالا یہی واقعہ حسب ذیل تصنیفات میں بھی موجود ہے:

ارشاد الساری شرح البخاری جلد ۶، ص ۲۲۸ طبع کانپور۔ سیرت ابن ہشام، ج ۳، ص ۹۱ طبع قاہرہ۔ سیر الصحابہ، ج ۶، حصہ دہم، ص ۱۸۱، طبع دہلی۔ تذکار صحابیات از طالب ہاشمی، ص ۳۶۱ طبع لاہور۔ خطبات قاسمی از ضیاء القاسمی چیئرمین سپاہ صحابہ، ج ۱، ص ۴۹، طبع فیصل آباد۔

اس طرح اپنی عداوت کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ آتش عداوت ٹھنڈی نہ ہوسکی بلکہ اس کی نسل میں منتقل ہوگئی۔ معاویہ بن ابی سفیان نے غالباً ۴۶ ہجری میں شہداء احد کی بے حرمتی کی غرض سے ان کی قبور کے عین درمیان میں سے ایک نہر گزارنے کے لئے کھدائی کا حکم دیا۔ دیگر شہداء کے علاوہ حضرت حمزہؓ کی قبر کو بھی کھود ڈالا گیا۔ ﴿فاصابت المسجاة قدم حمزة فانبعث دما﴾ یعنی "حضرت حمزہؓ کے پاؤں پر پھاوڑا لگا، زخم ہوکر تازہ خون بہنے لگا۔" (البدایہ النھایہ ج ۴، ص ۴۳، مطبوعہ مکتبہ ریاض الحدیثہ، تفسیر کبیر رازی ج ۳ ص ۱۴۹ طبع مصر، جذب القلوب للشیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۷۲ طبع کلکتہ، شرح الصدور للسیوطی ص ۲۹۹ طبع محمدی لاہور)

معاویہ کے بیٹے یزید کے حکم سے محرم ۶۱ ہجری میں شہداء کربلا کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے۔ تمام شہداء کے سر کاٹ کر انہیں کربلا سے دمشق اور پھر وہاں سے واپس کہاں کہاں تک توہین کی غرض سے گھمایا گیا۔ ایک ناصبی حکمران متوکل علی اللہ عباسی نے ۲۳۶ ہجری میں امام حسین علیہ السلام کے مزار مقدس کو منہدم کرا دیا اور وہاں پانی چھوڑ کر زراعت کا حکم دے دیا۔

معاویہ کی پشت میں سے آخر زمانہ میں ایک شخص خروج کرے گا جو اپنے جد اعلیٰ کے کردار کا اصلی نمونہ ہوگا اور ہندہ مادر معاویہ کی تمناؤں کی تکمیل کے لئے کوشش کرے گا۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ یہ شخص ﴿یخرج من ناحیة دمشق و یبعث خیله و سرایاه فی البر و البحر فیبقرون بطون الحبائی و ینشرون الناس بالمناشیر و یحرقون و یطبخون فی القدور و یبعث جیشا له فی المدینة فیقتلون و یاسرون و یحرقون ثم ینبشون عن قبر النبی صلی اللّٰه علیه و سلم و قبر فاطمة رضی اللّٰه عنها ثم یقتلون کل من کان اسمه محمدا و فاطمة و یصلبوتهم علی باب المسجد﴾

''دمشق کے نزدیک سے خروج کرے گا اور اپنی افواج کو خشکی اور تری میں روانہ کرے گا۔ وہ لوگ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑیں گے، لوگوں کو آروں سے چیریں گے، آگ میں جلائیں گے۔ (کھولتے ہوئے پانی کی) دیگوں مین پکائیں گے، یہی سفیانی (ناصبی) مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کے لئے ایک لشکر روانہ کرے گا۔ یہ لوگ وسیع پیمانے پر لوگوں کو قتل کریں گے۔ قیدی بنائیں گے۔ نذر آتش کرتے چلے جائیں گے۔ پھر نبی اکرم ﷺ اور حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی قبروں کو کھودیں گے، پھر مدینہ منورہ میں ہر اس شخص کو قتل کریں گے جس کا نام محمد اور فاطمہ ہوگا اور ان کی لاشوں کو مسجد کے دروازے پر سولی لٹکا دیں گے۔'' (خریدۃ العجائب، تالیف امام سراج الدین عمر حلبی، ص ۱۳۲، مطبوعہ قاہرہ، کتاب البدء والتاریخ، ج ا، ص ۱۷۸، مطبوعہ باریز، ۱۸۹۹ء)

اور علامہ قرطبی نے سفیانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب سفیانی شام میں خطبہ دے گا تو اپنا تعارف یوں کرائے گا:

﴿یا اهل دمشق انا رجل منکم و انتم خاصتنا جدی معاویة بن ابی سفیان﴾

سفیانی دمشق میں خطاب کرے گا اور اہل دمشق سے کہے گا: اے اہل دمشق! میں تم میں سے ہوں اور تم ہمارے خاص آدمی ہو میرا دادا معاویہ بن ابی سفیان ہے۔ (تذکرہ قرطبی، ص ــــ، طبع کوئٹہ)

علامہ یوسف مقدسی شافعی نے سفیانی اموی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''سفیانی اس قدر بغض اہل بیت رکھتا ہوگا کہ ہر اس مسلمان کو قتل کرے گا جس کا نام محمد،

احمد، علی، جعفر، حسن، حسین، فاطمہ اور زینب ہوگا اور جن بچوں کا نام حسن و حسین ہوگا ان کو سولی
لٹکائے گا اور مسجد کوفہ کے دروازے پر ان کو پھانسی دے گا سفیانی دہشت گرد ایران کی مخالفت میر
نکلیں گے اور وہ آل محمدؐ کے شیعوں کو قتل کریں گے پھر ایران والے امام مہدیؑ کی تلاش میں نکلیر
گے۔" (عقد الدرر، ص ۹۳، طبع مکتبہ عالم الفکر قاہرہ)

مزید برآں علامہ مقدسی شافعی نے سفیانی کی تخریب کاریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

﴿من ذلك و خروج السفياني ابن اكلة الاكباد من الوادى اليابس و عتو و تجنيده الاجناد ذوى القلوب القاسية و الوجوه العوابس و ظهور امره و تغلبه علي البلاد و تخريبه المدرس و المساجد و اظهاره للظلم و الجور تعزيبه كل راكع ساجد و قتله العلماء و الفضلاء و الزهاد ستبيحا سفك الدماء المحرمة و معاندة لال محمد اشد العناد متجريا على اهانة النفوس المكرمه و الحنفسف تجيشه بالبيداء و من معهم يغادرهم غدرهم مثله اللعباد﴾

"امام مہدیؑ کی علامات میں سے سفیانی کا نکلنا ہے جو جگر خوار ہند (معاویہ کی ماں) بیٹا ہوگا اور وہ سرکش ہوگا سنگ دل اور ترش رو لوگوں کا لشکر بنا کر شہر پر غلبہ پالے گا مدارس او مساجد کو برباد کر دے گا ظلم و فساد برپا کرے گا ہر رکوع و سجود کرنے والے کو عذاب دے گا علماء فضلاء اور پرہیزگار لوگوں کو قتل کرے گا محترم جانوں کی خونریزی مباح قرار دے گا اور اہل بیت رسولؐ سے انتہائی بغض و عناد رکھے گا مگر وہ اپنے تخریب کار لشکر سمیت مقام بیداء میں زمین کے اند دھنس جائے گا۔" (عقد الدرر، ص ۱۳۱، مطبوعہ قاہرہ)

ان ناقابل تردید حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ معاویہ ابوسفیان کی اول سے پیدا ہونے والا تخریب کار سفیانی جس کے دل میں اپنے اسلاف کی طرح اہل بیتؑ کی دشمن کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی۔ اپنے آباء و اجداد اور امہات (اس لئے کہ ان کی ماں ہندہ جگر خوا مشہور تھی اس نے غزوہ احد میں اپنی درندگی اور بربریت کا ثبوت فراہم کیا) کے نقش قدم پر چا ہوئے ظلم و بربریت، قتل و دہشت گردی اور وحشت و غارت گری کی انتہا کر دے گا حتیٰ کہ حضو

اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا کی قبریں کھود ڈالے گا اور انہیں قبروں سے نکال کر ان کی توہین کرے گا مگر گستاخ مؤلف نے امام مہدی علیہ السلام کے بغض وعناد کی بناء پر اپنے امام سفیانی کی ان حرکات کو حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی طرف منسوب کر کے امامؑ کی شان اقدس میں گستاخی اور بے ادبی کرنے کا جواز پیدا کیا ہے اس طرح سے مسلمانوں کے متفقہ عقیدہ امام مہدیؑ کا مذاق اڑا کر ان کے جذبات کو مجروح کیا ہے جو کہ ناقابل معافی جرم ہے۔

عصر حاضر کے نواصب اپنے اسلاف کے مظالم اور گھناؤنے جرائم سے چشم پوشی کرتے ہوئے اپنے آئندہ کے قائد سفیانی کے قبیح ظالمانہ کردار کی پردہ پوشی کی کوشش میں مصروف ہیں۔ الٹا الزام بے چارے مسلمانوں کو دیتے ہیں تا کہ ان کا اپنا ظالمانہ منصوبہ مخفی رہے اور آخری مراحل میں کامیاب ہو جائے اس نوع کے مظالم کی ابتداء نواصب کے ممدوح سعودی حکمرانوں نے اس صدی کے آغاز سے ہی کر دی تھی۔ ماضی قریب میں ہی پہلے حضور سرور کائنات ﷺ کی اکلوتی لخت جگر خاتون جنت حضرت سیدہ فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا اور دیگر اہل بیتؑ رسولؐ کے مزارات شہید کر دیئے اور اب حال ہی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وھب سلام اللہ علیہا کے مزار مقدس پر بلڈوزر چلا کر اسے زمین کے ساتھ ہموار کر دیا گیا مختلف ممالک کے مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی، جو صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ نواصب ملاؤں نے سعودیوں کے اس فعل شنیع کی پوری پوری حمایت کی۔

مزید یہ کہ اہل سنت کی کتب حدیث میں بے شمار ایسی روایت موجود ہیں جن سے انبیاء اور دیگر مقدس شخصیت کی توہین ہوتی ہے ایسی ہی روایات کو مستشرقین نے استعمال کیا، سلمان رشدی اور ہندو راجپال نے ایسی ہی روایات سے مفہوم اخذ کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک ومقدس دامن پر اعتراضات کئے ہیں نعوذ باللہ من ذالک ۔ لیکن ایسی روایات قطعاً ناقابل اعتماد ہیں ان کے راوی مجروح وملعون ہیں اس نوع کی روایات پر اعتماد کرنا عقل ونقل کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔

باب ۱۰

نکاح متعہ کا شرعی جواز

اسلام دین فطرت ہے

اسلام انسانی معاشرے کی تشکیل اور توسیع کے ساتھ ساتھ انسانی بنیادی ضروریات کو منظ اور منضبط طریقے سے پورا کرنے کا بندوبست کرتا ہے۔ اسلام جس طرح انسانی بھوک کو مٹانے کے لئے مناسب اور پاکیزہ غذا کی فراہمی کا ہر فرد معاشرہ کے لئے کفیل اور ضامن ہوتا ہے اسی طرح اس کے مناسب لباس اور رہائش کے لئے انتظام کرتا ہے اور اس سلسلے میں ہدایات جاری کرتا ہے حلال رزق کے حصول کے لئے حلال اور باعزت پیشے اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے اسی طرح انسان کی بلوغت کے بعد انتہائی شدید جنسی جذبات اور شہوات کی تسکین کا بھی اسلام نے پورا پو خیال رکھا ہے اور انسان کو شتر بے مہار مادر پدر آزاد نہیں چھوڑا بلکہ اس سلسلے میں مرد و عورت دونو ں کی حیثیت اور ضرورت کو مدنظر رکھ کر خاندان کی تشکیل اور جنسی جذبات کی تسکین کا بندوبست کیا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں انسان کے تمام حالات کو مدنظر رکھ کر ہدایات جاری کی ہیں۔ ان ہدایات پر عمل کرنے سے نہ صرف افراد معاشرہ کے جملہ حقوق محفوظ ہو سکتے ہیں بلکہ آئندہ نسل انسانی کی فلاح کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ یوں نسب محفوظ رہے گا اور ایک کا حق دوسرے کے پاس جانے کی راہ میں مضبوط رکاوٹ کھڑی ہو جائے گی۔

نکاح کیا ہے؟

خاندان کی تشکیل اور جنسی جذبات کی تسکین کے لئے اور انسانی ضرورت کے تحت اللہ تعالیٰ نے نکاح کا طریقہ جاری کیا تاکہ لوگ زنا ایسی بدکاری کا ارتکاب نہ کریں، ارشاد ہوتا ہے ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ﴾ ”پس نکاح کرلو جو عورتیں تم کو اچھی لگیں، دو دو، تین تین، چار چار۔“ (سورۃ النساء، آیت ۳)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ یَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾

''بے شوہر عورتوں اور اپنے نیک غلاموں اور لونڈیوں کا بھی نکاح کر دیا کرو اگر یہ لوگ محتاج ہوں گے تو خدا اپنے فضل و کرم سے انہیں مالدار بنا دے گا اور خدا تو بڑی گنجائش والا واقف کار ہے۔'' (سورۂ نور، آیت ۳۲)

پس نکاح مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا نام ہے جس میں فریقین کے سرپرستوں کی اجازت اور رضامندی بھی شامل ہوتی ہے اس عقد یعنی باہمی عہد کرنے کے ساتھ ہی اس سے متعلق وضع کردہ تمام اسلامی شرعی قوانین فریقین پر عائد ہو جاتے ہیں۔

نکاح کے مقاصد

اللہ رب العزت نے نکاح کے مقصد کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا﴾

''وہی ذات ہے جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی (کی بچ جانے والی مٹی) سے اس کی زوجہ کو بنایا، تا کہ اسکے پاس جا کر سکون و آرام حاصل کرے۔ (سورۃ الاعراف، ۱۸۹)

جہاں پر نکاح کا مقصد بقاء و افزائش نسل انسانی بتایا گیا ہے، وہاں دوسرا مقصد سکون (جنسی جذبات کی تسکین) حاصل کرنا ہے۔ بعض نادان لوگ یہ کہتے ہیں کہ نکاح محض بقاء نسل انسانی کا ذریعہ ہے اور بس، نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کے جنسی جذبات و خواہشات کی تسکین کا سامان بھی ہے۔

چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لئے آسان طریقے وضع کئے گئے ہیں۔ پہلا طریقہ معمول کے حالات میں تو دائمی نکاح ہے جو شخص برداشت کر سکتا ہو اور اس کے حالات اسے اجازت دیتے ہوں ان دونوں مقاصد یا ان میں سے ایک مقصد کے حصول کے لئے دائمی نکاح

کرے اور جس شخص کو غیر معمولی حالات کا سامنا ہو اور اس کے حالات اسے دائمی نکاح کی اجازت نہ دیتے ہوں تو دینِ فطرت نے ان مقاصد کے حصول کے لئے نکاح موقت کی اجازت دی ہے۔

نکاح موقت کا اسلامی شریعت میں جواز

چونکہ اسلام نے انسانوں کے نسب کو ان کے حقوق کے تحفظ کی خاطر محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا ہے اور ساتھ ہی انسانوں کی جائز خواہشات کی تکمیل کا بندوبست کیا ہے، لہٰذا زنا اور بدکاری کو حرام قرار دیا ہے لیکن نکاح موقت کو جائز قرار دیا ہے تاکہ کوئی شخص اللہ کی نعمت سے محروم نہ رہے، چنانچہ سب سے پہلے متعہ یا نکاح موقت کی تعریف ذکر کی جاتی ہے۔

چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی سورۂ نساء کی متعلقہ آیت ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ م بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ "جن عورتوں سے تم (نکاح) متعہ کرلو تو انہیں جو مہر معین کیا ہے دے دو اور مہر کے مقرر ہونے کے بعد اگر آپس میں (کم وبیش پر) راضی ہو جائیں تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے، بے شک اللہ تعالیٰ (ہر چیز سے) واقف ہے اور مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔" (سورۂ نساء آیت ۲۴) کے تحت لکھتے ہیں...... ﴿المراد بالاستمتاع عقد المتعة وهی عقدير ادبها ملك البضعة الی مدة معينة بمهر معين بانت المراة بعد انقضاء تلك المدة بلا طلاق﴾ "مراد اس استمتاع سے نکاح متعہ ہے اور یہ ایسا نکاح ہے کہ جس کے سبب انسان زن ممتوعہ کا ایک مدتِ معینہ تک مہرِ معین کے معاوضہ میں مالک ہو جاتا ہے اور وہ عورت مدت (معینہ) پوری ہو جانے پر بغیر طلاق کے خود بخود بائنہ ہو جاتی ہے۔" (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۴۷، طبع دہلی)

سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں بے شمار علماء اہل سنت نے لکھا ہے کہ بہت سے صحابہ کرامؓ اس آیت سے نکاح متعہ یا موقت کے جواز پر استدلال کیا کرتے تھے بلکہ اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰى اَجَلٍ مُسَمًّى﴾ "جو فائدہ تم ان سے اس (مہر کے عوض) میں ان عورتوں سے حاصل کرو ایک مقرر مدت تک۔"

علامہ بغوی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے: ﴿كان ابن عباس يذهب الی انها

محکمة و ترخص فی نکاح المتعة ﴾، ''عبداللہ بن عباس کہتے تھے کہ آیت متعہ محکم ہے (منسوخ نہیں ہے) اور نکاح متعہ کی اجازت دیتی ہے۔'' (معالم التنزیل بحاشیہ تفسیر خازن ج ۱ ص ۴۲۳)

سلیمان بن اشعث بجستانی، سنن ابی داؤد کے مؤلف، ابو داؤد کے بیٹے نے اپنی معروف کتاب ''المصاحف'' میں اسی آیت کی قرأت متعدد صحابہؓ سے اس طرح نقل کی ہے، چنانچہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہوئے درج کرتے ہیں ﴿''.....عن ابی نضرة قال قرات علی ان عباس فما استمتعتم به منهن ''فقال ابن عباس، الی اجل مسمی'' قلت! ما هکذا اقروها، قال! و الله لقد نزلت معها، قالها ثلاث مرات ﴾، ابونضرہ نے کہا کہ میں نے ابن عباسؓ کے سامنے ''فما استمتم به منهن'' پڑھی، تو ابن عباسؓ نے کہا! ''الی اجل مسمی'' میں نے کہا: میں تو اس آیت کو اس طرح نہیں پڑھتا، ابن عباسؓ نے کہا: اللہ کی قسم، یہ آیت ان الفاظ سمیت نازل ہوئی تھی، اس بات کو ابن عباسؓ نے تین بار دہرایا۔'' (کتاب المصاحف، ص ۳۴۲، طبع قاہرہ۔ تفسیر طبری، ج ۵، ص ۹، ۱۰، طبع مصر۔ مستدرک حاکم، ج ۲، ص ۳۰۵، طبع دکن)

ابوحیان اندلسی نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر میں اسی آیت کے ضمن میں لکھا ہے: ﴿و قراء ابیؓ و ابن عباسؓ و ابن جبیرؓ ''فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی فاتوهن اجور هن ﴾ ابی بن کعبؓ ابن عباسؓ اور ابن جبیرؓ نے اس آیت کو اس طرح (الی اجل مسمی کے ساتھ) پڑھا کرتے تھے۔'' (البحر المحیط، ج ۳، ص ۲۱۸، طبع جدید، بیروت)

سلیمان بن اشعث بجستانی نے کتاب المصاحف میں ابی بن کعبؓ سے بھی یہی ''الی اجل مسمی'' کی قرأت نقل کی ہے، ﴿عن سعید بن جبیر! فما استمتعتم .... الی اجل مسمی و قال هذه قراة ابی بن کعب ﴾ ''ابی بن کعب، سعید بن جبیرؓ نے اس آیت کو الی اجل مسمی کے ساتھ پڑھا اور کہا کہ یہ ابی بن کعبؓ کی قرأت ہے۔''

(کتاب المصاحف، ص ۲۸۶، مطبوعہ قاہرہ)

اسی طرح معروف صحابی رسولؐ عبداللہ بن مسعود ﷺ بھی اس آیت کو ان الفاظ سمیت پڑھا کرتے تھے چنانچہ نووی شارح مسلم لکھتے ہیں: ﴿و فی قراة ابن مسعود فما استمتعتم به

منهن الی اجل ﴾ ''ابن مسعود کی قرأت میں (اس آیت کے ساتھ) الی اجل .... ہے۔''
(نووی شرح صحیح مسلم، ج ۱، ص ۴۵۰، طبع لکھنؤ

عبداللہ بن عباس ﷺ کی قرآن فہمی تو اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے انہیں انصار مہاجرین کے شیوخ صحابہ ؓ کو قرآن اور اس کی تفسیر پڑھانے کے لئے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں باقاعدہ متعین کیا تھا چنانچہ آپ ان بزرگ اصحاب رسولؐ کو قرآن اور اس کی تفسیر پڑھاتے تھے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لئے دعا کی تھی، ﴿اللّٰھم علمه الكتاب﴾ ''اے اللہ اسے کتاب اللہ سکھا دے۔''

عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ وہ صحابی ہیں جن کی فضیلت صحیح بخاری میں اس طرح وارد ہوئی ہے: ﴿ذكر عبد اللّٰه بن مسعود عند عبد اللّٰه بن عمرو فقال ذاك رجل لا ازال احبه سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول: خذوا القرآن من اربعة من عبد الله بن مسعود فبداء به و سالم مولٰی ابی حذیفة و معاذ بن جبل و ابی بن کعب﴾

''عبداللہ بن مسعودؓ کا ذکر عبداللہ بن عمروؓ کے پاس ہوا۔ اس نے کہا: وہ تو ایسا شخص ہے جس سے میں مسلسل محبت کرتا چلا آیا ہوں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: تم قرآن چار اشخاص سے حاصل کرو، عبداللہؓ بن مسعود، چنانچہ آپ نے پہلے عبداللہؓ بن مسعود کا نام لیا، سالم مولی ابی حذیفہؓ، معاذ بن جبلؓ اور ابی بن کعبؓ سے۔''

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۹۰، باب مناقب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

لیکن افسوس صد افسوس امت نے پیغمبر ﷺ کی دیگر ہدایات کی طرح اس ہدایت پر بھی عمل نہیں کیا اور اپنے حکمرانوں کی خواہشات کو ہی اپنا دین بنایا، اور ان صحابہ کرامؓ کی قرأتوں کو شاذ وغیرہ کہہ کر مسترد کر دیا۔

مہر کی مقدار پر اعتراض

مؤلف اپنے اسلاف کی تقلید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''اب ذرا شیعہ کے ''متعہ کا جائزہ لیتے ہیں متعہ کی تعریف یہ ہے کہ کوئی بھی مرد کسی ایسی

عورت سے جو بغیر شوہر کے ہو بغیر کسی گواہ کے خاموشی کے ساتھ ایک سال، ایک مہینہ، ایک دن حتیٰ کہ صرف دس منٹ تک کے لئے نکاح متعہ کرسکتا ہے اور اس پر مہر ادا کرنے کا پابند ہے چاہے وہ مہر ایک پانی کا گلاس ہی کیوں نہ ہو اور جونہی وہ وقت ختم ہوگا تو مرد و عورت پھر آپس میں غیر محرم ہوں گے اب عورت اگر کوئی بچہ جنے گی تو وہ اس مرد کا وارث ہوگا، نہ اس بچے کے مال سے اس کا یہ باپ وارث بنے گا اس بچہ کی حالت بالکل وہی ہوگی جو آج کل امریکہ کے صدر یا یورپ کے حرامی بچوں کی ہے اس طرح اگر متعہ کی مدت کے دوران خود عورت یا مرد میں سے کوئی مرگیا تو وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔" (خطبات جیل ص ۲۵۶، ۲۵۷)

<u>الجواب</u>:۔ قرآن کریم میں **الی اجل مسمی** تو اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے شیعہ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، اس کی قرأت بھی اہل سنت کی مستند کتب اور جلیل القدر صحابہؓ سے ثابت ہے۔ اب مؤلف ناسمجھ بتائیں کیا دس منٹ یا ایک سال اجل کی حدود سے باہر ہے؟ دس منٹ بھی تو ایک اجل مسمی ہے۔ لیکن جو شخص عقد طے کرے گا وہ عام طور پر حسب ضرورت مدت ہی معین کرے گا۔

تاہم مؤلف کا یہ لکھنا کہ "مہر پانی کا ایک گلاس ہی کیوں نہ ہو" کیا اس احمق کے نزدیک کم از کم یا زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی رقم معین ہے؟ اگر پڑھنے کی صلاحیت ہے تو اپنی فقہ حنفی کی بنیادی کتب اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت کی شرح میں ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

﴿**وفيه دليل الجمهور لجواز النكاح بالخاتم الحديد**﴾ "اس میں جمہور کے حق میں دلیل ہے کہ لوہے کی انگوٹھی مہر کے بدلے بھی نکاح جائز ہے۔"

(فتح الباری، ج ۹، ص ۱۷۳، باب التزویج علی القرآن و بغیر صداق)

نکاح بالخصوص نکاح متعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک چادر یا کپڑے کا ٹکڑا دیا جاتا تھا، چنانچہ مروی ہے:

﴿**عن عبد الله رخص لنا ان ننكح المراة بالثوب**﴾، عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اجازت دی کہ ہم کسی عورت سے کپڑے کے مہر پر نکاح کریں۔" (بخاری کتاب النکاح مطبوعہ مصر، مسلم ج ا باب نکاح المتعہ)

حق مہر بالخصوص نکاح متعہ میں آٹے کی ایک مٹھی یا کھجور کی ایک مٹھی (جس میں زیادہ سے زیادہ آٹھ دس کھجوریں آسکتی ہیں) بھی ادا کی جاتی تھی، راوی کا بیان ہے:

﴿سمعت جابراً يقول كنا نستمتع بالقبضة من التمر و الدقيق ﴾ ''میں نے جابرؓ سے سنا وہ کہتے تھے، ہم مٹھی بھر کھجور یا آٹے کے بدلے (نکاح) متعہ کرتے تھے۔''

(صحیح مسلم، ج ا، باب نکاح المتعہ، ص ۴۵۱)

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نکاح میں صرف جوتوں کا ایک جوڑا حق مہر کے طور پر مقرر کیا، چنانچہ مروی ہے: ﴿ان امراة من بني فزارة تزوجت على نعلين فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم) ارضيت من نفسك و مالك بنعلين قالت نعم قال فاجاز ﴾ ''بنوفزارہ کی ایک عورت نے ایک جوڑا جوتوں کے مہر پر نکاح کرلیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے پوچھا: کیا تم اپنے نفس اور مال کو جوتیوں کے جوڑے کے عوض دینے پر راضی ہو؟ اس عورت نے کہا: جی ہاں، راوی صحابی کہتے ہیں: آپؐ نے اس نکاح کو جائز قرار دے دیا۔'' (سنن ترمذی، ج ا، ص ۱۵۲، باب ماجاء فی مھور النساء)

بغیر مہر کے بھی نکاح کو شریعت میں جائز قرار دیا گیا ہے، یعنی صرف قرآن کو مہر بنا دیا گیا۔ کوئی شخص پورے قرآن یا اس کے بعض حصے کا حافظ تھا چنانچہ اس کا نکاح اسی پر کر دیا گیا۔

(فتح الباری، ج ۹، ص ۱۷۴، طبع بیروت)

بلکہ امام نووی کی المجموع شرح المھذب، ج ۱۵، ص ۴۸۲، کتاب الصداق، طبع بیروت اور المغنی ابن قدامہ، ج ۶، ص ۶۸۰، طبع قاہرہ میں لکھا ہے کہ امام شافعی، امام احمد، سفیان ثوری امام اسحاق وغیرہ کے نزدیک مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں بلکہ ہر وہ چیز جو مال ہو اور بیع میں ثمن بن سکتی ہو وہ نکاح میں مہر بن سکتی ہے۔

مؤلف پانی کے گلاس کو حقیر سمجھ کر اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ درج بالا واقعات کو ایک بار بغور ملاحظہ کریں اور پھر اپنے مذہب کا مطالعہ بھی کریں جس کے مطابق شراب کے ایک گلاس ہی بلکہ ہونے والی زوجہ کے لئے شراب کے ایک گھونٹ اور خنزیر (کے گوشت کی چند بوٹیوں) پر بھی

نکاح جائز ہے۔ چنانچہ درس نظامی میں پڑھائی جانے والی فقہ حنفی کی استدلالی کتاب شرح وقایہ میں ہے: ﴿و صح النکاح بلا ذکر مهر و مع نفیه و بخمر و خنزیر ﴾ "مہر کا ذکر ہی نہ کیا جائے یا مہر دینے کی نفی کر دی جائے تب بھی نکاح درست ہے، اور اگر شراب اور خنزیر مہر میں دیا جائے تب بھی نکاح درست ہے۔" (شرح وقایہ، ج ۲، ص ۳۱، کتاب النکاح، مطبوعہ دہلی)

علامہ ابن حزم کے نزدیک تقریباً ہر چیز مہر بن سکتی ہے حتیٰ کہ پانی، کتا اور بلی وغیرہ بھی، (تفصیل کے لئے دیکھئے: "المحلی لابن حزم"، ج ۹، ص ۴۹۴، مسئلہ ۱۸۴۶، ۱۸۴۷)

نکاح متعہ میں گواہوں کا مسئلہ

جہاں تک نکاح دائمی یا نکاح موقت (متعہ) میں گواہی کا تعلق ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت بھی اس کے لئے گواہی شرط نہ تھی، چنانچہ بغیر گواہ کے نکاح متعہ ہوتے تھے، اس امر کو اہل سنت علماء بغیر کسی شک و شبہ کے تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ نووی نے شرح مسلم میں ایک حدیث کے ضمن میں صراحت کی ہے، سبرہ بن معبد صحابی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے سال ﴿امر اصحابه بالتمتع من النساء﴾ اپنے اصحاب کو عورتوں سے متعہ کرنے کا حکم دیا، کہتے ہیں کہ میں اور بنو سلیم میں سے میرا ایک دوست نکلے، حتیٰ کہ ہمیں بنو عامر کی ایک جوان لڑکی ملی، ﴿کانها بکرة عیطاء﴾ جو لمبی گردن والی جوان موٹی تازی اونٹنی کی طرح تھی، ہم دونوں نے اپنے آپ کی اس سے بات کی اور دونوں نے (اپنی اپنی) چادریں (مہر کے طور پر) اس کے سامنے پیش کیں وہ معائنہ کرنے لگی، چنانچہ اس نے مجھے میرے ساتھی سے زیادہ حسین وجمیل پایا، اور میرے دوست کی چادر میری چادر سے اچھی لگی، میرے دوست نے ﴿ینظر الی عطفها﴾ سر سے لے کر رانوں تک خوب غور سے دیکھا، اس عورت نے کچھ دیر اپنے دل میں سوچا، پھر میرے دوست کی بجائے مجھے پسند کر لیا، جن عورتوں سے ہم نے نکاح متعہ کیا، تین دن تک وہ ہمارے پاس رہیں، پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جدا کر دینے کا حکم دیا۔"

اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے اس واقعہ کو دلیل بنا کر نووی نے لکھا ہے اور ﴿و فی هذا الحدیث دلیل علی انه لم یکن فی نکاح المتعة ولی و شهود ﴾، "اس حدیث میں

دلیل ہے کہ نکاح متعہ میں ولی اور گواہوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

(صحیح مسلم مع شرح نووی، ج ا، ص ۴۵۱)

ناظرین کرام:۔غور فرمائیں کہ یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ اگر متعہ کے نکاح کو زنا قرار دینا ہے تو یہ ضرب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑتی ہے، کیا رسول اللہ صلی وآلہ وسلم نے زنا کا حکم اور اجازت دی؟ خواہ ایک لحہ کے لئے بھی ہو، ہرگز نہیں کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، جب کہ نہ ولی سے اجازت کی ضرورت تھی نہ گواہوں کی موجودگی لازم۔شریعت اسلامی سے ناسمجھ تو اسے زنا ہی کہیں گے، اگر کسی غیر مسلم نے پیغمبر اکرم ﷺ کی اس اجازت اور حکم کو اسی مفہوم میں لے لیا جس میں تم اب لے رہے ہو، تو تمہارے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔ پیغمبر ﷺ کی عزت وحرمت کا تو لحاظ اور خیال رکھیں صحابہؓ کے عمل کو کس میزان میں رکھیں گے؟ کیا مکہ پر حملہ کے بعد فتح مکہ کی خوشی میں اسی طرح جشن منانا تھا کہ مکہ میں خوبصورت عورتوں کو تلاش کر کے ان سے بالکل معمولی مہر پر تین دن تک متعہ (....) کرتے رہے نکاح متعہ کو تم اب کیا قرار دیتے ہو؟ صحابہؓ کے لئے بھی وہی قرار دو، پھر تمہارے دفاع صحابہ کا احمقانہ دعویٰ سب کے سامنے کھل جائے کہ اصلی مقصد توہین رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ ہے۔ کیا اصحاب فتح مکہ کے لئے روانگی سے لیکر مکہ سے مدینہ واپسی تک چند دن یا مہینہ ڈیڑھ مہینہ اپنی جنسی خواہشات پر قابو نہیں پا سکتے تھے؟ کیا شمع رسالتؐ کے پروانے، جان نثاران رسولؐ اتنا ضبط بھی نہ کرسکتے تھے؟ پھر پیغمبر ﷺ نے بھی ان کی خواہش ومطالبے پر انہیں اس کی اجازت دیدی تاکہ وہ فتح کے جشن کے سلسلے میں رنگ رلیاں مناتے پھریں۔ **استغفر الله العظيم** تم اپنی حماقت اور نادانی سے ایک فطری ضرورت کو جائز طریقے سے پورا کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈال کر بہت بڑے جرم کا ارتکاب کررہے ہو۔ فقہ حنفی کی معروف کتاب فتاویٰ قاضی خان میں ہے: **﴿فصل في شرائط النكاح منها الشهادة عندنا و قال مالك رحمه الله الشرط هو الاعلان دون الشهادة حتى لو تزوجها بحضرة الشهود و شرط الكتمان لا يجوز ولو تزوجها بغير شهود و شرط الاعلان جاز﴾**، شرائط نکاح، ان میں سے ایک ہمارے نزدیک گواہی ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ گواہی نہیں بلکہ اعلان شرط ہے، حتیٰ کہ اگر

گواہوں کی موجودگی میں نکاح کیا اور اس نکاح کو چھپائے رکھنے کی شرط عائد کی، تو نکاح جائز نہیں ہے، اور اگر بغیر گواہوں کے نکاح کرے اور اعلان کی شرط پائی جائے تو نکاح جائز ہے ... (فتاویٰ قاضی خان ج ا، ص ۱۵۳، طبع نول کشور، بدائع الصنائع علامہ کاسانی ج ۲، ص ۲۵۲، طبع کراچی)

یعنی نکاح کا اعلان ضروری ہے، جس سے مراد یہ ہے معاشرے کے دوسرے افراد کو اس نکاح کا علم ہو جائے کہ فلاں مرد و عورت نے باہمی عقد کر لیا ہے اگر تنازع کی صورت میں اس کی احتیاج ہوئی تو یہی گواہی ہو جائے گی۔

مؤلف کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے سرکاری مذہب چار ائمہ (چار ستونوں) میں سے ایک بڑے اہم ستون امام مالک کے نزدیک دائمی نکاح میں بھی گواہی شرط نہیں ہے، بلکہ نکاح کا اعلان شرط ہے، صاحب ہدایہ اس سلسلے میں امام مالک کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿اعلم ان الشهادة شرط فی باب النكاح لقوله عليه السلام لا نكاح الا بشهود و هو حجة علی مالك رحمة الله عليه فی اشتراط الاعلان دون الشهادة ﴾، جان لیں کہ شہادت نکاح میں شرط ہے بر بناء فرمان رسول علیہ السلام! نکاح نہیں ہے مگر گواہوں سے، یہ مالک رحمتہ اللہ علیہ کے خلاف حجت ہے جو گواہی نہیں بلکہ صرف اعلان نکاح کو شرط قرار دیتے ہیں۔"

(ھدایہ آخرین کتاب النکاح ج ۲ ص ۳۰۶ طبع دہلی)

اعلان سے مراد گلے میں ڈھول[1] ڈال کر گلی گلی ڈھنڈورہ پیٹنا نہیں ہے نہ ہی اخبار، ریڈیو یا ٹی وی میں اشتہار و اعلان شائع و نشر کرنا مراد ہے بلکہ صرف اتنا کہ معاشرے کے افراد کو علم ہو جائے کہ فلاں مرد و عورت نے باہم عقد نکاح کر لیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب دائمی نکاح بھی بغیر گواہی کے جائز ہے تو نکاح موقت بدرجہ اولیٰ بغیر گواہی کے جائز اور درست ہوگا۔

نکاح متعہ سے پیدا ہونے والے قریشی

جناب مؤلف صاحب! آپ نے کہاں سے پڑھ لیا کہ نکاح متعہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا بچہ باپ کا وارث نہیں ہوگا اور باپ اس کا وارث نہیں ہوگا کیا آپ نے اس سلسلے میں

---

[1] شرح العنایہ بر حاشیہ فتح القدیر ج ۲ ص ۵۰۳ طبع مصر۔

تفصیلات کتب حدیث و فقہ اسلامی میں نہیں پڑھیں وائے تمہاری جہالت پر، اس پر طرہ یہ کہ جماعت کا سربراہ اور کتابوں کے مؤلف بننے کا شوق بھی دامن گیر ہے۔ ملاں صاحب کہتے ہیں کہ متعہ کے نکاح سے بچے پیدا ہوں گے تو انہیں اپنا باپ معلوم نہ ہوگا، اس سلسلہ میں جواباً عرض ہے کہ آپ کو پتہ ہونا چاہئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے جو متعہ ہوتا رہا ہے اس کے نتیجے میں بہت سے لوگ پیدا ہوئے اور انہیں حرامی اور ولدالزنا نہیں قرار دیا گیا، بلکہ اپنے آباء سے منسوب اور ان کے وارث تھے۔

چنانچہ امام طحاوی نے اس کا تذکرہ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کے حوالے سے کیا ہے، لکھتے ہیں: ﴿عن سعید بن جبیر قال سمعت عبد الله بن الزبیر یخطب و هو یعرض یا بن عباس یعیب علیه قوله فی المتعة فقال ابن عباس یسال امه، ان کان صادقاً فسألها، فقالت: صدق ابن عباس، قد کان ذلك فقال ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما لو شئت لسمیت رجالا من قریش ولدوا فیها﴾، سعید بن جبیر سے مروی ہے، کہ انہوں نے عبداللہ بن زبیر کو خطبہ دیتے ہوئے سنا کہ وہ ابن عباسؓ پر تعریض کر رہے تھے، ابن عباسؓ پر نکتہ چینی کرتے تھے کہ یہ متعہ کے جواز کے قائل ہیں، ابن عباسؓ نے کہا، اسے چاہئے کہ اپنی ماں سے اس بارے میں پوچھے اگر وہ سچا ہے تو، (جب ابن زبیر نے ماں "اسماء بنت ابوبکر" سے پوچھا) تو اس کی ماں نے کہا: ابن عباسؓ نے سچ کہا ہے، یہ متعہ واقعی ہوتا تھا، اب ابن عباس نے کہا، اگر تم چاہو تو میں ان قریشی مردوں کے نام بھی تمہیں بتا دوں جو متعہ کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔"

(شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۱۴ باب نکاح المتعۃ، طبع کتب خانہ رحیمیہ دیوبند)

ان کے علاوہ حضرت سلمہ بن امیہ رضی اللہ عنہ نے ام راکہ سے نکاح متعہ کیا ہے علامہ ابن حزم اندلسی خلف بن امیہ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

﴿فولد سلمة بن امية، معبد بن سلمة امه ام راکة نکحها سلمة نکاح متعة فی عهد عمر او ف عهد ابی بکر فولد له منها معبد﴾

"حضرت سلمہؓ بن امیہ کا صرف ایک بیٹا معبد تھا اس کی ماں کا نام ام راکہ تھا جس سے

حضرت سلمہؓ نے عہد عمرؓ یا زمانہ ابوبکرؓ میں نکاح متعہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں ''معبد'' پیدا ہوئے۔''
(جمہرۃ انساب العرب ص ۱۵۹ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

معلوم ہوا کہ بہت سے ''قریشی'' اور صحابہ زادے متعہ کی اولاد تھے، ان کی نسل غالباً اب تک باقی ہوگی، یہ نکاح متعہ عجمی ایرانیوں نے مروج نہیں کیا بلکہ اس کی بنیاد عربی قریشیوں نے رکھی اور بقول ابن حزم تمام مکی فقہا اس کے قائل تھے ابن جریج کا بڑے شوق سے اس پر عمل آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

یہ قریشی جو نکاح متعہ کی وجہ سے پیدا ہوئے، اپنے والدین کے وارث ہوئے ہوں گے ورنہ ابن عباسؓ ان کے نام کیسے بتا سکتے کہ وہ کون لوگ ہیں جو متعہ سے پیدا ہوئے ہیں یہ معروف لوگ ہوں گے اور اپنے والدین سے منسوب اور ان کے وارث ہونگے، جیسا کہ اسلامی قانون وراثت کا تقاضا ہے اگر حکمرانوں نے اپنی جابرانہ رائے سے اس پر خط تنسیخ کھینچ دیا تو یہ ناجائز نہیں ہوسکتا، یہ بھی قابل غور امر ہے کہ اسما بنت ابوبکرؓ متعہ کے جواز کی قائل تھیں، اس کی حقیقت سے واقف تھیں لیکن ابن زبیر نے کبھی ان سے اس سلسلے میں سوال نہ کیا بلکہ سابق حکمرانوں کے فتووں کو ہی دین سمجھے رکھا جب ابن عباسؓ سے اختلاف ہوا تب اپنی ماں سے پوچھا اور حقیقت حال واضح ہوگئی، حقائق اسی طرح مٹائے جاتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔

چونکہ آپ ناصبی ہیں اس لئے آپ امریکی صدر کو یاد رکھتے ہیں درحقیقت امریکہ اور اس کا صدر ہی تمہارا آقا و مالک ہے اسی کے آلۂ کار بن کر تم بے گناہ مسلمانوں کا خون بہانے کے فتوے جاری کرتے ہو، کیونکہ وہ حرامی ہیں اس لئے تم ان کے دفاع میں دوسرے مسلمانوں پر اس حرام کاری کے جواز کا الزام لگاتے ہیں۔

لمحہ فکریہ!

ابتدائے اسلام سے فتح مکہ تک تقریباً اٹھارہ سال بنتے ہیں اگر بقول شما نکاح متعہ زنا، اس کا مرتکب زناکار اور فاسق و فاجر ہے تو اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر با انصاف جواب دیجئے کہ کیا وہ صحابہ کرامؓ اور حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر جنہوں نے نکاح متعہ کیا تھا کم و بیش اٹھارہ سال زنا

کرتے رہے اور مرتکب زنا ہو کر فاسق و فاجر ہو گئے ہیں؟ جو اس عرصہ میں نکاح متعہ سے بچے پیدا ہوئے تھے کیا آپ انہیں حرام زدہ کہیں گے؟ (نعوذ باللہ من ذالک) نیز جو صحابہؓ و صحابیاتؓ اور تابعین و تابعیات تادم حیات نکاح متعہ کے عامل اور قائل رہے ہیں ان کے متعلق کیا رائے ہے؟؟

باہم وارث نہ ہونے کا نکاح کی عدم صحت سے کوئی تعلق نہیں ہے

جہاں تک عورت اور مرد کے باہم وارث نہ ہونے کا تعلق ہے تو نکاح موقت میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے، یہی قانون اس بارے میں قرین انصاف و مصلحت ہے۔ جب عقد دائمی نہیں ہے تو یہ حق وراثت بھی انہیں حاصل نہ ہوگا، جبکہ فقہ حنفی میں بعض حالات میں عقد نکاح دائمی میں بھی مرد و عورت ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔

یہ دعویٰ کہ ممتوعہ عورت وارث نہیں ہوتی اس لیے زوجہ نہیں ہے بالکل باطل اور مضمحل ہے توارث زوجیت کے لوازمات میں سے نہیں ہے اس کے منتفی ہونے سے زوجیت کا انتفا لازم نہیں آتا مشہور ضابطۂ قانون ومامن عام الاوقد خص کے تحت اسلامی شریعت میں بعض تخصیصات سنت سے ثابت ہیں۔ سنت قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل اور مبہم مسائل کی شرح و توضیح اس کے ساتھ ساتھ سنت قرآن حکیم کے عام احکام کی تخصیص اور مطلق تقیید بھی کرتی ہے جیسا کہ فقہی کتب میں موانع ارث کا باب موجود ہے زوجہ کے لئے میراث عرض مفارق ہے عرض لازم نہیں ہے اسی طرح ممتوعہ سے مفارقت کے لیے طلاق کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ انقضائے مدت ہی طلاق کا قائم مقام ہے لہٰذا ان عوارض کے منتفی ہونے سے اس کی زوجیت کا منتفی و مسلوب ہونا لازم نہیں آ سکتا۔

چنانچہ فقہ حنفی کی مسائل میراث پر مخصوص اور معروف کتاب ''سراجی فی المیراث'' جو ہمیشہ سے فقہ حنفیہ کی ایک اہم درسی کتاب رہی ہے اور آج بھی دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والے مدارس میں درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے اس میں موانع ارث کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿**المانع من الارث اربعة الرق و افراً كان او ناقصاً والقتل الذی يتعلق به وجوب القصاص او الكفارة و اختلاف الدينين و اختلاف الدارين اما حقيقةً كالحربی و الذمی** ..... ﴾ مانع ارث چار ہیں: (۱) ''غلامی'' چاہے پوری

غلامی ہو یا ناقص صورت میں۔(۲) وہ قتل جس سے قصاص یا کفارہ واجب ہوتا ہے۔(۳) دین کا اختلاف۔(۴) دار (ملک) کا اختلاف جو حقیقی ہو، جیسے حربی اور ذمی یا دو مختلف ملکوں کے حربی باشندے (میاں بیوی)...... (سراجی فی المیراث ص ۲۱۴ طبع کانپور، فتاویٰ شامی ج ۵، ص ۵۴۱، طبع لولاق مصر، تبیین الحقائق ج ۶ ص ۲۳۹ طبع ملتان، کشاف القناع ج ۴ ص ۴۴۸ طبع مکہ مکرمہ)

مزید تفصیلات کے لئے عصر حاضر کے ایک فاضل مصنف ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی استاد جامعہ دمشق شام کی شہرۂ آفاق کتاب ''الفقہ الاسلامی وادلیتہ'' جلد ۸ ص ۲۵۴ تا ص ۲۶۸ الفصل الخامس موانع الارث مطبوعہ دار الفکر دمشق بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

ان صورتوں میں نکاح تو درست ہے لیکن میاں بیوی ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے، معلوم ہوا کہ صرف نکاح متعہ ہی ایسا نکاح نہیں ہے جس میں زوجین باہم وارث نہیں ہوں گے بلکہ اہل سنت کے نزدیک بعض حالات میں دائمی نکاح میں بھی زوجین ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے، لہٰذا وارث ہونے یا نہ ہونے کا نکاح کی صحت یا عدم صحت سے کوئی تعلق نہیں ہے، مؤلف اور ان کے ہم عقیدہ مُلّوانے عوام کالانعام کو شیعہ کے خلاف اکسانے کے لئے جاہلانہ باتیں پیش کرکے یہ گمان کررہے ہیں کہ شاید ہم نے کوئی بڑا علمی معرکہ سر کر لیا ہے، جب ملاں ہی اصل مسائل اور حقائق سے بے علم ہے تو دوسرے عوام کی رہنمائی کیا کرے گا؟

ع   آں خویشتن گم است کرا رہبری کند؟

اگر متعہ آپ کے نزدیک اسلام کے پاکیزہ معاشرے اور دینی ماحول میں زنا ہی کا دوسرا نام ہے، تو انصاف و دیانت سے بتائیں کہ دیگر متعدد مواقع کے علاوہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کی اجازت کیوں دی؟ اور جن صحابہ کرامؓ نے ان مواقع اور بالخصوص فتح مکہ کے موقع پر اس پر دل کھول کر عمل کرتے ہوئے کیوں لطف و سرور حاصل کیا؟ اگر تمہارے بقول یہ خالص زنا ہی ہے تب پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے اصحاب کرامؓ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا مکہ فتح ہونے تک پاکیزہ اسلامی معاشرہ قائم نہیں ہوا تھا؟ کیا دس ہزار فرزندان توحید و شمع رسالت کے پروانوں پر ابھی اسلامی تعلیمات کا اثر نہیں ہوا تھا بلکہ

جاہلی معاشرے کے اتنے اثرات موجود تھے کہ وہ چند دن بھی عورتوں کے ذریعے سے جنسی جذبات وشہوات کی تسکین کے بغیر نہ رہ سکتے تھے؟ یا تو ذرا دل کھول کر ان صحابہ کرامؓ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کریں، یا انسان کی ایک زندہ اور دائمی فطری ضرورت کے مطابق اسلام کے اس قانون کو درست تسلیم کرلیں۔

کیا نکاح متعہ آیت ''اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ'' سے منسوخ ہو چکا ہے؟

''خطبات جیل'' کے ص ۲۵۷ پر ''متعہ کی حرمت قرآن کریم سے ثابت ہے'' کا عنوان قائم کرتا ہے بعد ازاں لکھتا ہے کہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسلام سے قبل دور جاہلیت میں جیسے شراب، جوا، سود، خنزیر، مردار، خون وغیرہ جائز سمجھے جاتے تھے اس طرح متعہ بھی جائز سمجھا جاتا تھا اسلام نے جس طرح باقی چیزوں کی حرمت کا اعلان کر کے ان کا خاتمہ کر دیا اسی طرح متعہ کی یہ آیت ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ﴾ یعنی وہ لوگ کامیاب ہونے والے ہیں جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی منکوحہ بیویوں اور مملوکہ باندیوں کے کسی دوسری طرف نہیں دیکھتے ہیں، تو اس آیت میں صرف دو صورتیں ایسی ہیں جہاں انسان کو اجازت ہے (۱) منکوحہ بیوی (۲) مملوکہ باندی۔ یہاں تیسری صورت متعہ والی نہیں ہے تو اس آیت سے متعہ سمیت جاہلیت کے وہ تمام طریقے جو دوسری عورتوں سے فائدہ اٹھانے کے مروج تھے ختم ہو چکے ہیں۔ (خطبات جیل ص ۲۵۷، ۲۵۸)

الجواب:۔ مؤلف کا یہ کہنا کہ اسلام سے قبل دور جاہلیت میں جیسے شراب، جوا، سود، خنزیر، مردار خون وغیرہ جائز سمجھے جاتے تھے اس طرح متعہ بھی جائز سمجھا جاتا تھا تو آپ سے مکرر سوال ہے کہ آیا فتح مکہ تک اسلامی معاشرہ خود مسلمانوں کے اندر بھی قائم ہوا تھا یا نہیں؟ اگر ہوا تھا تو اس دس ہزار صحابہؓ کو پیغمبر اسلام ﷺ نے اس موقع پر نکاح متعہ کی اجازت کیوں دی؟ کیا اس وقت تک وہ لوگ جہالت کی رسموں اور عادتوں پر عمل پیرا تھے؟ جبکہ دیگر سب اشیاء تو اس سے بہت پہلے حرام قرار دی جا چکی تھیں یہ صرف نکاح متعہ ہی کے بارے میں بار بار کیوں حکم میں تبدیلی اور ترمیم ہوتی رہی؟ کیوں استثنائی احکام جاری ہوتے رہے؟ کیا صحابہ کرامؓ اس عمل سے اللہ و رسولؐ کی خاطر با

نہیں آ سکتے تھے؟ ویسے اللہ تعالیٰ نے اسی امر کی جانب اشارہ کیا ہے ﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۷) ''اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو گیا کہ تم اس سلسلے میں اپنے آپ سے بھی خیانت کا ارتکاب کرتے تھے چنانچہ اب ان سے (رمضان کی راتوں میں) مباشرت کرو۔'' ان مذکورہ دلائل کو دوبارہ بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہر سوال کا جواب خوب غور و خوض کر کے دیں۔

مؤلف نے جو آیت حرمت متعہ کی دلیل کے طور پر پیش کی ہے اس کا حرمت نکاح متعہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اس لئے کہ یہ آیت تو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی، جبکہ نکاح موقت (متعہ) کی حرمت پر اہل سنت کی دلیل احادیث میں وضاحت ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع پر پیغمبر اسلام ﷺ نے متعہ کو ممنوع قرار دیا تھا۔ یہ بحث الگ ہے اس لئے کہ یہ احادیث پیغمبر اسلام ﷺ پر سرکاری مذہب کے بانیوں کی طرف سے افتراء کردہ ہیں ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔

علامہ شبیر احمد عثانی اس آیت ﴿اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ کے بارے میں لکھتے ہیں..... ﴿الاية التى اشار اليها مكية...﴾ وہ آیت جس کی جانب اشارہ کیا ہے، مکی ہے... '' (فتح الملہم شرح مسلم ج ۳ ص ۴۴۱ طبع بجنور)

علامہ آلوسی بغدادی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿بان الاية مكية بمعنى انها نزلت قبل الهجرة و اشكل الاستدلال بها على تحريم المتعة بعد تحليلها بعد الهجرة لكون دليل التحليل مخصصاً لعمومها..... و يحتاج حينئذ الى دليل غيرها﴾ ''یہ کہ آیت مکی ہے اس معنی میں کہ ہجرت سے قبل نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ متعہ ہجرت کے بعد بھی حلال تھا، اس لئے اس آیت سے حرمت متعہ پر استدلال مشکل ہے، اس وجہ سے کہ حلت کی دلیل اس آیت کے عموم کو تخصیص کرنے والی ہے چنانچہ حرمت متعہ کے لئے کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہے۔'' (تفسیر روح المعانی ج ۱۸ ص ۱۰، طبع ادارۃ الطباعۃ المنیر یہ مصر)

علامہ وحید الزمان حیدر آبادی اپنی شہرۂ آفاق عربی کی لغت ''انوار اللغۃ'' جو تھوڑا عرصہ پہلے کراچی سے لغات الحدیث کے نام سے شائع ہوئی ہے اس کی جلد ۵ ص ۹ طبع بنگلور میں لکھتے

ہیں: ''متعہ اوائل اسلام میں تھا یعنی درست تھا، جب یہ آیت اتری ﴿اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِہِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ﴾ تو وہ حرام ہو گیا مگر یہاں پر اعتراض ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور متعہ اس کے بعد کئی بار درست ہوا۔ (کذافی تیسیر الباری شرح بخاری، ج ۶، ص ۱۱۱، طبع کراچی)

بعد ازاں علامہ وحید الزمان اسی کتاب میں لفظ ''شق'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ آیت دو سورتوں میں ہے اور وہ دونوں سورتیں بالاتفاق مکی ہیں اور متعہ قطعاً ان آیتوں کے اترنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال کر دیا تھا۔ (لغات الحدیث ج ۳ ص ۱۰۵)

علامہ شبیر احمد عثمانی اپنی بیش بہا تصنیف فتح الملہم شرح صحیح مسلم جلد ۳ ص ۴۰۰ مطبوعہ بجنور میں اس سلسلے میں وارد روایات ذکر کر کے ان سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿و علی هذا فالمتعة او النكاح الموقت لم يكن سفاحاً محضاً و ان كان قريباً منه و لا نكاحاً مطلقاً كما هو الظاهر﴾ ''سو ان روایات کی بناء پر متعہ یا نکاح موقت محض شہوت رانی (زنا) نہ تھا اگرچہ اس کے قریب قریب تھا نہ مطلق نکاح تھا، جیسا کہ ظاہر ہی ہے۔

''اسکے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی اپنی تحقیق یوں درج کرتے ہیں ﴿و حينئذ فالمتعة او النكاح الموقت كان نكاحاً قاصراً قد حرم تحريما مؤبداً بعد الاباحة و كان لا يفيد الاحصان و لا يثبت به احكام الطلاق و المواريث و الحقوق التى تثبت بالنكاح و ان كان له شبه بالنكاح من وجه و هكذا المراة المستمتع منها كانت زوجة ناقصة لا يثبت لها جميع احكام الزوجة الكاملة و من ههنا يظهر لك ان قوله عزوجل الا على ازواجهم او ما ملكت ايمانهم فانهم غير ملومين فمن ابتغى وراء ذلك فاولئك هم العادون لم يكن صريحاً فى ابطال المتعة و تحريمها فان المراة المستمتع منها لا يمتنع ان تكون داخلة فى الازواج لبعض معانى الزوجية كما قررنا من اطلاق النكاح والتزويج على المتعة و تلبسها بامور تفارق بها الزنا المجرد و كيف يقال ان الآية المذكورة صريحة في تحريم المتعة مع ان الاية مكية و لم يقل احد من العلماء فيما بلغنا بتحريم المتعة قبل خيبر و ان اختلفت اقوالهم فيما بعدها﴾

تب متعہ یا نکاح موقت ایک چھوٹے درجے کا نکاح ہے جو مباح ہونے کے بعد دائمی طور پر حرام کر دیا گیا، اس نکاح سے محصن ہونے کا فائدہ حاصل نہ ہوتا تھا نہ ہی اس سے طلاق، وراثت اور دیگر وہ حقوق ثابت ہوتے تھے جو (دائمی) نکاح سے ثابت ہوتے ہیں اگرچہ ایک لحاظ سے یہ بھی نکاح ہی تھا۔ اسی طرح ممتوعہ عورت ''زوجہ ناقصہ'' ہوتی تھی اس کیلئے زوجہ کاملہ کے حقوق ثابت نہیں ہوتے تھے یہیں سے تم پر یہ امر ظاہر ہوگا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد الا علی ازواجہم..... الخ

(مگر ان کی بیویوں پر یا جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ ہوئے تو وہ قابل ملامت نہیں ہیں جو کوئی اس سے آگے بڑھے وہی زیادتی کرنے والے ہیں) متعہ کے ابطال اور حرمت پر صریح نہ تھا۔ چنانچہ اس امر میں کوئی امتناع نہیں ہے کہ ممتوعہ عورت بھی زوجیت کے بعض معانی کے اعتبار سے ازواج میں داخل ہو، جیسا کہ ہم نے متعہ پر نکاح اور تزویج کا اطلاق ثابت کیا ہے اسی طرح یہ (نکاح متعہ) بعض ایسے امور پر مشتمل ہے جن کی بنیاد پر محض زنا اس سے جدا ہو جاتا ہے یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ آیت مذکورہ حرمت متعہ کے باب میں صریح ہے حالانکہ آیت مکی ہے جبکہ ہمارے علم کے مطابق کسی ایک عالم سے بھی خیبر کے غزوہ سے پہلے حرمت متعہ کا قول منقول نہیں ہے۔ اگرچہ بعد از غزوہ خیبر علماء کے اقوال حرمت متعہ کے باب میں مختلف ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے مؤلف کے تمام ہفوات کا جواب دے دیا ہے لہٰذا ان کو اپنی جہالت اور حماقت پر چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہئے۔ ان ناقابل تردید حقائق سے روز روشن کی طرح عیاں ہوا کہ جس آیت کو ناسخ تصور کیا جاتا ہے وہ مکی ہے جو آیت متعہ (مدنی) سے قبل ہجرت سے پہلے نازل ہوئی جبکہ آیت متعہ اس کے بعد نازل ہوئی ہے یہ امر انتہائی ممتنع اور محال ہے کہ ناسخ پہلے اور منسوخ بعد میں نازل ہو اور قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت کے بھی خلاف ہے۔

نکاح متعہ پر اٹھائے گئے اعتراضات کے مدلل جوابات کئی صدیوں پہلے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے شاگردوں نے دیئے۔ ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے اپنے شاگردوں کو جو کچھ بتایا ہے اسے بھی ہدیہ قارئین کیا جائے۔ عصر حاضر میں نکاح متعہ کے بارے میں جو اعتراضات و اشکالات عائد کئے جاتے ہیں آج سے کئی صدیوں پہلے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی

خدمت میں زانو تہہ کرنے والے تلامذہ نے ان کا مدلل جواب دے دیا ہے اس سلسلے میں اہل بیتؑ میں سے چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک شاگرد ابوجعفر محمد بن نعمان صاحب الطاقؒ جو شیعہ اکابر علماء اور علم کمال و مناظرہ کے مشہور ماہرین میں سے تھے بڑے ذہین و فطین اور حاضر جواب تھے انہوں نے مختلف موضوعات پر شیعہ مخالفین سے مناظرے کیے اس کے علاوہ انہوں نے ''الرد علی الخوارج و الکلام علیھم'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے ان کے اور اہل سنت کے امام ابوحنیفہ کے درمیان ایک دلچسپ اور فیصلہ کن مناظرہ ہوا اس کا تذکرہ حضرت شیخ کلینیؒ نے جن الفاظ میں کیا ہے اسے نقل کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا ملاحظہ فرمایئے:

﴿سال ابو حنیفة ابا جعفر محمد بن النعمان صاحب الطاق فقال له یا ابا جعفر ما تقول فی المتعة أتزعم انها حلال؟ قال نعم قال فما یمنعك ان تأمر نسائك ان یستمتعن و یکسبن علیك فقال له ابو جعفر لیس کل الصناعات یرغب فیها و ان کانت حلالا و للناس اقدار و مراتب یرفعون اقداهم ولکن ما تقول یا ابا حنیفة فی النبیذ أتزعم انه حلال؟ فقال نعم قال فما یمنعك ان تقعد نسائك في الحوانیت نباذات فیکتسبن علیك؟ فقال ابو حنیفة واحدة بواحدة و سهمك انفذ.........﴾

ابوحنیفہ نے ایک دفعہ ابوجعفر محمد بن نعمان صاحب الطاق سے سوال کیا کہ اے ابوجعفر متعہ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ کیا تمہارے خیال میں یہ حلال ہے؟ صاحب طاق نے جواب دیا: ہاں، تب ابوحنیفہ نے کہا: پھر تمہیں کونسی چیز مانع ہے کہ تم اپنی عورتوں کو حکم دو کہ وہ متعہ کریں اور دولت کما کر تمہارے لیے لائیں؟ ابوجعفر نے اسے کہا: ہر ایک پیشے کو مرغوب نہیں سمجھا جا سکتا خواہ وہ حلال ہی ہو، لوگوں کی اپنی اپنی اقدار اور مراتب ہوتے ہیں وہ اپنی قدر و منزلت کو قائم رکھتے ہیں لیکن اے ابوحنیفہ تم بتاؤ نبیذ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو، کیا یہ حلال ہے؟ ابوحنیفہ نے کہا: ہاں حلال ہے۔ صاحب الطاق نے کہا: پھر تمہیں کون سی چیز مانع ہے کہ تم اپنی عورتوں کو شراب فروشی کی دکانوں پر بٹھاؤ تا کہ وہ نبیذ فروخت کریں اور تمہارے لیے دولت کما کر لائیں؟ ابوحنیفہ نے کہا: یہ تو ایک کے بدلے میں ایک بات ہوئی لیکن تمہارا تیر زیادہ نشانے پر لگا ہے (یعنی مؤثر ہے) پھر ابو

حنیفہ نے کہا: اے ابو جعفر سورۂ سأل سائل (سورۂ معارج) میں آیت حرمت متعہ پر دلالت کرتی ہے اور نبی ﷺ سے متعہ کے منسوخ ہونے کی روایت آئی ہے چنانچہ ابو جعفر نے کہا: اے ابو حنیفہ سورۂ معارج مکی ہے اور آیت متعہ مدنی ہے اور تمہاری روایت شاذ و مردود ہے، پس ابو حنیفہؒ نے کہا: آیت میراث بھی متعہ کے منسوخ ہونے کی دلیل ہے۔ ابو جعفر صاحب الطاق نے کہا: نکاح تو میراث کے بغیر بھی ثابت ہوتا ہے۔ ابو حنیفہ نے کہا: اس بات کی تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ ابو جعفر نے کہا: اگر کوئی مسلمان مرد کسی اہل کتاب عورت سے نکاح کرے پھر وہ شخص فوت ہو جائے تو اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے (وہ عورت اس کی وارث ہوگی یا نہیں؟) ابو حنیفہ نے کہا: وہ عورت اس مرد مسلمان کی وارث نہ ہوگی۔ ابو جعفر نے کہا: بغیر میراث کے نکاح ثابت ہوگیا ہے (اب بات کرو) بعد ازاں دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ (فروع کافی ج ۲ ص ۱۹۱ طبع لکھنؤ)

قابل قدر قارئین! مذکورہ بالا علمی مباحثہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہے کہ موجودہ زمانے کے کچھ نافہم لوگ جن دلائل کی بنیاد پر نکاح متعہ کی حرمت کا اظہار کرتے پھر رہے ہیں وہی دلائل ان کے سابقہ اماموں کے پیش نظر تھے جن کا مسکت اور دندان شکن جواب ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ایک ادنیٰ شاگرد نے امام ابو حنیفہ کے سامنے پیش کر کے انہیں مبہوت اور لاجواب کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے پیروکار آج تک لاجواب ہوکر بھی اپنے غلط موقف سے دستبردار نہیں ہوئے، اسے ضد، ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتا دیا ہے ﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ آپ کی خواہش ہو تب بھی اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

حضرت عمر کے اعلان (حرمت متعہ) پر صحابہ کرامؓ کا اختلاف

مؤلف یوں رطب اللسانؔ ہے کہ:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہایت ہی اہتمام اور تاکید کے ساتھ پوری مملکت اسلامیہ میں اس بات کی تشہیر کرا دی کہ متعہ حرام ہے ہر چھوٹے بڑے نو مسلم و قدیم الاسلام کو جان لینا چاہیے کہ اب اگر کسی نے متعہ پر عمل کیا تو اسے وہی سزا دی جائے گی جو زانی کو دی جاتی ہے حضرت

عمر کے اس اعلان سے کسی بھی ایک شخص نے اختلاف نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ حضرت! "آپ ایک جائز اور ثواب والی چیز کو کیونکر حرام کرتے ہیں جبکہ وہ تو حضور علیہ السلام کے دور میں جائز تھی اور اب تک جائز و حلال رہی ہے بلکہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے اس اعلان کی تائید و تصدیق کی کہ واقعی متعہ حرام ہو چکا تھا اس حرمت کی تشہیر پر مبنی اعلان ہی اب دوبارہ کیا جا رہا ہے اور تو اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسنؓ و حسینؓ جیسی شخصیات کو بھی اس اعلان کی تشہیر پر کسی قسم کا اعتراض نہ ہوا اور نہ ہی انہوں (نے) کبھی یہ کہا کہ ایک حلال چیز کو بلاوجہ حرام قرار دے کر اسلام کو کیوں مسخ کیا جا رہا ہے۔" (خطبات جیل ص ۲۵۸، ۲۵۹)

الجواب:۔ مؤلف نابکار کا قول مبنی بر جہالت ہے کہ حضرت عمر کے اس اعلان (حرمت متعہ) سے کسی بھی ایک شخص نے اختلاف نہیں کیا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلامی کتب کا مطالعہ نہ کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے تب ہی تو کسی بھی امر میں حقیقت کی خبر سے آشنائی نہیں ہے کیا اس مؤلف نے صحیحین کی "کتاب النکاح" میں باب المتعہ بھی نہیں پڑھا؟ تب ہی تو اسے کچھ معلوم نہیں ہے، جان بوجھ کر دھوکہ بازی اور خیانت کاری کا ارتکاب کر رہا ہے بہر حال جو صورت بھی ہو۔ ایسے لوگ اللہ کی نگاہ میں مغضوب، مقہور، مکروہ، منحوس اور انتہائی خبیث ہیں جو علم نہ رکھتے ہوئے مجادلہ کریں کتمان علم جان بوجھ کر کریں، ایسوں پر تو اللہ تعالیٰ، تمام فرشتوں اور سب لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔

حضرت عبد اللہؓ بن مسعود معروف اور جلیل القدر صحابی ہیں انہیں سے قرآن سیکھنے کی ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیگر صحابہؓ کو جاری کی تھی، حضرت عمر کی طرف سے متعہ کی حرمت کا اعلان سن کر انہوں نے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی: ﴿عن قیس قال سمعت عبد الله یقول کنا نغزو مع رسول الله صلى الله علیه وسلم لیس لنا نساء فقلنا ال انستخصی فنهانا عن ذلك ثم رخص لنا ان ننكح المراة بالثوب الى اجل ثم قرأ عبد الله یا ایها الذین امنوا لاتحرموا طیبات ما احل الله لكم و لا تعتدوا ان الله لا یحب المعتدین﴾ قیس کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن مسعودؓ کو یہ کہتے سنا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ

وسلم کے ساتھ غزوہ پر جاتے تھے ہمارے ساتھ عورتیں نہ ہوتی تھیں، ہم نے کہا کیا ہم خصی نہ ہو جائیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسا کرنے سے منع کر دیا پھر ہمیں اجازت دی کہ ہم کسی عورت سے ایک کپڑے مہر کے عوض میں ایک معین مدت کے لئے نکاح کر لیں، پھر حضرت عبداللہ نے یہ آیت پڑھی ﴿یا ایھاالذین امنو... الخ﴾ "اے ایمان والو، جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دی ہیں انہیں حرام قرار نہ دو، حدود سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

(صحیح مسلم، ج ا، ص ۴۵۰۔ صحیح بخاری، ج ۳، کتاب النکاح، ص ۱۴۶)

نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: ﴿فیہ اشارۃ الی انہ کان یعتقد اباحتھا کقول ابن عباس و انہ لم یبلغہ نسخھا﴾، (روایت) اس میں اشارہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہا متعہ کے جواز کا اعتقاد رکھتے تھے جیسا کہ ابن عباسؓ کا قول ہے اور یہ کہ انہیں بھی متعہ کے نسخ کی خبر نہیں پہنچی۔ (صحیح المسلم مع نووی ج ا، ص ۴۵۱)

کیا یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایسے امر میں جس میں ابتلاء عام ہو اور جس کی ضرورت ہمہ وقت اور ہمہ گیر ہو اور کام بھی انتہائی لذیذ اور دلچسپ ہو جس کیلئے صحابہ کرامؓ نے رمضان کی راتوں میں اپنے آپ سے خیانت کی معاذ اللہ نسخ کا اعلان ہو اور حبر امت ابن عباسؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ جیسے پیغمبر اکرم ﷺ کے مقرب صحابی اس سے بے خبر رہیں حتیٰ کہ یہ عمل معاشرے میں دھڑلے کے ساتھ جاری رہے حضرت عمر کو بھی اس پر اعتراض نہ ہوا ان کی خلافت کے عہد میں یہ کام ہوتا رہا انہوں نے منع نہ کیا حتیٰ کہ عمرو بن حریثؓ کا واقعہ پیش آیا جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے منع کر دیا پہلے تو حضرت عمرؓ اس عمل کو برداشت کرتے رہے لیکن اب منع کرنے پر مجبور ہو گئے؟ اس کی منسوخی کا اعلان اگر رسول اللہ ﷺ نے کیا ہوتا تو حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں کچھ عرصہ اس عمل کو کیوں برداشت کیا؟ یا حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اسکی منسوخی کے دوبارہ اعلان کیلئے کیوں زور نہ ڈالا جبکہ اور بہت سے معاملات میں وہ ایسا کرتے رہے ہیں یہ امکان بھی نہیں ہے کہ معاشرے میں یہ عمل حضرت عمرؓ کی بے خبری کی وجہ سے ہوتا رہا یہ تو بلویٰ عام ہے اس کی اطلاع نہ ہونا قابل تسلیم نہیں ہے۔

حضرت عمر بن حریثؓ کا واقعہ کیا ہے؟ فتح الباری میں ابن حجر عسقلانی نے محدث عبدالرزاق سے اس کا لب لباب بیان کیا ہے، لکھتے ہیں: ﴿اخرجه عبد الرزاق فی مصنفه بهذا الاسناد عن جابر رضی الله عنه قال قدم عمرو بن حریث الکوفة فاستمتع بمولاة فاتی بها عمرو حبلٰی فساله فاعترف﴾

محدث عبدالرزاق نے اپنی تصنیف میں اسی اسناد سے حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ عمرو بن حریث کوفہ وارد ہوا تو ایک لونڈی سے نکاح متعہ کر لیا عمرو نے اس لونڈی سے جماع کیا جب کہ وہ کنیز پہلے سے حاملہ تھی اس عمرو سے (حضرت عمرؓ نے) پوچھا تو اس نے اعتراف کیا (واقعی وہ عورت پہلے سے حاملہ تھی اس کے باوجود میں نے اس سے نکاح کیا۔")

(فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۹ ص ۱۴۱ طبع بیروت)

چنانچہ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح متعہ سے ممانعت کا سبب یہ نہیں تھا کہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے اس سے منع کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود عام لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا لہٰذا اس پر عمل ہوتا رہا تب حضرت عمر نے تاکیداً ممانعت کے لئے دوبارہ اعلان کیا اور زجر و توبیخ سے کام لیا تاہم یہ متعہ جاری رہا حضرت عمر اور حضرت ابوبکر جانتے تھے لیکن عمرو بن حریثؓ کے معاملہ میں حضرت عمر نے منع کر دیا کہ لوگ اس سلسلے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور حاملہ عورتوں سے بھی نکاح متعہ کر لینے میں دریغ نہیں کرتے، اس سے بہت سے قانونی مفاسد پیدا ہونے کا اندیشہ تھا لیکن کیا یہ معاملہ صرف نکاح متعہ میں ہی ہوتا ہے؟ اس طرح کے گھپلے تو دائمی نکاح میں بھی دیکھنے میں آتے ہیں کیا ان گھپلوں کی بنا پر نکاح دائمی کو بھی ناجائز قرار دیا جانا چاہئے؟ یہ نامعقول اور نادانائی پر مبنی رویہ ہے کہ ان غلط کاریوں کو روکنے کے لئے اس طرح کرنے والوں کو قانون کے مطابق سزا دی جانی چاہئے لیکن جس شخص کو اسلامی قانون سے واقفیت ہی نہ ہو وہ ایسے مسائل میں فیصلے اسی طرح کرتا رہے گا جیسے حضرت..... نے کیا ہے۔ بعض ارباب حل وعقد نے عندیہ دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے انتظامی و سیاسی حیثیت سے بطور تہدید اس سے منع کر دیا ہو حالانکہ ممانعت کی حیثیت بالکل غیر شرعی تھی قرآن وسنت کے مطابق کوئی امتی اس کا ہرگز مجاز نہیں ہے کہ

شریعت میں قرآن وسنت کے خلاف اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کرے۔

وہ صحابہؓ و تابعینؒ جو نکاح متعہ کے تاحیات قائل رہے

تاریخ اسلام کے اوراق پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ نکاح متعہ صرف عہد رسولؐ میں ہی نہیں ہوتا رہا بلکہ بعد میں بھی صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور بڑے بڑے ائمہ حدیث جواز نکاح متعہ کے تاحیات قائل اور عامل رہے مجوزین کی تعداد کا احصاء ناممکن ہے صرف چند ایک کا تذکرہ ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ وحید الزمان حیدرآبادی لکھتے ہیں کہ "مگر بعض صحابہؓ اس جواز کے قائل رہے جیسے جابر بن عبد اللہؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ اور ابومسعودؓ اور ابوسعیدؓ اور معاویہ بن ابی سفیان اور اسماء بنت ابی بکرؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ اور عمرو بن حویرثؓ اور سلمہ بن الاکوعؓ اور جماعت تابعینؒ میں سے بھی جواز کی قائل ہوئی ہے۔

(موطا امام مالک مع اردو شرح، ص ۳۹۰، طبع کراچی)

موطا امام مالک میں ہے کہ خولہ بنت حکیم حضرت عمرؓ کے پاس گئیں اور کہا کہ ربیعہ بن امیہ نے متعہ کیا تھا ایک عورت مولدۃ سے، پس وہ عورت حاملہ ہے ربیعہ سے، چنانچہ حضرت عمر گھبرا کر چادر گھسیٹتے ہوئے نکلے اور کہا، کہ یہ متعہ ہے اگر میں پہلے اس کی ممانعت کر چکا ہوتا تو رجم کرتا۔

(موطا امام مالک مع اردو ترجمہ وحید الزمان ص ۳۹۰)

ابن حزم اندلسی نکاح متعہ کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿.....**وقد ثبت علی تحلیلها بعد رسول جماعة من السلفؒ منهم من الصحابة رضی الله عنهم اسماء بنت ابی بکر الصدیق و جابر بن عبد الله..... الخ**﴾ رسول اللہ کے بعد سلف صالحین کی ایک جماعت متعہ کی حلت پر قائم رہی صحابہؓ میں سے اسماء بنت ابی بکر صدیق، جابرؓ بن عبد اللہؓ، عبد اللہؓ بن مسعودؓ، ابن عباسؓ، معاویہ بن ابوسفیان، عمرو بن حریث، ابوسعید خدری، سلمہ بن اکوعؓ، معبد بن امیہ (اس کا بھائی ربیعہ بن امیہ بھی جیسا کہ بحوالہ موطا امام مالک گزر چکا ہے) جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے اسکے جواز اور رواج کو تمام صحابہؓ سے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں حضرت ابوبکر کے عہد میں اور ﴿**و عمر الی قرب آخر خلافة عمر**﴾ حضرت عمر کے عہد میں خلافت

کے تقریباً اختتام تک جواز روایت کیا ہے عبد اللہ بن زبیرؓ سے متعہ کی اباحت کے باب میں مختلف قول منقول ہیں حضرت علیؓ سے توقف ہے حضرت عمر سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس صورت میں متعہ کا انکار کیا جب اس کی نکاح پر دو گواہ مقرر نہ کئے گئے ہوں اگر دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح ہو تو اسے مباح قرار دیا گیا ہے تابعین میں سے طاوس، عطاء، سعید بن جبیر اور تمام فقہائے مکہ اسکے جواز کے قائل ہیں۔ (المحلی بالآ ثار فی شرح المجلی لابن حزم ج ۹ ص ۵۱۹، ۵۲۰، طبع قاہرہ)

بیہقی ہند قاضی ثناء اللہ پانی پتی جنہیں ''العثمانی الحنفی المظہری المجددی النقشبندی '' ایسے القابات سے ملقب کیا گیا ہے اپنی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں: ﴿و روی تحليلها عن جماعة من الصحابة ﴾ ''نکاح متعہ کا حلال ہونا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے ان صحابہ کرامؓ کے اسماء بھی تحریر کئے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد بھی نکاح متعہ کی حلیت کے قائل رہے جن کے نام یہ ہیں: حضرت عبد اللہؓ بن عباس، حضرت جابرؓ بن عبد اللہ، حضرت سلمہؓ بن اکوع، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، معاویہ بن ابی سفیان، حضرت سلمہؓ بن امیہ، حضرت معبدؓ بن امیہ۔

ان مندرجہ بالا صحابہ کرامؓ کے بیانات نقل کرنے کے بعد یوں رقمطراز ہیں:

﴿قال الحافظ افتى بها من التابعين ابن جريج و طاؤس و عطا و اصحاب ابن عباسؓ و سعيد ابن جبير و فقهاء مكة ﴾

''یعنی حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا کہ تابعین میں سے ابن جریجؒ، طاؤسؒ، عطاؒ، (بن ابی رباح)، حضرت ابن عباسؓ کے شاگردوں اور سعیدؒ ابن جبیر اور مکہ معظمہ کے فقہاء نے متعہ کے حلال ہونے پر فتویٰ دیا ہے۔'' (تفسیر مظہری، ج ۲، ص ۵۷، سورۃ النساء، طبع دہلی)

مزید تائید کیلئے حسب ذیل کتب بھی دیکھی جاسکتی ہیں: (۱) فتح الباری شرح البخاری ج ص ۱۴۲ طبع جدید بیروت۔ (۲) نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۴۵۰ طبع نولکشور۔ (۳) عمدہ القاری شرح بخاری باب غزوہ خیبر ج ۱۷ ص ۲۴۶ طبع قدیم استنبول۔ (۴) اصابہ فی تمییز الصحابہ ج ۲ ص

ترجمہ سلمہ بن امیہ طبع قدیم مصر۔ (۵) تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۴۴ زیر آیت فما استمتعتم بہ، مطبوعہ مصر۔ (۶) تلخیص الحبیر لابن حجر ج ۳ ص ۱۵۹، ۱۶۰ مطبوعہ قاہرہ وغیرھا۔

معاویہ اپنی ممتوعہ کو ہر سال وظیفہ دیتا تھا

جناب مؤلف صاحب کے ماموں جان حضرت امیر معاویہ بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے رہے ہیں چنانچہ مروی ہے کہ: ﴿ان معاویہ استمتع بامراۃ بالطائف و اسنادہ صحیح﴾ معاویہ نے طائف میں ایک عورت سے متعہ کیا اور اس روایت کی سند صحیح ہے، ﴿استمتع معاویۃ مقدمہ الطائف مولاۃ لبنی الحضرمی یقال لها معانۃ قال جابر ثم عاشت معانۃ الی خلافۃ معاویہ فکان یرسل الیها بجائزۃ کل عام﴾، جب معاویہ طائف گیا ہوا تھا تو اس نے بنو حضرمی کی ایک لونڈی سے متعہ کیا جس کا نام معانہ تھا حضرت جابرؓ نے بتایا معانہ خلافت معاویہ کے دور تک زندہ رہی تو معاویہ ہر سال اس کی طرف وظیفہ ارسال کیا کرتا تھا۔"

(فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۹ ص ۱۴۲، ۱۴۳)

بعینہٖ یہ روایت کہ معاویہ اپنی اس ممتوعہ کو اس کے مرنے تک بیت المال سے وظیفہ دیا کرتا تھا مصنف عبدالرزاق جلد ۷ ص ۴۹۹ مطبوعہ بیروت میں بھی موجود ہے۔

حضرت اسما بنت ابی بکرؓ نے نکاح متعہ کیا ہے

حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے خود نکاح متعہ کیا ہے اور اپنے ممتوعہ ہونے کا اقرار فرمایا ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے:

﴿و قد ثبت علی تحلیلها بعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم جماعۃ من السلف منهم من الصحابۃ اسماء بنت ابی بکر ...... فاخرجه النسائی من طریق مسلم القری قال دخلت علی اسماء بنت ابی بکر فسالناها عن متعۃ النساء فقالت فعلناها علی عهد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم﴾

نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد عقد متعہ کا حلال ہونا سلف صالحین کی ایک (بڑی) جماعت سے مروی ہے صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ابوبکر کی بیٹی اسماءؓ ہے..... امام نسائی نے مسلم

قری سے روایت کی ہے کہ ہم جناب اسماء بنت ابی بکر کی خدمت میں آئے اور ان سے ہم نے متعہ نساء کے بارے میں سوال کیا انہوں نے فرمایا کہ زمانہ رسول اللہؐ میں ہم نے یہ متعہ خود کیا ہے۔

(تلخیص الخبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر، ج ۳ ص ۱۵۹ طبع قاہر

یہی روایت بعینہا درج ذیل کتب میں بھی موجود ہے:

(۲) مسند ابی داؤد الطیالسی ج ۷ ص ۲۲۷ طبع حیدر آباد دکن۔ (۳) سنن الکبریٰ للنسائی جلد ۳ صف ۱۳۵ طبع بیروت (۴) تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ ۷۴ طبع دہلی (۵) معانی الآ ثار جلد ۲ صفحہ ۱۶ طبع دیو (۶) منحتہ المعبود لترتیب مسند ابی داؤد جلد ۱ ص ۳۰۹ طبع بیروت (۷) نیل الاوطار للشوکانی جلد ۶ ص ۱۳۵ طبع مصر۔ ہم نے تکرار اور اطناب وطوالت سے بچنے کے لیے صرف کتابوں کے نام مع اجزا صفحات تحریر کرنے پر اکتفا کرلیا ہے۔

امام راغب اصفہانی نے اس راز سے پردہ اٹھایا ہے چنانچہ اپنی مشہور عالم کتا ''محاضرات الادباء جلد ۲ ص ۹۴ مطبوعہ المطبعہ العامرہ الشرفیہ مصر میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں عبداللہ بن زبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو نکاح متعہ کے حلال سمجھنے کا طعنہ دیا تو انہوں نے کہا ﴿ امك کیف سطعت المجام بینها و بین ابیك ﴾ کہ تو اپنی ماں سے پوچھ اس میں اور تیر باپ میں متعہ کی انگیٹھی کس طرح گرم اور روشن ہوئی۔

﴿احالة ابن عباس فعل القضاء علی ام عروة اسماء بنت ابی بکرؓ انما هی تمتع الز بها و انها ولدت عبدالله﴾

حضرت ابن عباسؓ نے اس قضیہ کا فیصلہ عروہؓ کی ماں اور حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی کے حوا کیوں کیا؟ اس لئے کہ عروہ کی ماں اسماء بنت ابی بکر نے عقد متعہ زبیر سے کیا تھا جس سے عبد بن زبیر کی ولادت ہوئی، بنا بریں نکاح متعہ کے موضوع پر حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عباسؓ کی گفتگو مشہور ہے۔ کہ ایک دفعہ عروہ بن زبیر نے حضرت بن عباسؓ کو سرزنش کے ا میں کہا کہ ﴿الا تتقی الله ترخص فی المتعة؟ ﴾ اے عبداللہ بن عباسؓ تجھے خدا کا خوف کہ متعہ کی اجازت دیتے اور اسے مباح جانتے ہو؟ تو اس کا جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ

عروہ کو اس طرح دیا ﴿سل امك يا عرية﴾، اے عروہ متعہ کی رخصت کا یہ مسئلہ بجائے میرے اپنی ماں سے پوچھ، (زاد المعاد لابن قیم الجوزیہ ج ۔۔۔ص ۲۱۹ طبع مصر)

آپ کے چار فقہی ائمہ میں سے امام مالک جواز نکاح متعہ کے قائل تھے جیسا کہ انہوں نے خود فرمایا ہے: ﴿هو جائز لانه كان مباحاً فينبغي الى ان يظهر ناسخه﴾ (ہدایہ آخرین، جلد اول، صفحہ ۱۹۳، مطبوعہ دہلی) آپ کے اسلاف نے اس کا فارسی ترجمہ اس طرح کیا ہے:

﴿گفته است مالك كه نكاح متعه جائز است زيرا كه آن مباح بود پس تا ظاهر شدن ناسخ آن بر اباحت خود باقی ماند﴾ (ہدایہ مترجم فارسی جلد ۲، صفحہ ۶۴، سطر ۳، مطبوعہ نولکشور) اب جرأت کریں اپنے امام مالک پر بھی وہی فتویٰ لگائیں جو ہم پر لگا رہے ہیں۔

اگر نکاح متعہ شرعی لحاظ سے جائز نہیں ہے تو کیا صحابہ کرامؓ کی اتنی بڑی جماعت جن میں حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ بھی شامل تھیں تابعین اور مکہ معظمہ کے بڑے بڑے فقہاء نعوذ باللہ فعل حرام کا ارتکاب کرتے رہے؟؟

سوال ا:۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا: ﴿فعلناها على عهد رسول اللهؐ﴾ ہم نے زمانہ رسول اللہ ﷺ میں متعہ کیا۔ جمع کا صیغہ استعمال کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خود متکلم بھی اس میں داخل ہو بلکہ بالعموم متکلم کلام سے خارج ہوتا ہے اس میں کلام نہیں کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان میں سے بعض نے ابتداء میں دور دراز سفروں پر ہوتے ہوئے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے محدود وقت کے لیے متعہ کیا پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا، لہٰذا ان بعض کا فعل بطور جمع متکلم کے صیغہ سے تعبیر کر دیا گیا جس طرح جائیداد کے لالچ میں قتل کئے جانے والے بنی اسرائیل کے خرد کے قتل کی نسبت تمام بنی اسرائیل کی طرف کر دی گئی ﴿قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ (البقرہ، ۲،۷۲) حالانکہ اس کو صرف چچا زاد بھائیوں نے قتل کیا تھا۔

جواب:۔ اصولی ضابطہ وقانون کے مطابق ہمیشہ معنی اولی ہی قابل اعتبار اور واجب العمل ہوتا ہے نہ کہ معنی ثانوی واحتمالی، چونکہ حقیقت اصل ہے محتاج دلیل نہیں ہے لیکن معنی مجازی دلیل و برہان اور قرینہ مانعہ کا محتاج ہوتا ہے اصل قبولیت معنی اولی کو حاصل ہے مثلاً اگر کوئی شخص ''انا'' یا

''نحن'' کہہ کر کلام کرے تو اس کی شمولیت ایک یقینی و لابدی امر ہے تا آنکہ اس کی شمولیت کے خلاف کوئی حتمی اور مضبوط اشارہ یا قرینہ مانعہ قائم ہو جائے تب تک کے لیے وہ اپنے اصلی و ظاہری معنی پر ہی دلالت کرتا ہے وہی معنی واجب العمل ہے کیونکہ یہ بات طے ہے کہ ظواہر قرآن حجت ہیں اگر اس طرح ہر جملہ میں معنی اولی کو ترک کر کے احتمالات کا دروازہ وا کر دیا جائے تو اس سے ہر متکلم گنگ اور مخاطب تذبذب کا شکار ہو کر رہ جائے گا اور کلام عرب میں کوئی جملہ بھی کسی خاص مقصد و مفہوم کو ادا کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوگا لہٰذا اس مخمصہ اور مصیبت سے بچنے کا عقلائی طریقہ یہ ہے کہ معنی اولی وظاہری ہی حجت مانا جائے، اور یہی ہماری روزمرہ کی گفتگو کا معمول ہے اگر حضرت اسماء بنت ابوبکر اس میں خود شامل نہ ہوتی تو ﴿کانوا یفعلون کذا علی عهد رسول اللّٰہؐ﴾ کہتی مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔ یہ جواز نکاح متعہ کی اس قدر حامی تھی کہ حضرت عمر کے حرام کرنے کے باوجود بڑی شد و مد سے اس کے حلال ہونے کا اعلان فرمایا کرتی تھیں جیسا کہ مندرجہ بالا حوالہ جات اس کے شاہد ہیں۔ اور اس کے علاوہ حضرت اسماء بنت ابوبکر کو متعہ کرنے والوں میں شامل نہ سمجھنا اصل واقعات و حقائق کے بھی خلاف ہے ان کا حضرت زبیرؓ بن عوام سے نکاح متعہ کرنا گزشتہ اوراق میں ثابت ہو چکا ہے انہوں نے پہلے نکاح متعہ کیا بعد میں نکاح دائمی کر لیا تھا۔ پیش کردہ آیت مبارکہ ﴿و اذا قتلتم نفسا ....﴾ میں خود قاتل بھی شامل ہے اور دیگر بنی اسرائیل کو مخاطب اس لیے کیا کہ وہ اس قاتل کے ہم عقیدہ ونظریہ تھے اس آیت میں شامل ہونے کا قرینہ ان کا ہم عقیدہ ہونا ہے۔ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر کا ''فعلناها'' کہنا ثابت کرتا ہے کہ دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ نکاح متعہ کرنے والوں میں یہ بھی شامل تھیں اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

<u>سوال ۲</u>:۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اگرچہ اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن وہ خود تو محدث نہیں بلکہ انہوں نے نسائی اور طحاوی کا حوالہ دیا ہے لیکن سنن نسائی نے کتاب النکاح کے باب المتعہ میں اس روایت کا کہیں نام و نشان نہیں ہے بلکہ کتاب الحج کے باب التمتع میں بھی اس کا کہیں ذکر نہیں ہے گویا نسائی شریف کا حوالہ نہ متعۃ النساء کے لحاظ سے درست ہے اور نہ ہی متعۃ حج کے لحاظ سے

طحاوی شریف میں بھی کتاب النکاح میں قطعاً اس کا ذکر نہیں ہے۔

جواب :۔ قاضی صاحب کی محدثانہ بصیرت کا اندازہ کرنے کیلئے صرف یہی کافی ہے کہ شاہ عبد العزیز دہلوی نے ان کو ''بیہقی وقت'' یا ''بیہقی زمانہ'' کا لقب دیا ہے یہ لقب چونکہ اپنے دور کی مشہور شخصیت کی جانب سے دیا گیا ہے اسلیے علمی طور پر اس کی بے پناہ اہمیت ہے دس مجلدات پر مشتمل ان کی تفسیر مظہری کا شمار اہل سنت کی بلند پایہ تفاسیر میں ہوتا ہے چنانچہ علماء دیوبند میں سے علامہ انور شاہ الکشمیری ایسی شخصیت نے اس تفسیر سے متعلق کہا ہے کہ ''اس جیسی تفسیر روئے زمین پر نہیں ہے'' (دیکھیئے تقاریظ بر سرورق تفسیر مظہری المجلد الخامس والسادس مطبوعہ حمایت اسلام پریس لاہور ۱۹۴۲ء) اسی طرح انہی صفحات پر مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد مدنی کے بھی اس تفسیر کے حق میں زبردست تعریفی کلمات و تقاریظ موجود ہیں۔ حضرت اسماءؓ بنت ابو بکر کے نکاح متعہ والی روایت امام نسائی کی ''السنن الکبریٰ جلد ۳ صفحہ ۱۳۲۶ و ۱۳۲۷ کتاب النکاح باب المتعہ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت میں موجود ہے اصل روایت یوں ہے:

﴿... عن مسلم القری قال دخلنا علی اسماء ابنة ابی بکر فسألناها عن متعة النساء فقالت فعلناها علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ﴾ ''مسلم قری سے روایت ہے کہ ہم حضرت اسماء بنت ابی بکر کی خدمت میں حاضر ہوئے ہم نے ان سے متعۃ النساء کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم نے خود حضرت رسالت مآبؐ کے زمانہ میں متعہ کیا ہے۔'' (کذا فی المعجم الکبیر طبرانی جلد ۲۴ صفحہ ۱۰۳ طبع بغداد)

اس روایت سے پہلے حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ سے بھی مروی ایک روایت ان الفاظ میں موجود ہے ﴿کنا نعمل بها یعنی متعة النساء علی عهد رسول اللهؐ و فی زمان ابی بکر و صدراً من خلافة عمر حتی نهانا عنها ﴾ ''ہم نے عہد نبی اکرمؐ، زمانہ خلافت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں عورتوں سے نکاح متعہ کیا حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے اس سے منع کر دیا۔'' رہا معاملہ طحاوی شریف کا تو اس میں بھی حضرت اسماءؓ بنت ابو بکر کے متعہ والی

روایت موجود ہے۔

(ملاحظہ ہو: طحاوی شریف جلد ۲ صفحہ ۱۶ کتاب النکاح باب المتعۃ مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند)

لہٰذا ثابت ہوا کہ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنی تفسیر مظہری میں امام نسائی اور امام طحاوی کے حوالے سے جناب اسماء بنت ابو بکر کے نکاح متعہ کی جو روایت نقل کی ہے وہ بالکل صحیح اور درست نقل کی ہے علامہ قاضی ایسی شخصیت سے یہ بعید ہے کہ وہ غلط حوالہ دے دیں۔ معترض کو علامہ قاضی صاحب پر بے جا طعن کرنے کے بجائے اصل محولہ کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے تھا۔

نکاح متعہ کو حضرت عمر نے حرام قرار دیا

حضرت عمرؓ نے نبی اکرم ﷺ کے نکاح متعہ کو منسوخ کرنے کا حکم کوئی تاکیداً نافذ نہیں کیا تھا اس لئے کہ خود حضرت عمر اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ اس سلسلے میں رسول اکرم ﷺ کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے دونوں متعوں سے منع کیا یہ ان کی اپنی رائے تھی متعہ الحج کے باب میں عمران بن حصین بار بار کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں متعہ ہوا کرتا تھا نہ آپ نے منع کیا نہ اس کے حکم کو منسوخ کیا نہ کوئی آیت ناسخ نازل ہوئی اس شخص نے اپنی رائے سے اسے منسوخ قرار دیا ہے یہی حال متعۃ النساء میں بھی ہوا ہے اما طحاوی روایت کرتے ہیں: ﴿عن جابر بن عبد اللّٰه قال تمتعنا مع رسول صلى اللّٰه عليه و آله وسلم فلما ولى عمر خطب الناس فقال ان القرآن هو القرآن و ان الرسول هو الرسول و انهما كانتا متعتان على عهد رسول الله ﷺ متعة الحج فافصلوا بين لحجكم و عمرتكم فانه اتم لحجكم و اتم لعمرتكم والاخرى متعة النساء فانه عنها و اعاقب عليها﴾ ''حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں متعہ کیا جب حضرت عمر حکمران ہوئے تو انہوں نے خطبہ اور کہا کہ قرآن تو قرآن ہی ہے اور رسول رسول ہی ہے دونوں متعے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تھے ایک متعۃ الحج چنانچہ اب تم حج اور عمرہ الگ الگ کرو۔ اس سے تمہارا حج اور عمرہ دونوں مکمل ہو گے دوسرا متعہ نساء ہے میں اس سے منع کرتا ہوں اور اس کے کرنے والوں کو سزا دوں گا۔''

(شرح معانی الاثار ج اص ۳۷۴ طبع دیوبند، المعجم لابن المقری، ص ۲۴۱، طبع الریاض)

ملا سعد الدین تفتازانی شرح مقاصد ج ۲ ص ۲۹۴ فصل رابع فی الامامہ مطبوعہ قدیم استنبول میں لکھتے ہیں:

﴿انہ قال ثلاث کن علی عهد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم انا انهی عنهن و احرمهن و هی متعة النساء و متعة الحج و حی علی خیر العمل﴾

"تین چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھیں میں ان سے ممانعت کرتا ہوں اور انہیں حرام قرار دیتا ہوں وہ متعۃ النساء اور متعۃ الحج اور حی علی خیر العمل ہے۔"

(کذا فی شرح مختصر الاصول لابن حاجب ج ۲ ص ۳۷۰ طبع بولاق مصر)

علامہ تفتازانی حضرت عمر کے اس کلام کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

﴿معنی احرمهن احکم بحرمتهن و اعتقد ذلك بقیام الدلیل کما یقال حرم المثلث الشافعی و اباحة ابوحنیفة﴾

"حضرت عمر کا یہ کہنا کہ میں ان (متعۃ النساء، متعۃ الحج اور حی علی خیر العمل) کو حرام کرتا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ان کے حرام ہونے کا حکم جاری کرتا ہوں اور دلیل کے قائم ہونے کی وجہ سے میں اسی کا اعتقاد رکھتا ہوں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ امام شافعی نے انگور کو آگ پر جوش دینے کے بعد باقی ماندہ تہائی شیرے کو حرام قرار دیا اور امام ابوحنیفہ نے مباح قرار دیا ہے۔"

﴿ان اول من حرم المتعة سیدنا عمر رضی اللّٰہ عنه﴾ "بلاشبہ سب سے پہلے متعہ حضرت عمر نے حرام کیا ہے۔" (سیرت حلبیہ ج ۳ ص ۵۳ باب غزوہ خیبر طبع مصر)

﴿اول من حرم المتعة﴾ "جس نے سب سے پہلے متعہ حرام کیا وہ عمر ہے۔"

(تاریخ الخلفا ص ۹۷ ذکر اولیات عمر)

ارباب دانش وبینش پر مخفی نہیں ہے کہ دین اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے حلال یا حرام کر دیا ہے اسے بدلنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے کوئی امتی بغیر کسی قطعی دلیل کے حلال کو حرام قرار دینے کا ہرگز مجاز نہیں ہے حرام کا اثبات محض اجماع یا

کسی شخص کے کہنے سے نہیں بلکہ دلیل قطعی سے ہوتا ہے کیونکہ یہ طے شدہ اصول ہے ﴿**الحرام ما یثبت الا بدلیل قطعی**﴾ یعنی عند الشریعت حرام وہی چیز ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو لیکن انتہائی افسوس ہے کہ یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اس کے لیے محولہ بالا عبارات میں واضح الفاظ ﴿**انا انهی عنهن و احرمهن**﴾ اور ﴿**اول من حرم** ......﴾ کو دوبارہ بغور و تدبر ملاحظہ کیجیے اور پھر فرمایئے کہ کیا شریعتِ اسلامیہ میں اللہ و رسولؐ کی حلال کردہ چیز کو حرام کرنے کا اختیار حضرت عمر کو حاصل ہے؟؟

حضرت علیؑ نے نکاح متعہ کے بارے میں جناب عمر کی مخالفت کی ہے

حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عمر کے اس فعل کی مذمت کی تھی جیسا کہ جلال الدین سیوطی نے نقل کیا ہے ﴿**و قال علیؑ لولا ان عمر نهی عن المتعة ما زنا الاشقی**﴾ حضرت علیؑ نے فرمایا: اگر عمر نے متعہ سے ممانعت نہ کی ہوتی تو کسی بدبخت کے سوا کوئی زنا نہ کرتا۔"

(تفسیر در منثور ج۲ ص۱۴۰ طبع میمنیہ مصر)

(۲) فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر جلد۳ ص ۲۸۷ مطبوعہ مصر میں بعینہٖ یہی روایت انہی الفاظ میں حضرت علی علیہ السلام کا حضرت عمر پر اعتراض اور نکاح متعہ کی حلت پر نقل کیا ہے۔

(۳) امام ابن جریر الطبری نے جامع البیان جلد۵ ص۱۳ بولاق مصر میں نکاح متعہ کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا عمر کو جھٹلانا تحریر کیا ہے۔

(۴) ابن حیان اندلسی نے تفسیر البحر المحیط جلد۳ ص ۲۱۸ طبع بیروت میں حضرت علیؑ کا یہی اظہار افسوس نقل کیا ہے۔

(۵) علی متقی الہندی نے کنز العمال جلد۸ ص۲۹۴ طبع حیدر آباد دکن۔

(۶) اور حافظ عبد الرزاق محدث نے کتاب المصنف ج۷ ص۵۰۰ مطبوعہ بیروت کا صحیح سند کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کے اس اظہار مذمت کو درج کیا ہے۔ یہ امر اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ نکاح متعہ کی تشریع و جواز کی اصلی غرض و غایت فطری تقاضے کو پورا کرکے زنا سے محفوظ رہنا ہے اور نکاح دائمی کے متعدد اغراض و مقاصد اور فوائد ہیں جیسا کہ سرکار

آقائے سید محسن الحکیم طباطبائی "مستمسک شرح عروۃ الوثقی جلد ۱۲ صفحہ ۴ طبع نجف میں تحریر فرماتے ہیں: ﴿**لان فائدته لا تنحصر فی کسر الشهوة بل له فوائد منها زیادة النسل و کثرة قائل لا اله الا الله**﴾ نکاح کا فائدہ صرف شہوت فطریہ پورا کرنے میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے اور بھی فوائد ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ نسل کا زیادہ ہونا اور کلمۂ توحید پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے۔

(۷) امام ابو اسحاق ثعلبی نے اپنی تفسیر "الکشف والبیان" جلد ۳، صفحہ ۲۸۶ طبع جدید بیروت میں حضرت امام علی علیہ السلام کا درج بالا فرمان نقل کیا ہے۔

ویسے مؤلف محترم! حضرت علی علیہ السلام اور حضرات حسنین علیہما السلام حضرت عمر کے کس کس امر پر احتجاج اور اعتراض کرتے؟ غصبِ خلافت سے لے کر عمومی تغیر دین اور دینی احکام کو پس پشت ڈال کر اپنی آراء پر عمل کرنے کا وسیع سلسلہ تھا کسی ایک آدھ معاملہ میں مشورہ دے بھی دیتے تھے اور اگر وہ مشورہ ان حکمرانوں کی پالیسی (حکمت عملی) کے موافق ہوتو اسے مان بھی لیتے تھے لیکن عمومی طور پر یہ حکمران اپنی رائے اور خوشامدیوں کی طرف سے ہاں میں ہاں ملانے کے بعد عمل درآمد کر دیتے تھے اور وہی سرکاری مذہب قرار پاتا تھا۔ آج تک سرکاری مذہب ہی رائج ہے کہ حقیقی اسلام کو آپ نے غلط قرار دے رکھا ہے نکاح متعہ کا جواز حضرت عمر کی مخالفت میں ایرانی مجوسیوں کے جذبات انتقام کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ شرعی دلائل کی بنا پر ہے متعدد صحابی اور تابعین ایرانی نہ تھے بلکہ بہت سے اموی تھے ان میں سے آپ کے ماموں جان معاویہ بن ابی سفیان اور دیگر بہت سے قریشی صحابی تھے مثلاً عمرو بن حریث، ربیعہ بن امیہ، سلمہ بن امیہ، معبد بن ربعیہ اور بقول ابن حزم تمام فقہائے مکہ، عجمی ایرانی مجوسی نہ تھے بلکہ خالص عرب اور قریشی تھے اب غور کریں کہ یہ لوگ نکاح متعہ کے جواز کے کیوں قائل تھے؟

نکاح متعہ ہزار عورتوں سے ہوسکتا ہے؟

مؤلف نے عنوان قائم کیا ہے کہ "ایک وقت میں ہزار عورتوں سے متعہ ہوسکتا ہے" بعد ازاں لکھا ہے کہ:

''امام جعفر صادقؑ کا فتویٰ (بحذف عربی) عبید بن زرارہ اپنے باپ سے اور وہ امام جعفرؑ سے روایت کرتا ہے کہ امام جعفرؑ کے سامنے متعہ کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہ کیا وہ صرف ایک وقت میں چار عورتوں سے ہوسکتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا کہ تو ہزار عورتوں سے کرسکتا ہے وہ کرایہ پر چلنے والی ہیں۔'' (خطبات جیل ص ۲۶۰)

الجواب:۔ درج بالا مؤلف کی باتوں کو مدنظر رکھ کر ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ یقیناً نہیں پڑھا آپ کے نام سے جو خطبات چند دیگر افراد نے جمع ہو کر لکھے ہیں انہوں نے ﴿اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ...... الاية﴾ بھی درج کردی ہے ملک یمین لونڈیاں ہیں ان کی تعداد معین نہیں ہے ہزار چھوڑ کر لاکھ بھی ہوسکتی ہیں ان لونڈیوں سے جماع کرنا بحکم خداوندی جائز ہے صرف جائز ہی نہیں بلکہ جس ثواب کی بشارت زوجہ سے ہمستری پر اہل سنت کی کتاب احادیث میں درج ہے وہ لونڈی سے مباشرت پر بھی حاصل ہوگا آپ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر کیوں اعتراض نہیں کرتے کہ انہوں نے لونڈی بازی کی اجازت دے دی ہے اور نعوذ باللہ بے حیائی پھیلانے کا حکم دیا ہے۔ کچھ شرم کریں وہاں جناب ملاں صاحب اپنے مشہور فقیہ، محدث، مفسر اور امام کا واقعہ ملاحظہ کیجئے۔ شیعہ نے تو صرف جواز کے لئے تکثیراً ہزار کا عدد ذکر کیا ہے تمہارے فقیہ نے کثرت سے اس پر عمل کیا ہے۔ علامہ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں کہ ﴿فقيه الحرم ابو الوليد و يقال ابو خالد عبد الملك بن عبد العزيز بن جريج الرومي الاموي مولاهم المكي الفقيه صاحب التصانيف احد الاعلام..... ولد سنة نيف و سبعين و ادرك صغار الصحابة..... قال احمد بن حنبل كان من اوعية العلم ...و قال جرير كان ابن جريج يرى المتعة تزوج ستين امراة ...قال ابن عبد الحكم سمعت الشافعي يقول استمتع ابن جريج بتسعين امراة حتى انه يحتقن في الليلة باقية شيرج طلبا للجماع﴾ ،حرم مکہ کا فقیہ، ابو ولید، کہا گیا ہے کہ ابو خالد عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج الاموی بنو امیہ کا غلام مکی فقیہ تھا اس کی بہت سی تصانیف ہیں بڑے اور جید علماء میں سے ایک تھا ۷۰ ہجری کے چند سال بعد پیدا ہوا صغار صحابہؓ سے ان کی ملاقات ہوئی...... احمد

بن حنبل نے کہا یہ ابن جریج علم کے خزانوں میں سے ایک خزانہ تھا جریر نے کہا ابن جریج متعہ کو جائز سمجھتے تھے ساٹھ عورتوں سے انہوں نے نکاح متعہ کے ذریعے تزویج کی..... ابن عبد الحکم نے کہا کہ میں نے امام شافعی سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ ابن جریج نے نوے (۹۰) عورتوں سے نکاح متعہ کیا حتیٰ کہ وہ رات کے وقت تلوں کے تیل کا حقنہ (ٹیکہ) کرواتے تھے تا کہ جماع اور امساک کی قوت حاصل کریں۔" (تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۱۷۰، ۱۷۱، طبع دکن)

اسی طرح ابن جریج کے نکاح متعہ کی یہی بات تہذیب التہذیب جلد ۶ صفحہ ۴۰۶ طبع دکن، توضیح الافکار للکحلانی جلد ۲ ص ۱۴۷ طبع مدینہ منورہ، سیر اعلام النبلاء جلد ۶ ص ۳۳۳ طبع بیروت، میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۶۵۹ طبع مصر وغیرہ کتب معتبرہ میں بھی موجود ہے۔

مذکورہ بالا واقعات وحقائق سے مذہب اہل بیتؑ کی مکمل طور پر حقانیت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ اسماعیل بن فضل ہاشمی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نکاح متعہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: ﴿**الق عبد الملك بن جريج فساله عنها فان عنده منها علماً فلقيته فاملى علي منها شيئاً كثيرا في استحلالها**...﴾ جا کر عبدالملک ابن جریج سے مل لو، اس سے نکاح متعہ کے بارے میں پوچھ لو، اس سلسلے میں ان کے پاس بہت سا علم ہے چنانچہ میں نے اس سے ملاقات کی تو اس نے اس بارے میں مجھے بہت سی اس کے حلال ہونے سے متعلق لکھوائیں... ﴿**فاتيت بالكتاب ابا عبد الله عليه السلام فعرضته عليه فقال صدق و اقر به**﴾ میں وہ تحریر لے کر امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو وہ تحریر دکھائی تو آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا اور اس کو درست قرار دیا۔ (فروع کافی، جلد ۲، صفحہ ۱۹۱، باب **انهن بمنزلة الاماء**) چونکہ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شاید نکاح متعہ کی حلت کا مسلک صرف اہل بیت علیہم السلام اور ان کی اتباع کرنے والوں نے اپنا رکھا ہے اس لیے کہ امام کی دور اندیش نگاہوں نے اسے بھانپ لیا اس شبہ کو زائل کرنے کے لیے آپ نے سائلؓ کو اہل سنت کے مشہور فقیہ ابن جریج کے پاس جانے اور اس سے سوال کرنے کی ہدایت کی تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ مسلک صرف اہل بیتؑ کا ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے منصف مزاج اور حق پسند فقہاء اسی

مسلک پر قائم ہیں۔

امام ابن جریج کی امامت، عدالت اور ثقاہت پر ائمہ اہل سنت کا اجماع ہے یہ کتب صحاح ستہ کا مرکزی راوی ہے محدثین نے جہاں کہیں بھی انکے نکاح متعہ کا ذکر کیا ہے وہاں ''زنا'' کا لفظ بالکل استعمال نہیں کیا بلکہ ''تزوّج'' (نکاح کیا) کے الفاظ تحریر کئے ہیں اس اجمالی تفصیل سے بخوبی معلوم ہوا کہ متعہ ایک شرعی نکاح ہے کسی محدث یا امام نے انہیں زنا کا مرتکب قرار نہیں دیا ہے۔

اپنے مذہب حنفی کی فقہ کو سامنے لایئے جس میں ۹ عورتوں سے نکاح دائمی و ہمدنی جائز ہیں (ملاحظہ فرمائیں: فتح القدیر لابن ہمام جلد ۲ صفحہ ۲۹ طبع نول کشور) آپ بار بار متعہ کی تعداد کے بارے میں سوال کرتے ہیں بلکہ معراج الدرایہ شرح ہدایہ صفحہ ۱۸ طبع کانپور میں یہ بھی لکھا ہے کہ جتنی تعداد میں چاہے عورتوں سے نکاح کرسکتا ہے۔

ثواب متعہ پر تمسخر اور اس کا جواب

مؤلف زیر عنوان ''فضیلت اور ثواب متعہ'' یوں گوہر افشانی کرتا ہے کہ:

''ملاں باقر مجلسی کی مشہور کتاب العجالہ حسنہ سے اقتباس ملاحظہ ہو متعہ کی فضیلت میں احادیث کثیرہ وارد ہوئی ہیں چنانچہ منجملہ ان کے چند احادیث نقل کی جاتی ہیں حضرت سلمان فارسیؓ مقداد ابن سعود کندی اور عمار بن یاسرؓ یہ حدیث صحیح روایت کرتے ہیں کہ جناب خاتم المرسلین ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنی عمر میں ایک دفعہ متعہ کرے گا وہ اہل بہشت سے ہے وہ مرد جس نے متعہ کا ارادہ کیا اور عورت جو متعہ کے لئے آمادہ ہوئی جب یہ دونوں باہم بیٹھے تو ایک فرشتہ نازل ہوتا ہے اور جب تک دونوں اپنی خلوت گاہ سے نہیں نکلتے ہیں وہ ان کی حفاظت کرتا ہے...... راوی حدیث جناب سلمان فارسیؓ بیان کرتے ہیں کہ امیر المومنین علیؑ اٹھے اور عرض کیا: یا حضرت میں آپ کی تصدیق کرنے والا ہوں یہ ارشاد ہو کہ جو شخص اس کار خیر میں سعی کرے اس کے لئے کیا ثواب ہے حضرت نے فرمایا: ان کا ثواب بھی متعہ کرنے والوں کے ثواب کے مانند ہے پھر جناب امیر المومنین علیؑ نے عرض کیا کہ متعہ کرنے والوں کا کیا ثواب ہے تو حضرت نے فرمایا کہ وہ لوگ جب متعہ سے فارغ ہو کر غسل کرتے ہیں تو جتنے قطرے ان کے بدن سے گرتے ہیں ان سے حق تعالیٰ

ایسے فرشتے خلق فرماتا ہے جو تسبیح و تقدیس ایزدی بجالاتے ہیں اور اس کا ثواب تا قیامت دونوں کو پہنچتا ہے۔" (خطبات جیل ص۲۶۱، ۲۶۲)

الجواب۔ مؤلف اور اس کے اسلاف بہت عرصہ سے نکاح متعہ پر ثواب کی روایات نقل کر کے مذاق اڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور متعہ کو بزعمھم زنا گردان کر پھر اس زنا پر اتنے ثواب کو انتہائی گھناؤنا امر ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں شاید یہ حقیقت کبھی نہ سا سکے اس لئے کہ تعصب اور مشاغبت کے ساتھ ساتھ حماقت کے دبیز پردے ان کی عقلوں پر پڑے ہوئے ہیں حالانکہ یہ امر بالکل واضح ہو چکا ہے کہ نکاح متعہ کے ذریعے تزویج شدہ عورت بھی منکوحہ عورت ہے۔ یہ ایک قسم کا نکاح ہے عورت زوجہ ہے چنانچہ نکاح کرنے کے ثواب کے بیان میں جتنی روایات وارد ہوئی ہیں وہ روایات سب اس نکاح سے بھی متعلق ہوں گی اور زوجہ سے ملاعبت سے لے کر ہمبستری اور غسل تک کے افعال کے لئے جتنی فضیلتیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں وہ زوجہ ممتوعہ کے ساتھ ان افعال کی ادائیگی پر بھی حاصل ہونگی خصوصی طور پر نکاح متعہ کے فضائل آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس لئے بیان کئے کہ آئمہ جور نے ایک طرف منجانب اللہ و منجانب الرسول مشروع عمل کو حرام قرار دیا ہے جس سے معاشرے میں بہت سی برائیوں نے جنم لیا چنانچہ اب اس مشروع امر کو متعارف اور جاری کرانا گویا مردہ سنت کو دوبارہ زندہ کرنا تھا جس پر سو شہداء کے ثواب کی بشارت دی گئی ہے۔

رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ﴿من اغتسل یوم الجمعة غسل الجنابة ثم راح .... الخ﴾ اور جو شخص جمعہ کے دن غسل جنابت کرے پھر چلے تو گویا اس نے اونٹ کی قربانی دی اور جو شخص دوسری ساعت میں چلا گویا اس نے گائے کی قربانی دی، جو تیسری ساعت میں نماز جمعہ کو چلا گویا اس نے دنبہ قربان کیا، جو چوتھی ساعت میں چلا اس نے جیسے مرغی قربان (صدقہ) کی، جو پانچویں ساعت میں چلا گویا اس نے انڈہ صدقے میں دیا جب امام خطبے کے لئے کھڑا ہو جائے تو فرشتے ثواب لکھنا چھوڑ دیتے ہیں اور ذکر (خطبہ سننے) میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

(صحیح بخاری ج۱ ص۱۰۴ باب فضل الغسل یوم الجمعہ)

سنن ترمذی میں اسی نوع کی روایت کے الفاظ اس طرح سے ہیں کہ ﴿من اغتسل یوم

الجمعة و غسل ﴾ترمذی نے اس حدیث کے الفاظ کی مراد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
﴿**قال محمود فی هذا الحدیث قال وکیع اغتسل هو و غسل امراته**... ﴾
''محمود نے اس حدیث کے بارے میں کہا کہ وکیع نے اس کا مفہوم اس طرح واضح کیا ہے خود غسل کیا اور اپنی بیوی کو بھی غسل کروایا'' اس کے حاشیے پر احمد علی محدث سہارنپوری اس حدیث کی وضاحت حاشیہ نمبر ۴ پر یوں فرماتے ہیں کہ ﴿**قوله غسل امراته ای حملها علی الغسل بان یطاءها و هذا لتسکین نفسه و غض بصره**﴾، وکیع کا قول کہ اس نے اپنی بیوی کو غسل کرایا یعنی اسے غسل کرنے پر مجبور کر دیا اس طرح کہ اس سے ہمبستری کرے اور یہ کام اپنے نفس کی تسکین نیز نگاہ کو نیچا کرنے کے لئے (تاکہ دوسری غیر محرم عورتوں کی طرف راستے میں نہ دیکھتا پھرے)۔ (سنن ترمذی مع حاشیہ احمد علی محدث سہارنپوری جلد ۱ صفحہ ۸۵ مطبوعہ دیوبند)

اسی طرح یہی تشریح ملا علی قاری حنفی نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد ۳ صفحہ ۲۵۵ مطبوعہ ملتان میں درج کی ہے۔ غور فرمائیں کہ نکاح متعہ کو ''محض شہوت رانی اور تسکین نفس'' کہنے والوں کے لیے اپنے ہی محدث کا فرمان ''**هذا لتسکین نفسه**'' عبرت و غیرت اور لمحۂ فکریہ کے لیے کافی ہی نہیں بلکہ شافی ہے۔ ایک شخص اپنی خواہش نفسانی پوری کرتا ہے یعنی اپنی زوج سے (خواہ نکاح دائمی سے ہو یا نکاح منقطع سے) جماع کرتا ہے اس کے لئے اتنا ثواب ہے کہ جب جمعہ کے لئے اسی غسل کے ساتھ مسجد میں پہلے جائے تو اس کے لئے فرشتے اونٹ قربان کرنے کی نیکی لکھ دیتے ہیں ظاہر ہے کہ غسل جنابت کے بغیر عام غسل یا وضو سے جائے گا تو اتنا ثواب نہیں ملے گا جب کہ غسل جنابت کے بعد جانے سے بہت بڑی قربانی کا ثواب حاصل ہوگا۔ حالانکہ اس نے کام کونسا کیا ہے جس پر اتنا ثواب مل رہا ہے؟ اپنی زوجہ سے جماع ہی تو کیا ہے، جس میں اس کی خواہش نفسانی کا بہت بڑا دخل ہے۔ یہ زوجہ نکاح متعہ سے بھی ہو سکتی ہے اور نکاح دائمی سے بھی۔ روایات میں ثواب کا ذکر مطلقاً آیا ہے۔ عام منکوحہ اور منکوحہ بالمتعہ کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ فضائل بیان کیے تھے تو اس وقت نکاح متعہ اہل سنت کے قول کے مطابق بھی جائز ہی تھا ممانعت تو فتح مکہ بلکہ حجۃ الوداع کے بعد ہوئی ہے۔ بقول علمائے اہل سنت، یہ فضائل جماع اس سے

پہلے بیان کئے گئے تھے، اسی لئے مشہور فقیہؒ حافظ ابن جریج نے یہ فضائل سمیٹنے کیلئے نوے (۹۰) عورتوں سے نکاح کیا اور اسی ثواب کو جمع کرنے کیلئے تیل کا حقنہ (دبر میں پچکاری) لیا کرتے تھے۔

مؤلف کو اعتراض ہے کہ ممتوعہ زوجہ سے جماع کے بعد غسل اور وضو کرنے پر جتنے قطرے بدن سے گرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان قطروں سے فرشتے پیدا کرتے ہیں۔

جناب مؤلف صاحب! عقل سے کام لیں، بیوی سے جماع کے بعد غسل کرکے جمعہ کی نماز پڑھنے کا جتنا ثواب ہے وہ تو پہلے لکھ دیا گیا ہے۔ وضو بھی غسل جماع کے ساتھ اعمال مستحب میں سے ہے۔ کیا اس وضو پر ثواب مرتب ہوگا یا نہ؟ ضرور ہوگا، اس لئے کہ یہ بھی وضو برائے نماز ہی ہے، غسل کا ثواب تو اپنی جگہ الگ ہے جو ہر وضو کے ساتھ ہوتا بھی نہیں، اب وضو کا ثواب ملاحظہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص وضو کرتا ہے اس کے ہر قطرہ وضو سے ایک فرشتہ پیدا ہوتا ہے۔" (کنز العمال، ج ۵، ص ۱۱۳، کتاب الطہارت)

یہ حدیث مطلقاً ثواب وضو بیان کر رہی ہے۔ خواہ وہ وضو مع الغسل ہو یا بغیر غسل جنابت کے، پھر غسل جنابت دائمی منکوحہ بیوی سے ہو یا نکاح متعہ کے ذریعے بنائی گئی زوجہ سے جماع کے بعد غسل اور وضو کر رہا ہو، یا ملک یمین یعنی کنیز سے جماع کے بعد وضو اور غسل کر رہا ہو۔ ہر حال میں یہ ثواب ملے گا اور اس شخص نے جو جماع کیا اور اب اسے غسل اور وضو کرنا پڑا ہے تو اس کے نتیجے میں کوئی بچہ پیدا ہو یا نہ ہو، فرشتے ضرور پیدا ہوں گے کہ پانی کے قطرے تو گرنے ہی ہیں۔ تاہم فرشتوں کی تخلیق قطرے گرنے سے مشروط نہیں ہے بلکہ وضو کے پانی کے ہر قطرے سے پیدائش ملائکہ لازمی ہے خواہ وہ پانی وضو کرنے کے جسم پر ہی لگا رہے۔

پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی نے "آداب النکاح" کے عنوان سے اس سلسلے کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بیان کی ہے کہ جب عورت اپنے خاوند سے حاملہ ہو جاتی ہے تو اسے شب بیداری، دن کو روزہ رکھنے اور فی سبیل اللہ جہاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ یہ فضائل سن کر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ عورتوں کو تو بڑا ثواب دیا گیا ہے۔ اے

مردو! تمہارا کیا حال ہے؟ رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا:

﴿ما من رجل اخذ بید امراته یراودها الا کتب الله تعالٰی له حسنة فان عانقها فعشر حسنات فاذا اتاها کان خیرا من الدنیا وما فیها فاذا قام لیغتسل لم یمر الماء علی شعرة من جسده الا تکتب له حسنة و تمحٰی عنه سیئة و ترفع له درجة و ما یعطی بغسله خیر من الدنیا وما فیها و ان الله عزوجل یباهی به الملائکة یقول انظروا الٰی عبدی قام فی لیلة قرة یغتسل من الجنابة یتیقن الٰی ربه اشهدوا بانی قد غفرت له﴾

جو شخص اپنی بیوی کے ہاتھ سے پکڑ کر اسے ہمبستری کیلئے مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے ایک نیکی لکھ دیتے ہیں۔ پس جب اس سے بغل گیر ہوتا ہے تو اس کیلئے دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں۔ پھر جب اس سے مباشرت کرتا ہے تو اس کیلئے دنیا و مافیہا سے بہتر ثواب ہوتا ہے۔ پھر جب وہ غسل کیلئے تیار ہوتا ہے تو اس کے جسم کے ہر بال، جس پر سے پانی گزرتا ہے کے بدلے میں اس کیلئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور ایک گناہ مٹا دیا جاتا ہے اور ایک درجہ بلند کر دیا جاتا ہے۔ اسے غسل کے صلے میں جو ثواب ملتا ہے وہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے فرشتوں پر فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میرے بندے کی طرف دیکھو کہ ٹھنڈی رات میں جنابت سے غسل کر رہا ہے۔ اسے یقین ہے کہ میں اس کا رب ہوں۔ گواہ رہو کہ میں نے اس کی مغفرت کر دی ہے۔" (غنیۃ الطالبین ج ۱ ص ۳۱ دار الکتب العربیہ مصر)

مؤلف کو سوچنا چاہیے کہ اتنے عظیم ثواب کی بشارت کس عمل کے نتیجے میں دی جا رہی ہے؟ اس میں نکاح متعہ اور دائمی نکاح سے منکوحہ میں کوئی تفریق مذکور نہیں ہے۔

ممتوعہ عورت کے بارے میں تفتیش کی ضرورت ہے یا نہ؟

مؤلف لکھتا ہے کہ: "(بحذف عربی) علی بن یقطین نے روایت کی ہے کہ میں نے امام ابوالحسن سے کہا: مدینہ کی عورتیں کیسی ہیں؟ تو انہوں نے کہا: فاسق ہیں۔ میں نے کہا: کیا میں ان سے نکاح متعہ کر لوں۔ تو امام صاحب نے کہا: ہاں جب کوئی آدمی نکاح متعہ کرے اس پر تفتیش لازم نہیں بس عورت جیسے کہے اسے مان لینا چاہیے"۔ (تہذیب الاحکام ص ۲۵۳)

اس کے بعد بعنوان ''متعہ کے وقت اگر دل میں بار بار وسوسہ بھی پیدا ہو کہ یہ شوہر والی عورت ہے تو پھر بھی تفتیش نہ کرو'' یوں رطب اللسان ہے کہ:

''امام جعفر صادق سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے انہیں کہا کہ میں نے ایک عورت سے نکاح متعہ کیا پھر میرے دل میں خیال آیا کہ یہ شوہر والی ہے میں نے تفتیش کی تو اس کا واقعی شوہر تھا تو آپ نے جواب دیا کہ تفتیش مت کرو۔ (تہذیب الاحکام تالیف ابی جعفر محمد بن الحسن الطوسی صفحہ ۲۵۳) ''..... (خطبات جیل ص ۲۶۳، ۲۶۴)

<u>الجواب</u>:۔ ویسے یہ سوال تو ان صحابہؓ سے کرنا چاہیے جو نبی ﷺ کی معیت میں آپ کی اجازت سے نکاح متعہ کرتے رہے ہیں۔ بالخصوص ان علاقوں اور بستیوں میں جہاں ان کی کوئی خاص واقفیت نہ تھی۔ آیا وہ اس بابت تفتیش کرتے تھے یا نہ؟ اسلامی کتب عموماً اس سلسلے میں خاموش ہیں لیکن صحابی رسول عمروؓ بن حریث مخزومی قریشی کا واقعہ بتاتا ہے کہ تفتیش نہ کرتے تھے۔ یعنی یہ تفتیش ضروری نہ تھی۔ اگر ضروری ہوتی تو مؤلف کے نظریہ کے مطابق صحابہ کرامؓ بہت محتاط اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے افراد تھے۔ وہ ضرور تحقیق کرتے، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف سے اس بارے میں تفتیش ضروری قرار نہ دی گئی تھی۔

تاہم تہذیب الاحکام کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس کے سلسلہ سند میں ایک راوی علی بن حدید ہے۔ شیخ طوسیؒ نے اس راوی پر ایک دوسری جگہ اس طرح جرح کی ہے:

﴿و ما خبر زرارة فالطریق الیه علی بن حدید و هو ضعیف جداً لا یعول علی ما ینفرد بنقله﴾

جناب زرارہ کی مروی خبر کی سند میں علی بن حدید ہے، یہ انتہائی ضعیف ہے۔ تنہا اس کی نقل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

(تہذیب الاحکام کتاب التجارات باب بیع الواحد بالاثنین ج ۲ ص ۱۲۵، طبع قدیم ایران)

علامہ طوسی رحمتہ اللہ علیہ اپنی دوسری معروف کتاب ''الاستبصار'' میں بھی اس راوی سے متعلق اس رائے کا اظہار کرتے ہیں چنانچہ لکھا ہے:

﴿فاول ما فی هذا الخبر انه مرسل و راویه ضعیف و هو علی بن حدید و هذا یضعف الاحتجاج بخبره﴾

"پہلی بات جو اس خبر میں ہے یہ کہ خبر مرسل ہے اور اس کا راوی علی بن حدید ضعیف ہے۔ اس بناء پر اس خبر سے استدلال کمزور ہو جاتا ہے۔"

(الاستبصار، ج ا، ص ۲۲، ج ۲، ص ۵۳، طبع قدیم لکھنو

مزید یہ کہ اس راوی کے نا قابل اعتماد اور ضعیف ہونے کی بابت تنقیح المقال ج ۲ ص ۳۷۵، رجال مجلسی ص ۲۵۸ نمبر ۱۲۲ پر تصریح موجود ہے۔ فلیراجع الیهما،

ملاں نے اس سلسلے کی دوسری روایت کا سہارا لیا ہے لیکن وہ بھی قابل استدلال نہیں چونکہ اس کا راوی فضل مولیٰ محمد بن راشد مجہول الحال ہے۔ ملاحظہ ہو تنقیح المقال ج ۲ ص ۱۲، باب القاء۔

حضرت علیؑ نے حضرت عمرؓ کی بہن سے متعہ کیا؟

مؤلف کتاب شواھد الصادقین، ص ۲۹ سے انوار النعمانیہ، ص ۲۳ کا حوالہ دیتے ہو۔ لکھتا ہے کہ "عمر کی طرف سے متعۃ النساء کو حرام کرنے کا سبب بیان کیا گیا ہے کہ ایک رات عمرؓ۔ امیر المومنین علیؑ کو اپنے گھر بلایا جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا تو حضرت عمرؓ نے علی مرتضیٰؑ کو وہیں سو رہنے کیلئے کہا پس علی مرتضیٰؑ نے وہیں آرام فرمایا پس صبح کے وقت جب گھر سے باہر آیا تو بط تعریض علی مرتضیٰؑ کو کہنے لگے کہ آپ تو فرماتے تھے کہ مؤمن کو مناسب نہیں ہے کہ اپنے شہر میں ؛ عورت کے مجرد شب بسر کرے پس علی مرتضیٰ نے فرمایا: میرے مجرد رہنے کا تمہیں کہاں سے علم تحقیق میں نے آج رات کو تمہاری فلاں ہمشیرہ سے متعہ کیا، پس عمر ﷺ کو اس واقعہ سے جو قلق خفت حاصل ہوئی اس کو مخفی رکھا۔ اس وقت کہ ان کو متعہ کی حرمت کی قدرت حاصل ہوئی بس متہ عمرؓ نے حرام کر دیا۔"

حضرت عمرؓ نے متعہ بند کر کے حرام کاری کے اڈے کھول دیئے اور عمر کی جان کو ہم روئیں تم خود روتے ہو کہ اسلامی دنیا میں جگہ جگہ چکلے آباد ہیں ان چکلوں کا ایک ایک ذرہ رو رہا کہ اگر متعہ پر پابندی عائد نہ ہوتی تو کوئی زنا نہ کرتا سوائے شقی کے..... (ہم متعہ کیوں کر

ہیں؟ ص ۳۴۳ مصنف عبدالکریم مشتاق)۔ (خطبات جیل ص ۳۶۴، ۳۶۵)

الجواب۔ مؤلف نے شواہد الصادقین اور انوار نعمانیہ کے حوالے سے جو واقعہ لکھا ہے، اس کی کوئی سند نہیں ہے بلکہ صیغہ تمریض کے ساتھ "حکی" کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ واقعہ بے سند ہے۔ بعض بے پر کی اڑانے والوں کا من گھڑت قصہ ہے، نیز حضرت علیؑ اور حضرت عمر کے تعلقات اس حد تک دوستانہ تھے ہی نہیں کہ حضرت علیؑ رات گئے تک ان کے گھر میں رہیں اور پھر رات کو ان کے گھر میں سو رہیں، جبکہ بخاری و مسلم میں درج ہے کہ جب حضرت علیؑ نے حضرت ابو بکر کو صلح کے لئے گھر میں بلایا تو کہلا بھیجا کہ عمرؓ تمہارے ساتھ میرے گھر نہ آئیں۔ بعد میں یہ کشیدگی دوستانہ تعلقات میں تبدیل نہیں ہوئی۔ بلکہ حضرت علیؑ ہمیشہ ان حضرات کے رویہ پر شاکی رہے۔

بفرض تسلیم یہ کوئی غلط اور نامشروع عمل تو تھا نہیں۔ کیا دوسری جنتی قریشی اور غیر قریشی عورتوں سے صحابہ کرامؓ اور دوسرے لوگ نکاح متعہ کرتے رہے، کسی کی بیٹیاں اور بہنیں نہ تھیں؟ اگر کنیزیں بھی مان لی جائیں تب بھی وہ کسی شخص کی ملک یمین تو ضرور تھیں، تاہم جب شرائط پائی جائیں آزاد عورتوں سے متعہ کا نکاح ناجائز تو نہیں تھا نہ ہے۔ لہٰذا اس واقعہ پر چین بجبیں نہیں ہونا چاہئے بلکہ تمہیں تو اس واقعہ سے حضرت علیؑ اور حضرت عمر کی رشتہ داری اور اچھے دوستانہ تعلقات ثابت کر کے شیعوں کو مبہوت کرنا چاہئے۔ جس طرح تم ان کے اہل بیتؑ رسولؐ سے دیگر رشتے ثابت کرتے ہو ایک رشتہ یہ بھی ثابت کر دو کیونکہ یہ تو تمہارے حق میں ایک دلیل بن جائے گی۔

جہاں تک متعہ کو بند کر کے حرامکاری کے اڈے کھولنے کا تعلق ہے، تو اس بارے میں بحوالہ تفسیر کبیر رازی وغیرہ حضرت علی علیہ السلام کا قول نقل کیا جا چکا ہے کہ اگر عمر متعہ کو حرام قرار نہ دیتا تو سوائے بدبخت کے کوئی زنا نہ کرتا۔

یہی قول حضرت ابن عباسؓ سے شرح معانی الآثار میں امام طحاوی نے نقل کیا ہے۔ جب آسان راستہ جنسی جذبات کی تسکین کا میسر ہوتا تو زنا کا ارتکاب کیوں کیا جاتا؟ متعہ کی حرمت سے یہ آسان راستہ مسدود ہو گیا، جبکہ دائمی نکاح بعض اوقات میسر نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو ایک ہی ہو سکتا ہے، اسی طرح دیگر انسانی حالات ہیں جب کوئی شخص اپنی دائمی منکوحہ زوجہ سے دور ہوتا ہے تب

اسے عارضی اور مختصر مدت کے لئے زوجہ کی ضرورت ہوتی ہے بہت سے لوگ اس کے اخراجات برداشت کرسکتے ہیں لیکن پابندی کی وجہ سے اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ اس طرح بہت سے لوگ خفیہ دوستی (زنا) کا راستہ اپنا لیتے ہیں۔

مسلمان بیوی کی موجودگی میں اہلِ کتاب عورت سے نکاح متعہ کا جواز

مؤلف نے یہ ایراد وارد کیا ہے کہ ''مسلمان بیوی کی موجودگی میں بھی غیر مسلم عورتوں سے متعہ جائز ہے (بحذف عربی) زرارہ امام جعفرؒ سے روایت کرتا ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی حرج کی بات نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص یہودیہ، نصرانیہ سے متعہ کرلے جبکہ اس کی مومنہ بیوی بھی ہو۔ (تہذیب الاحکام، صفحہ ۲۵۶، جلد ۷)'' (خطبات جیل، ص ۲۶۶)

الجواب:۔ اسلام کے قانون نکاح کے رو سے مسلمان عورت کی موجودگی میں بھی کتابیہ سے عقد ازدواج کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ مؤلف یقیناً عقل وعلم سے بالکل ہی عاری ہے۔ کیا اس نے قرآن کریم کی وہ آیت بھی نہیں پڑھی جس میں حلت نکاح موجود ہے جب اہل کتاب عورتوں سے دائمی نکاح بالاتفاق جائز ہے خواہ اس کے علاوہ مسلمان عورتیں بھی جائز تعداد میں اس کے نکاح میں موجود ہوں، تو نکاح متعہ کے ساتھ اہل کتاب عورت سے تزویج میں کون سا امر مانع ہے؟ واہ رے تیری جہالت اور بے عقلی کے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿أُحِلَّ لَكُمُ ...... وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ أَخْدَانٍ﴾ ''حلال کردی گئی ہیں تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے ..... اور اہل کتاب میں سے پاک دامن عورتیں بشرطیکہ تم انہیں ان کے مہر ادا کردو شرمگاہوں کی حفاظت کی خاطر نہ زنا کاری کیلئے اور نہ چھپی دوستی کرنے کیلئے (بلکہ نکاح کے ذریعے سے یہ عورتیں بھی تم پر حلال ہیں)۔'' (سورۂ مائدہ آیت نمبر ۵)

معلوم ہوا کہ اہل کتاب یہودی اور عیسائی سے نکاح کرنا شریعت محمدیہ میں جائز ہے اس بنیاد پر بہت سے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح دائمی کئے ہوئے تھے جیسا کہ معروف حنفی فقیہ امام ابوبکر الجصاص الرازی نے ان صحابہ کرامؓ اور تابعین میں سے چند ایک

کی نشاندہی کی ہے کہ جنہوں نے ان عورتوں سے شادی کی ہوئی تھی چنانچہ رقمطراز ہیں:

﴿و قد روی عن جماعة من الصحابة و التابعين اباحة نكاح الكتابيات .... ان عثمان تزوج نائلة بنت الفراصه الكلبية وهی نصرانية علی نسائه ..... ان طلحة بن عبيدالله تزوج يهودية من اهل الشام و روی عن يذيفة ايضاً انه تزوج يهودية..... و روی عن جماعة من التابعين اباحة تزويج الكتابيات منهم الحسن و ابراهيم والشعبی ولا نعلم عن احد من الصحابة و التابعين تحريم نكاحهن . و قد تزوج عثمان و طلحة و حذيفه الكتابيات و لو كان ذلك محرما عند الصحابة لظهر منهم نكيرا و خلاف و فی ذلك دليل علی اتفاقهم علی جوازه﴾

صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت سے اہل کتاب عورت سے نکاح کی اباحت مروی ہے حضرت عثمانؓ نے ایک عیسائی عورت نائلہ بنت فراصہ کلبیہ سے ...... طلحہ بن عبید اللہؓ نے شام کی رہنے والی ایک یہودی عورت سے نکاح کیا ہے اور اسی طرح حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی ایک یہودی عورت سے شادی کی۔...... اور تابعین میں سے حسن بصری، ابراہیم نخعی اور شعبی سے بھی اہل کتاب عورت سے نکاح کی اباحت ہے۔ ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ صحابہؓ اور تابعین میں سے کسی ایک نے بھی اہل کتاب عورت سے نکاح کو حرام قرار دیا ہو۔ اور دوسری طرف حضرت عثمان، حضرت طلحہ اور حضرت حذیفہؓ نے یہودی عورتوں سے نکاح کیا تھا اگر یہ نکاح صحابہ کرام کے ہاں حرام ہوتا تو اس پر سب نکیر کرتے اور اس کے مخالف ہو جاتے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نکاح کے جواز پر سب کا اتفاق تھا۔'' (احکام القرآن ج ا ص ۳۳۳ طبع بیروت)

اور اسی طرح عصر حاضر کے ایک مشہور محقق و سکالر ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی استاد جامعہ دمشق نے بھی اپنی مبسوط کتاب ''الفقه الاسلامی فی ادلته'' جو آٹھ جلدوں میں دمشق سے شائع ہو چکی ہے کی جلد ۷ ص ۵۱۳، ۵۱۴ پر موضوع بالا کے ضمن میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔

(کذا فی شرح فتح القدیر ج ۲، ص ۵۰۶، ۵۰۷)

ویسے ہمارے مخاطب نے جان بوجھ کر تہذیب الاحکام کی محولہ بالا روایت میں مذکور ﴿لاباس بان

یتزوج الیھودیۃ و النصرانیۃ ﴾ کا اپنی طرف سے غلط مفہوم "غیر مسلم" لکھ دیا ہے جس کے عموم میں ہندو، سکھ، بدھ، دھریہ، عورتیں بھی شامل ہیں یہ مؤلف کی پرلے درجے کی بدذیانتی کا مظہر ہے۔

متعہ پر ثواب کے درجات والی روایت کا تحقیقی جواب

"تین مرتبہ متعہ کرنے والا حضرت علیؓ اور ۴ مرتبہ متعہ کرنے والا حضور ﷺ کا درجہ پا لیتا ہے۔ (معاذ اللہ) حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ایک مرتبہ متعہ کیا اس نے درجہ حسین کا پایا جس نے دو مرتبہ متعہ کیا اس نے درجہ حسن کا پایا جس نے تین مرتبہ متعہ کیا اس نے درجہ علی کا پایا جس نے چار مرتبہ متعہ کیا اس کا درجہ میری مثل ہوا۔ (برہان المتعہ وتفسیر منہاج الصادقین)

(خطبات جیل، ص ۲۶۶، ۲۶۷)

الجواب:۔ مؤلف کو اپنے اسلاف کی مانند اس روایت پر شدید اعتراض ہے۔ مؤلف اور ان کے اسلاف اپنی نادانی سے نکاح متعہ کو حرام بلکہ سراسر زنا سمجھ بیٹھے ہیں، چنانچہ اسی بناء پر متعہ کے بارے میں موجود ثواب کی روایات سن کر یہ نادان اف اف اور معاذ اللہ کہنے لگتے ہیں، حالانکہ گزشتہ صفحات میں بیان کر دیا گیا ہے کہ نکاح متعہ بھی نکاح دائمی کی مانند ایک نکاح ہے، اور اس نکاح کے ذریعہ سے منکوحہ زوجہ بھی اسی طرح حلال ہے جیسے مستقل دائمی نکاح سے منکوحہ زوجہ، دونوں سے مباشرت کرنے اور دیگر دوامی نکاح و مباشرت پر ایک جیسا ثواب ملے گا، جس طرح کے ثواب کا وعدہ احادیث میں عام نکاح کے ذریعہ سے عقد میں لائی گئی زوجہ کے ساتھ جماع پر کیا گیا ہے وہی ثواب ممتوعہ زوجہ سے ہمبستری پر بھی ملے گا، اس لئے کہ ان روایات میں یہ تفصیل بیان نہیں کی گئی کہ یہ ثواب صرف دائمی نکاح کے ذریعہ گھر میں لائی گئی بیوی سے جماع پر ملے گا بلکہ احادیث اپنے عموم پر قائم ہیں۔ کیونکہ ان میں زوجہ کے ساتھ مباشرت پر ثواب کا وعدہ ہے۔ اس لئے یہ ثواب نکاح متعہ کے ذریعے بنائی گئی زوجہ کے ساتھ ہمبستری پر بھی لازماً ملے گا۔ تفسیر منہج الصادقین، فارسی، مطبوعہ انتشارات علمیہ اسلامیہ ایران میرے سامنے موجود ہے دیکھنے سے پتہ چلا کہ یہ محولہ بالا روایت ملا فتح اللہ کاشانیؒ نے کسی نامعلوم رسالہ کے حوالے سے نقل کر دی ہے ان کے اصل ابتدائی الفاظ اس طرح ہیں: ﴿ الشیخ علی بن عبد العالی در رسالہ کہ در

باب متعہ نوشتہ آوردہ کہ ... و ایضاً آوردہ کہ من تمتع مرۃ کان درجتہ کدرجۃ .. الخ ﴾ (ص ۴۹۳) لیکن ہمیں تلاش بسیار کے باوجود یہ رسالہ دستیاب نہ ہو سکا اگر ہمیں یہ اصل رسالہ مل جاتا تو ہم اس روایت کے سلسلۂ اسناد کو دیکھ کر معلوم کر لیتے کہ یہ روایت موضوع ضعیف ہے؟ یا درجہ صحت پر بھی پوری اترتی ہے یا نہیں، لہٰذا اس کی سند پر تبصرہ کرنے سے ہمیں معذور تصور کریں۔

مؤلف نے روایت کے ترجمہ میں بھی خیانت کی ہے، روایت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ایک مرتبہ متعہ کیا اس نے درجہ حسینؑ کا پایا جس نے دو مرتبہ متعہ کیا اس نے درجہ حسنؑ کا پایا جس نے تین مرتبہ متعہ کیا اس نے درجہ علیؑ کا پایا جس نے چار مرتبہ متعہ کیا اس کا درجہ میری مثل ہوا''

مؤلف نے روایتی خیانت سے ترجمہ غلط کیا ہے، حالانکہ روایت میں لفظ ﴿درجۃ کدرجۃ الحسین، ... کدرجۃ الحسن ... کدرجۃ علی ... کدرجتی ﴾ ہیں، کاف تشبیہ کے لئے ہے، اس کو برابری کے معنی میں لینا ہرگز درست نہیں ہے بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا درجہ ان بزرگوں کے درجہ کی مانند ہو نہ کہ عین وہی درجہ اسے مل جائے گا جو ان مقدس ہستیوں کے لئے تیار ہے۔ اس نوع کی بے شمار روایات فضائل اعمال میں مل سکتی ہیں، برہان المتعہ کے فاضل مؤلف نے ص ۵۲ پر اس روایت کا ترجمہ ان الفاظ سے کیا ہے'' ....﴿ہر کہ یکبار متعہ کند درجہ او در جنت چون درجہ حسینؑ می باشد ... الخ ﴾

مؤلف کو شیعہ پر انگشت تنقید اٹھانے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک لینا چاہیئے کہ ان کی اپنی فقہ کی بنیادی کتب میں کیا لکھا ہے جبکہ ان کے ہاں مشہور فقہی کتاب ''الھدایہ'' قرآن کی مانند ہے جیسا کہ ہدایہ آخرین کے مقدمہ ص ۳ طبع دہلی میں یہ شعر درج ہے:

ان الھدایۃ کالقرآن قد نسخت ما صنفوا قبلھا من الشرع من کتب

''بے شک ''ہدایہ'' قرآن کی طرح ہے اس نے تمام سابقہ مذہبی کتب کو منسوخ کر ڈالا ہے۔'' امید ہے کہ مؤلف اس کا کوئی معقول جواب مہیا کریں گے فما جوابکم فھو جوابنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد مبارک ہے: ﴿من احیا سنتی فقد احیانی و م
احیانی کان معی فی الجنة﴾ "جس نے میری سنت زندہ کی اس نے مجھے زندہ کیا اور جس
مجھے زندہ کیا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔" (جامع ترمذی ابواب العلم ج ۲ ص ۹۲ مطبوعہ دیوبند

اس معیت سے کوئی بے وقوف ہی یہ سمجھے گا کہ ایسا محی السنۃ شخص اسی مکان میں رہے گا
جنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تیار کیا گیا ہے، چونکہ جنت ایک ملک یا شہر
مانند ہوگی اس لئے جو جنت میں ہوا گویا وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہوا۔ جو دوزخی ہوں
وہ آپ کی معیت میں نہیں ہوں گے۔

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت منقول ہے:

﴿ان رسول اللّٰہ اخذ بید حسن و حسین فقال من احبنی و احب ھذین
اباھما و امھما کان معی فی درجتی یوم القیامة﴾

رسول اللہ ﷺ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ہاتھ سے پکڑا اور فرمایا: "جو شخص
سے، ان دونوں سے، اور ان کے ماں باپ سے محبت کرے، تو قیامت کے دن وہ میرے سا
میرے درجے میں ہوگا۔" (سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۷، ابواب المناقب مطبوعہ دیوبند)

بعینہٖ یہی حدیث انہی الفاظ میں حسب ذیل کتب میں بھی پائی جاتی ہے۔

(۲) مسند الامام احمد ج ۱ ص ۷۷ طبع میمنیہ مصر۔ (۳) مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱۰ ص ۵۳۲ طبع مـ
المکرمہ۔ (۴) سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۵۴ طبع بیروت۔ (۵) الصواعق المحرقہ ص ۸۲ طبع میمنـ
مصر۔ (۶) جامع الاصول لابن اثیر الجزری ج ۱۰ ص ۱۰۲ طبع السنۃ المحمدیہ قاہرہ۔ (۷) الشفـ
القاضی عیاض ج ۲ ص ۱۶ طبع مصر۔

خشک مغز مؤلف کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح عبادات بدنی، زبانی اور مالی عبادات
ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اسی طرح حقوق العباد ادا کرنا بھی عبادت الٰہی ہے جس پر ثواب کا وعـ
ہے زوجہ سے ہمبستری اعلیٰ درجہ کے حقوق العباد میں سے ہے، جس میں انسان ساری زندگی مشغو
رہتا ہے یہ وظیفہ زوجیت ہے، دونوں کے باہم حقوق ہیں اس لئے دیگر عبادات کی طرح بلکہ ا

سے بڑھ کر اس میں ثواب کی امید ہے اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم اور حقوق العباد دونوں پہلو شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسانی معاشرے کے قیام کے لئے تزویج اور باہمی محبت و الفت کا حکم دیتا ہے، اس کے اسباب بھی فراہم کئے ہیں اور محبت و الفت کا اعلیٰ سبب اور ذریعہ مباشرت ہے، جس کے نتیجے میں اولاد بھی حاصل ہوتی ہے نسل انسانی کی بقاء اور افزائش کا ذریعہ ہے اور آئندہ نیک اولاد اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت کرتی رہے گی بلکہ ان کی نیکیاں بھی والدین کے لئے صدقہ جاریہ کے طور پر ہوں گی، کیا یہ سب نتائج مباشرت کے نہیں ہیں؟ پھر اس پر ثواب کی امید اور وعدہ کیوں نہ ہو؟ مؤلف صاحب ذرا عقل سے کام لیجئے ع

نگاہ غور سے دیکھو تو عقدہ صاف کھل جائے

پیشہ ور زانیہ عورت سے نکاح متعہ کرنا کیسا ہے؟

مؤلف نے اپنی جہالت کا اظہار کرتے ہوئے بعنوان "پیشہ ور زانیہ عورت سے متعہ کرنا جائز ہے (خمینی کا فتویٰ)" کے ذیل میں لکھا ہے کہ امام خمینی رضوان اللہ عنہ کی فقہی کتاب تحریر الوسیلہ سے نقل کیا ہے کہ زنا کار عورت سے نکاح متعہ کراہت کے ساتھ جائز ہے یعنی جواز تو ہے لیکن مکروہ ہے، اگر وہ عورت مشہور پیشہ ور زانیہ ہو، تاہم اگر مرد نکاح کرے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے بدکاری سے روک دے۔ (خطبات جیل، ص ۲۶۸)

الجواب:۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آیت ﴿اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ﴾ کے ضمن میں ابن کثیر دمشقی نے لکھا ہے: ﴿و قد ادعٰی طائفة آخرون من العلماء ان هذه الاية منسوخة﴾

علماء کے ایک گروہ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے سعید بن مسیب سے یہی قول ابوعبید القاسم ابن سلام سے کتاب الناسخ المنسوخ میں مروی ہے، امام محمد ادریس شافعی نے اسی پر نص کی ہے، بہرحال ﴿اذا حصلت توبة فانه یحل التزویج﴾ جب ایسی عورت یا مرد توبہ کر لیں تو تزویج حلال ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۶۴ طبع مصر)

اس آیت میں زانی اور زانیہ سے مراد وہ ہیں جو زنا سے توبہ نہ کریں اور اسی بری عادت

پڑے رہیں اور اگر ان میں سے کوئی مرد خانہ داری یا اولاد کی مصلحت سے کسی پاک دامن عورت سے نکاح کرے یا ایسی عورت کسی نیک مرد سے نکاح کرے تو اس آیت میں اس نکاح کی نفی لازم نہیں آتی یہ نکاح شرعی نقطۂ نظر سے درست ہو جائے گا۔ شاید نکاح اس زانیہ کی عفت اور پاکدامنی کا سبب بن جائے۔ جمہور فقہاءِ اہل سنت امام ابوحنیفہ، امام مالک اور شافعی وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔ صحابہ کرامؓ سے ایسے نکاح کرانے کے واقعات ثابت ہیں اور تفسیر ابن کثیر میں حبر الامت حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی فتویٰ نقل کیا گیا ہے اب رہا آیت کا آخری جملہ ''**و حرم ذلك على المؤمنين** '' تو اس میں ''**ذلك** '' کا اشارہ زنا کی طرف ہے تو اس جملے کا معنی یہ ہوا کہ زنا ایک خبیث فعل ہے جو مؤمنین پر حرام کر دیا گیا ہے۔

امام خمینی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی یہی بات لکھی ہے، یعنی اولاً بچنا چاہیے، اگر بامر مجبوری ہو تو آئندہ اس عورت کو زنا کاری سے روک دیں۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں ﴿**و ان فعل فليمنعها من الفجور**﴾ ''اگر اس سے نکاح متعہ کرے تو اس کو بدکاری سے منع کرنا چاہیئے۔'' پس جب عام نکاح میں یہ آیت اپنے عموم اور اطلاق پر نہیں ہے تو نکاح متعہ میں کیوں ہوگی؟

عبارت میں خیانت کارانہ تحریف!

تحریر الوسیلہ جلد دوم ص ۱۹۰ کے حوالے سے مؤلف لکھتا ہے کہ ''خمینی نے تحریر کیا ہے متعہ کم سے کم مدت کے لئے کیا جا سکتا ہے مثلاً صرف ایک رات یا ایک دن یا اس سے کم وقت یعنی گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے بھی کیا جا سکتا ہے۔'' (خطبات جیل ص ۲۶۹)

<u>الجواب</u>:۔ حالانکہ تحریر الوسیلہ کے متعلقہ مقام کی اصل عربی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

﴿**مسالة ۱۲۔ يجوز ان يشترط عليها و عليه الاتيان ليلاً او نهاراً و ان يشترط المرة او المرات مع تعيين المدة بالزمان**﴾

دونوں کے لئے ایک دوسرے پر دن یا رات میں ہمبستری کرنے کی شرط عائد کرنا ہمبستری کرنے کی تعداد معین کرنا جبکہ وقت کے اعتبار سے مدت معین ہو، جائز ہے''

(تحریر الوسیلہ ج ۲ ص ۵۱۸، ۵۱۹، طبع جدید ایران)

دیکھا آپ نے کہ مؤلف نے اپنی جہالت اور بے علمی سے غلط ترجمہ کیا ہے اس طرح اعلیٰ درجہ کی خیانت کا مرتکب ہوا، جاہل ملاں کو جب عربی عبارت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی تو لوگوں کو گمراہ کرنے کیلئے غلط ترجمہ کی کیا ضرورت پڑی؟ تحریر الوسیلہ میں ایک رات یا ایک گھنٹے کیلئے متعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ اس عبارت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ زوجین میں سے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو عقد کے وقت شرائط طے کر سکتے ہیں کہ مرد رات کو عورت کے پاس آئے گا یا دن کو، اسی طرح یہ شرط لگانا بھی جائز ہے کہ دوران متعہ میں کل کتنی بار جماع کیا جائے گا۔ ان شرائط کے علاوہ عقد میں مدت کا تعین بھی لازمی ہے، عبارت میں کم از کم یا زیادہ سے زیادہ مدت کا ذکر نہیں ہے۔ تاہم گذشتہ اوراق میں ملاں نے بحوالہ صحیح مسلم پڑھ لیا ہوتا کہ صحابہ کرامؓ نے کم از کم تین دن کی مدت کے لئے چادر کے مہر پر نکاح کیا ہے تو یہ کم از کم بہتر (۷۲) گھنٹے ہوئے اسی طرح قرآن نے الی اجل مسمی بتایا ہے کم از کم یا زیادہ کی وضاحت نہیں کی۔ امام نووی لکھتے ہیں: ﴿**قال القاضی و اتفق العلماء علیٰ ان ھذہ المتعة کانت نکاحاً الیٰ اجل لا میراث فیھا و فراقھا یحصل بانقضاء الاجل من غیر طلاق**﴾

قاضی عیاض نے کہا ہے کہ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ متعہ ایک مدت معین کے لئے نکاح ہوتا تھا جس میں زوجین ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے تھے اور جدائی مقررہ مدت کے ختم ہونے پر بغیر طلاق کے ہو جاتی تھی۔" (صحیح مسلم مع شرح نووی ج ا ص ۴۵۰ مطبوعہ لکھنؤ)

اجل، زمان اور مدت جیسے الفاظ کے معانی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ملاں صاحب بتائیں کیا ایک منٹ ان الفاظ کے معانی میں شامل ہے یا نہیں؟ اسی طرح آدھ گھنٹہ، گھنٹہ، دو گھنٹے، آدھا دن، ایک دن، تین دن وغیرہ ملاں کی حماقت پر خود اسے اور اس کے اتباع کرنے والوں کو ماتم یعنی سینہ کوبی کرنی چاہیے۔

کاش! آپ اتنا سوچنے کی زحمت گوارا فرما لیتے کہ دجل و فریب اور دھاندلی سے حقائق بدل نہیں جایا کرتے، مانا کہ اس دنیائے مستعار میں اندھیر ہے لیکن صبح قیامت میں کیا دیر ہے؟ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ۔

﴾باب ۱۱﴿

اسلام میں تقیہ کا جواز

مؤلف نے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۹ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ ...... الخ ﴾ سے یہ
ثابت کرنے کی سعی نامشکور کی ہے کہ تقیہ کتمان حق ہے۔ اس لئے اس آیت کی روشنی مین جائز نہیں
ہے۔ بلکہ تقیہ کتمان حق ہی کا دوسرا نام ہے جس پر بہت بڑی لعنت کی وعید شدید وارد ہوئی ہے۔
جاہل مؤلف کو معلوم نہیں ہے کہ اس آیت کا تقیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ باطل مقاصد کے لئے
حق اور اللہ تعالیٰ کے دین کو چھپانا مراد ہے، خصوصی طور پر یہ آیت یہود کی مذمت میں ہے چنانچ
علامہ شبیر احمد عثمانی مندرجہ بالا آیت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس سے مراد ہیں یہود کہ توریت
میں جو آپ کی تصدیق تھی اس کو اور تحویل قبلہ وغیرہ امور کو چھپاتے تھے اور جس نے غرض دنیا کے
واسطے اللہ کے حکم کو چھپایا وہ سب اس میں داخل ہیں۔''

مؤلف زہر افشانی کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے کہ:

''عقیدہ شیعہ:۔ تقیہ اماموں اور ان کے آباء و اجداد کا دین ہے جو تقیہ نہیں کرتا و
مؤمن ہی نہیں! اب ذرا شیعہ کی معتبر ترین کتاب اصول کافی کی یہ روایت سنیں اور دنیاء حیرت میر
ڈوب جائیں کہ شیعہ کے بقول ان کے اماموں کا دین کیا ہے؟ (بحذف عربی) معمر بن خلاد سے
روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے ابوالحسن علیہ السلام سے پوچھا کہ حکام وقت کی اطاعت کا کیا حکم ہے
انہوں نے کہا: امام باقر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے تقیہ میرا اور میرے باپ دادا کا دین ہے اور جو شخص تقیہ
نہ کرے اس کا ایمان ہی نہیں ہے۔ لیجیے جناب! امام باقر کے فتویٰ نے تو اب اس بات کی گنجائش
ہی نہیں چھوڑی ہے کہ وقت کے ان حکام کے سامنے کلمۂ حق کہا جائے جو گمراہ ہیں جبکہ ان کا حکم
صرف اور صرف تقیہ کرنے کا ہے بلکہ جو کلمۂ حق بلند کرنے کی صورت میں تقیہ کی راہ چھوڑے گا ا
ایمان سے فارغ ہو جائے گا برادران اسلام! غور کرنے کا مقام ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو جابر ا

ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے کو جہادِ اکبر ارشاد فرماتے ہیں ...دین کے دس حصوں میں سے نو حصے تقیہ ہے اصول کافی کی روایت ملاحظہ کیجئے (بحذف عربی) (اصول کافی ص ۴۲۲) ابی عمیر سے روایت ہے کہ مجھ سے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اے ابوعمیر دین کے نو حصے من جملہ دس کے تقیہ میں ہیں اور جو شخص تقیہ نہ کرے اس کا دین نہیں ہے اور تقیہ ہر چیز میں ہے سوائے نبیذ پینے اور موزوں پر مسح کرنے کے۔" (خطبات جیل ص ۲۷۴،۲۷۵)

الجواب ۔ مؤلف اصل حقیقت کو سمجھ نہیں سکا، آخر کون نہیں جانتا کہ لوگوں کو حق سے دور رکھنے کے لئے کتمان حق قابل لعنت جرم ہے، جس کا ارتکاب یہود کیا کرتے تھے اور ان کے پیروکار نواصب بھی مسلسل کتمان حق کرتے چلے آ رہے ہیں، جبکہ حق کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے ظالموں سے اسے چھپانا اس کتمان حق سے بالکل الگ امر ہے۔ ایک طرف کتمان حق اس لئے ہے کہ حق کو کمزور کیا جائے۔

یہاں تقیہ میں حق کو چھپانا ظالموں اور ایمان کے ڈاکوؤں سے بچانے کی غرض سے ہے جس کا جواز ہی نہیں بلکہ بعض مواقع پر مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے قرآن مجید کی آیت ﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾، ایمان والوں کو نہیں چاہئے کہ وہ کافروں کو اپنا دوست بنائیں مومنین کو چھوڑ کر، جو ایسا کرے گا تو اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، ہاں اگر تم ان سے دوستی کا اظہار کر کے ان سے بچاؤ کرنا چاہو تو جائز ہے۔"

(سورۂ آل عمران، آیت ۲۸)

اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے امام بخاری نے تقیہ کا جواز ثابت کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿قال اللّٰه تعالٰی الا ان تتقوا منهم تقاة هی التقیة، و قال الحسن: التقیة الٰی یوم القیامة﴾،

"اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ اگر تم ان سے بچاؤ کرنا چاہو (تو وہ الگ بات ہے) یہ ہی تقیہ

ہے۔ حسن بصری نے کہا کہ تقیہ قیامت کے دن تک جائز ہے۔"

(صحیح بخاری ج ۴ص ۱۲۱، ۱۲۲، کتاب الاکراہ طبع عثمانیہ مصر۔ تفسیر قرطبی، ج ۴، ص ۵۷، طبع قاہرہ)

بخاری کے حاشیہ السندی میں اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: ﴿قوله التقية الى يوم القيامة اى ثابتة الى يومها لا تختص بعهده صلى الله عليه وسلم ﴾، "ان کا فرمانا کہ تقیہ قیامت تک ہے، یعنی قیامت کے دن تک ثابت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے ہی مخصوص نہیں ہے۔"

ان حقائق کے تناظر میں بیہقی ہند قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنی تصنیف "السیف المسلول" صفحہ ۲۰ مطبع احمدی دہلی میں بڑے طمطراق سے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ:

﴿تقيه عبارت ست از اظهار باطل و اخفائے حق برائے خوف اعداء و شك نيست كه بنا بر ضرورة تقيه جائز باشد﴾

"دشمنوں کے خوف سے باطل کا اظہار کرنے اور حق کو پوشیدہ رکھنے کا نام تقیہ ہے اس میں شک نہیں کہ ضرورت کے وقت تقیہ کر لینا جائز ہوتا ہے۔"

مندرجہ بالا سورۂ آل عمران کی اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں تمام علماء اہل سنت نے برملا اور واضح طور پر تقیہ کا اثبات کیا ہے اور اس کی تفصیلی بحث اسی آیت مجیدہ کے ضمن میں لائے ہیں انہی میں سے ایک امام احمد مصطفیٰ مراغی ہیں کہ جنہوں نے تمام جید علماء کے اقوال کا خلاصہ اپنی بیش بہا تفسیر المراغی جلد ۳ صفحہ ۱۳۷ طبع بیروت میں ان الفاظ میں لکھا ہے:

﴿وقد استنبط العلماء من هذه الآية جواز التقية بان يقول الانسان او يفعل ما يخالف الحق لاجل توقى ضرر من الاعداء يعود الى النفس او العرض او المال فمن نطق بكلمة الكفر مكرها و قاية لنفسه من الهلاك و قلبه مطمئن بالايمان لا يكون كافراً بل يعذر كما فعل عمار بن ياسرؓ حين اكرهته قريش على الكفر فوافقها مكرهاً و قلبه ملئ بالايمان وفيه نزلت الآية من كفر بالله من بعد ايمانه الا من اكره و قلبه مطمئن بالايمان. و يدخل فى التقية مداراة الكفرة و الظلمة و الفسقة و

الانة الكلام لهم و التبسم فی وجوهم و بذلك المال لهم لكف اذا هم و صيانة العرض منهم و لا بعد هذا من الموالاة المنهی عنها بل هو مشروع .....﴾

علماء نے اس آیت سے تقیہ کا جواز استنباط کیا ہے یعنی کوئی شخص ایسی بات کرے یا ایسا کام کرے جو (بظاہر) حق کے مخالف ہو اور وہ اسکے ذریعے سے دشمنوں کے اس ضرر سے بچنا چاہتا ہو جو جان، عزت یا مال کو پہنچنے کا خدشہ ہو پس جو شخص مجبوری کی حالت میں ہلاکت سے بچنے کی خاطر کفر کا کلمہ کہے درحالاں کہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو، تو ایسا شخص کافر نہیں ہوتا بلکہ معذور ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمارؓ بن یاسر نے کیا جب انہیں قریش نے کفر پر مجبور کیا تو حضرت عمارؓ نے مجبوراً ان کی موافقت کی، جبکہ ان کا دل ایمان سے معمور تھا انہی کے بارے میں یہ آیت اتری ﴿**مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ ۢبَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ ۢ بِالْاِيْمَانِ**...﴾ اور تقیہ کے مفہوم میں کافروں، ظالموں اور فاسقوں سے نرم گفتاری، ان کے سامنے چہروں پر مسکراہٹ لانا ان کی اذیت سے بچنے اور ان سے اپنی عزت و ناموس بچانے کی خاطر مال خرچ کرنا شامل ہے۔ یہ امور ان سے ممنوع دوستی کے زمرے میں نہیں آتے بلکہ یہ شریعت اسلامیہ میں جائز ہیں۔

بعینہا اسی طرح جامعہ دمشق کے شعبہ فقہ اسلامی کے پروفیسر استاد ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی نے اپنی تفسیر ''التفسیر المنیر'' جلد۳ صفحہ۲۰۳ طبع دار الفکر دمشق میں اس آیت مبارکہ کو تقیہ کے جواز کی دلیل قرار دیا ہے ان کی اصل عبارت یوں ہے: ﴿..... **و فی الاية ایضاً دليل على مشروعية التقية و هی المحافظة على النفس او العرض او المال من شر الاعداء ..... الخ** ﴾

مذکورہ بالا نص صریحہ کے بعد تقیہ کا جواز مزید کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں رہ جاتا لہٰذا قرآن مجید کی ان واضح نصوص کے باوجود تقیہ کو منافقت سے تعبیر کرنا اور اسے ناجائز قرار دینا صریحاً کفر ہے۔

شاہ عبد العزیز دہلوی تقیہ کی مشروعیت کے قائل ہیں

شاہ عبد العزیز دہلوی شیعہ کے شدید مخالف تھے۔ حتیٰ کہ شیعہ اثنا عشریہ کی تردید میں ان کی کتاب ''تحفہ اثنا عشریہ'' جو اہل سنت کے نزدیک شہرۂ آفاق سمجھی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ

مؤلف کی طرح جاہل مطلق نہ تھے کہ تقیہ اور کتمان حق میں فرق نہ کرتے ہوئے تقیہ کو بھی حرام قرار دیں، بلکہ وہ تقیہ کی مشروعیت کے قائل ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿باید دانست که تقیه دراصل مشروع است بدلیل آیات قرآنی قوله تعالی لا یتخذ المومنون الکفرین اولیاء ... الا ان تتقوا منهم تقاۃ ... و قوله تعالی الا من اکره و قلبه مطمئن بالایمان و تعریف تقیه آن است که محافظت نفس یا عرض یا مال از شر اعدا نمائد ... ﴾

جاننا چاہئے کہ تقیہ دراصل جائز ہے آیات قرآنی کی دلیل سے، ان میں سے ایک آیت ﴿اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾ ہے اور دوسرا فرمان باری تعالیٰ ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ﴾ مگر وہ شخص جس پر اکراہ ہوا ہو (اس کے لئے کفر کا ظاہر کرنا جائز ہے) جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تقیہ کی تعریف یہ ہے کہ دشمنوں کے شر سے جان یا مال یا ناموس کی محافظت کرنا، اور یہ دو قسم پر ہے ایک یہ کہ عداوت کی بنیاد دین و مذہب پر ہو جیسے کافر و مسلمان، دوسرے یہ کہ اس کی بنیاد اغراض دنیا پر ہو جیسے ملک و مالک اور زن و متاع پس تقیہ بھی دو قسم ہے....

(تحفہ اثنا عشریہ فارسی ص ۵۸۴ مطبع ثمر ہند لکھنو)

پھر اسی تحفہ کے "کید نود وہشتم" صفحہ ۱۳۹ پر بخاری کی معروف حدیث ﴿**لم یکذب ابراهیم الا ثلث کذبات**﴾ کی وجوہ اور تشریحات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

﴿اگر دفع جابرے از مال و جان و ناموس خود منجر بکذب صریح شود آن نیز در ان وقت حلال می گردد و چه جائے تعریضات﴾

"اگر کسی جابر کے ضرر سے اپنی جان، مال اور عزت و ناموس کا بچاؤ واضح جھوٹ بولنے سے ہوتا ہو تو یہ جھوٹ بھی اس وقت حلال ہے چہ جائیکہ تعریض یا کنایہ میں بات کی جائے۔"

بغداد کے ایک مشہور عالم اہل سنت علامہ محمود شکری الآلوسی کہ جنہوں نے تحفۂ اثنا عشری فارسی از شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تلخیص "المنحۃ الالٰھیہ تلخیص التحفۃ الاثنا عشریہ" کے نام سے عربی میں لکھی انہوں نے اپنی اس کتاب کے متعدد مقامات پر تقیہ کے جواز اور اس کی اباحت پر سیر حاصل

بحث کی ہے ملاحظہ ہو: ﴿عن الحسن التقية جائزة الی یوما لقیامة (صفحہ۲۹۶)ان التقية محافظ النفس او العرض او المال من شر الاعداء (صفحہ۲۸۷)ان التقية لا تکون الا لخوف .... الخوف علی النفس (صفحہ۲۹۵)نعم لو ارادو ابا لتقية المداراة التی اشرنا الیها (صفحہ۲۹۵)﴾

بلکہ اس کتاب کے محشی محبّ الدین الخطیب جو انتہائی متعصب اور مذہبی جنونی عالم ہیں انہوں نے بھی اس کے مقدمہ میں اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ سے کیا ہے: ﴿ان التقية هی باب رخصة للمسلم اذا اضطر الیها و خاف من ذی سلطان اعطاه غیر ما فی نفسه یدراء عن ذمة ﴾ ”بے شک تقیہ مسلمان کے لیے باب رخصت ہے جب اس کی ضرورت پڑے۔ اور غلبہ والے شخص سے خوف ہو تو اس وقت تقیہ کرلیں اور جو کچھ دل میں ہے اس کے خلاف کہہ دیں اس طرح اللہ کے عہد سے بچاؤ کریں۔“

ارباب انصاف کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں مظلوم کو ظالم کے پنجۂ ظلم و استبداد سے بچنے اور تحفظ کے لیے تقیہ کا جواز موجود ہے بایں ہمہ شاہ صاحب بھی ایسی حالت میں تقیہ کرنے حتیٰ کہ صریح جھوٹ بولنے تک کو حلال قرار دے رہے ہیں۔ شیعہ پر طعن و تشنیع اور بلا جواز کلوخ اندازی کرنے کی بجائے اپنے محدث شاہ عبدالعزیز دہلوی صاحب کی بات ہی کو مان لیں اگر ضد ہے تو ضد لا علاج مرض ہے ع

داء الضد لیس له دواء ان کان المسیح له طبیبا

”کلمۂ حق عند سلطان جائر“ کا صحیح مفہوم

مؤلف نے یہ حدیث پیش کی ہے کہ ”کلمہ حق عند سلطان جائر بہترین جہاد ہے“ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس جہاد کے چند مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ:۔ بزور بازو ظالم حکمران کو ظلم سے روکنا یعنی اس سے مسلح جہاد کرکے اسے اقتدار سے ہٹا کر عدل کا قیام چنانچہ نواصب آج تک ظالم حکمرانوں کے دست و بازو بنے رہے ہیں۔

دوسرا مرتبہ :۔ زبانی مذمت ہے وعظ و نصیحت ہے، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ظالم لوگوں سے دل سے نفرت رکھے، یہ کمزور درجہ ایمان یعنی جہاد ہے۔

یہ تیسرا درجہ ہی دراصل تقیہ ہے کہ دل سے تو سلاطین جور سے نفرت ہو لیکن زبان سے اس نفرت کا اظہار جان، مال اور عزت کے بچاؤ کی خاطر ممکن نہ ہو ع

من نگویم کہ ایں مکن آں کن مصلحت بین و کار آساں کن

حضرت علی علیہ السلام نے متعۃ الحج کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ اور ان سے قبل خلیفہ کی مخالفت کی، حج کے موقع پر ہی حضرت علیؓ اور عثمانؓ کا آمنا سامنا ہو گیا اور اس امر پر گفتگو ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں نے متعۃ الحج سے منع کر رکھا ہے لیکن تم اس پر عمل کر رہے ہو۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: ﴿لم اکن ادع سنة رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم لقول احد من الناس﴾ میں کسی بھی شخص کی بات سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ترک کرنے والا نہیں ہوں'' اس کی وضاحت میں علامہ ذھبی لکھتے ہیں:

﴿وفيه ان مذهب الامام علی کان يرى مخالفة ولی الامر لاجل متابعة السنة و هذا حسن لمن قوى، ولم يوذه امامه فان آذاه، فله ترك السنة و ليس له ترك الفرض الا ان يخاف السيف﴾

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام علیؓ کا مذہب سنت کی پیروی میں ولی الامر کی مخالفت کا جواز تھا، یہ امر مستحسن ہے اس شخص کے لئے جس میں اس کی قوت ہو اور حکمران کی طرف سے اسے اذیت کا اندیشہ نہ ہو، اگر حکمران اسے اذیت دے، تو ایسا شخص سنت ترک کر سکتا ہے لیکن اسے فرض چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، ہاں، اگر حکمران کی تلوار کا خوف ہو تو پھر فرض بھی چھوڑ سکتا ہے۔'' (سیر اعلام النبلاء ج ۱۲، ص ۴۰۹، ۴۱۰ طبع بیروت)

اور اسی طرح فاضل محقق ابن عساکر دمشقی شافعی نے حضرت امام حسن علیہ السلام کے حالات میں ایک مقام پر آپ کا ایک خطبہ درج کیا ہے جس میں امام علیہ السلام نے بوقت خوف تقیہ کو لازم قرار دیا ہے اس کا ایک شمہ یوں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ﴿ويلك ان التقية انما

ھی باب رخصۃ للمسلم اذا اضطر الیھا وخاف من ذی سلطان اعطاہ غیر ما فی نفسہ یدراء عن ذمۃ اللّٰہ تعالٰی﴾

''افسوس ہے تجھ پر! بے شک تقیہ تو مسلمان کے لئے باب رخصت ہے جب اس کی ضرورت پڑے اور غلبہ والے شخص سے خوف ہو تو تقیہ استعمال کرے اور جو کچھ دل میں ہے اس کے خلاف کہہ دے اس طرح اللہ تعالٰی کے عہد سے بچاؤ کرے''

(تہذیب ابن عساکر ج ۴ ص ۱۶۸ طبع بیروت)

زمانہ بنی امیہ میں لوگ تقیہ کیے ہوئے تھے

اموی دور حکومت میں زندہ انسانوں کا جینا مشکل ہو چکا تھا امراء بنی امیہ عیش وعشرت اور لہو ولعب میں سرمست تھے قانون کی بجائے جبر وقہر، مسلمانوں پر ناقابل برداشت مظالم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے خون ریز دہشت گردی اور ظلم وتشدد حتیٰ کہ معصوم بچوں تک کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا، ایسے خون آشام اور دکھ بھرے واقعات کی داستان بہت طویل ہے اگر چہ شرعی زاویہ نگاہ سے ان کی حکومت ناجائز تھی تاہم اگر ان کی حکمرانی کو بظاہر تسلیم نہ کیا جاتا تو مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی، فتنہ وفساد اور انتشار رونما ہونے کا خطرہ لاحق تھا اس لیے ''**الضرورۃ تبیح المحظورات**'' ضرورت اور مجبوری کے وقت بعض ممنوع چیزیں بقدر ضرورت جائز ہو جاتی ہیں کیونکہ فساد اور خرابی کا سد باب کرنا لازمی ہوتا ہے لہٰذا ان شرعی قواعد کی بنا پر قانون ضرورت **خوفاً من قھرہ و غلبتہ** کے تحت غاصب اور مسلط بالجبر حکمران سے تقیہ کرنا ضروری و لازم قرار دیا گیا ہے۔ برسر اقتدار طبقہ کی اکثریت تلون مزاجی اور بے راہ روی اور گمراہی میں مبتلا تھی پاک باز اور ایماندار افراد کو اپنی عزت وناموس کا تحفظ انتہائی ضروری تھا لہٰذا ان حالات کے تناظر میں انہوں نے تقیہ کے ذریعہ ہی دین اسلام کے بقا اور تحفظ کی ہر ممکن کوشش کی جیسا کہ مشہور تابعی سعید بن مسیب کے حالات بیان کرتے ہوئے علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ جب ولید بن عبد الملک حکمران بنا تو مدینہ منورہ آیا مسجد نبوی میں گیا تو دیکھا کہ ایک بوڑھے شخص کے اردگرد لوگ جمع ہیں، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ سعید بن مسیب ہیں، ولید نے سعید بن مسیب کو بلایا، لیکن وہ ولید کے پاس

نہ گئے، اس پر ولید غضبناک ہوگیا ﴿فغضب و هم به، قال: و فی الناس یومئذ تقیة ﴾، راوی عمرو بن عاصم کہتا ہے کہ ان دنوں لوگ تقیہ کئے ہوئے تھے، چنانچہ لوگوں نے سعید بن میسب کو بچانے کے لئے ولید کی منت سماجت شروع کر دی، بالآخر اس نے سعید کو قتل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ (سیر اعلام النبلاء ج۴ ص ۲۲۷)

بنی امیہ میں سے خلیفہ دمشق یزید بن عبد الملک کے زمانہ ۱۰۳ھ میں اہل سنت کے اکابر تابعین شعبی اور محمد بن سیرین نے تقیہ پر عمل کیا ہے جیسا کہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ جب حکمران نے ان سے رائے طلب کی تو ﴿فقال ابن سیرین و الشعبی قولا فیه تقیة ﴾ ''امام ابن سیرین اور شعبی نے ان باتوں کا جواب تقیہ میں دیا۔'' (وفیات الاعیان ج ۱، ص ۱۶۰ طبع مصر)

مؤلف کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ ان کے ناصبی امراء سے تمام مسلمان تقیہ کئے ہوئے تھے علامہ ذہبی اور حافظ ابن خلکان اس کی تصدیق کرتے ہیں لیکن تمہیں اپنی علمی بے مائیگی اور جہالت کے باوجود شرم نہیں آتی کہ تقیہ کو کتمان حق بنا کر اس کی مذمت کر رہے ہیں۔

مؤلف کا یہ کہنا کہ عقیدہ شیعہ میں تقیہ ائمہ اہل بیتؑ اور ان کے آباء و اجداد کا دین ہے امر واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص معمر بن خلاد نے امام ابوالحسن علیہ السلام سے ظالم حکمرانوں کے خلاف قیام کے بارے میں سوال کیا، تو آپؑ نے جواب دیا کہ ہمارے جد امام محمد باقر علیہ السلام کا قول ہے کہ تقیہ ہمارے اور ہمارے آباء و اجداد کا دین ہے، جو تقیہ نہ کرے، اس کا دین (محفوظ) نہیں ہے۔''

ملاں صاحب بتائیں کہ علامہ ذہبی نے سعید بن میسب تابعی کے واقعہ میں بیان کیا ہے کہ ''و فی الناس یومئذ تقیة '' تو یہ لوگ کس کے آباء و اجداد کا دین پکڑے ہوئے تھے، کس کی ہدایت پر عمل کر رہے تھے، وہ سب دیندار لوگ ولید بن عبد الملک اموی اور ان جیسے ظالم اموی ناصبی حکمرانوں سے کیوں تقیہ کئے ہوئے تھے؟ کیوں ان کے خلاف جہاد نہیں کر رہے تھے؟ کیا سب شیعہ تھے؟ یہ واقعہ بھی مدینہ منورہ میں پیش آیا ہے، عقل حاضر رکھ کر سوچیں۔

دین کے دس حصوں میں سے نو حصے تقیہ ہے۔ اس روایت پر بھی مؤلف اور اس کے اسلاف کو اعتراض ہے، اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام اگر چہ غالب ہونے کے لئے

ہے، لیکن اس وقت اس کی یہ حالت ہے کہ جابر و ظالم حکمرانوں کی خواہشات و فرامین سرکاری مذہب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے، جبکہ اصل اسلام بالکل پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اسلام کے نو حصے متروک اور مخفی ہو چکے ہیں، ایک حصہ ظاہر رہ گیا ہے، اسی طرح تقیہ کی ضرورت اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ قدم قدم اور لحہ بہ لحہ اس سے کام لینا پڑتا ہے، اس لحاظ سے نو حصے دین بن چکا ہے۔ اسی کے ذریعے سے اصل اسلام کا دفاع کیا جاتا ہے۔

روایت نقل کرنے میں دجل وفریب

مؤلف بڑے طمطراق سے کہتا ہے کہ:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ''لوگو! اگر تمہیں مجھے گالی دینے کا کہا جائے تو بے دھڑک ہو کر گالی دے لینا، اصول کافی ہی کی ایک روایت سن لیجئے (بحذف عربی) (اصول کافی ص ۴۸۴) مصعدہ (صحیح مسعدہ ہے) بن صدقہ سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا گیا کہ لوگ روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے کوفہ کے منبر پر فرمایا کہ اے لوگو تم سے کہا جائے گا کہ مجھے گالی دو تو تم مجھے گالی دے لینا پھر فرمایا: تم سے کہا جائے گا کہ مجھ سے تبرا کرو تو تبرا نہ کرنا، امام جعفر نے فرمایا: لوگ حضرت علی علیہ السلام پر بہت جھوٹ جوڑتے ہیں انہوں نے تو یہ فرمایا تھا کہ لوگ تم سے کہیں گے کہ مجھے گالی دو تو تم مجھے گالی دے دینا پھر تم سے کہیں گے کہ مجھ سے تبرا کرو حالانکہ میں دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوں حضرت نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ مجھ پر تبرا نہ کرو۔'' (خطبات جیل ص ۲۷۶، ۲۷۷)

مؤلف خائن نے اصول کافی سے حدیث نقل کرتے ہوئے انتہائی مکاری سے اس کا آخری حصہ ترک کر دیا ہے۔ اس لئے کہ اسی حصہ سے اس حدیث میں بیان کردہ مسئلہ کی تائید قرآنی آیت اور واقعہ سے ہو رہی تھی۔ اسی کو کتمان حق کہتے ہیں، جس کا ارتکاب یہود کرتے تھے اور ان کے پیروکار اور آلہ کار ناصبی ملاں بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کتمان حق کے مرتکب ہوتے ہیں جس پر شدید لعنت کی دھمکی دی گئی ہے۔

مؤلف نے حدیث کے الفاظ ''ولا تبروا منی'' تک تو نقل کئے ہیں لیکن اس کے بعد

والی مندرجہ ذیل عبارت اپنے باطل مقصد کے خلاف دیکھ کر یہودی ملاؤں کی طرح چھوڑ کر دی وہ عبارت یہ ہے:

﴿فقال لہ السائل ارایت ان اختار القتل دون البرائة فقال واللّٰہ ما ذالك علیہ وما لہ الا ما مضی علیہ عمار بن یاسر حیث اکرھہ اھل مکة و قلبہ مطمئن بالایمان فانزل اللّٰہ عزوجل فیہ الامن اکرہ و قلبہ، مطمئن بالایمان فقال لہ النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ عندھا یا عمار ان عادوا فعد فقد انزل اللّٰہ عزوجل عذرك و امرك ان تعود ان عادوا﴾

"سائل نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: آپ کا کیا خیال ہے اگر کوئی شخص تبراء کرنے کی بجائے قتل ہونا پسند کرے، تو آپؑ نے فرمایا: اللہ کی قسم! یہ اس پر لازم نہیں ہے، اس کو وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جو عمار بن یاسرؓ نے اس وقت اپنایا تھا جب مکہ والوں نے آپؓ پر جبر واکراہ کیا تھا جبکہ ان کا دل ایمان پر قائم تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آیت ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ م بِالْاِيْمَان﴾ اتاری، عمار رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے فرمایا: اے عمار، اگر وہ پھر تمہیں مجبور کریں تو تم اسی طرح کہہ دو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری دلیل نازل کر دی ہے اور حکم دے دیا ہے کہ اگر وہ دوبارہ مجبور کر کے کلمہ کفر کہلوائیں تو کہہ دو۔" (اصول کافی ص ۴۸۴ مطبوعہ نول کشور لکھنو)

پھر شیعہ کتب میں اس آیت اور اس کے شان نزول حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو درج نہیں کیا گیا، بلکہ تمام اہل سنت مفسرین نے اس آیت مذکورہ کے ضمن میں اس کا شان نزول حضرت عمار بن یاسرؓ کے واقعہ کو لکھا ہے، نیز اس سے استدلال کرتے ہوئے واضح کیا ہے **﴿و ھو دلیل بجواز التکلم بالکفر عند الاکراہ﴾** "یہ آیت (اور واقعہ عمارؓ بن یاسر) اکراہ کے وقت کفریہ کلمات کہنے کے جواز کی دلیل ہے" (تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۴۵۳ طبع دہلی، لامع الدراری شرح بخاری مؤلفہ رشید احمد گنگوھی ج ۳ ص ۷ا طبع سہارنپور)

علامہ بغوی نے اس آیت کے تحت اس امر پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے: **﴿و اجمع العلماء علی ان من اکرہ علی کلمة الکفر یجوز لہ ان یقول بلسانہ﴾**،

علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ جس شخص کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا گیا ہو، اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی زبان سے کلمۂ کفر کہہ دے۔"

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۲۱۴، تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج ۵ ص ۵۲۴ طبع قدیم مصر)

جبر واکراہ کے وقت نبی پاک کو گالی دینا جائز ہے

آپ کے عقیدہ کی رو سے جبر واکراہ کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کو گالی دنیا جائز ہے العیاذ باللہ چنانچہ درس نظامی میں پڑھائی جانے والی فقہ حنفی کے اصول کی شہرۂ آفاق کتاب "اصول الشاشی" مع شرح احسن الحواشی مطبوعہ مکتبہ رحیمیہ دیوبند ہمارے پیش نظر ہے اس کی "فصل العزیمہ" ص ۱۰۵ پر عبارت موجود ہے:

﴿اجراء کلمة الکفر علی اللسان مع اطمینان القلب عند الاکراہ و سب النبی علیه السلام و ایلاف مال المسلم و قتل النفس ظلماً﴾،

جبر واکراہ کے وقت نبی اکرم علیہ السلام کو گالی دینا، مسلمان کے مال تلف ہونے اور جان کے قتل کے وقت زبان پر کلمۂ کفر جاری کرنا جائز ہے بشرطیکہ دل مطمئن ہو۔

اگر کوئی شخص اپنی پسند سے بغیر تقیہ کے کلمہ کفر کہے یا شعائر کفار اپنائے تو وہ کافر ہو جائے گا لہٰذا معلوم ہوا کہ اگر اس مقام پر تقیہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو کفر لازم آتا ہے چنانچہ ابو شکور سالمی نے اپنی مشہور کتاب "التمہید فی بیان التوحید" میں متعدد مقامات پر تقیہ کے جواز کا ذکر کیا ہے چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

﴿و کذلك الکفر من اقبح القبائح ولو اکرہ علی الکفر بقتل فانه یباح له اظهار کلمة الکفر تقیة و لا یحکم بکفرہ فاستحسن الشرع هذا﴾،

اور اسی طرح کفر سب سے بری چیز ہے لیکن اگر قتل کی دھمکی دے کر کفر پر مجبور کیا جائے تو تقیہ کر کے کلمہ کفر کہہ دینا جائز ہے اور اس قائل کے کفر کا حکم نہ دیا جائے گا پس اسلامی شریعت نے بحالت تقیہ اظہار کفر کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔

(تمہید ابی شکور سالمی باب اول القول التاسع، ص ۱۸، ۱۹، طبع فاروقی دہلی)

ملاں کو غور کرنا چاہیئے کہ اس حدیث میں حضرت علی علیہ السلام نے ایک پیشگوئی فرمائی ہے کہ آئندہ معاویہ وغیرہ کے عہد حکومت میں یہ کفر جاری ہوگا، اور تمہیں اس طرح مجھ سے تبراء کرنے پر مجبور کیا جائے گا، تاریخ نے اس اخبار بالغیب کو سچ کر دکھایا، یہ منحوس دور چشم فلک نے دیکھا لوگوں کو حضرت علیؑ پر سب وشتم کرنے، تبراء کرنے پر مجبور کیا گیا، حتیٰ کہ لوگوں نے حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور جناب میثم تمار رضی اللہ عنہ کی عزیمت ملاحظہ کی، یہود کے پیروکار، ملاں دراصل حق سے منحرف ہیں اس لئے چشم قلب سے اندھے ہو چکے ہیں، جس طرح یہودی مبغض اور دشمن عیسیٰؑ بن کر گمراہ ہوئے، اسی طرح ناصبی خارجی حضرت علیؑ اور ان کی اولاد اطہارؑ سے بغض و عداوت کی بناء پر قعرِ ہلاکت میں گرے ہیں۔

تارک تقیہ تارک نماز کی طرح ہے

''تارک تقیہ تارک نماز کی طرح ہے، شیعہ کی معتبر ترین کتاب صحاح اربعہ میں سے ایک اہم کتاب ''من لایحضرہ الفقیہ'' کا حوالہ بھی سن لیجئے اور تقیہ کے ترک کرنے کا گناہ بھی دیکھ لیجئے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا اگر میں یہ کہوں کہ تارک تقیہ مثل تارک صلوٰۃ کے ہے تو میں اس قول میں سچا ہوں گا نیز امام نے فرمایا: ﴿لا دین لمن لا تقیة له﴾ جو شخص تقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے۔'' (خطبات جیل ۲۷۷)

الجواب:۔ بلاشبہ یہ امر بدیہی کہ بعض امور میں تقیہ واجب ہوتا ہے، چنانچہ ان حالات میں تقیہ نماز سے بھی زیادہ کار ثواب ہوگا۔ اس کے لئے ہمیں معاشرتی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، عقلمند لوگ جانتے ہیں، اسی طرح تقیہ ترک کرنے سے دین کا تحفظ مشکل ہو سکتا ہے، جب حکمران ظالم ناصبی یا کفار ہوں، ترک تقیہ کے نتیجے میں جان، مال اور عزت عدم تحفظ کا شکار ہو جائیں تو پھر بعض حالات میں ایمان بھی داؤ پر لگ جاتا ہے اور دائمی طور پر نسلاً بعد نسل نقصان جاری رہتا ہے۔

انہی الفاظ پر مشتمل حدیث علامہ علاؤ الدین علی المتقی الحنفی الھندی نے ذخیرہ حدیث کی عظیم کتاب کنز العمال میں درج کی ہے، جو یہ ہے: ﴿لا دین لمن لا تقیة له﴾، جو تقیہ نہیں کرتا

اس کا کوئی دین نہیں۔" (کنز العمال ج ۲ ص ۲۲ رقم الحدیث ۵۴۰)

یہی حدیث مسند الفردوس للدیلمی جلد ۵، صفحہ ۲۱۰، رقم ۷۶ ۹ الطبعۃ الاولیٰ دار الکتب العلمیہ بیروت میں بھی حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام سے مروی ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اہل سنت کی مندرجہ بالا معتبر کتب میں یہ حدیث ان ہی الفاظ سے منقول ہے جن الفاظ سے یہ روایت کتب شیعہ میں پائی جاتی ہے بایں ہمہ اس حدیث کا مذا اڑانے والا مسلمان کہلانے کا حقدار ہے؟

حافظ ابن حیان اندلسی نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر "البحر المحیط" میں تقیہ کے متعلق بڑی تفصیل سے بحث کی ہے صحابہ کرامؓ میں سے ابن عباسؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے اقوال سے تقیہ کا جواز ثابت کیا ہے مزید برآں تقیہ کے وجوب پر حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام کا فرمان حق بیان بھی پیش کیا ہے کہ:

﴿و قال الصادق رضی اللہ عنہ التقية واجبة انی لا سمع الرجل فی المسجد يشتمنی فاستتر منه بالسارية لئلا يرانی ﴾،

"حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تقیہ واجب ہے میں مسجد میں کسی شخص کو سنتا ہوں کہ مجھے گالیاں دے رہا ہوتا ہے تو میں ستون کے پیچھے چھپ جاتا ہوں تاکہ مجھے دیکھ نہ لے۔" (تفسیر البحر المحیط، ج ۲ ص ۴۲۳ مطبوعہ بیروت)

یہ انتہائی معقول امر ہے کہ تقیہ کے جواز کا قول دین اسلام کے ماخذات پر ایمان کا مظہر ہے، اس لئے جو شخص تقیہ کا انکار کرے، تو گویا اس نے دین اسلام کو ہی چھوڑ دیا اور تقیہ کی ڈھال مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین کر انہیں تنہا کر کے ظالم اور کافر حکمرانوں کے پنجۂ استبداد میں دے دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے منکر تقیہ کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تقیہ کر کے مخالفین کے پیچھے نماز پڑھنے کی ضرورت کیوں؟

"جس نے تقیہ کر کے مخالفین کی پہلی صف میں نماز پڑھی گویا اس نے رسول خدا ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا جو شخص مخالفین کے ساتھ ان کی پہلی صف میں

(ہاتھ باندھ کر تقیۃً) نماز پڑھے تو وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صف اول میں نماز پڑھی ہو، (احسن الفوائد فی شرح العقائد ص ۶۳۰'')

(خطبات جُبیل صفحہ ۲۷۷، ۲۷۸)

الجواب:۔ یہ تعلیم صرف حضرات ائمہ اہل بیت اطہار ﷺ نے نہیں دی بلکہ یہی تعلیم علماء عامہ نے بھی حاصل کی تھی اور اموی نواصب کے ظلم وستم سے معمور عہد میں اس تعلیم پر عمل کرتے تھے، یہ روش نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان سے اخذ کر کے اختیار کر رکھی تھی۔ مؤلف نے اگر صحاح ستہ کا مطالعہ کیا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا، لیکن جاہل ملاں کو تو صرف حدیث کا ''دورہ'' پڑھنا ہے، حدیث پڑھتے یا سمجھتے نہیں ہیں، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ﴿**یا اباذر کیف انت اذا کانت علیک امراء یوخرون الصلوٰۃ؟ عن وقتھا او یمیتون الصلوٰۃ عن وقتھا قال: قلت یا رسول اللّٰہ فما تامرنی؟ قال: صل الصلوٰۃ لوقتھا فان ادرکتھا معھم فصل فانھا لک نافلۃ** ﴾

''اے ابوذرؓ تمہارا کیا حال ہوگا، جب تم پر ایسے حکمران ہوں گے جو نماز کو بہت تاخیر سے پڑھیں گے؟ ابوذر نے کہا: یارسول اللہؐ! آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم نماز تو اپنے وقت پر ادا کرو اگر تم ان کے ساتھ نماز کو پالو تو (ان کے ساتھ بھی) ادا کرلو، یہ تمہاری نفل نماز ہو جائے گی۔'' (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۳۰ طبع نول کشور، سنن ابی داؤد ج ۱، ص ۶۲، طبع کراچی، سنن ترمذی ج ۱ ص ۴۴ طبع دیوبند، السنن الکبریٰ بیہقی، ج ۳، ص ۱۲۴، طبع دکن، سنن الدارمی ص ۱۴۵ طبع کانپور، التمہید لابن عبدالبر، ج ۸، ص ۶۴، طبع مراکش)

حافظ ابن عبدالبر اندلسی نے اس طرح کی روایات درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

﴿ **انما صلی من صلی ایماء و قاعداً لخوف خروج الوقت و للخوف علی نفسہ القتل و القرب** ﴾،

''لوگ اشارے سے اور بیٹھے بیٹھے نماز ادا کرتے تھے اسلئے کہ وقت نکل جانے کا اندیشہ ہوتا تھا (اور اگر الگ نماز پڑھیں تو) قتل اور زدوکوب کا خوف لاحق ہوتا تھا۔'' (التمہید لابن عبدالبر، ج ۸، ص ۶۲)

بنو امیہ کے ناصبی حکمران نماز کو ہمیشہ مؤخر کر کے پڑھتے تھے اس لئے لوگ ان کے ساتھ نماز پڑھنا پسند نہ کرتے تھے، بلکہ گھر میں ہی پڑھ لیتے تھے، چنانچہ وہ لوگوں سے حلف لیتے کہ انہوں نے گھر میں نماز نہیں پڑھی اور حکمرانوں کے ساتھ ہی پڑھیں گے، لکھتے ہیں:

﴿کانوا یوخرون الصلوٰۃ و فی ایام الولید ابن عبد الملک و یستحلفون خوف الناس انهم ما صلوا فاتی عبد اللّٰہ بن ابی زکریا، فاستحلف انہ ما صلیٰ، فحلف انہ ما صلیٰ و قد کان صلی و اتی مکحول فقال فلم جئنا اذن؟ فترک﴾

ولید بن عبدالملک کے دنوں میں نماز کو مؤخر کرتے تھے تو ساتھ لوگوں سے حلف بھی لیتے تھے کہ انہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی (گھر میں پڑھ کر نہیں آئے) عبداللہ بن ابی زکریا آئے تو ان سے حلف لیا گیا کہ انہوں نے نماز نہیں پڑھی، انہوں نے قسم کھالی کہ میں نے نماز نہیں پڑھی۔ حالانکہ وہ (گھر سے) نماز پڑھ کر آئے تھے۔ مکحول (جو شام کے فقہا میں سے تھے) آئے، اس سے ایسا ہی معاملہ کیا گیا) تو اس نے کہا: ہم یہاں کس لئے آئے ہیں (نماز پڑھنے کے لئے ہی تو آئے ہیں، گھر میں پڑھی ہوتی تو کیوں آتے؟) تب انہیں چھوڑ دیا گیا۔"

(التمہید لابن عبدالبر، ج ۸ ص ۶۲، ۶۳)

بعینہ اسی طرح مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیری نے بھی اپنے افادات میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ:

"ائمہ جور کے ظلم سے بچنے کے لئے اگر نمازوں میں کوتاہی ہو تو وہ قابل مواخذہ نہ ہوگی اور سلف سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ وقت پر اپنی کامل نمازیں گھروں میں پڑھ کر جاتے تھے اور پھر ائمہ جور کے ساتھ بھی رفع فتنہ کے خیال سے اقتداء کر لیتے تھے۔"

(انوار الباری شرح بخاری ج ۱۳ ص ۱۵۳ باب اذا لم یتم الامام و اتم من خلفه، طبع ملتان)

اس سلسلہ میں مزید تفصیل کیلئے ملا علی قاری حنفی کا رسالہ "الاقتداء بالمخالف" ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ تو عام مسلمانوں کی حالت تھی، شیعیان اہل بیتؑ پر تو نواصب بنو امیہ کی خصوصی عنایت تھی۔ اس لئے انہیں تقیہ کی زیادہ ضرورت پڑتی تھی۔ اگر وہ حقیقی اسلام کے دفاع اور اپنی جان، مال و عزت کے بچاؤ کے لئے اس پر عمل کرتے تھے تو انہیں ثواب بھی اسی مقدار سے ملنا عین

تقاضائے عقل ہے۔

برسر اقتدار افراد اور خاندان نبوت میں شدید اختلاف تھا

''شیعہ کو عقیدہ تقیہ ایجاد کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جب وہ کوشش بسیار کے باوجود خلفاء راشدین اور خاندان نبوت حضرت علی، حضرت حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مابین کوئی اختلاف و جنگ و جدل کی کیفیت کو نہ دیکھ سکے بلکہ قدم قدم پر انہیں ان شخصیات کا کردار و عمل خلفاء راشدین کی حمایت و نصرت پر مبنی نظر آیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس سارے کردار کو جھٹلانے کی کوشش شروع کر دی کہ آئمہ اہل بیت نے اگر اپنے دور میں ظالموں، مرتدوں، کافروں اور غیر شرعی حکمرانوں کی تائید و حمایت کی تھی تو وہ محض تقیۃً تھی۔'' (خطبات جیل ص ۲۷۸)

الجواب:۔ مؤلف کا خیال باطل یہ ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ اور نواصب کے مزعومہ خلفاء کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط اور محض مفروضہ ہے۔ اہل سنت اور نواصب کا مشترکہ لٹریچر ایسے واقعات اور حقائق سے بھرا پڑا ہے جو واضح طور پر برسر اقتدار افراد اور ان کے ہمنواؤں کے ساتھ خاندان نبوت میں شدید اختلاف کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کیا چھ ماہ تک حضرت ابوبکر کی خلافت سے اختلاف کرتے ہوئے شدید احتجاج کرنا صحیح بخاری میں مذکور نہیں ہے؟ کیا صحیح مسلم میں حضرت عمر کا یہ اعتراف نہیں ہے کہ تم (بنو ہاشم) نے حضرت ابوبکر کو آثم، خائن اور غادر سمجھا پھر حضرت عمر کے بارے میں حضرت علیؑ اور حضرت عباسؓ کا یہی خیال اس میں مذکور ہے۔ حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؑ کی زندگی میں حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی۔ جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے دیکھا کہ اب لوگوں کا رویہ تبدیل ہو کر مزید گستاخانہ اور تند ہو گیا ہے۔ تب بقول اہل سنت اپنے بچاؤ کی خاطر ظاہری صلح کے لئے پیغام بھیجا۔ ورنہ حکومتی جانب سے پہل نہیں ہوئی تاہم حضرت علیؑ نے یہ بھی کہا کہ ﴿ان ائتنا ولا یاتنا معك احد کراھیة محضر عمر بن الخطاب فقال عمر لابی بکر واللہ تدخل علیھم وحدك﴾ حضرت عمر، ابوبکر کے ہمراہ نہ آئیں۔ حضرت عمر کے وجود کی کراہت کی وجہ (سے ایسا فرمایا) حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو مشورہ دیا کہ آپ اکیلے ان کے پاس نہ جائیں

(صحیح مسلم، جلد۲، صفحہ۹۱، طبع لکھنؤ) کیا یہ سب امور شدید اختلاف پر دلالت نہیں کرتے؟ ملاں تسلیم کریں یا نہ کریں اکابر علماء اہل سنت نے اس اختلاف کو تسلیم کیا ہے۔ دیگر اکابر علماء کے علاوہ برصغیر کے معروف محقق دانشور شاہ ولی اللہ دہلوی اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

﴿زبیر و جمعی از بنی هاشم در خانه حضرت فاطمه رضی الله تعالی عنها جمع شده در باب نقض خلافت مشورت ها بکار می بردند و حضرت شیخین آنرا بتدبیرے که بایستی برهم زدند﴾، زبیر اور بنو ہاشم کا ایک گروہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں جمع ہوتے اور خلافت کا تختہ الٹنے کے بارے میں سوچ بچار اور منصوبہ بندی کرتے تھے۔ حضرت شیخین نے اس منصوبہ بندی کو ہر ممکن طریقہ سے برہم کر دیا۔"

ان ممکن تدبیروں میں سے ایک تدبیر جو حضرت عمر نے سوچی تھی، وہ دختر رسولؐ جناب فاطمۃ الزہراؑ کے گھر کو جلانا تھا اس جانگداز واقعہ کی صحت کے لیے صرف وہی کافی ہے جو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بڑے وثوق سے لکھا ہے کہ ﴿ابو بکر عن اسلم باسناد صحیح علی شرط الشیخین انه بویع لابی بکر ...﴾ باسناد صحیح شیخین کی شرط پر روایت ہے کہ ابو بکر نے اسلم سے بیان کیا ہے کہ جب ابو بکر سے بیعت کر لی گئی ... تو حضرت عمر چلے اور حضرت فاطمہؑ کے گھر گئے اور کہا: یا بنت رسول اللہ ﷺ، آپ کے والد صاحب ہمیں تمام مخلوق سے زیادہ محبوب تھے، ان کے بعد آپ سے بڑھ کر محبوب ہمارے لئے کوئی نہیں ہے۔ لیکن ﴿و ایم الله ما ذالك بما نعی ان اجتمع هولاء النفر عندك ان آمر بهم ان یحرق علیهم البیت﴾۔

"اللہ کی قسم، اگر یہ لوگ آپ کے گھر میں جمع ہوئے تو آپ کی محبوبیت میرے لئے اس امر میں مانع نہیں ہوگی کہ میں اس گھر کو ان افراد سمیت جلا دینے کا حکم دے دوں۔"

(ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۹/۲۹، ۱۹۷۶ء، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

برصغیر کے ایک معروف سیرت نگار اور شہرہ آفاق نقاد علامہ شبلی نعمانی اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

"بنو ہاشم ہمیشہ استعجاب کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے تیمی اور عدی خلافت پر کیونکر قبضہ کر بیٹھے ہیں۔ حضرت ابو بکر کے زمانے میں تو علانیہ نقض خلافت کے مشورے

ہوتے رہے..... حضرت عمر کی سطوت نے بنو ہاشم کے ادعا کو اگرچہ دبا دیا تھا لیکن بالکل مٹا کیونکر سکتی تھی۔ ''(الفاروق حصہ دوم ص۸۲ طبع دہلی)

مؤلف اپنی حماقت کے باوجود اتنی بات تو سمجھتا ہوگا کہ جہاں گھر کے ساتھ ساتھ اہل خانہ کو بھی جلا دینے کی دھمکیاں ہوں، جہاں سطوت (حملہ آور ہو کر مغلوب کرنے) اور زبردستی دبانے کے حربے استعمال کئے جاتے ہوں، کیا وہاں ایسا کرنے والوں کے موقف کو فریق مخالف خوشی سے تسلیم کرتا ہے؟ ہرگز نہیں ظاہری خاموشی تقیہ پر دلالت کرتی ہے، شبلی نعمانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی اسی حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ ورنہ بقول شبلی نعمانی بنو ہاشم، جن کی قیادت دراصل ائمہ اہل بیتؑ کے ہاتھ میں تھی، ہمیشہ اس امر کے مدعی رہے کہ ہم خلافت کے مستحق ہیں اور جو لوگ برسر اقتدار ہیں وہ ناجائز قابض ہیں۔ کبھی کبھار کا ظاہری تعاون یا رہنمائی محض اسلام کی بہتری کی خاطر تھی یا کسی مظلوم کی دادرسی کے لئے، نہ کہ حکمرانوں کے ساتھ دوستی اور محبت کی علامت۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے اپنے اس موقف کو محض اپنے شیعوں تک چھپا کر نہیں رکھا بلکہ اس حقیقت کا برملا اظہار کرتے رہے، تب ہی تو شاہ ولی اللہ، شبلی نعمانی کو معتبر اسلامی کتب سے اس بارے میں قابل یقین مواد ملا ہے، جس کی روشنی میں انہوں نے برسر اقتدار طبقہ سے آئمہ اہل بیتؑ کے شدید اختلاف کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کیا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　　چشمہ آفتاب را چہ گناہ

ملاں کی مثال بھی چمگادڑ کی سی ہے جو تاریکی کی دلدادہ اور روشنی سے متنفر ہے۔ تاہم بعض حالات میں تقیۃً اپنے موقف کو کھل کر بیان نہیں کیا، بلکہ ایسا بیان جاری کیا جس سے مخالفین نے یوں سمجھا کہ ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن ائمہ اطہار ؑ بعد ازاں اس بیان کی وضاحت کر کے اپنے معتقدین کو حقیقت سے باخبر کر دیتے تھے۔

جب حضرت علیؑ پر سب کیا گیا تو اکثریت کیوں خاموش تھی؟

علامہ انور شاہ محدث کشمیری ایک تاریخی حقیقت کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

﴿ثم ان من السنة تقديم الصلوٰة على الخطبة و انما قدمها مروان لانه كان

یسب علیا رضی اللہ عنہ و کان الناس یقومون عنہا ﴾

سنت یہ ہے کہ عید کی نماز خطبے سے پہلے ہو، لیکن مروان نے خطبہ مقدم کر دیا، اس بناء پر کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کیا کرتا تھا اور لوگ اٹھ کر چلے جاتے تھے۔"

(فیض الباری ج ۲ ص ۳۵۹ طبع ڈابھیل ، العرف الشذی ص ۲۳۰ طبع دیوبند)

خطبہ کی تقدیم پر صرف حضرت ابوسعید خدریؓ نے احتجاج کر کے حق فریضہ ادا کیا، تو وقت کے حکمران کی طرف سے یہ جواب ملا ﴿**قد ترك ما هنالك** ﴾ "جو تم جانتے ہو وہ متروک ہو چکا ہے" یعنی جو باتیں آپ نے زمانہ پیغمبرؐ میں دیکھی تھیں وہ عرصہ سے متروک ہیں ﴿**اما هذا فقد قضى ما عليه** ﴾ "لیکن جوان پر واجب تھا وہ انہوں نے ادا کر دیا، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس وقت کثیر تعداد صحابہ کرامؓ کی موجود نہیں تھی؟ پھر عید کے اجتماع میں ہر شخص بڑے اہتمام سے حاضر ہوتا ہے یہ سب کے سب سامعین و حاضرین کیوں خاموش رہے کسی نے آواز نہ اٹھائی ؟؟

اس کی وجہ ملاں صاحب بتائیں۔ جب خلیفہ راشد حضرت علی علیہ السلام کو بر سر منبر مدینہ منورہ میں، مسجد نبوی میں عیدین اور جمعہ کے اجتماعات میں سب و شتم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اکثریت کیوں خاموش تھی؟ اس کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں:

ایک یہ کہ اکثریت، جن میں متعدد صحابہ کرامؓ شامل ہیں، حضرت علیؑ پر سب و شتم کو کار ثواب سمجھتی ہوگی، اگر یہ توجیہ قبول ہے تو پھر اکثریت کے بارے میں فیصلہ کر لیں، جو بہت تلخ ہوگا۔ دوسری یہ کہ ظالم اموی حکمرانوں کے خوف سے ان کی زبانیں مقفل ہو چکی تھیں اور صدائے احتجاج بلند کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لئے تقیہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی۔ یہ توجیہ کافی حد تک قابل قبول ہے۔ اسی میں اکثر صحابہ کرامؓ اور مسلمانوں کا بچاؤ بھی ہے۔ عمرو بن بحر جاحظ نے بھی اسی توجیہ کو صحیح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

﴿ **و بقى رجال غض ابصارهم ذكر المرجع و اراق دموعهم خوف المحشر فهم بين شريد نافرو خائف منقع و ساكت معكوم و داع مخلص و موجع ثكلان قد اخملتهم التقية** ﴾،

اور ایسے لوگوں کا ذکر باقی ہے جن کی آنکھوں کو آخرت کی یاد نے نیچے کر رکھا ہے اور محشر کے خوف نے ان کے آنسو بہائے ہیں ایسے لوگ اس حالت میں ہیں کہ کچھ تو منتشر و متفرق ہیں بعض خائف تن تنہا بیٹھے ہیں اور کچھ منتظر ہیں اخلاص سے دعا کر رہے ہیں اور دردمند و غمزدہ ہیں انہیں تقیہ نے گمنام (خاموش) کر رکھا ہے۔ (البیان والتبیین ج ۲ ص ۲۹ طبع قاہرہ)

حضرات ائمہ اہل بیت علیہم السلام تو ان حکمرانوں کے مدمقابل امامت و خلافت کے خو... مدعی تھے، اس کے ساتھ ساتھ اصلی اسلام کی ترویج اور اپنی جان کی حفاظت بھی مطلوب تھی۔ اس لئے تقیہ بھی ان کی حکمت عملی کا ایک ضروری حصہ تھا۔

حضرت علی کے مبنی برحق الزامیہ دلائل

''حضرت علی کے خط میں خلفاء راشدین کی تعریف شیعہ کی طرف سے تقیہ قرار دے کر جھٹلانے کی کوشش'' کا عنوان قائم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''شیعہ کی معتبر ترین کتاب نہج البلاغہ قسم دوم ص ۷ میں ایک خط حضرت علی رضی اللہ عنہ بنام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حسب ذیل ہے۔ ﴿**انہ بایعنی القوم الذین بایعوا ابا بکر و عمر و عثمان .... الخ**﴾ بہ تحقیق مجھ سے بیعت کی ہے ان لوگوں نے جنہوں نے بیعت کی تھی ابوبکر اور عمر اور عثمان سے انہیں شرائط پر جن شرائط پر ان سے بیعت کی تھی لہٰذا اب نہ حاضر کو اختیار ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرے اور نہ غائب کو اختیار ہے کہ وہ (میری بیعت کو) رد کرے......

یہ کیسا پر لطف تقیہ ہے جب دشمن کا خوف نہ دکھا سکے تو کہہ دیا کہ خود اپنے اصحاب کے خوف سے حضرت علی نے تقیہ کیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت علی کے اصحاب بڑے دغاباز و منافق تھے حضرت علی ان سے اس قدر ڈرتے تھے کہ اپنا اصلی مذہب نہ ظاہر کر سکتے تھے..... حضرت علی نے اپنے زمانہ خلافت میں بھی متعہ جیسی عظیم الشان عبادت کے حلال ہونے کا اعلان کیا نہ نماز تراویح جیسے گناہ کبیرہ کو روکا..... حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے زمانہ خلافت میں کیا خوف تھا'' کیا ضرور تقیہ کی تھی..... حضرت علیؑ کو چاہیے تھا کہ خود ہی ایسی خلافت پر لات مار دیتے ان کو ایسا شوق خلافت کا تھا کہ اس کے چھن جانے کے خوف سے ایسے کبیرہ گناہوں کا وبال اپنے ذمہ لے ر...

تھے۔ (ماخوذ از یازدہ نجوم تالیف مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمتہ اللہ) (خطبات جیل، ص ۲۷۸، ۲۷۹)

الجواب:۔ مؤلف نے نہج البلاغہ سے حضرت علی علیہ السلام کے ایک خط کی عبارت نقل کی ہے، جس میں آپؑ نے معاویہ کو اس کے اپنے مسلمہ اصول کے مطابق بیعت کرنے کی دعوت دی اور واضح کیا کہ میری بیعت انہی لوگوں نے کی ہے جنہوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی، پھر کیا وجہ ہے کہ تم میری بیعت نہیں کر رہے ہو، جس انداز میں ان کی خلافت منعقد ہوئی، اسی طریقہ سے میری خلافت قائم ہوئی ہے، یہ تو حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے مخالف کو اس کے اپنے مسلمات کے مطابق قائل کرنے کی کوشش تھی نہ کہ واقعتاً ابوبکر، عمر و عثمان کی خلافت کو تسلیم کرنے کا اقرار تھا۔ چونکہ یہ تسلیم شدہ اصول ہے کہ دلیل ہمیشہ مسلمات خصم سے دی جاتی ہے لہٰذا بموجب ھو من باب مجاراۃ الخصم، یہ خط معاویہ کی طرف حجت الزامی ہے یہ اس دلیل کو کہا جاتا ہے جو صرف فریق مخالف کے نزدیک مسلم ہو۔ ایسی دلیل سے مقصود پیش کنندہ کے عقائد کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ فریق مخالف کو اس کے غلط طرزِ عمل پر نظر ثانی کی ترغیب دینا مطلوب ہوتا ہے تاہم مؤلف نے توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ کا ارتکاب کیا ہے ع

لیس لما جئت بہ حاصل　　　　کلمۃ حق ارید بھا باطل

جبکہ حضرت علیؑ نے خلفاء ثلاثہ کی خلافت کے لئے جس موقف کو اختیار کیا، اسے اپنے دیگر خطبوں میں بیان فرما دیا ہے۔ آپ نے اس مکتوب میں معاویہ بن ابی سفیان کو اس کے مسلمات سے ہی جھوٹا ثابت کر دیا ہے۔ اہل سنت کی مستند کتاب العقد الفرید جلد ۳ ص ۱۰۶ مطبوعہ قدیم مصر میں اس مکتوب گرامی کے ابتدائی الفاظ اس طرح ہیں: ﴿و کتب الی معاویۃ بعد واقعۃ الجمل..... اما بعد فان بیعتی بالمدینۃ لزمتك و انت بالشام لانہ بایعنی الذین ..... الخ﴾ یعنی یہ خط حضرت علیؑ نے معاویہ کو واقعہ جمل کے بعد لکھا کہ اما بعد پس میری بیعت کا مدینہ میں ہونا تجھ کو لازم ہے خواہ تو شام میں ہو کیونکہ قانون تمہارے..... کا یہ ہے..... الخ

شبلی نعمانی اور شاہ ولی اللہ آپؑ کے اس موقف کو بیان کر چکے ہیں۔ جس کا حوالہ سابقہ اوراق میں گذر چکا ہے، یہ خطبے اور ان میں بیان کردہ موقف محض شیعوں کی افتراء نہیں ہے۔ چنانچہ

آپؑ نے خطبہ شقشقیہ میں اپنے موقف کو کھل کر بیان کیا ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کی کاروائی کی رپورٹ لیتے ہوئے حضرت امیرؑ نے فرمایا کہ:

﴿ماذا قالت قریش؟ قالوا احتجت بانہاشجرۃ الرسول صلی اللہ علیہ و آلہ، فقال علیہ السلام، احتجوا بالشجرۃ و اضاعوا الثمرۃ﴾۔

قریش نے انصار کے موقف (منا امیر و منکم امیر) کا کیا جواب دیا؟ کاروائی کے عینی شاہدین نے بتایا کہ قریش نے یہ دلیل پیش کی کہ وہ رسول کے شجرہ (خاندان) سے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔ شجرہ میں سے ہونے کا استدلال کیا ہے لیکن انہوں نے ثمر (پھل) کو ضائع کر دیا۔" (نہج البلاغہ ج ۱ خطبہ ۶۴ ص ۱۱۲ مطبعہ مطبعۃ الاستقامہ مصر)

مصر کے مفتی شیخ محمد عبدہ نے "ثمرۃ" کی تشریح میں لکھا ہے: ﴿یرید من الثمرۃ آل بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم﴾۔

"ثمرہ سے آپ کی مراد آل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔"

اس مندرجہ بالا ارشاد گرامی سے کسی کو انکار ممکن ہی نہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام حق تلف کرنے والوں کو ظالم سمجھتے تھے آپ کا یہ ارشاد ان کی خلافت بلافصل پر سکت خصم دلیل ہے۔ جو چشم بینا کے لیے سرمۂ بصیرت ہے انہی الفاظ پر اکتفا کیا جاتا ہے اس لیے کہ ع

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم   انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

حضرت علیؑ نے اپنا موقف دہرایا

معاویہ کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے آپؑ نے اپنے موقف کو دہرایا ہے۔

ترجمہ پیش خدمت ہے:

تو ہم کبھی اس لئے سب سے مقدم ہیں کہ رسولؐ کے سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار اور کبھی اس لئے سب سے بڑھ کر ہیں کہ رسولؐ کے سب سے بڑھ کر فرمانبردار ہیں، اور مہاجرین نے یوم سقیفہ کے موقع پر جب انصار کے سامنے اپنی حجت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے پیش کی تھی تو انصار نے سر جھکا لیا تھا، اب اگر سقیفے میں مہاجرین کی یہ حجت صحیح

حکومت کا حق ہمیں ہے نہ کہ تمہیں اور اگر مہاجرین کی حجت غلط تھی تو انصار کا دعویٰ اپنی جگہ قائم ہے۔اور تم نے دعویٰ کیا ہے کہ میں سب خلفاء پر حسد کیا کرتا تھا۔ اور سب سے سرکشی کرنا میرا وطیرہ تھا۔ اگر واقعی یہی ہے تو میں نے تمہارا تو کوئی قصور نہیں کیا کہ تمہارے سامنے اپنا عذر پیش کروں اور تم نے لکھا ہے کہ خلفاء کی بیعت کے لئے مجھے اسی طرح گھسیٹا جاتا تھا، جس طرح نکیل پڑے اونٹ کو چلایا جاتا ہے، تو بخدا تم نے چاہی تھی مذمت اور ہوگئی تعریف تم نے چاہا تھا رسوا کرنا، ہو گئے تم خود رسوا۔ بھلا سوچو تو مسلمان کے لئے اس میں بھی کوئی عیب ہے کہ وہ مظلوم ہو۔ ''

اس کے بعد حضرت امیرؑ نے رقم فرمایا: ﴿و هذه حجتي الى غيرك قصدها ولكني اطلقت لك منها بقدر ما سنح من ذكرها﴾،

''میری اس دلیل کا مقصود تو کوئی اور ہے لیکن جو بات سامنے آ گئی ہے اتنی تمہارے لئے بھی کہہ دی ہے۔'' (نہج البلاغہ ج ۳ ص ۳۸ مکتوب نمبر ۲۸ مطبوعہ مصر)

شیخ محمد عبدہ المصری اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ﴿يحتج الامام على حقه لغير معاوية لانه مظنة الاستحقاق اما معاوية فهو منقطع عن جرثومة الامر فلا حاجة للاحتجاج عليه﴾۔ امامؑ کا اپنے حق پر استدلال معاویہ کے علاوہ کسی اور کے خلاف ہے، اس لئے کہ آپؑ کے علاوہ ان لوگوں کے بارے میں خلافت کے استحقاق کا گمان کیا جا سکتا ہے پس معاویہ، تجھے تو حکومت کے معاملے میں سرے سے کوئی حق ہے ہی نہیں، چنانچہ اس کے خلاف استدلال کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔''

ملاؤں میں کلام امامؑ کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بس اپنے گذشتہ راہنماؤں کی طرح اس ایک خطبے کے ظاہری الفاظ سے استدلال کرتے جا رہے ہیں۔ جبکہ اس کتاب نہج البلاغہ میں موجود دیگر بے شمار خطبوں اور مکتوبات میں واضح اشیاء سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ یہ بددیانتی اور علمی خیانت کی اعلیٰ مثال ہے۔

حضرت علیؑ چونکہ مثل ہارونؑ تھے سنت ہارونیؑ پر عمل کیا

مؤلف کے نزدیک یہ پرلطف تقیہ ہے کہ دشمن کا خوف تو نہیں ہے لیکن اپنے اصحاب سے

ہی تقیہ ہوتا رہا حالانکہ انہیں بتایا جا چکا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کی اکثریت نے حضرت علیؑ اور ان کے ہمنوا بنو ہاشم کے موقف کے برعکس حضرت ابوبکر کو خلیفہ بنا لیا، یہ سلسلہ حضرت عثمان تک جاری رہا۔ بہت سی نئی باتیں اسلام میں جاری ہوئیں اکثریت نے بیعت خلافت کی طرح ان میں خلفاء کی پیروی کی اور اسے اصل اسلام سمجھ لیا۔ حضرت عثمان کے دور میں ایسی فاش غلطیاں سامنے آئیں کہ وہی لوگ اختلاف وعناد کا شکار ہو گئے۔ قتل عثمان کے بعد کوئی مناسب شخص نہ ملا تو حضرت علیؑ کی بیعت کر لی گئی۔ اس لئے کہ اب لوگ بنوامیہ کی لوٹ مار سے تنگ آ چکے تھے لیکن نظریہ خلافت اور دیگر احکام میں لوگوں کی اکثریت شیخین کے معتقد تھی، حضرت علیؑ کی فوج میں اکثریت ایسے ہی افراد کی تھی، چنانچہ ان کو ہی ہمراہ لے کر پہلے بنوامیہ کے فتنے کا قلع قمع کرنا تھا، اسی لئے امامؑ نے انہیں ساتھ لیا، لیکن آپ کے ہمراہی شیخین کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبات اور مکتوبات میں خلافت کی حقیقی حیثیت ظاہر کی ہے۔ بعض اوقات غیر شرعی احکام کو بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن دیکھا کہ لوگ اس سلسلے میں اطاعت پر آمادہ نہیں، بلکہ انتشار و افتراق کا خدشہ ہے چنانچہ خاموشی اختیار کر لی، ہارون علیہ السلام نے بھی بنواسرائیل کی گوسالہ پرستی کے بارے میں اسی طرح مناسب کوشش کے بعد خاموشی اختیار کر لی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپس آ کر پوچھ گچھ کی تو آپؑ نے فرمایا: ﴿اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ﴾، مجھے خدشہ ہوا کہ آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنو اسرائیل میں تفرقہ وانتشار ڈال دیا اور میری وصیت کا خیال نہیں رکھا۔" (سورۂ طہٰ، آیت نمبر ۹۴)

قوم بنو اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو کر صریح طور پر گمراہ ہو چکی تھی، مناسب انداز میں ہارون علیہ السلام نے روکا لیکن باز نہ آئے بلکہ آپ کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو گئے، اب اگر سختی سے منع کرتے تو زیادہ انتشار وافتراق کا خدشہ تھا۔ اگر حضرت ہارون علیہ السلام سکوت اختیار نہ کرتے تو قوم انہیں قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتی، قرآن کریم میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ﴿قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ کَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ﴾ "ہارون علیہ السلام نے کہا اے میری ماں کے بیٹے قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں۔"

(سورہ اعراف، آیت ۱۵۰) یہ آیت مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام خوف قتل کی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے رک گئے اور تقیہ اختیار کیا اگر اس حالت میں بھی تقیہ نہ کرتے تو نوبت قتل و خونریزی تک پہنچ جاتی لہٰذا اس عارضی تقیہ نے آئندہ کے بہت بڑے فتنے وفساد سے قوم کو بچا لیا اگر حضرت ہارون علیہ السلام تقیہ نہ کرتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک بنواسرائیل کی تباہی و بربادی ہوگئی ہوتی۔ اسی لئے ہارون علیہ السلام نے تقیہ کر لیا، پس یہی حال حضرت امیر علیہ السلام کا تھا، آپ مثل ہارون تھے آپ نے واضح الفاظ میں فرما دیا: ﴿**فکنت انا الذی ابیت علیه مخافة الفرقة بین المسلمین لقرب عهد الناس بالکفر**﴾، ابوسفیان نے جب مجھے ان لوگوں کے مقابلے میں جنگ کرنے کا مشورہ دیا تھا تو میں نے تفریق بین المسلمین کے خوف سے انکار کر دیا کیونکہ زمانہ کفر قریب تھا لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ (العقد الفرید ج ۳ ص ۱۰۸ طبع مصر)

اگر آپؑ کھلم کھلا کثرت کے ساتھ شیخین کی مذمت شروع کر دیتے اور ان کے جاری کردہ احکام کو تبدیل کر کے اصل شریعت نافذ کرتے تو انتشار و افتراق میں اضافہ ہوتا، جو تھوڑی بہت اصلاح ہو رہی تھی اس کے مواقع بھی ختم ہو جاتے۔

شرعی احکام کے عدم ترویج کی وجوہات

ملاں صاحب اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ کو اپنی خلافت میں کیا خوف تھا کہ وہ سابقہ خلفاء کے غیر شرعی احکام محو نہ کر سکے، حضرت علیؑ نے ایسی خلافت لی ہی کیوں، جس کے مقاصد وہ پورے نہ کر سکے، یہ طعن شیعوں پر ہے، ملاں صاحب! ذرا بتائیں، خلافت تو رہی ایک طرف نبوت کے فرائض و مقاصد کیا ہیں؟ ہارون علیہ السلام کے نبی ہونے کا تو انکار نہیں کر سکتے ہو، بتاؤ انہوں نے سب سے بڑی گمراہی یعنی بت پرستی ہوتے ہوئے دیکھی لیکن اپنے قتل اور قوم میں انتشار کے خوف سے خاموشی اختیار کی، آپؑ نبی تھے ساتھ ہی موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے، ایک دن، ایک مہینہ، ایک سال یا دس سال اس سلسلے میں برابر ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن بعد واپس آنا تھا، ہارون علیہ السلام چالیس دن اپنی قوم میں یہ گمراہی ہوتے دیکھتے رہے اور خلیفہ اور نبی

ہونے کے باوجود خاموش رہے۔ آپ کے احمقانہ خیال میں تو انہیں بھی چاہئے تھا کہ نبوت اور خلافت پر لات مار دیتے، اگر یہاں یہ بات تسلیم نہیں ہے تو حضرت امیر علیہ السلام کے بارے میں کس بناء پر اس طرح کے بکواسات لکھنے کی جسارت کرتے ہو؟ ہمیں معلوم ہے کہ اس کی بناء تمہاری ''ناصبیت'' ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

﴿لما قدم بنو العباس بدؤ و ابا لصلاۃ قبل الخطبۃ فانصرف الناس وھم یقولون بدلت السنۃ، بدلت السنۃ یوم العید﴾

جب بنو عباس کی حکومت آئی تو انہوں نے خطبہ سے قبل نماز شروع کی، تو لوگ یہ کہتے ہوئے واپس ہو گئے! سنت تبدیل کر دی گئی ہے، عید کے دن سنت تبدیل کر دی گئی ہے۔''

(سیر اعلام النبلاء ج ۹ ص ۵۶ طبع بیروت)

حالانکہ نماز عید سے قبل خطبہ کی بدعت بنو امیہ نے ایجاد کی تھی، لیکن مرور زمانہ سے لوگوں نے اسے ہی اصل اسلام اور سنت سمجھ لیا، اب عوام کالانعام اس کے برعکس کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہ تھے، تبدیلی کی کوشش یعنی اموی بدعت کے مٹانے کی سعی پر انہوں نے احتجاج کر دیا کہ یہ تو سنت مٹائی جا رہی ہے۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے اس طرح کے بیسیوں واقعات تاریخ اسلام میں درج ہیں، چنانچہ مروی ہے کہ جب حضرت امیر المومنین علیہ السلام کوفہ وارد ہوئے تو امام حسن علیہ السلام کو یہ اعلان کرنے پر مامور کیا کہ مساجد میں جماعت کے ساتھ رمضان میں نماز نفل ادا کرنے کی ممانعت کی منادی کر دیں، امام حسن علیہ السلام نے اس امر کا اعلان فرما دیا، جب لوگوں نے یہ حکم سنا تو **واعمراہ واعمراہ** چیخ اٹھے، امام حسن علیہ السلام نے امیر المومنین کو مطلع کیا تو آپؑ نے حکم دیا کہ انہیں کہہ دیں جیسے پڑھتے ہیں پڑھتے رہیں۔ اپنا رواج جاری رکھیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تہذیب الاحکام ج ا ص ۱۳۵ طبع ایران)

اگر حضرت علی علیہ السلام خلفاء ثلاثہ کے کسی حکم اور فیصلے سے اختلاف کرتے تو لوگ آپؑ کی پیروی سے انکار کر دیتے تھے، اسی طرح کا واقعہ، امہات الاولاد کے فروخت کرنے کے جواز و عدم جواز کے مسئلہ پر پیش آیا، اس سلسلہ میں ابن تیمیہ حرانی لکھتے ہیں:

﴿وقد ثبت بالاسناد الصحيح ان عليا قال اجتمع رائی و رای عمر فی امهات الاولاد ان لا يبعن، وقد رايت الان ان يبعن فقال له عبيدة السلمانی فاضيه رايك مع عمر فی الجماعة احب الينا من رايك وحدك فی الفرقة﴾، صحیح اسناد سے ثابت ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ امہات الاولاد کو فروخت نہ کرنے کے بارے میں میری اور عمر کی رائے ایک ہی تھی، لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ امہات الاولاد بیچی جاسکتی ہیں؟ آپؑ کے قاضی عبید سلمانی نے آپؑ کو کہا: آپؑ کی علیحدہ رائے کی نسبت عمر کے ساتھ آپ کی متحدہ رائے ہی ہمارے لئے زیادہ پسندیدہ ہے۔

(منہاج السنہ ج ۳ ص ۲۶۵ طبع بولاق مصر، قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار ص ۲۲۰ طبع دیوبند)

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے بیان کرتے ہیں: ﴿كنا نبيع امهات الاولاد على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم و ابی بكر فلما كان عمر نهانا فانتهينا عنه﴾ (رواہ ابوداؤد، مستدرك الصحيحين، جلد۲، صفحہ ۱۸، ۱۹ طبع دکن، ازالۃ الخفاء جلد ۲ صفحہ ۱۱۳، طبع لاہور)

اس حدیث کے تحت امام حاکم اور امام ذہبی نے لکھا ہے:

﴿هذا حديث صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه﴾ ''یہ حدیث امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔''

مذکورہ بالا حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ امہات الاولاد کو فروخت کرنا عین سنت رسولؐ ہے اور یہ سنت عہد پیغمبرؐ اور زمانہ ابوبکر تک عمل ہوتا رہا لیکن اس سنت پر عمل کرنے سے حضرت عمر بن خطاب نے سختی سے روک دیا تو لوگ اس سنت رسولؐ کو چھوڑ کر حکم عمر کے سامنے سرنگوں ہوگئے بہت کم لوگ اس سنت پر قائم رہ سکے۔ حضرت زبیرؓ بن عوام اور ان کے صاجزادے جناب عبداللہ بن زبیرؓ اس معاملہ میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھے حضرت عمر کے حکم سے اختلاف رکھتے تھے اس طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی امہات الاولاد کی بیع کے قائل تھے لوگوں نے اعتراض کر دیا کہ حضرت عمر بن خطاب کا حکم اس کے خلاف تھا تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ عمر نے یہ قانون اپنی ذاتی رائے سے بنایا تھا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۶ ص ۴۳۹، مصنف عبدالرزاق جلد ۷ ص ۲۹۳،

السنن الکبریٰ بیہقی ج ۱۰ص ۳۴۸)

اسی بنیاد پر حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ ج ۳ ص ۲۴۹ مطبوعہ بولاق مصر میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ:

﴿و علی رضی اللّٰه عنه تولی الخلافة و لم یکن تصرفه و انبساطه تصرف قبله و انبساطهم﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر چہ خلافت ظاہری کے مالک ہوئے مگر ان کو وہ تصرف حاصل نہ ہوا جو پہلے خلفاء کو ہوا تھا۔

اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ:

﴿هر چند این معنی در حق وی رضی اللّٰه عنه نقصی پیدا نه کرد زیرا که وی ساعی بود در اقامت دین اگرچه میسر نه شد لیکن فضیلت جارحه الٰهی بودن دیگرست و آن اگر می بود احکام خلافت خاصه از وی متخلف نمی شد﴾،

''ہر چند کہ اس سے حضرت علی علیہ السلام کی شان اقدس میں کوئی تنقیص پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ اقامت دین میں ساعی تھے اگر چہ وہ میسر نہ ہو سکی لیکن فضیلت جارحہ الٰہی کا پایا جانا دوسرا امر ہے اور اگر وہ آپ میں پائی جاتی تو آپ کے احکام خلافت خاصہ ہرگز متخلف نہ ہوتے۔''

(ازالتہ الخفاء مقصد اول ص ۳۳۴ طبع سہیل اکیڈمی لاہور)

ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ باوجود خواہش اور کوشش کے غیر شرعی احکام کو مٹا نہ سکے، اس سلسلے میں وہی لوگ رکاوٹ تھے جو گزشتہ خلفاء کے جاری کردہ احکام کے عادی ہو چکے تھے اور انہیں ہی اصل اسلام سمجھ رکھا تھا، اگر حضرت علی علیہ السلام اس سلسلے میں زبردستی کرتے تو یہی لوگ آپؑ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے، معاویہ اور اس کی صیہونی پشت پناہ اسی امر کی کوشش میں تھے، لیکن پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے، حضرت علیؑ بھی اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہوئے پہلے اموِیت و یہودیت سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے، اس کے بعد داخلی اصلاح واحوال پر زور

دیا جاتا، تب اصلاح کا امکان زیادہ ہوتا، لیکن صیہونیوں نے آپ کو اس کا موقع نہ دیا، جوامت مسلمہ کے لئے شدید المیہ اور انتہائی دکھ کا باعث بنا ہوا ہے۔

لوگوں کی ظاہر بین نظریں نہ معلوم کتنے غلط نظریئے اور کتنی غلط آراء قائم کیا کرتی ہیں حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام اور دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کی حکمتوں کا کوئی کیا احاطہ کر سکتا ہے؟ بموجب ﴿لان فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ﴾ ان کے ہر قول و فعل میں مصلحت و حکمت اور مراتب علیا و مدارج کبریٰ پنہاں ہوتے ہیں جن میں بہت سے فوائد مضمر ہیں ہماری ناقص عقل ان کی حکمتوں کا ادراک ہرگز نہیں کر سکتی، لہٰذا اپنے سطحی جذبات سے مغلوب ہو کر ان معصوم ہستیوں کے کردار پر انگشت نمائی اور زبان اعتراض دراز کرنے کی جسارت کرنا گناہِ کبیرہ اور موجب کفر و ضلالت ہے۔ ﴿عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَ عَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ یہ بہت ممکن ہے کہ تم بعض باتوں کو برا سمجھو لیکن وہ تمہارے لیے مفید ہوں اور تم بہت سی باتوں کو اپنے لئے بہتر سمجھو لیکن وہ تمہارے لیے مضر ہوں ہر شئے کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

بحالت تقیہ ائمہ ؑ کا باہم اختلاف اور اس کا معقول جواب

مؤلف فروع کافی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ" امام باقر (والد) تقیہ کے طور پر ایک چیز کو حلال قرار دیتے ہیں امام جعفر (بیٹے) اسے حرام قرار دیتے ہیں فروع کافی مطبوعہ لکھنو جلد دوم ص ۸۰ میں ہے امام (ابان) ابن تغلب سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے امام جعفر علیہ السلام کو سنا وہ فرماتے تھے کہ میرے والد (امام باقر) علیہ السلام بنی امیہ کے زمانہ میں فتوے دیتے تھے کہ باز اور شکرا جس چڑیا کو قتل کریں وہ حلال ہے میرے والد بنی امیہ سے تقیہ کرتے تھے مگر میں ان سے تقیہ نہیں کرتا اور فتوے دیتا ہوں کہ وہ چڑیا جس کو باز اور شکرا قتل کرے حرام ہے۔ دیکھیے امام باقر علیہ السلام نے تقیہ میں حرام کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا اور یہ تقیہ ہرگز محل خوف میں نہ تھا کیونکہ یہ مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا ایسے مسائل اجتہادیہ میں خود فقہائے اہلسنت باہم مختلف تھے اور کوئی کسی پر گرفت نہ کرتا تھا"... (خطبات جیل ص ۲۸۶)

الجواب:۔ ملاں کی سمجھ میں قصور ہے، اموی، عباسی اور دیگر بادشاہوں کے ادوار میں، نیز آج تک بے دین حکمران شکار کو تفریح مشغلہ سمجھتے ہوئے، کتوں اور شکاری پرندوں کے ذریعے شکار کھیلتے ہیں۔ اموی حکمرانوں کے شکاری پرندے اپنے شکار کو مار دیتے ہوں گے، تب بھی وہ حلال سمجھ کر کھا جاتے ہونگے، اسی سلسلے میں انہوں نے یا ان کے کسی نمائندے نے امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی فتویٰ لیا ہوگا، اگر آپؑ حرام قرار دیتے تو اموی کہتے، اچھا تم ہمیں حرام خور قرار دیتے ہو، اس طرح غضبناک ہوجاتے اور آپؑ کی جان، مال، عزت کو ان ظالموں سے خطرہ بڑھ جاتا، چنانچہ تقیہ کے طور پر ان کے موافق فتویٰ دے دیا، امام مفترض الطاعتہ ہے کیا اللہ اور رسولؐ نے بھی ایسے اضطراری اور اکراہی حالات میں حرام کھانے کی اجازت نہیں دی ہے؟ احمق ملاں دین کو سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں تو اس میں اللہ تعالیٰ، رسول ﷺ اور ائمہ اہل بیت ؑ کا کیا قصور ہے۔

اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت ان نفوسِ قدسیہ کے علمی کمالات اور ارشادات وفرمودات سے یکسر بے بہرہ ہے یہ حقائق ودقائق ان کے فہم وادراک سے بالاتر ہیں بقول داغ دہلوی ؎

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک　　　وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور امامت بنو امیہ کے زوال اور عباسی عہد کے ابتداء واستحکام میں گزرا ہے لہٰذا اب بنو امیہ اہل بیتؑ سے توجہ ہٹا کر عباسیوں کے بالمقابل تھے۔ جب عباسی آئے تو پہلے کے مسائل کی کوئی اہمیت نہ رہی بلکہ اموی بدعات کی مخالفت اور اصل دین کی ترویج آسان ہوگئی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کو مکتب اہل بیت کی ترویج کا موقع مل گیا اسی سبب سے انہوں نے فرمایا کہ میں اس زمانہ میں تقیہ نہیں کرتا۔ مزید برآں جبکہ فروع کافی جلد دوم باب صید البزاۃ والصقور وغیر ذالک ص ۸۰ مطبوعہ لکھنؤ پر صحیح احادیث موجود ہیں کہ جن میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا ارسلت بازا او صقراً او عقابا فلا تاکل حتی تدر که فتذکیه و ان قتل فلا تاکل﴾،

جب تم شکار نے باز یا شکرا یا عقاب سے شکار کیا جب تک تو شکار کو ذبح نہ کر لو مت کھاؤ اور

اگر ان پرندوں نے شکار کو مار ڈالا ہو تو اسے نہ کھاؤ''

اور اس کے برعکس اہل سنت کے نزدیک باز یا شکرے سے شکار زخم لگنے سے مر جائے تو وہ شکار حلال ہے اور اس کا کھانا جائز ہے چنانچہ نور الھدایہ باب احکام الصید ج ۴ ص ۸۵ مطبوعہ کانپور میں ہے کہ:

''اگر باز شکار میں سے گوشت کھالے تو وہ شکار کھانا درست ہے'' مگر مذہب اہل بیتؑ میں شکار ذبح کرنے کے بعد کھانا جائز ہے اور مرا ہوا شکار بغیر ذبح کیے ہوئے کا کھانا قطعاً حرام ہے۔

بنو امیہ کے عہد کے درباری فقہاء جو اہل بیتؑ کے مخالف تھے ان کا فتویٰ بادشاہوں کی خواہش کے مطابق ہوتا تھا کیونکہ خلفاء بنی امیہ باز اور شکرا کے ساتھ شکار کرنے کے از حد شوقین تھے اس لئے باز اور شکرا کے مارے ہوئے جانور کو اگرچہ وہ مکروہ ہی کیوں نہ ہو اس کی حلت کا فتویٰ دے دیتے تھے مگر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اس سے پرہیز کرتے تھے مؤلف اس حکمت عملی کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہے ورنہ صحیح بخاری کے ابتدائی صفحات میں ہی ایک مستقل باب ہے کہ ﴿من خص بالعلم قوما دون قوم کراھیة ان لا یفھموا﴾ یعنی علم کی بعض باتیں بتانا اور بعض لوگوں کو نہ بتانا اس وجہ سے کہ ان کی سمجھ میں نہ آئیں'' (ملاحظہ کیجئے: صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴ مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ مصر) بخاری کے اسی مندرجہ بالا باب میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: ﴿حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللّٰہ و رسولہ﴾ ''لوگوں سے (دین کی وہ باتیں) بیان کرو جن کی وہ معرفت رکھتے ہوں کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو جھٹلا دیں'' اور صحیح بخاری کے اسی صفحہ پر ایک اور باب ہے کہ ﴿من ترک بعض الاختیار مخافة ان یقصر فھم بعض الناس عنه فیقعوا فی اشد منه﴾ یعنی ایک بہتر اور افضل بات کو اس ڈر سے نہ کرنا کہ بعض لوگ اس کو نہ سمجھ سکیں اور اس کے نہ کرنے سے بڑھ کر کسی گناہ میں نہ پڑ جائیں''۔

اہل بیت رسولؐ کی برگزیدہ اور مقدس شخصیات کو نشانہ طعن بنانے سے پہلے اپنے مذہب کی کتب کا مطالعہ کرلیا کریں۔ ع

ہے اعتراض اوروں پہ اپنی خبر نہیں

علاوہ بریں اگر سند کے لحاظ سے روایت کی پڑتال کی جائے تو علامہ باقر مجلسیؒ نے اس کے بارے میں اپنی رائے یوں درج کی ہے:

﴿الثامن ضعیف علی المشهور﴾، آٹھویں روایت (اس باب کی) بنابر قول مشہور ضعیف ہے"
(مراۃ العقول ج ۴ ص ۴۵ طبع قدیم ایران)

اس کے راویوں میں سے دو راوی سہل بن زیاد اور مفضل بن صالح ابو جمیلہ الاسدی النحاس مجروح قرار دیئے گئے ہیں، اس سلسلے میں تنقیح المقال ج ۲ ص ۷۵ ج ۳ ص ۲۳۷ طبع نجف، رجال نجاشی ص ۱۳۲ طبع بمبئی، نقد الرجال ص ۳۵۱ مطبوعہ ایران وغیرہ کتب رجال کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

بیٹی کے ترکہ کے متعلق امام کا برجستہ جواب

ملاں کہتا ہے کہ "پل بھر میں مسئلہ تبدیل..... امام جعفر صادقؑ کا عجیب انداز (بحذف عربی) سلمہ بن محرز سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا کہ ایک ارمانی شخص مرگیا اور اس نے مجھے اپنے ترکہ کا وصی بنایا امام نے مجھ سے پوچھا کہ ارمانی کس کو کہتے ہیں میں نے کہا ایک پہاڑی قوم کو کہتے ہیں (اور آپ کو اس سے کیا مطلب مسئلہ تو صرف اتنا ہے کہ وہ مرگیا، اور اس نے مجھے اپنے ترکہ کا وصی بنایا اور ایک بیٹی اس نے چھوڑ دی امام نے مجھ سے فرمایا کہ لڑکی کو نصف دے دو، سلمہ راوی کہتے ہیں میں نے یہ فتویٰ زرارہ سے بیان کیا تو زرارہ نے مجھ سے کہا کہ امام نے تجھ سے تقیہ کیا ہے کل مال اسی لڑکی کو ملے گا، سلمہ کہتے ہیں کہ پھر میں اس کے بعد امام کے پاس گیا تو میں نے کہا کہ اللہ آپ کی حالت درست کرے ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ آپ نے مجھ سے تقیہ کیا امام نے کہا اللہ کی قسم میں نے تم سے تقیہ نہیں کیا بلکہ تمہارے لئے تقیہ کیا کہ کہیں تم کو تاوان نہ پڑ جائے کسی کو اس فتویٰ کا علم تو نہیں ہوا؟ میں نے کہا نہیں تو امام نے فرمایا کہ اچھا باقی مال بھی لڑکی کو دے دو۔ (فروع کافی کتاب المواریث ص ۴۸)

(خطبات جیل ص ۲۸۶، ۲۸۸)

نوٹ۔: واضح ہو کہ یہاں کتاب "خطبات جیل" کے صفحے نمبر آگے پیچھے چھپ گئے ہیں۔

الجواب :۔ جو روایت فروع الکافی کی کتاب المواریث باب میراث الولد سے لی گئی ہے کہ جس میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ترکہ کے باب میں عامہ کے مسلک کے مطابق حکم دیا کہ جب میت کا کوئی بیٹا نہیں ہے فقط ایک بیٹی ہے تو آدھا مال لڑکی کو ملے گا، جناب زرارہؒ سے مستفتی کی ملاقات ہوگئی تو انہوں نے بتایا کہ امامؑ نے تجھ سے تقیہ کر کے یہ مسئلہ اس طرح بتایا ہے ورنہ اصل میں پوری میراث لڑکی کو ملتی ہے۔ وہ شخص واپس گیا اور پوچھا کہ آپؑ نے مجھ سے تقیہ کیا تھا؟ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ تجھ سے نہیں بلکہ تیری خاطر تقیہ کیا تھا، ورنہ آدھے مال کا تجھ پر تاوان پڑ جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ارمانی شخص سنی ہوگا یا اس کے خاندان کے دیگر افراد سنی ہوں گے، اگر یہ وصی سارا مال اس بیٹی کے حوالے کر دیتا تو وہ وارث اس نبطی پر دعویٰ کر دیتے کہ تم ہمارے حصے کا آدھا حصہ ہمیں واپس کرو۔ اس طرح اس شخص کو خواہ مخواہ تاوان پڑ جاتا، امامؑ نے اسکی حالت کو دیکھتے ہوئے اسے بچانے کی خاطر تقیہ کیا، جس طرح تقیہ اپنی جان مال، عزت کو بچانے کے لئے ہوتا ہے، اسی طرح دوسرے شخص کی جان، مال اور عزت بچانے کیلئے تقیہ جائز بلکہ بعض صورتوں میں ضروری ہو جاتا ہے۔

اس روایت کا دوسرا پہلو اسنادی ہے اس لحاظ سے بھی یہ قابل اعتماد نہیں ہے، علامہ مجلسیؒ اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں...

﴿الثالث مجھول﴾، تیسری روایت مجہول ہے (''مراۃ العقول ج ۴ ص ۱۴۴)

امامت اور ولایت کے اہم مقاصد کا ادراک نہ کرنے کی بنا پر احمقانہ استدلال

اصول کافی صفحہ ۴۸۷ میں ہے کہ امام باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کی ولایت (یعنی مسئلہ امامت) کو اللہ نے جبریل سے بطور راز کے بیان کیا، اور جبریل نے پوشیدہ طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے پوشیدہ طور پر بیان کیا، اور علی نے پوشیدہ طور پر جن سے چاہا بیان کیا، مگر اب تم اس کو مشہور کئے دیتے ہو۔'' (خطبات جیل ص ۴۸۷)

الجواب :۔ اسی روایت کے ابتداء میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ایک راوی نے امام رضا علیہ السلام سے

ایک مسئلہ دریافت کیا، آپؑ نے اس مسئلہ کا جواب دینے سے انکار کر دیا، پھر فرمایا: ﴿لو اعطیناکم کلما تریدون کان شراً لکم و اخذ برقبة صاحب هذا لامر﴾، جو کچھ تم پوچھتے ہو، اگر سب کا جواب ہم تمہیں دے دیں، تو تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا اور صاحب ھذا الامر (امامؑ) کی گردن سے پکڑ لیا جائے گا"

اگر سائل کے سوالات کی نوعیت معلوم ہو جائے تو روایت آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے، غالباً سوال غاصب اور ظالم حکمرانوں کے بارے میں ہوگا، یا امام مہدی علیہ السلام قائم آل محمدؑ کے ظہور اور ظالموں کی حکومت کے خاتمے کے باب میں ہوگا۔ جن کے ظہور کو اللہ تعالیٰ خفیہ رکھنا چاہتے تھے، اسی ولایت کو ایک ایسا راز قرار دیا ہے جس کو چھپانے کا حکم ہے، اگر عام شیعوں کو معلوم ہو جاتا تو اس کے وقت کا مخفی رہنا مشکل تھا، نیز اس امر کے کئی صدیاں بعد وقوع کا سن کر عوام مایوس ہو جاتے، اس لئے اسے راز میں رکھنا ضروری تھا، نیز ٹھیک وقت اور تمام علامات واضح کر دی جاتیں تو دشمن ان تک آسانی سے پہنچ سکتے۔

علامہ مجلسیؒ نے مراۃ العقول ج ۲ ص ۱۹۹، ۲۰۰ پر اس روایت کی متعدد معقول توجیہات بیان کی ہیں، مندرجہ بالا توجیہات ان میں سے ہی ہیں، روایت کے الفاظ ان توجیہات کا احتمال رکھتے ہیں، امامؑ نے اسی روایت میں عباسی حکمرانوں کے لئے لفظ "فراعنہ" استعمال کیا ہے، ﴿انتم ترون اعمال هولاء الفراعنة ای بنی عباس﴾ تم ان فرعونوں یعنی بنی عباس کے کرتوت دیکھ ہی رہے ہو، تم ان ظالموں سے بچ کر رہو تو سمجھو کہ تم نے اس امر یعنی قیام قائم آل محمدؑ کو پالیا ہے۔

جہاں تک اپنی امامت کا معاملہ ہے تو ہر امام نے وضاحت کے ساتھ اپنی امامت کا اعلان کیا ہے اور اس پر ایمان لانے کی تلقین کی ہے، لیکن ائمہ اہل بیت ﷺ کی قیادت میں کب الٰہی حکومت قائم ہوگی اور ظالموں غاصبوں کی حکومتوں کا خاتمہ ہوگا، اس سوال کے جواب سے اعراض کیا ہے، کیونکہ اس کا تعلق حال اور مستقبل کے ظالم حکمرانوں کی حکومتوں کے خاتمے سے تھا، یہی وہ راز ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء ﷺ تک پہنچایا جب امامؑ کا ظہور ہوگا تب اس راز کا اعلان کیا جائے گا، تب صیہونی اور ان کے آلۂ کار مبہوت ہو جائیں گے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کی امامت پر اعتراض اور اصول کافی کی عبارت میں خیانت

مؤلف کا عنوان "امام جعفر صادقؑ علانیہ طور پر اپنی امامت کا انکار کرتے تھے" (معاذ اللہ)

اس کے بعد اصول کافی ص ۱۴۲ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

زیدیہ کے دو شخص امام جعفر صادقؑ کے پاس آئے اور پوچھا: کیا تم میں امام مفترض الطاعۃ ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: نہیں، ان دونوں نے آپؑ کو کہا کہ ہمیں تو آپؑ کی طرف سے قابل اعتماد لوگوں نے بتایا ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں، وہ فلاں فلاں لوگ ہیں وہ پرہیزگار لوگ ہیں جھوٹ بولنے والے نہیں ہیں، امامؑ غضب ناک ہو گئے اور فرمایا: میں نے انہیں اس کا حکم نہیں دیا، بعد ازاں وہ دونوں شخص وہاں سے چلے گئے۔" (خطبات جیل ص ۲۸۹، ۲۹۰)

الجواب:۔ مؤلف نے اپنی روایتی خیانت سے روایت کا بعد والا حصہ ذکر نہیں کیا، چنانچہ امام علیہ السلام نے سعید بن السمان سے کہا: آیا تم ان دونوں کو پہچانتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں!، یہ ہمارے بازار کے لوگوں میں سے زیدی مسلک کے لوگ ہیں، اور ان دونوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی تلوار عبداللہ بن الحسن کے پاس ہے (جس کے پاس آپؐ کی تلوار ہو وہی امام مفترض الطاعۃ ہو سکتا ہے) آپؑ نے فرمایا کہ یہ ملعون جھوٹ کہتے ہیں، عبداللہ بن الحسن نے اس تلوار کو اپنی آنکھوں سے کبھی دیکھا تک نہیں ہے، نہ اس کے باپ نے اسے دیکھا ہے، ہاں اگر اس کے باپ نے یہ تلوار حضرت علی بن الحسینؑ کے پاس دیکھی ہو تو صحیح بات ہے اگر یہ دونوں سچے ہیں تو بتائیں کہ اس کے قبضے میں کیا علامت ہے؟ اور اس کی جائے ضرب پر کیا نشانات ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار میرے پاس ہے۔ آپؐ کا رایہ، آپؐ کی زرہ میرے پاس ہیں ..... بنو اسرائیل میں تابوت جس کے گھر ہوتا تھا اسے نبوت ملتی تھی، اور ہم میں جس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلاح ہوتے ہیں امامت اسے ملتی ہے.....

مؤلف عقل کی آنکھ سے دیکھتا نہیں ہے کہ اسی روایت کے آخر میں امامؑ اپنی امامت، کا اعلان کر رہے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ زیدیہ میں سے دونوں افراد عام بازاری قسم کے غنڈہ گرد

آدمی ہوں گے، اسی لئے ان کے بدتمیزی کے لہجہ سے ہی امامؑ نے بھانپ کر اس طرح کا جواب دیا کہ وہ کوئی گستاخانہ بات نہ کر سکے، عزت بچانے کے لئے تقیہ اسی طرح کیا جاتا ہے۔

علامہ باقر مجلسیؒ نے اس روایت کی شرح میں لکھا ہے: ﴿**الأول مجهول فقال لا قال عليه السلام ذلك تقية** ﴾، ''یہ روایت مجہول ہے، آپ نے فرمایا ہے کہ ''نہیں'' یہ نفی آپؑ نے تقیہ کرتے ہوئے کی تھی۔'' (مراۃ العقول ج ۱ ص ۱۷۳)

نماز توڑنے والی چیزیں تقیہ کی حالت میں کی جائیں تو نماز نہیں ٹوٹتی

مؤلف لکھتا ہے کہ.....

''خمینی صاحب اپنی کتاب تحریر الوسیلہ کی جلد اول کتاب الصلوٰۃ میں نماز توڑنے والی چیزوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں (بحذف عربی) دوسرا عمل جو نماز کو باطل کر دیتا ہے وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھنا ہے جس طرح ہم شیعوں کے علاوہ دوسرے لوگ کرتے ہیں ہاں تقیہ کی حالت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (ص ۱۸۶) نویں چیز جس سے نماز باطل ہوتی ہے سورۂ فاتحہ کے بعد قصداً آمین کہنا ہے لیکن تقیہ کے طور پر جائز ہے'' (ص ۱۹۰) (خطبات جیل ص ۲۹۰)

الجواب:۔ مثال کے طور پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا، فاتحہ کے اختتام پر آمین کہنا وغیرہ نماز کو باطل کر دیتے ہیں، لیکن تقیہ کر کے ان کو بجالایا جائے تو مبطل نماز نہیں ہیں۔

ملاں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جان، مال اور عزت کے بچاؤ کے لئے تقیہ روا ہے، خواہ نماز میں دوسروں کی موافقت سے ہو یا کسی بھی عمل میں، بنو امیہ کے عہد میں بڑے بڑے فقہاء ان کی اقتداء میں نماز ادا کرنے سے گریز کرتے تھے لیکن اموی حکمران مسجد میں زبردستی حاضری لگاتے، تب وہ لوگ گھر میں پڑھ کر آجاتے اور ان ظالموں کے پوچھنے پر کہتے کہ ہم گھر پر ادا کر کے نہیں آئے بلکہ تمہاری اقتداء میں ادا کریں گے۔ اور اس سلسلے میں قسمیں بھی کھا لیتے، صحابہ کرامؓ اور تابعین میں سے بعض لوگ حجاج بن یوسف کو کافر اور بعض فاسق سمجھتے تھے لیکن پھر بھی نماز تقیہ کی حالت میں اسی کے پیچھے پڑھ لیا کرتے تھے چنانچہ علامہ ابوعثمان عمرو بن بحر جاحظ حجاج کے ناملائم حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں...... ﴿**و اما ما حكيتم من ولايته للحجاج فقد ولي**

للحجاج و صلى خلفه من كان يرى اكفاره فضلا عن من يرى ففسيقه و في البراة منه و في التقية وسعة و في الخوف عذر ﴾ "اور جو تم بیان کرتے ہو کہ وہ (انس بن مالک) حجاج کے دوست تھے تو بے شک حجاج کے دوست تو تھے ہی اور انہوں نے اس کے پیچھے نماز بھی پڑھی ہے جبکہ وہ (انس) اسے کافر سمجھتے تھے محض تفسیق کرنے والے کی تو بات ہی کیا ہے حجاج سے بیزاری کرنے اور تقیہ کرنے میں وسعت ہے اور خوف میں عذر ہے۔"

(کتاب العثمانیہ للجاحظ ص ۱۵۲ طبع دمشق)

ابن تیمیہ حنبلی نے بھی اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ بہت سے صحابہؓ اور تابعین اپنے وقت کے ظالم اور فاسق حکمرانوں کی اقتداء میں (بحالت تقیہ) نمازیں پڑھتے رہے چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿و كان عبد الله بن عمر وغيره من الصحابة يصلون خلف الحجاج بن يوسف و كان الصحابة و التابعون يصلون خلف ابن ابى عبيد و كان متهما بالالحاد و داعيا الى الضلال﴾

"عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ صحابہ کرامؓ حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی طرح صحابہؓ اور تابعین ابن ابی عبید کی اقتداء میں بھی نمازیں پڑھتے تھے جو کفر و الحاد سے متہم اور گمراہی و ضلالت کی طرف دعوت دینے والا تھا۔"

(مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۳ ص ۲۸۱ طبع اول سعودی عرب)

مزید برآں حافظ ابن عبد البر اندلسی کی کتاب "التمہید" کے حوالے سے ہم اسی باب میں اس مسئلے کا مفصل ذکر کر چکے ہیں وہاں مراجعت کر لی جائے۔

مخالفین سے ظاہراً رواداری کا معاملہ......؟

"امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے مخالفین سے ظاہر میں رواداری کرو اور ان سے میل ملاپ رکھو.... مگر.... اندرونی طور پر ان کے مخالف رہو۔ (احسن الفوائد فی شرح العقائد ص ۶۲۹) بخدا یہ اس تقیہ ہی کی نحوست اور غلاظت کا کرشمہ ہے کہ جس کے باعث امت اسلام کئی حصوں میں بٹ کر رہ گئی ہے" (خطبات جیل ۲۹۰، ۲۹۱)

الجواب :۔ آپ بتائیں کہ جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہو یا آپ کے ہم خیال لوگوں کی تعداد کم اور مخالفین زیادہ ہوں وہاں تم ابتداء میں کیا رویہ اختیار کریں گے، آپ کے دیوبندی ملاں مساجد پر اسی حکمت عملی سے قبضہ کرتے ہیں۔

اس سے پہلے ذرا اصح الکتب صحیح بخاری میں نظر کرلی ہوتی تو ان باتوں میں نہ الجھتے چنانچہ ایک باب میں اسی طرح کی روایت ہے: ﴿**المداراة مع الناس و یذکر عن ابی الدرداء انا لنکشر فی وجوه اقوام وان قلوبنا لتلعنهم**﴾، لوگوں کے ساتھ مدارات کا سلوک کرنا، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے کہ ہم کچھ لوگوں کے سامنے ہنستے ہیں لیکن ہمارے دل ان پر لعنت کررہے ہوتے ہیں، اسی باب میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا آپؐ نے فرمایا اسے اجازت دے دو۔ بہت برا شخص ہے، جب وہ پہنچا تو آپؐ نے اس سے خوب نرم رویے اور لہجے میں گفتگو کی۔ میں نے کہا، یارسول اللہ آپؐ نے پہلے تو اس کی مذمت کی پھر اس کے ساتھ میٹھی باتیں بھی کیں، آپؐ نے فرمایا:

﴿**فقال ای عائشة ان شر الناس منزلة عند الله من ترکه او ودعه الناس اتقاء فحشه**﴾، اے عائشہ! ..... اللہ کے نزدیک بدترین شخص وہ ہے جس سے لوگ اس کے شر سے بچنے کے لئے قطع تعلق کرلیں۔'' (صحیح بخاری ج ۴ ص ۴۳، ۴۴ مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ مصر)

اب دیکھیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرمان میں کیا خامی ہے، صحیح بخاری میں فرمان رسولؐ اور فرمان امامؑ بالکل مطابق اور یکساں ہیں۔

جاہل ملاں کو معلوم ہونا چاہئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تین سال تک خفیہ رہی۔ اس کے بعد ''**فاصدع بما تومر**'' کا حکم ہوا، اگر شیعہ نے بفرض محال کوئی سازش کی ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے تو عام مسلمانوں پر مسلط ظالم اور غاصب بدکردار حکمرانوں کے خلاف ایسی منصوبہ بندی جرم نہ تھی۔ بلکہ یہ عین جہاد تھا، **الحرب خدعه** کی حدیث شاید ملاں کو دیکھنے کی توفیق نہیں ہوئی سب سے بڑا جہاد ظالم اور جابر حکمرانوں کے خلاف ہے، جبکہ تم لوگ ہمیشہ ظالموں اور جابرین کے حامی اور انہیں ظل اللہ کہنے والوں میں پیش پیش رہے ہو۔ تقیہ، مومن

اپنے جان مال عزت کو بچانے کے لئے کرتا ہے۔ جبکہ منافق اپنے کفر اور کفریہ مقاصد کو چھپا کر کامیاب ہونے کے لئے نفاق اختیار کرتا ہے۔

تقیہ کی وجہ سے امت کئی حصوں میں تقسیم نہیں ہوئی بلکہ جعلی سرکاری مذہب کے علمبردار اموی ناصبی صہیونی عناصر کی سازشوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئی، خاندان نبوت کا کردار صاف شفاف بالکل بے داغ ہے جبکہ نواصب کے بڑوں کے گھناؤنے کردار چھپانے کی ہزار کوششوں کے باوجود نہیں چھپتے۔

نواصب کے بڑوں نے واقعی ائمہ اہل بیت ﷺ کے کردار کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ سالہاسال تک منبروں پر ان مقدس حضرات کو لعن طعن کا نشانہ بنایا، لیکن یہ ساری لعنت لوٹ کر ان نواصب پر پڑتی رہی۔ ان نواصب کا کردار انتہائی قابل شرم اور حیا سوز ہے جبکہ ائمہ اہل بیتؑ کا کردار قابل فخر اور روشن ہے کہ امت مسلمہ ان کے نام لے کر سرفراز ہوتی ہے، جبکہ نواصب کے اکابر کے محض نام لے کر امت کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ غرضیکہ ہر ایک کو بھلا یہ مقام کہاں نصیب ہوسکتا ہے ؎

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ائمہ اہل بیتؑ کے تقیہ پر مؤلف کا بے جا اعتراض

مؤلف یہ عنوان قائم کرتا ہے کہ:

''شیعہ کے ائمہ اکثر دینی مسائل میں تقیہ کرتے تھے'' بعد ازاں (مولوی عبدالشکور) کہتا ہے کہ ....

''علماء شیعہ کو اس موضوع پر مستقل تصانیف کرنی پڑی ہیں جن میں کتاب استبصار شیعوں کے اصول اربعہ میں داخل ہے النجم کے مناظرہ حصہ چہارم میں اسی کتاب استبصار سے بہت سے واقعات ائمہ کے تقیہ کے نقل کئے جا سکتے ہیں اس وقت پھر اس کا اعادہ بغرض تکمیل بحث مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلا باب اس کتاب کا ابواب المیاہ ہے اس باب کی ایک حدیث یہ ہے:

ترجمہ :۔ جو حدیث محمد بن علی بن محبوب نے عباس، انہوں نے عبداللہ بن مغیرہ سے انہوں نے اپنے بعض اصحاب سے انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ انہوں نے

فرمایا جب پانی بقدر دو قلہ کے ہو تو اس کو کوئی چیز نجس نہیں کر سکتی قـلـة مٹکے کو کہتے ہیں پس خرابی اس روایت میں یہ ہے کہ مرسل ہے اور احتمال ہے کہ یہ حدیث بطور تقیہ کے ہو کیونکہ یہ مذہب بہت سے سنیوں کا ہے......

ترجمہ:۔ ... جو حدیث احمد بن محمد نے برقی سے انہوں نے وہب بن وہب سے انہوں نے ابو عبداللہ علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا میرے والد کی انگوٹھی میں یہ عبارت کندہ تھی: ﴿العزة لله جميعا﴾ یہ انگوٹھی ان کے بائیں ہاتھ میں رہتی تھی اور وہ اسی سے آبدست لیتے تھے اور امیر المومنین علیہ السلام کی انگوٹھی میں یہ عبارت کندہ تھی: ﴿الملك لله﴾ وہ انگوٹھی ان کے ہاتھ میں رہتی تھی اور اسی سے وہ آبدست لیتے تھے پس یہ حدیث تقیہ پر محمول ہے"....

(خطبات جیل ص ۲۹۳، تا ۲۹۶)

الجواب:۔ مؤلف کو شاید معلوم نہیں ہے کہ جس زمانے میں حضرات ائمہ اہل بیت علیہم السلام گزرے ہیں، وہ زمانہ نواصب کے عروج کا زمانہ تھا، اکثر اموی اور عباسی حکمران خود ناصبی اور نواصب کے سرپرست تھے، عوام کی اکثریت ناصبیت کو ہی اصل اسلام سمجھے ہوئے تھی یہ نواصب اتنے خبیث تھے کہ کسی معمولی سے امر میں بھی اپنی مخالفت برداشت کرنے کے روادار نہ تھے، اس سے آگے بڑھ کر وہ ائمہ اہل بیتؑ اور ان کے ماننے والوں کو سرکاری مذہب (ناصبیت) اور حکمرانوں کے اقتدار کے لئے خطرہ تصور کرتے تھے، اس لئے اس عہد میں قدم قدم پر اور لحہ بہ لحہ تقیہ کی ضرورت پڑتی تھی، امامؑ کی غیبت کے بعد حکمرانوں کے لئے خطرہ کم ہو گیا اور اس طرح تقیہ کی ضرورت بھی کم ہو گئی۔

حضرات ائمہ اطہارؑ کے پاس نواصب عوام اور حکمرانوں کے آلہ کار بھی آتے اور بعض مسائل پوچھتے، یا ان کی موجودگی میں بعض شیعہ کسی مسئلہ پر سوال کرتے تب حکمت عملی کی بنیاد پر ایسا جواب دیا جاتا تھا جس سے نواصب اور حکمرانوں کے جاسوسوں کو اشتعال انگیز مخبری کرنے کا موقع نہ ملے۔ ملاں نے عبدالشکور لکھنوی کے رسالہ النجم سے اقتباس لے کر شیخ الطائفہؒ کی کتاب الاستبصار کی بعض روایات کو اس سلسلے میں پیش کیا ہے ہم ان میں سے بعض اہم روایات پر تبصرہ کئے دیتے ہیں۔

پہلی روایت الاستبصار کے ابواب المیاہ سے ماخوذ ہے، جس میں یہ الفاظ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں: ﴿اذا کان الماء قدر قلتین لم ینجسه شی .... ﴾ جب پانی دو قلوں کے برابر ہو تو اسے کوئی شے نجس نہیں کرتی۔ چونکہ یہ روایت سنداً منقطع ہے اسی لئے مؤلف علامہ شیخ طوسیؒ نے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے:

﴿فاول ما فی هذا الخبر انه مرسل ﴾

"اس خبر میں پہلی خامی یہ ہے کہ یہ مرسل ہے"

اس کی سند کا انقطاع اس طرح مذکور ہے۔

﴿... عن عبدالله بن المغیرة عن بعض اصحابه عن ابی عبدالله علیه السلام.... الخ﴾

جب راوی مجہول ہوں تو روایت نا قابل اعتماد ہوتی ہے۔

سرکار علامہ شیخ طوسیؒ نے دوسرا احتمال تقیہ کا پیش کیا ہے کہ اگر روایت کے انقطاع سے قطع نظر کر کے اس کی صحت تسلیم کر لی جائے تو اسے تقیہ پر محمول کیا جائے گا لیکن مؤلف نے اپنی روایتی بددیانتی اور دجل و فریب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے گرو عبدالشکور لکھنوی کی تقلید و تأسی کرتے ہوئے النجم سے عبارت نقل کر دی جبکہ اصل کتاب دیکھی تک نہیں، کتاب استبصار طبع قدیم لکھنو ہمارے پیش نظر ہے، اس کے متعلقہ مقام پر متصل ہی یہ عبارت ہے، جسے عبدالشکور اور اس کے اندھے مقلد نے اپنے مکروہ عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے نقل کرنا گوارا نہ کیا وہ حذف شدہ عبارت درج ذیل ہے:

﴿و یحتمل مع تسلیمه ان یکون الوجه فیه ما ذکرناه فی الخبر المتقدم و هو ان یکون مقدار القلتین مقدار الکر لان ذلك لیس بمنکر لان القلة هی الجر الکبیر فی اللغة و علیٰ هذا لاتنا فی بین الاخبار﴾،

اس روایت کو درست تسلیم کرنے کی صورت میں اسی توجیہ کا احتمال ہو سکتا ہے جو گزشتہ روایت میں ہم نے ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ دو قلوں کی مقدار کُر (تقریباً ساڑھے تین مربع بالشت پانی) کی مقدار کے برابر بنتی ہو، یہ کوئی نا معقول بات نہیں ہے، اس لئے کہ قلہ لغت میں جرہ کبیرہ کو

ہی کہا جاتا ہے، چنانچہ اس بناء پر ان روایات میں باہم کوئی منافات نہیں ہے“

(الاستبصار، ج ۱، ص ۵، مطبوعہ لکھنو)

ایک اور قابل ذکر روایت استنجاء کے بارے میں ہے، جس میں یہ مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ والد کی انگشتری میں ﴿العزة لله جميعا﴾ کی عبارت کندہ تھی، یہ انگوٹھی آپ کے بائیں ہاتھ میں رہتی تھی، اس ہاتھ سے آپؑ آبدست لیتے تھے، اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کی انگوٹھی پر ﴿الملك لله﴾ کی عبارت کندہ تھی، آپ بھی اس انگوٹھی کے پہنے ہوئے اسی ہاتھ سے آبدست لیتے تھے۔

اس روایت پر جو تبصرہ شیخ طوسیؒ نے کیا ہے اسے عمداً عبدالشکور اور اس کے بے عقل اور احمق مقلد نے ترک کر دیا اور صریح خیانت کا ارتکاب کرتے ہوئے اپنی جہالت و بددیانتی کا عجیب کرشمہ دکھایا ہے، شیخ طوسیؒ اس روایت پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

﴿فهذا الخبر محمول على التقية لان راويه وهب بن وهب وهو عامي ضعيف متروك الحديث فيما يختص به﴾

”یہ خبر تقیہ پر محمول ہے اس لئے کہ اسکا راوی وھب بن وھب ہے جو عامی (ناصبی) ہے جو خبر صرف اسی سے مروی ہو اس میں یہ ضعیف اور متروک ہے۔“ (الاستبصار ج ۱ ص ۳۶ طبع لکھنو)

اس روایت کی بناء پر عبدالشکور لکھنوی اور اسکے نادان چیلے نے حضرات ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی توہین کی ہے اور ان مقدس ہستیوں کا تمسخر اڑانے کی مذموم کوشش کی ہے، چنانچہ اس روایت کے راوی نے جو عامی یعنی ناصبی تھا، ائمہ اطہار علیہم السلام کے ساتھ اپنی عداوت اور بغض کا اظہار کرتے ہوئے اس طرح کی خبر وضع کی، پھر اسی قدیم ناصبی کی نے چاٹتے ہوئے لکھنوی و جھنگوی جدید نواصب نے ائمہ اہل بیتؑ کی توہین کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا۔

حضرت امام زین العابدینؑ کا تقیہ اور مؤلف کی نکتہ چینی

مؤلف کہتا ہے کہ:

”امام زین العابدین اپنے گھر میں اذان دیتے وقت ﴿الصلوة خير من النوم﴾ کہتے

ہیں نیز اسی کتاب (الاستبصار) کی بحث اذان میں ہے (بحذف عربی) حسین بن سعید نے فضالہ سے انہوں نے علاء سے انہوں نے امام باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میرے والد امام زین العابدین اپنے گھر میں اذان صبح کے اندر ﴿الصلوٰۃ خیر من النوم﴾ کہتے تھے اور اگر میں اس کو نہ کہوں تب بھی کچھ حرج نہیں اس قسم کی جس قدر حدیثیں ہیں جن میں ﴿الصلوٰۃ خیر من النوم﴾ کا ذکر ہے سب تقیہ پر محمول ہیں۔ (خطبات جیل ص ۳۰۷)

الجواب:۔ مؤلف کا یہ اعتراض کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ ان کے والد صاحب گھر میں اذان دیتے ہوئے ﴿الصلوٰۃ خیر من النوم﴾ کہتے تھے ﴿ولو رددت ذلك لم یکن به باس﴾ اگر میں بھی اس کو دہراؤں تو کوئی حرج نہیں ہے اس قسم کی روایت جو ان الفاظ پر مشتمل ہیں، یہ تقیہ پر محمول ہیں یہاں مراد تقیۂ راوی ہے نہ کہ امام علیہ السلام کا تقیہ، چونکہ بعض اوقات نامساعد حالات کی وجہ سے امام علیہ السلام حکمت عملی سے جواب دیتے ہیں مگر راوی تقیۂ اس کی نسبت امام علیہ السلام کی طرف کر دیتا ہے۔ اور اصل عربی عبارت ﴿ولو رددت ذلك لم یکن به باس﴾ کا ترجمہ عبدالشکور لکھنوی اور اس کے اندھے نقال نے بالکل غلط کیا کہ (اگر میں اس کو نہ کہوں تب بھی کچھ حرج نہیں)'' یہ تو ان احمقوں کی عربی دانی کا حال ہے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ ''اگر میں بھی اس عمل کو دہراؤں، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگی'' ہے۔ ملاؤں کو اعتراض ہے کہ گھر میں تقیہ کی کیا ضرورت تھی، امام کو کس نے مجبور کیا تھا کہ گھر میں اذان دیں اور یہ الفاظ بھی کہیں، اپنے حالات کو خود مبتلا ہونے والا ہی بہتر سمجھ سکتا ہے، امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد خاندان رسالت کی جو مظلومیت تھی وہ محتاج بیان نہیں ہے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اموی مظالم کے عروج کے زمانے میں زندگی بسر کر رہے تھے، کیونکہ اموی ظالمین خلافت ثلاثہ کو اچھا سمجھتے اور حضرت علیؑ کی برملا مذمت کرتے تھے، اس لئے شہادت امام حسینؑ کے بعد انہوں نے جاسوس اور مخبر مقرر کئے ہوں گے جو انہیں اس امر کی اطلاع دینے پر مامور ہوں گے کہ ائمہ اہل بیتؑ ان کے مزعومہ سرکاری مذہب سے منحرف تو نہیں ہیں۔ اگر ان کو خلفاء ثلاثہ کے مسلک کے خلاف کوئی امر ملتا تو ائمہ اہل بیتؑ کے خلاف پروپیگنڈہ مہم مزید تیز کر دیتے، اس لئے آپؑ نے عوام کو یہ باور کرانے کے لئے

کبھی کبھار اس طرح عمل کیا کہ عوام یہ سمجھیں کہ امامؑ ابوبکر، عمر اور عثمان کو مانتے ہیں، تاکہ عوام اموی پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں اور بتدریج اہل بیت علیہم السلام کے ہمدرد بنے رہیں خواہ پورے کے پورے متبع نہ بن سکیں۔ ائمہ علیہم السلام کے معاملات اسرار مخفیہ پر مبنی ہوا کرتے ہیں ہر انسان کی عقل انہیں ادراک نہیں کر سکتی۔ ع

نہ در ہر سخن بحث کردن رواست
خطا کردن بزرگان گرفتن خطاست

شیخ طوسیؒ نے اسی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے "محمولہ علی التقیة" کے متصل بعد لکھا ہے: ﴿لاجماع الطائفة علی ترك العمل بها﴾ اس لئے کہ شیعہ علماء کا اجماع ہے کہ اس پر عمل متروک ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اذان کے کلمات کی تمام احادیث ان کلمات سے خالی ہیں، بلکہ یہ حضرت عمر کے دور کی ایجاد ہے۔

تقیہ کے عدم جواز کے قائل صرف خارجی ہیں

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اہل اسلام میں سے سوائے خوارج کے تقیہ کا انکار کسی نے بھی نہیں کیا۔

مشہور مورخ ابن عساکر دمشقی نے خارجیوں کے مخصوص عقائد کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک خاصہ تقیہ کے عدم جواز کا لکھا ہے چنانچہ حسان بن فرخ بصری کے حالات میں لکھتے ہیں:

﴿رابعها انهم اباحوا قتل اطفال و نساء الذين خالفوهم ..... سادسها قالوا ان التقية غير جائزة لا في القول ولا في العمل﴾ خوارج کا چوتھا خاصہ یہ ہے کہ جو ان کے مخالف ہیں ان کے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا مباح جانتے ہیں اور چھٹا خاصہ یہ ہے کہ وہ تقیہ کو قول و عمل میں ناجائز قرار دیتے ہیں۔" (تہذیب ابن عساکر ج ۴ ص ۱۴۷ طبع بیروت)

علم کلام کے مشہور محقق میر شریف الجرجانی ﴿الفرقة الثالثة من كبار الفرق الاسلامية الخوارج﴾ کے ذیل میں خواص خوارج بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

﴿وقالوا تحريم التقية في القول و العمل و يجوز قتل اولاد المخالفين﴾ "اور خارجی

کہتے ہیں کہ تقیہ قول وفعل دونوں میں حرام ہے اور وہ اپنے مخالفین کو قتل کرنا جائز سمجھتے ہیں۔"

(شرح مواقف ص ۷۵۷ طبع لکھنو)

اور اسی طرح علامہ عبد الکریم شہرستانی نے اپنی معروف کتاب الملل والنحل ج ا ص ۱۲۲ مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر میں خارجیوں کے نظریات کو بڑی شرح وبسط سے بیان کیا ہے جن میں سے ایک نظریہ یوں ہے:

﴿والسادسة أن التقية غير جائزة في قول ولا عمل﴾

"اور خوارج کی چھٹی علامت یہ ہے کہ وہ قول وعمل میں تقیہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔"

(کذافی تفسیر المنار، ج ۳، ص ۲۸۰، طبع دار المنار مصر)

اسی سلسلہ میں علامہ محمود شکری آلوسی نے خوارج سے متعلق لکھا ہے: **﴿اما الخوارج فذهبوا الى انه لا تجوز التقية بحال ولا يراعى المال و حفظ النفس و العرض فى مقابلة الدين اصلاً﴾** (مختصر التحفۃ الاثنا عشریہ، ص ۲۸۹، طبع استانبول)

مندرجہ بالا بیانات اور تحقیقات انیقہ سے اظہر من الشمس ہوا کہ شیعہ اور اہلسنت دونوں تقیہ کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن اس کے برعکس تقیہ کے منکر اور اسے ناجائز سمجھنے والے صرف خارجی اور ناصبی ہیں جو اپنے مخالف اور اس کی اولاد کو بھی قتل کرنا باعث ثواب سمجھتے ہیں۔

حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی کے باہمی اختلافات کا اجمالی تذکرہ

ملاں نے مذہب اہل بیت کو مطعون کرنے اور مورد الزام ٹھہرانے کی خاطر یوں الزام تراشی کی ہے کہ:

"ائمہ شیعہ کی ان اختلاف بیانیوں یا تقیہ پردازیوں کے سبب سے ان کے اصحاب میں مذہبی اختلاف بکثرت پیدا ہوئے اور اصحاب کے بعد علماء اور ائمہ مجتہدین میں وہی اختلاف رونما ہوئے اور یہ اختلاف صرف اعمال میں نہیں بلکہ عقائد میں ...." (خطبات جیل ص ۳۲۳)

<u>الجواب</u>۔ مؤلف کا یہ کہنا کہ "ائمہ شیعہ کے ان متضاد بیانات کی وجہ سے شیعہ میں مذہبی اختلاف بکثرت پیدا ہوئے یہ اختلاف صرف اعمال میں ہی نہیں بلکہ عقائد میں بھی" اصل حقیقت کے

سراسر منافی ہے۔ مؤلف نے یہاں دجل وتلبیس کی انتہا کر دی ہے۔ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی، اوزاعی، سفیان ثوری مسلم، بخاری وغیرہ کے باہم شدید اختلافات، جو آج تک باقی ہیں اور مشاہدے میں آ رہے ہیں جو کتب میں دیکھے جا سکتے ہیں کس کے متضاد اور مختلف بیانات کی بناء پر پیدا ہوئے ہیں؟ کیا آپ اس کا الزام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عام صحابہؓ پر لگاؤ گے؟ کیا آپ کی ناقص عقل اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ ان مذکورہ فقہاء کے باہمی اختلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متضاد بیانات اور اختلاف بیانیوں اور صحابہ کرامؓ کے مختلف اقوال کی وجہ سے ظاہر ہوئے؟

شرم تم کو مگر نہیں آتی

امام بخاری نے تقریباً سترہ مقامات پر ''بعض الناس'' کے لفظ کے بعد امام ابوحنیفہ کی مذمت کی ہے، امام مسلم نے بخاری کی مذمت صحیح مسلم کے مقدمہ میں کی ہے، اوزاعی اور عبداللہ بن مبارک نے امام ابو حنیفہ کی شدید مذمت کی ہے۔ چار اماموں کے درمیان اتنا شدید اختلاف کہ ایک مسلک کی طرف حق و انصاف واضح ہونے کے باوجود دوسرے امام کے پیروکار اپنے امام کی غلط بات پر اڑ گئے اگر اس بات میں شک وشبہ ہو تو شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس دار العلوم دیوبند کا فرمان ان کی ''تقریر ترمذی'' ص ۳۹ مطبوعہ مکتبہ رحیمیہ دیوبند میں دیکھ لیجیے۔ جیسا کہ باب البیعان بالخیار کے تحت آخر میں فرماتے ہیں: ﴿**الحق و الانصاف ان الترجیح للشافعی فی هذه المسلة و نحن مقلدون یجب علینا تقلید امامنا ابی حنیفة**﴾ یعنی حق اور انصاف یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ترجیح شافعی کے مسلک کو ہے اور ہم مقلد ہیں ہم پر ہمارے امام ابو حنیفہ کی تقلید واجب ہے۔

اب بتائیے کہ کیا یہ معمولی اختلاف ہے کہ حق و انصاف مان لینے کے بعد بھی انکار کر دیا جائے اور جب بڑے بزرگوں کا یہ حال ہو کہ محض تعصب کی بناء پر حق بات کو بھی نہ ماننا واجب قرار دیا جائے تو نچلے طبقہ کے لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ ع

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربا

فلا تلم الاولاد فیه علی الرقص

جب گھر کا مالک ہی ڈھول بجانا شروع کر دے تو اگر بچے رقص کرنے لگیں تو انہیں ملامت مت کریں۔

دمشق کے ایک حنفی قاضی محمد بن موسیٰ متوفی ۵۰۶ ھ شافعی اہلسنت کے بارے میں اپنا فیصلہ اس طرح صادر کرتے ہیں:

﴿لو كان لى امر لاخذت الجزية من الشافعية﴾

اگر میری حکومت ہوتی تو میں شافعیوں سے جزیہ وصول کرتا'' (میزان الاعتدال ج ۴ص ۵۲ ، الجواہر المضیہ ج ۲ص ۱۳۶، سیر اعلام النبلاء ج ۱۹، ص ۲۴۹ حاشیہ نمبر ۳)

یعنی قاضی صاحب کے نزدیک شافعی مسلک کے لوگ بشمول امام شافعی غیر مسلم قرار پاتے ہیں جن سے جزیہ لینا چاہئے۔ اسی طرح شام کے حاکم شرف الدین عیسیٰ بن ابی بکر کا خاندان امام شافعی کا مقلد تھا، لیکن اس نے ۶۲۴ ہجری میں حنفی مذہب اختیار کر لیا، اس کے باپ نے اس سے پوچھا کہ تمہارا پورا خاندان شافعی المذہب ہے تم نے کیوں حنفی مذہب اختیار کر لیا؟ تو انہوں نے جواب میں کہا... ﴿اترغبون عن ان يكون فيكم رجل واحد مسلم ﴾ کیا تم یہ بات ناپسند کرتے ہو کہ تم میں سے کوئی ایک آدمی مسلمان ہو'' (الفوائد البہیہ ص ۶۲ طبع لکھنو)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شرف الدین کے نزدیک شافعی مسلمان ہی نہیں ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ تقیہ کی بناء پر مختلف بیانات کی وجہ سے شیعہ اثنا عشریہ میں نہ کوئی اختلاف پیدا ہوا، نہ ہی متعدد مسلک قائم کئے گئے، جن کی باہم اس حد تک مخالفت ہوتی کہ وہ ایک دوسرے کو گمراہ قرار دیتے۔

مجتہدین شیعہ کا کوئی الگ الگ فرقہ یا گروہ نہیں ہوتا جو باہم تکفیر کرتا ہو۔ اگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے بعض اقوال بظاہر ایسے نظر آتے ہیں تو تمام تر شیعہ علماء نے انہیں موارد تقیہ میں قرار دیا ہے اور تقیہ کی حالت میں صادر شدہ فرامین اس وقت کے لوگ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ بعد میں سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بالخصوص معاند اور احمق ملاں تو ان معقول وجوہات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

مؤلف کی کج فہمی اور حق الیقین کی عبارت میں تحریف کا ارتکاب

''ائمہ کے بعض اصحاب ائمہ کو معصوم کہتے تھے اور بعض لوگ مثل اہلسنت کے ان کے معصوم ہونے کا انکار کرتے تھے اور ان کے علمائے نیکوکار جانتے تھے علامہ باقر مجلسیؒ کتاب حق الیقین کے صفحہ ۷۹۶ پر لکھتے ہیں: ﴿از احادیث ظاهر می شود که جمع از راویان که در اعصار ائمه علیهم السلام بوده اند از شیعیان اعتقاد به عصمت ایشان نواشته اند بلکه ایشان را علمائے نیکوکار میدانسته اند چنانکه از رجال کشی ظاهر۔ می شود و مع ذلك آئمه ﷺ حکم بایمان بلکه عدالت ایشان می کردند﴾

احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعہ راویوں کی ایک جماعت جو ائمہ ﷺ کی ہم عصر تھی آئمہ کے معصوم ہونے کا اعتقاد نہ رکھتی تھی بلکہ آئمہ کو نیکوکار عالم جانتی تھی چنانچہ رجال کشی سے معلوم ہوتا ہے اور باوجود اس کے ائمہ ﷺ نے ان کے مومن اور بلکہ عادل ہونے کا حکم لگایا ہے''

(خطبات جیل ۳۲۳)

<u>الجواب</u>۔ ملاں کا خیال ہے کہ آئمہ اہل بیت ﷺ کے بعض اصحاب اہل سنت کی طرح ان کے معصوم ہونے کا انکار کرتے تھے، اور ان کو علمائے نیکوکار جانتے تھے، اس کی تائید میں حق الیقین سے ایک عبارت پیش کی ہے، جسے علامہ مجلسیؒ نے شیخ زین الدین سے نقل کیا ہے، پھر اس کے بعد علامہ مجلسیؒ نے شیخ زین الدین کے اس خیال کی سختی سے تردید کر دی۔ لیکن ملاں اور اس کے مقتدا عبدالشکور لکھنوی نے جان بوجھ کر عبارت میں قطع و برید کر کے غلط مفہوم پیش کیا ہے، علامہ مجلسیؒ کی عبارت یوں ہے:

''مؤلف گوید که حکم عامی که شیخ زین الدین فرموده اند در مسئله اولی از هیچ طرف نزد فقیر درست نیست اما آنکه اعتقاد بامامت و وجوب اطاعت کافی است بیوجه است زیرا که بسیاری ازصفات ائمه هست که از ضروریات دین شیعه امامیه شده است .... و همچنیں عصمت ائمه ﷺ و آنکه بغیر ایشیان امامی نخواهد بود ....وآنچه فرموده است که از احادیث ظاهر

میشود که بعضی از اصحاب ائمه به عصمت ایشیان قائل نبوده اند، . . . علماء آنها را اکثر تاویل کرده اند و قدح در سندهای آنها کرده اند و اگر صحیح باشد چون معصوم نیستند، ممکن است که لغزشی باشد که از ایشان صادر شده باشد و اگر آنها را میگوید که در حق غیر امثال این جماعت وارد شده است ایمان و عدالت ایشان ممنوع است، وائمہ بانیك و بد مردم از برائے مصالح ضروریه سلوك نیکو میکرده اند"

مؤلف (علامہ مجلسی) کہتے ہیں کہ شیخ زین الدین نے مسئلہ اولیٰ میں جو عام حکم دیا ہے وہ کسی لحاظ سے بھی فقیر کے نزدیک درست نہیں ہے، چنانچہ یہ کہ صرف امامت اور اطاعت کے وجوب کا اعتقاد (شیعہ ہونے کے لئے) کافی ہے، بے دلیل ہے۔ اس لئے کہ ائمہؑ کے بہت سے اوصاف ایسے ہیں جو شیعہ امامیہ کے دین کی ضروریات میں سے ہیں.... اور اسی طرح عصمت ائمہ اہل بیتؑ ہے کہ جس کے بغیر کوئی شخص امام بن ہی نہیں سکتا.... یہ جو شیخ زین الدین نے کہا ہے کہ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہؑ کے بعض اصحاب آپ کی عصمت کے قائل نہیں تھے ..... " علماء نے اکثر ان کی تاویل اور ان کی سند میں قدح و جرح کی ہے، اگر ایسی روایات صحیح ہی تصور کر لی جائیں، چونکہ یہ لوگ معصوم نہیں ہیں، چنانچہ ممکن ہے کہ یہ ان کی لغزش ہو جو ان سے صادر ہوئی ہے.... اگر ایسی روایات کے بارے میں یہ کہیں کہ یہ ان جیسے علماء کے علاوہ دوسرے لوگوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں تو ان کا ایمان اور ان کی عدالت مستند نہیں ہے، جبکہ ائمہ علیہم السلام بعض ضروری مصلحتوں کی بناء پر اچھے برے ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرتے تھے۔"

(حق الیقین ص ۴۵۳ فصل نوزدہم معانی ایمان و اسلام و کفر و ارتداد طبع جدید تہران)

اگر بعض لوگ عصمت ائمہ علیہم السلام کے قائل نہ تھے تو ملاں کو علم نہیں کہ شیعہ کی اصطلاح ابتداءً ایسے سب لوگوں کے لئے استعمال ہوئی ہے جنہوں نے معاویہ اور دیگر اموی، عباسی حکمرانوں اور ان کے پیروکار نواصب کے مقابلہ میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے محبت کا اظہار کیا اور ان کا ساتھ دیا، خواہ یہ لوگ خلفاء ثلاثہ یا شیخین کی خلافت کے بھی قائل رہے ہوں، چنانچہ شاہ عبدالعزیز

دہلوی لکھتے ہیں:

﴿و نیز باید دانست که شیعه اولی که فرقه سنیه و تفضیلیه اند در زمان سابق بشیعه ملقب بودند﴾،

''نیز یہ جان لینا چاہئے کہ شیعہ اولیٰ، جو درحقیقت سنی اور تفضیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے زمانے میں ''شیعہ'' کے لقب سے ہی مشہور تھے''۔ (تحفہ اثنا عشریہ ص ۱۷ مطبوعہ لکھنو)

اس طرح کے شیعہ جو درحقیقت سنی تھے، ائمہ اہل بیتؑ کی عصمت کے قائل نہ تھے، یہ اصلی شیعہ بھی نہ تھے بلکہ یہ سنی ہی تھے، لیکن اس وقت تک اہل سنت کی اصطلاح رائج نہ ہوئی تھی بعد میں جب عباسی دور میں اہل سنت کی اصطلاح رائج ہوئی تو یہ لوگ الگ مشخص ہوگئے، چونکہ ابو حنیفہ بھی ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے عقیدت و محبت رکھتے تھے اس لئے انہیں بھی شیعہ کہا گیا اور ان کا شمار شیخ طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے رجال میں شیعہ کے ضمن میں کیا ہے، شاہ عبدالعزیز دہلوی اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

﴿از شیعه مخلصین امام ابو حنیفه کوفی رحمة الله علیه نیز تصویب رای زید مینمود﴾

''شیعہ مخلصین میں سے امام ابوحنیفہ کوفی نے بھی حضرت زید (بن علی) کی رائے کی تائید کی ہے''۔ (تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۸)

مؤلف نے اپنی بے علمی اور جہالت سے یہ سمجھ لیا کہ ائمہ علیہم السلام کو معصوم نہ سمجھنے والے بھی شیعہ تھے، حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے، جو انہیں تاریخی اور علمی اصطلاحات سے عدم واقفیت کی بنا پر ہوئی ہے اور عصمت کے قائل نہ ہونے والے لوگ اہل سنت کے متقدمین علماء کی اصطلاح میں تو شیعہ کہلاتے تھے، لیکن شیعہ امامیہ اثنا عشریہ نہ تھے بلکہ درحقیقت سنی تھے۔

﴿باب ۱۲﴾

قاتلانِ امام حسینؑ کا تعارف

اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کر دینا کوئی معمولی عبادت نہیں ہے، بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں فقط تھوڑا بہت مال قربان کر سکتے ہیں۔ جسے دوبارہ اسی دنیا میں حاصل کرنے کا امکان ہوتا ہے، اسی طرح بعض لوگ صرف وقتی طور پر اپنے آرام وسکون کو قربان کر دیتے ہیں۔ اس گمان سے کہ یہ مختصر وقت ہے گزر جائے گا۔ لیکن فی سبیل اللہ ان تمام اشیاء کے ساتھ ساتھ یعنی مال اور اولاد کے علاوہ جان کی قربانی آخری مرتبہ ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُصِيْبَةٌ قَالُوْٓا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ ہم ضرور آزمائیں گے تم کو کچھ خوف، بھوک اور مال، جان اور پھلوں کے نقصان کے ذریعے سے، صابرین کو خوشخبری سنا دیجئے، جن پر مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے، ایسے ہی لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے صلوٰت (درود) اور رحمت ہے، یہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں" (سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷)

کچھ مسلمان آپس میں یہ گفتگو کر رہے تھے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل سب سے زیادہ پسند ہے تو ہم وہی کام کر ڈالیں، تب اللہ تعالیٰ نے سورۂ الصّف کی یہ آیات نازل کیں: ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾

اے ایمان والو! ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جو تم کر نہیں سکتے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک، یہ امر

قابل نفرت ہے کہ تم ایسی باتیں کہو جن پر عمل نہیں کر سکتے، بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر جنگ کرتے ہیں جیسے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ (سورۂ الصف، آیت ۲-۴)

انہی آیات کے حاشیہ پر علامہ شبیر احمد عثمانی نے خدا لگتی بات کہی ہے، جسے اس مقام پر نقل کر دینا فائدہ سے خالی نہیں ہے،

''اور بندہ کو لاف زنی اور دعوے کی بات سے ڈرنا چاہیئے کہ پیچھے مشکل پڑتی ہے زبان سے ایک بات کہہ دینا آسان ہے لیکن اس کا نباہنا آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص سے سخت ناراض اور بیزار ہوتا ہے جو زبان سے کہے بہت کچھ اور کرے کچھ نہیں۔ روایات میں ہے کہ ایک جگہ مسلمان جمع تھے کہنے لگے ہم کو اگر معلوم ہو جائے کہ کون سا کام اللہ کو سب زیادہ پسند ہے تو وہی اختیار کریں، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ یعنی دیکھو! سنبھل کر کہو، لو ہم بتلائے دیتے ہیں کہ اللہ کو سب سے زیادہ ان لوگوں سے محبت ہے جو اللہ کی راہ میں اس کے دشمنوں کے مقابلہ پر ایک آہنی دیوار کی طرح ڈٹ جاتے ہیں اور میدان جنگ میں اس شان سے صف آرائی کرتے ہیں کہ گویا وہ سب مل کر ایک مضبوط دیوار ہیں جس میں سیسہ پلا دیا گیا ہے اب اس معیار پر اپنے کو پرکھ لو۔ بیشک تم میں بہت ایسے ہیں جو اس معیار پر کامل و اکمل اتر چکے ہیں مگر بعض مواقع ایسے بھی نکلیں گے جہاں بعضوں کے زبانی دعوؤں کی ان کے عمل نے تکذیب کی ہے آخر جنگ احد میں وہ بنیان مرصوص کہاں قائم رہی اور جس وقت حکم قتال اترا تو بعض نے یہ بھی کہا: ﴿رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا اَخَّرْتَنَآ﴾ (نساء رکوع ۱۱) (تفسیر عثمانی ص ۷۱ مطبوعہ بجنور)

شبیر احمد عثمانی سورۂ نساء کی اس مندرجہ بالا آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''یعنی ہجرت کرنے کے بعد جب مسلمانوں کو کافروں سے لڑنے کا حکم ہوا تو ان کو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ ہماری درخواست قبول ہوئی اور مراد ملی مگر بعض کچے مسلمان کافروں کے مقاتلہ سے ایسے ڈرنے لگے جیسا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے یا اس سے بھی زیادہ اور آرزو کرنے لگے کہ تھوڑی مدت اور بھی قتال کا حکم نہ آتا اور ہم زندہ رہتے تو خوب ہوتا۔''

(تفسیر عثمانی سورۂ نساء آیت ۷۷ص ۱۱۶)

مؤلف کو سوچنا چاہئے کہ یہ لاف زنی کرنے والے اور پھر معیار پر پورا نہ اترنے والے اور جنگ سے بھاگنے اور کفار کا سامنا کرنے سے ڈرنے والے کون لوگ تھے؟ شبیر احمد عثمانی نے بتایا ہے کہ وہ بعض مہاجرین تھے جنہوں نے ہجرت تو کرلی لیکن ابھی تک ''کچے مسلمان'' تھے۔ اسلام کی خاطر ہجرت کرلی گھر بار چھوڑ دیا لیکن عیش وعشرت سے زندہ رہنے کو پسند کرنے لگے۔

کیا شہادت ایک مصیبت ہے؟

''زیرعنوان ''شیعہ کے نزدیک شہادت ایک مصیبت ہے'' مؤلف یوں لکھتا ہے:

''شیعہ کے نزدیک اس کے بالکل برعکس شہادت ایک مصیبت ہے مسلمان شہادت پر ناز اور فخر کرتے ہیں شہیدوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور ان کے لواحقین کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں جبکہ شہادت پر ہائے وائے، ماتم، سینہ کوبی، جزع فزع، ماتمی مجلسوں کے انعقاد اور ماتمی جلوسوں کے اہتمام کے ذریعہ یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ شہادت ایک ایسی مصیبت ہے کہ جس پر چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی جس قدر ہائے، ہائے کیا جائے اور رونے دھونے کا انداز اپنا کر ٹسوے بھائے جائیں اس قدر یہ بہتر ہے اور شہیدوں کو ان گناہوں کی تلافی اور خطاؤں کی مغفرت کا باعث ہے۔'' (خطبات جیل ص ۳۴۰)

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ نے شہدا، فی سبیل اللہ کے لئے اس اعزاز کا اعلان کیا، ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾

اللہ کی راہ میں قتل ہو جانے والوں کو مردے نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو شعور نہیں ہے'' (سورۂ البقرہ آیت ۱۵۴)

اس آیت کے بعد ۱۵۶ نمبر آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انہیں اگر کوئی مصیبت آتی ہے (اللہ کی راہ میں) ﴿اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ﴾ تو کہتے ہیں: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے ان پر ان کے رب کی طرف سے درود ہیں

اور رحمت بھی اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں'' لہٰذا انہی حقائق کی رو سے بدیہی طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بیشک اللہ کی راہ میں شہادت بہت بڑا اعزاز ہے لیکن ساتھ ساتھ اس شہید کو شہادت کے وقت دکھ اور درد اللہ کی راہ میں برداشت کرنا پڑتا ہے، تیروں، تلواروں، نیزوں، گولیوں اور بموں کے زخم کھا کر تڑپنا پڑتا ہے، ایک لحاظ سے یہ مصیبت ہے اسی طرح اس شہید ہونے والے کے لواحقین کے لئے بھی اس کی مظلومیت اور ان سے جدائی ایک مصیبت ہے، اگرچہ وہ زندہ ہے اور سیدھا جنت کو جاتا ہے لیکن سنگدل اور احمق ملاں! کیا اس کے لواحقین پر اس کی موت اور جدائی کا غم اور اسکی مظلومیت کا دکھ نہیں ہوگا۔ تم جیسے جاہل جنہوں نے اسلامی تاریخ کو کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا، انہیں کیا معلوم کہ شہداء احد کے ماتم ہو رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ باقی لوگوں کے لئے تو رونے والیاں بہت ہیں لیکن افسوس حمزہ پر رونے والا کوئی نہیں۔ کیا اس انسانی فطری عمل کو کسی سنگدلی سے روکا جا سکتا ہے؟ کیا کسی کے جنت میں جانے سے اس کے لواحقین کو اس کی جدائی کا غم نہیں ہوتا؟ تم جیسے جاہل اجڈ غیر انسانی فطرت کے حامل بلکہ مسخ شدہ فطرت کے حامل لوگ اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن تم اور تمہارے خاندان اور مسلک والے بھی عمل فطری تقاضے پر کرتے ہو، تمہارا ضمیر اس پر گواہی دے رہا ہوگا۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت اور ان کے ماتم نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کرنے کے واقعہ کو علامہ شبلی نعمانی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو تمام مدینہ ماتم کدہ تھا۔ آپ جس طرف سے گزرتے تھے گھروں سے ماتم کی آوازیں آتی تھیں۔ آپ کو عبرت ہوئی کہ سب کے عزیز و اقارب ماتم داری کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ لیکن حمزہؓ کا کوئی نوحہ خواں نہیں ہے۔ رقت کے جوش آپ کی زبان سے بے اختیار نکلا، ﴿اما حمزة ولا بواكي له﴾ لیکن حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں۔

انصار نے یہ الفاظ سنے تو تڑپ اٹھے، سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کرو آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینان انصار کی بھیڑ

تھی اور حمزہ کا ماتم بلند تھا، ان کے حق میں دعاے خیر کی اور فرمایا میں تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں لیکن مردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں عرب میں دستور تھا کہ جب کسی کا ماتم کیا جاتا تو یہ داستان حضرت حمزہؓ سے شروع کی جاتی تھی اور یہ پابندی رسم نہ تھی بلکہ حضرت حمزہؓ کی حقیقی محبت تھی۔''

(سیرۃ النبی حصہ اول، از شبلی نعمانی، ص ۳۵۶ طبع سوم، اعظم گڑھ)

یہ امر انتہائی قابل افسوس ہے کہ سیرۃ النبی کی اس سے بعد والی اشاعتوں میں سے ''عرب میں دستور تھا..... سے آخر تک کی عبارت میں تحریف کر دی گئی ہے، شبلی نعمانی کی اصل عبارت کو تغیر و تبدل کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے، اصل حقائق کو چھپانے کی اسی طرح قبیح کوشش کی گئی ہے جس طرح ان ملاؤں کے اسلاف نے کی تھی اور یہود و نواصب نے باہم گٹھ جوڑ سے اسلامی تعلیمات میں تحریف کی تھی۔

مؤلف کا کہنا کہ شیعہ شہادت کو مصیبت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ایک نعمت ہے'' کذب و افتراء پر مبنی ہے بلکہ شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ شہادت پانے والے کے لئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے شمار انعامات تیار ہوتے ہیں، لیکن مصیبت اس کی مظلومیت اور لواحقین کے لئے ہوتی ہے کہ ان کے ایک ساتھی ان سے جدا ہو گیا، اور اس پر کفار و منافقین اور دیگر ظالموں نے شدید مظالم کئے حتیٰ کہ اس نے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی، اور یہ عمل فطرت کے عین مطابق ہے۔

کیا مؤلف نے یوسف علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم میں پڑھا نہیں ہے؟ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ موجود تھے اور اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ میں بالآخر یوسفؑ سے آپ کی ملاقات کرادوں گا، باوجود اس کے حضرت یوسف علیہ السلام کی مظلومیت اور جدائی کے غم میں حضرت یعقوب علیہ السلام انتہائی مضطرب رہتے ہوئے فرماتے تھے: ﴿وَ تَوَلّٰی عَنْھُمْ وَ قَالَ یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَ ابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَھُوَ كَظِیْمٌ﴾ حضرت یعقوب ان سے الگ ہو گئے اور یوسفؑ کو یاد کر کے کہنے لگے: ''ہائے یوسف'' (اگرچہ صبر وضبط کرتے) لیکن مارے غم کے رو رو کر ان کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور دل ہی دل میں گھٹا کرتے تھے۔''

علامہ شبیر احمد عثمانی اس آیت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں ''نیا زخم کھا کر پرانا زخم ہرا ہو گیا بے

اختیار پکار اٹھے: ﴿یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ﴾، (ہائے افسوس یوسف)''

(تفسیر عثمانی ص ۳۱۷ حاشیہ ۵ مطبوعہ بجنور)

ذرا جواب دیجئے!!

اگر آپ کے دیدۂ بصیرت کو بغض وعناد نے نابینا نہ کر دیا ہو تو ذرا جواب دیجئے کہ زندہ یوسفؑ پر، جو نبی تھے ایک دوسرے نبی نے ان کی جدائی کے غم میں ہائے کیوں کہا؟ کیوں رو رو کر اپنے آپ کو اندھا کر دیا؟ تم غم حسینؑ میں ماتم کو، ہائے کہنے کو روکنا چاہتے ہو، حضرت یعقوب علیہ السلام کو تمہارے خیال کے مطابق واہ یوسف واہ کہنا چاہیے اور دوسرے لوگوں کو چاہیے تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کے بیٹے کی قربانی پر مبارک پیش کرتے۔ **نعوذ باللّٰہ من سخافۃ العقول۔**

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبی است

''حضرت عثمانؓ جب قتل ہوئے تو ان کی بیوی نائلہ بنت الفرافصہ اسی شب میں نکلیں، آگے اور پیچھے سے اپنا گریبان چاک کئے ہوئے تھیں ہمراہ ایک چراغ تھا اور چلا رہی تھیں کہ ''ہائے امیر المؤمنین''۔

(طبقات ابن سعد، مترجم باب حضرت عثمان کا دفن حصہ سوم ص ۵۷ اطبع نفیس اکیڈیمی کراچی)

امیر معاویہ نے حضرت عثمان کی قمیض کیوں مسجد دمشق میں لٹکا رکھی تھی؟ اس کی موجودگی اور رضامندی سے بلکہ اس کی ترغیب سے کیوں دمشق کے ناصبی احمق دھاڑیں مار مار کر حضرت عثمان کی مظلومیت پر روتے تھے اور حضرت عثمان کے انتقام کی قسمیں کھاتے تھے؟ کیا عثمان ان کے اور تمہارے خیال میں شہید ہو کر جنت میں داخل نہیں ہو گئے تھے جبکہ وہ تو عشرہ مبشرہ میں سے بھی تھے؟ انہیں تو چاہیے تھا کہ وہ ایک دوسرے کو حضرت عثمان کے لواحقین کو اس کی شہادت پر مبارک باد دیتے اور عثمان کو خراج تحسین پیش کرتے، اس نعمت کے ان کو ملنے پر انہیں کیا دکھ تھا کہ وہ ماتم کناں تھے **ما لکم کیف تحکمون۔**

تشکیکات وتلبیسات کا بطلان

مؤلف کا گستاخانہ اور گمراہ کن عنوان ''بقول شیعہ ولادت حسین علیہ السلام پر حضورؐ اور حضرت

فاطمہؑ کی طرف سے اظہار ناپسندیدگی حضرت فاطمہؑ کو حسینؑ کی ولادت ناگوار اور حسینؑ نے بھی غیرت کے باعث اپنی والدہ کا دودھ نہ پیا۔'' پھر ان کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''شیعہ مذہب کی سب سے پہلی مستند ترین اور اہم کتاب اصول کافی طبع لکھنؤ کے صفحہ ۹۲۴ پر یہ روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو ولادت حسین اور ساتھ ساتھ شہادت کی خبر دی تو حضور علیہ السلام نے دو مرتبہ خدا تعالیٰ کی اس بشارت کو رد کر دیا بالآخر تیسری دفعہ خاص طور پر جبرئیل علیہ السلام جب یہ بشارت بھی ساتھ لائے کہ حسین کی اولاد سے امامت کا سلسلہ چلے گا تب حضور علیہ السلام نے اس بشارت کو قبول فرمایا ایسے ہی حضور علیہ السلام نے حضرت فاطمہ کو جب حسین کی ولادت و شہادت کی بشارت دی تو حضرت فاطمہؑ نے بھی اسے نامنظور کیا جب دوسری مرتب امامت کی بشارت بھی دی گئی تب اسے قبول کیا۔ اس روایت کا کیا معنی ہے؟ یعنی حضور علیہ السلام کو اپنے نواسے کی ولادت کے ساتھ جب معلوم ہوا کہ شہید بھی ہوگا تو اپنی طرف سے اور اسی طرح حضرت فاطمہؓ نے کس قدر اس پر اظہار ناپسندیدگی فرمایا کہ اس بشارت ہی کو نامنظور فرما دیا .... جب فاطمہؓ کو حسینؓ کا حمل ہوا تو وہ حسینؓ کا حمل ناپسند کرتی تھیں اور حسینؓ پیدا ہوئے تو ان کی ولادت بھی فاطمہؓ کو ناگوار تھی ... اب اگلی روایت سنئے کہ امام حسینؓ نے بھی پیدا ہونے کے بعد اپنی والدہ کا دودھ نہ پیا، حضرت حسینؓ کی اس ادا کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک شیعہ شاعر کہتا ہے۔

ہائے اے شبیر مظلومی تیری
رد ہوئی تیری بشارت تین بار

(خطبات جیل صفحہ ۳۴۰ تا صفحہ ۳۴۲)

<u>الجواب</u>:۔ چونکہ خانوادۂ عصمت و طہارت کے دشمن اور معاویہ و یزید کے حامی ان ملاؤں کی فطرت مسخ ہو چکی ہے لہذا یہ انسانوں کے حالات اور ان کی نفسیات سے قطعاً الگ تھلگ درندوں جیسے سنگ دلانہ اوصاف کے مالک ہیں۔ اس لئے یہ انسانی معاشرے کی کسی بات کو سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ سفاک ناصبی درندوں کے پیروکار درندہ صفت لوگ ہیں۔ صرف شکلیں انسانوں جیسی

ہیں۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ان درندوں کی صحیح تصویر کھینچی ہے۔

تاریخ اسلام کا طالب علم جانتا ہے کہ جب جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت لائے کہ آپ کو ایک نواسہ اور بیٹا عطا کیا جائے گا جسے بعد میں آپؐ کی امت قتل کر دے گی۔ تو آپؐ نے اور حضرت فاطمہؑ نے اسی بناء پر پہلے یہ عرض کیا کہ اس بیٹے کے قتل ہونے پر ہمیں بہت دکھ ہوگا، بلکہ ہم تو جب تک زندہ رہیں گے اس بچے کو دیکھ کر اس کی آئندہ کی مظلومیت پر روتے رہیں گے اس طرح مسلسل دکھ میں مبتلا رہیں گے بہتر ہے کہ ایسا بیٹا عطا ہی نہ کیا جائے، جب اللہ تعالیٰ نے جبریل کے ذریعے بتایا کہ میں امامت و ولایت اور وصایت کو اس کی اولاد میں رکھوں گا، تب آپ ﷺ تسلیم برضائے الٰہی ہو گئے اور حضرت فاطمہ علیہا السلام بھی راضی برضا ہو گئیں ان روایات میں پیغمبر اکرم ﷺ اور حضرت فاطمہ علیہا السلام کی کوئی توہین نہیں ہے، نہ ہی کوئی ایسی بات ہے کہ یہ حضرات اللہ کی رضا پر ناراض تھے لیکن یہ امر اپنی جگہ ثابت شدہ ہے کہ خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم حضرت امام حسین علیہ السلام کی مظلومانہ شہادت کو یاد کر کے رویا کرتے تھے۔

اگر شہادت کی موت پر رونے، واویلا کرنے، آہ و زاری کرنے یا اجتماع کرنے کو غیر فطری عمل سمجھتے ہو تو وہ وقت یاد کرو جب تمہارے تین رہنما حق نواز جھنگوی، ایثار القاسمی اور ضیاء الرحمٰن فاروقی کو قتل کیا گیا۔ حالانکہ ان کی موت تمہارے نزدیک شہادت کی موت ہے لیکن اس کے باوجود تم ان مواقع پر نہ صرف روئے بلکہ ماتم کیا، سر پیٹا، مظاہرے کیے، نعرہ بازی اور واویلا ہوا جس کے تمام اخبارات گواہ ہیں اور جنازوں کی ویڈیو کیسٹیں بھی موجود ہیں حالانکہ تمہیں تو اس موقع پر جشن منعقد کرنا چاہئے تھا محافل رقص و سرور کا اہتمام کرنا چاہئے تھا لیکن یہ کیا ہوا کہ سارے کا سارا عمل شیعوں والا؟

اعتراض کرتے وقت ڈوب کے مر کیوں نہیں گئے۔ تمہیں اقرار کرنا چاہئے کہ شہادت کا رتبہ معلوم ہونے اور شہید کے بلند درجات کا علم ہونے کے باوجود بھی فطری طور پر انسان کو اپنے ساتھی اور عزیز کے بچھڑنے کا افسوس ضرور ہوتا ہے اور اس کی مظلومیت پر رونا بھی فطرت کے عین مطابق ہے۔

ملاں صاحب! شہادت کا مرتبہ اپنی جگہ مسلم ہے لیکن مقتول کی مظلومیت پر سینے میں انسان کا دل رکھنے والے شخص کو ضرور دکھ اور افسوس ہوگا۔ ہاں جس ناصبی کے سینے میں پتھر اور جانور کا دل ہو وہ ان احساسات اور جذبات سے یکسر خالی ہوتا ہے۔

مؤلف صاحب! تم اپنے مرنے والوں اور قتل ہونے والوں پر خوشی کا اظہار کیا کرو، تعزیت کی بجائے ہدیہ تبریک اور خراج تحسین پیش کیا کرو، مقتول کے لواحقین کے ساتھ تعزیت نہ کرو بلکہ مل کر خوشی منایا کرو۔ ان کی عورتیں سوگ نہ منایا کریں بلکہ بن سنور کر خوشی کا مظاہرہ کریں اور دعوت طعام کا بندوبست کیا کریں افسوس تمہاری بے عقلی پر، اس لئے کہ عقل نام کی کوئی چیز تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔

حضرت امام حسینؑ کے اپنی والدہ کا دودھ نہ پینے کی اصل وجہ

جہاں تک امام حسین علیہ السلام کے اپنی والدہ ماجدہ کا دودھ نہ پینے کا تعلق ہے تو یہ اپنی والدہ سے اظہار ناراضگی کے طور پر نہیں ہے، بلکہ انہوں نے کسی عورت کا دودھ پیا ہی نہیں، جیسا کہ اس روایت میں موجود ہے لیکن تم جاہل نقل مار مولوی ہو تم نے اصل کتاب تو دیکھی ہی نہیں۔ چالاکی و چابکدستی سے عبارت کے مفہوم کو مسخ کر کے پیش کرنے کی جرات کی ہے اصل عبارت ملاحظہ فرمایئے۔ وہ روایت ترجمہ کے ساتھ ذیل میں درج کی جاتی ہے تاکہ قائدین کرام افتراء پرداز ملاں کے ظلم اور ناخدا ترسی کا خود ہی اندازہ لگالیں۔

﴿ولم یرضع الحسینؑ من فاطمة علیه السلام ولامن انثی کان یوتی به النبی صلی الله علیه و آله فیضع ابهامه فی فیه فیمص منها مایکنیه الیومین و الثلاث فنبت لحما الحسینؑ من لحم رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم و دمه﴾،

حسین علیہ السلام نے حضرت فاطمہ علیہا السلام اور کسی دوسری عورت کا دودھ نہیں پیا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائے جاتے تھے اور آپؐ حضرت امام حسینؑ کے منہ میں اپنا انگوٹھا دیتے، تو آپؑ اسے چوستے جس سے دو یا تین دن تک آپ کو بھوک نہ لگتی، پس امام حسین علیہ السلام کا گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گوشت اور خون سے پیدا ہوا۔

قارئین کرام! مذکورہ بالا عبارت اور اس کے ماقبل و بعد کا بغور مطالعہ کر کے انصاف سے فرمائیں کہ اس بہتان عظیم کا یہاں ذرہ بھر بھی شائبہ ہے جس کو یہ افترا پرداز ملاں نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ گویا

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ماں باپ کے لئے بچہ بچہ ہی ہوتا ہے، خواہ وہ ایک سال کا ہو یا دس کا، تیس سال کا یا سو سال کا، اس پر اگر مصیبت آئے گی تو والدین کو ضرور دکھ ہوگا، اگر چہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت مطلوب و مقصود مومن ہے لیکن ساتھ ہی لواحقین کے لئے مصیبت ہے، اس کی مظلومیت اسکی جدائی پر غم کھانا انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اگر چہ یہ ایک یقینی امر ہے کہ اس نے جنت میں جانا ہے اور اسکی موت بھی قابل فخر ہے اور اس کے لئے ایک نعمت ہے، اور مومنوں کے لئے پسندیدہ موت ہے۔

اس واقعہ میں حضور رحمۃ للعالمین ﷺ اور جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی اپنے بیٹے حسین علیہ السلام سے والہانہ محبت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اہل سنت کی معتبر کتب احادیث میں موجود ہے کہ جس وقت یہ فرحت و ملال اور رنج و راحت میں ملی ہوئی خبر کہ (حسینؑ کربلا کے تپتے ہوئے صحرا میں بے گناہ شہید کر دیا جائے گا) جب جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو پہنچی تو آپ کو انتہائی صدمہ ہوا آپ نے دربار رسالتؐ میں عرض کی: ''یا رسول اللہؐ اس وقت ہم لوگ کہاں ہوں گے؟'' تو حضور ﷺ نے فرمایا ''بیٹی اس لق و دق صحرا اور آگ برساتے ہوئے چٹیل میدان میں جب میرا حسین علیہ السلام امتحان دے رہا ہوگا تو ہم میں سے کوئی بھی اس ظاہری حیات میں وہاں موجود نہیں ہوگا۔ بس حضور سرور کائنات ﷺ اپنی پیاری بیٹی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے ساتھ مل کر دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ ایسی روایات الفاظ کی معمولی کمی وبیشی کے ساتھ المستدرک امام حاکم جلد ۳ ص ۱۷ طبع دکن اور ماثبت بالسنہ للشیخ عبدالحق دہلوی ص ۱۰ طبع لاہور وغیرہا میں موجود ہیں۔

مؤلف کا خیال ہے کہ مظلوم کی بے چینی اور اضطراب کو دور کرنے کی بجائے الٹا اس کے زخموں پر مزید نمک پاشی کی جائے ع

نہ تڑپنے کی اجازت نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

مؤلف کو اتنا یقین تو ہوگا کہ تمام صحابہؓ وصحابیاتؓ کے نزدیک پیغمبر خداﷺ وفات پاکر جنت میں چلے گئے ہیں، پھر حضرت عائشہ کیوں منہ پیٹ رہی تھی۔ چنانچہ آپ کی وفات حسرت آیات کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ عبدالحق دہلوی نے لکھا ہے۔﴿پس نهاد عائشه سر مبارك آنحضرت علیه السلام را بر بالین و برخاست در انحالیکه می زند بر روی خود﴾، ''حضرت عائشہ نے آنحضرت علیہ السلام کا سر مبارک سرہانے پر رکھا اور منہ پیٹتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئیں۔'' (مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۵۵۳ مطبوعہ نول کشور)

سیرۃ ابن ہشام میں حضرت عائشہؓ کا قول اس طرح منقول ہے ... ﴿ثم وضعت راسه علی وسادة و قمت التدم مع النساء و اضرب وجهی﴾،

''پھر میں نے آپ کا سر اقدس سرہانے پر رکھ دیا اور عورتوں کے ساتھ مل کر سینہ اور منہ پیٹنے لگی۔'' (السیرۃ النبویہ لابن ہشام مع الروض الانف ص ۳۷۱ الجزء الثانی طبع جمالیہ مصر)

اب حضرت ابوبکر کا عمل بھی ملاحظہ کرلیں چنانچہ شیخ عبدالحق دہلوی اسی باب میں لکھتے ہیں:

﴿و بود اثبت و اشجع ایشاں ابوبکر و باوجود آن می ریخت اشکهاے او و برمی رفت آه و ناله او﴾

''تمام صحابہ سے زیادہ ثابت قدم اور شجاع ابوبکر تھے اس کے باوجود ان کے آنسو بہنے لگے اور انہوں نے آہ و نالہ کی آواز بلند کی۔'' (مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۵۵۷)

یہ دونوں باپ بیٹی آپ کے خیال میں صدیق اور صدیقہ کائنات اور سب سے زیادہ ثابت قدم اور بہادر بھی یہی تھے باوجود اس کے پیغمبر ﷺ کی وفات پر سینہ کوبی اور منہ پیٹنا شروع کردیا اور واویلا مچادیا۔ کیا تمہارے خیال کے مطابق انہیں یقین نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ سیدھے جنت میں چلے گئے ہیں؟ اگر یقین تھا کہ پیغمبرؐ نے جنت میں جانا ہے اس امر کا تمہیں بھی اقرار ہوگا، پھر کیا انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنت میں جانا ناگوار اور ناپسند تھا کہ دیگر

امہات المومنین ، محلے اور شہر کی عورتوں کو ساتھ ملا کر سینہ کوبی اور ماتم شروع کر دیا۔ حضرت ابوبکر کو بھی حضرت محمد ﷺ کا جنت میں اعلیٰ درجات پر فائز ہونا گوارا نہ تھا بلکہ اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے رو رہے تھے کہ پیغمبر ﷺ کیوں جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔ تمام صحابہؓ و صحابیاتؓ کی پیغمبر اکرم ﷺ کا جنت کو سدھارنا اتنا ناگوار ہوا کہ سب نے پیغمبر ﷺ کے جنت میں جانے کو ایک مصیبت سمجھ کر مدینہ منورہ کو ماتم کدہ بنا دیا۔

شرم تم کو مگر نہیں آتی

تمہاری حماقت پر مبنی فلسفے کے مطابق ان سب لوگوں کو خوشیاں منانی چاہیئے تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت میں پہنچ گئے ہیں، تعزیت کی بجائے ایک دوسرے کو تہنیت دیتے، بالخصوص اس لئے بھی اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ تو اس دنیا سے رحلت کے بعد زندہ ہوتے اور فی الفور جنت میں جاتے ہیں، پھر یہ جزع و فزع آہ و فغان، ماتم اور سینہ کوبی و رخسار زنی، یا تو ان کی ناسمجھی کی دلیل ہے یا تمہارے فلسفے کی بناء پر تمہاری حماقت کی نشانی ہیں۔

مؤلف کی تلبیس ہی تلبیس

مؤلف نے اس کتاب میں کوئی علمی بات کرنے کی بجائے فریب کاری اور دھوکہ دہی کے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اور سراسر تلبیس سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اپنی ہفوات، ہفوات جیل کے ص ۳۳۲ میں اہل تشیع پر بے جا تنقید کرتے ہوئے حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت کے سلسلے میں چند اشعار نقل کئے ہیں، لیکن ان گستاخانہ اور توہین آمیز اشعار کو کسی نامعلوم شیعہ شاعر کی طرف منسوب کر دیا ہے چنانچہ لکھتا ہے:

''حضرت حسین ؑ کی اس ادا کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک شیعہ شاعر کہتا ہے''

حالانکہ یہ اشعار کسی شیعہ شاعر کے نہیں، بلکہ اس احمق مؤلف کے نادان اور بھٹکے ہوئے مولوی احتشام الدین مراد آبادی کے خود ساختہ ہیں، ان نے اپنی کتاب ''نصیحۃ الشیعہ'' مطبوعہ مکتبہ صدیقیہ ملتان کے صفحہ ۵۹ پر یہ اشعار درج کئے ہیں، لیکن ان نے کسی دوسرے شخص یا شیعہ شاعر کی طرف ان اشعار کی نسبت نہیں کی، تاہم ملاں نے تیسرا شعر نہ معلوم کس مصلحت کی بناء پر

نقل نہیں کیا، استاد بھی خیانت کاری اور فریب دہی سے کچھ کم نہ تھا، لیکن مراد آبادی کے روحانی شاگرد نے اپنے استاد کے بھی کان کاٹ دیئے ہیں، وہ تو ان اشعار کی جھوٹی نسبت سے شاید خوفزدہ ہو لیکن ملاں فرعون اور ابو جہل سے بھی زیادہ نڈر ہے، خوف خدا کا اس کے پاس سے گزر تک نہیں ہوا۔ لیکن اتنا نڈر ہونے کے باوجود ملاں اپنے آقا و مربی یہود کی طرح موت سے خائف اور جنت میں جلد از جلد جانے سے گریزاں ہے، ورنہ دو ڈھائی گھنٹے کماد کی فصل میں چھپنے کی کیا ضرورت تھی؟ جنت میں ہی تو جا رہے تھے، پھر جنت میں جانے سے چھپنا کیسا؟ کیا جناب کو بھی جنت میں جانا اور شہادت کا بلند رتبہ حاصل کرنا ناگوار ہے؟

معاویہ اور حضرت امام حسن و حسین علیہم السلام کے باہمی مخاصمات

مؤلف کا عنوان: ۔شیعہ کی طرف سے شہادت حسنؓ کے موقع پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو امیر معاویہ کے خلاف خروج کی پیشکش"

"جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ سے صلح کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو بیس سال تک اس بیعت کو اس طرح قائم رکھا کہ کسی لحہ پر بھی اس سے انحراف نہ فرمایا،" اہل بیعت رسول اور خاندان بنو امیہ کے باہمی تعلقات اور رشتہ داریاں اس قدر مضبوط ہوتی گئیں کہ حضرت علیؓ سے اختلاف و جنگ کی شکل میں جو باہمی دوریوں کا ایک خلا پیدا ہو گیا تھا وہ بالکل پر ہو گیا حتیٰ کہ جب امیر معاویہؓ کی زندگی ہی میں حضرت حسنؓ کوفہ کے شیعوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر اور اس طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرتے ہوئے کوفہ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے تو ان ظالم کوفیوں نے سازش سے زہر کھانے میں ملا کر حضرت حسنؓ کو شہید کرا دیا آپ کی شہادت کے بعد یہ لوگ ایک مرتبہ پھر متحرک ہوئے اور حضرت حسینؓ کو ورغلانے کی کوشش کی چنانچہ ملا باقر مجلسی شیعہ کا عظیم مجتہد لکھتا ہے:

ترجمہ: " ...... جب حضرت امام حسنؓ نے وصال فرمایا تو عراق کے شیعہ حرکت میں آئے اور حضرت امام حسینؓ کے پاس یہ عریضہ لکھا کہ ہم معاویہ کو خلافت سے معزول کر کے آپ سے بیعت کرتے ہیں امام حسینؓ نے اس وقت مصلحت نہ دیکھی اور شیعوں کو جواب دے دیا اور صبر

کرنے کا حکم فرمایا اس روایت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عراق کے شیعہ کی تو خواہش ہر وقت یہ رہی کہ حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ امیر معاویہؓ کے خلاف میدان میں آئیں مگر ان دو حضرات نے شیعوں کی اس خواہش کو پورا نہ کیا بلکہ حضرت امیر معاویہؓ سے وفا کی اور بیعت کے تقاضوں کو سو فیصد پورا فرما کر یہ ثابت کر دیا کہ نواسہ رسول جسے حق اور عادل خلیفہ سمجھتے ہیں اس کی بیعت تو کر سکتے ہیں مخالفت نہیں کر سکتے۔" (خطبات جیل صفحہ ۳۳۳،۳۳۴)

<u>الجواب</u>:۔ مؤلف کا یہ سراسر باطل خیال ہے کہ معاویہ کے خلاف جنگ سے دستبردار ہو جانے سے اہل بیت رسول اور شجرہ خبیثہ بنو امیہ کے تعلقات اور رشتہ داریاں اتنی مضبوط ہوگئی تھیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں باہمی اختلاف اور جنگ و جدل کی وجہ سے جو دوریاں پیدا ہوگئی تھیں وہ ختم ہوگئیں، بعد ازاں کوفی شیعوں نے امام حسنؑ کو زہر دیکر شہید کر دیا۔

جہاں تک دوریوں اور عداوتوں کا تعلق ہے تو اموی ناصبی اپنی ناصبیت میں شتر بے مہار کی طرح شرافت نہیں بلکہ بدمعاشی اور عداوت کی تمام حدود کو پھلانگ گیے، معاہدہ کے وقت طے کی گئی تمام شرائط کو بری طرح پامال کیا، جب خوارج نے معاویہ کے خلاف خروج کے لئے اجتماع کر لیا تو اس نے امام حسنؑ کو خوارج کے خلاف لشکر کشی کے لئے سالار بنانے کا مکارانہ ارادہ کیا، آپ اس وقت کوفہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے آپؑ نے معاویہ کو یہ جواب بھیجا۔

﴿ لو آثرت ان اقاتل احد امن اهل القبلة لبدات بقتالك فانی ترکتك الصلاح الامة و حقن دمائها ﴾،

"اگر میں اہل قبلہ میں سے کسی سے بھی جنگ کرنے کو ترجیح دیتا تو جنگ کا آغاز تجھ سے کرتا لیکن میں نے امت کی بہتری اور اس کے خون کو بچانے کے لئے تجھے چھوڑ دیا ہے۔"

<u>معاویہ نے حضرت امام حسنؑ کو زہر دلوایا نہ کہ شیعوں نے</u>

مؤلف کا یہ کہنا کہ .... ان ظالم کوفیوں نے سازش سے زہر کھانے میں ملا کر حضرت حسنؓ کو شہید کر دیا" حالانکہ تمام تواریخ میں مذکور ہے کہ آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث بن قیس کندی نے آپ کو زہر دیا تھا۔ بہت سے معتبر مورخین نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اس

عورت نے امام حسن علیہ السلام کو معاویہ کے اشارے پر زہر دیا تھا۔ الاستیعاب، سیر الاولیاء وغیرہ کتب میں مذکور ہے۔

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں امیر معاویہ کے ایک خاص معالج ''**ثمامہ بن آثال طبیب رومی**'' کا تذکرہ بڑی خصوصیت سے کیا ہے کہ معاویہ اپنے ہر مخالف کو برابر زہر دلوایا کرتا تھا۔ یہ دمشق کا رہنے والا اور عیسائی مذہب کا حامل انتہائی شہرت یافتہ طبیب تھا۔ چنانچہ مورخ مذکور رقمطراز ہیں:

﴿و کان ابن اثال بالادویة المفردة و المرکبة و قواها و منها سموم قواتل و کان معاویة یقربه لذلك کثیراً و مات فی ایام معاویة جماعة کثیره من اکابر الناس و الامراء من المسلمین﴾

ابن آثال مفرد اور مرکب دواؤں کا ماہر اور ان کے اثرات و طاقتوں کا جاننے والا تھا اور ہلاک کر دینے والے مختلف قسم کے زہروں سے بھی واقف تھا اسی وجہ سے معاویہ اس کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا معاویہ کے عہد میں اکابرین اسلام اور مسلمان امراء کی ایک بڑی جماعت تھی جو اس کے زہر سے ہلاک ہوئے۔ (عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ص ۱۵۳، ۱۵۴، طبع جدید بیروت)

اس کے بعد ابن ابی اصیبعہ الخزرجی نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کو معاویہ نے اپنے طبیب ابن آثال نصرانی کے تیار کردہ زہر سے قتل کرایا ہے مثلاً عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید اور حضرت علی علیہ السلام کے خاص صحابی جناب مالک اشتر وغیرھا۔ یہ ایسا زہر تھا کہ جس کا کوئی تریاق اس وقت کی عرب دنیا میں نہ تھا۔ پھر ص ۱۵۶ پر بحوالہ طبری حضرت امام حسن علیہ السلام کے متعلق لکھتے ہیں:

﴿ان الحسن بن علی رضی الله عنهما مات مسموماً فی ایام معاویة و کان عند معاویة کما قیل دهاء فدس الی جعده بنت الاشعث بن قیس و کانت زوجة الحسن رضی الله عنه شربة و قال لها ان قتلت الحسن زوجتك بیزید فلما توفی الحسن بعثت الی معاویة تطلب قوله فقال لها فی الجواب انا اضمن بیزید﴾،

''معاویہ کے عہد میں حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما زہر سے شہید ہوئے، معاویہ

نے جعدہ بنت اشعث زوجہ امام حسن سے ساز باز کر کے امام حسنؑ کو زہر پلا دیا اور اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تو حسنؑ کو قتل کر دے گی تو تیرا نکاح یزید سے کر دوں گا جب امام حسن علیہ السلام شہید ہو گئے جعدہ نے معاویہ سے وعدہ پورا کرنے کو کہلا بھیجا اس کے جواب میں معاویہ نے کہا کہ میں یزید کے لئے ڈرتا ہوں۔''

مورخ مطہر بن طاہر المقدسی اپنی کتاب ''البدء والتاریخ'' میں لکھتے ہیں:

﴿ان معاوية بن ابی سفيان دس الی جعدة بنت الاشعث بن قيس بان تسم الحسن و يزوجها يزيد فسمته و قتلته فقال لها معاوية ان يزيد منا بمكان و كيف يصلح لابن رسول الله و عوضها مائة الف درهم﴾،

معاویہ نے جعدہ بنت اشعث بن قیس سے خفیہ سازش کی کہ اگر وہ امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر دے تو وہ اس کا نکاح یزید کے ساتھ کر دے گا جب جعدہ نے معاویہ کے ایماء پر حضرت کو زہر دغا سے شہید کر دیا تو معاویہ نے ایک لاکھ درہم دے کر جعدہ سے کہا کہ یزید ہمیں عزیز ہے کیسے گوارا کیا جا سکتا ہے کہ جو فرزند رسول ﷺ کے لئے ہو وہی اس کے لئے ہو۔''

(کتاب البدء والتاریخ ج ۶ ص ۵ طبع پیرس، ۱۹۱۹ء)

ان کے علاوہ دوسرے مورخین نے بھی یہ صاف صاف لکھا ہے کہ معاویہ نے حضرت امام حسن علیہ السلام کو جعدہ کے ذریعہ سے زہر دلوایا لیکن بعض تاریخیں ایسی بھی ہیں جن میں جعدہ کا تذکرہ نہیں ہے مگر یہ وضاحت کی گئی ہے کہ معاویہ ہی نے نواسہ رسول ﷺ کو زہر دلوایا چنانچہ مورخ ابن عساکر دمشقی نے لکھا ہے۔

﴿و ان معاوية قد تلطف لبعض خدمه ان يسقيه سما فسقاه فاثر فيه حتى كان يوضع تحته طست و يرفع نحوا من اربعين مرة﴾

''معاویہ اپنے بعض غلاموں کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آیا اس غرض سے کہ وہ امام حسنؑ کو زہر دے دیں، پس اس نے معاویہ کے حسب منشاء امامؑ کو زہر دیا اور زہر نے حضرت امام پر اثر کیا حتیٰ کہ ان کے سامنے چالیس مرتبہ طشت رکھا گیا۔''

(تہذیب ابن عساکر ج ۴ص ۲۲۹، طبع جدید بیروت)

صرف متقدمین ہی نے نہیں بلکہ عصر حاضر کے محققین اہل سنت نے بھی اس حقیقت کو ظاہر کیا ہے چنانچہ ڈاکٹر حسن ابراہیم پروفیسر جامعہ مصر نے بھی اپنی "تاریخ الاسلام السیاسی جلد اول حاشیہ صفحہ ۳۹۸ طبع مصر میں اس امر کی توضیح کی ہے۔ نہ صرف مسلمان محدثین ومورخین ہی بلکہ مسیحی محققین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوایا، منقر یوس الصدقی نے تاریخ دول الاسلام جلد اول صفحہ ۵۳ طبع مطبعہ الھلال فجالہ مصر، اسی طرح ادیب مورخ عبدالمسیح انطاکی مدیر جریدہ العمران نے اپنی تصنیف "تاریخ شعری لصدر الاسلام صفحہ ۴۸۴ طبع مصر میں اس ناقابل انکار تاریخی مسلمہ حقیقت کو بیان کیا ہے۔

اور یہی وجہ تھی کہ جب معاویہ کو امام حسنؑ کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو یہ خوشی کا برملا اظہار کرتا رہا اور سجدہ شکر کیا اس سلسلے میں دمیری کی حیات الحیوان، العقد الفرید، الاخبار الطوال، مروج الذھب اور وحید الزمان حیدر آبادی کا ترجمہ وحاشیہ صحیح بخاری دیکھا جاسکتا ہے۔

اشعث بن قیس سے رشتہ داری کا پس منظر

مؤلف کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اشعث بن قیس کندی کا کن لوگوں سے قریبی رشتہ تھا آیئے ہم آپ کے اضافۂ معلومات کے لیے عرض کیے دیتے ہیں۔ علامہ ذہبی اس کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

﴿لـه صحبة و روای﴾ یہ صحابی ہے اور احادیث بھی اس سے مروی ہیں، پھر اس شرف صحابیت کو پامال کرتے ہوئے ﴿ارتد الاشعث فی ناس من کندة... لما قدم بالاشعث بن قیس اسیراً علی ابی بکر، اطلق وثاقه و زوجه﴾، اختہ بنوکندہ کے بہت سے لوگوں کے ہمراہ مرتد ہوگیا" جب اشعث کو گرفتار کر کے حضرت ابوبکر کے پاس لائے تو انہوں نے اس کی ہتھکڑیاں کھول دیں اور اپنی بہن (فروہ بنت ابی قحافہ) اس کی زوجیت میں دے دی۔ اب اشعث نے اس احسان کا کیا بدلہ دیا؟ ﴿فاخترط سیفه و دخل سوق الابل فجعل لا یری ناقه و لا جملاً الاعرقبه و صاح الناس کفر الاشعث ثم طرح سیفه و قال و الله ما

کفرت ولکن هذا الرجل زوجنی اخته ولو کنا فی بلادنا لکانت لنا ولیما غیر هذه یا اهل المدینة انحرو او کلو ویا اهل الابل تعالوا شروا اها﴾،

اس نے تلوار کھینچ لی اور اونٹوں کے بازار میں داخل ہوگیا، اونٹ اور اونٹنی دیکھے بغیر جو سامنے آیا اس کی کونچیں کاٹنی شروع کردیں، لوگ چیخ اٹھے اشعث (دوبارہ) کافر ہوگیا ہے، پھر اس نے اپنی تلوار پھینک دی اور کہا! اللہ کی قسم میں مرتد نہیں ہوا لیکن اس شخص (تمہارے خلیفہ) نے اپنی بہن میری زوجیت میں دیدی ہے، اگر ہم اپنے ملک میں ہوتے، تب تو ہم اس کے علاوہ اچھی طرح ولیمہ کرتے، اے مدینے والو! ذبح کرو اور کھاؤ، اے اونٹو والو! آؤ اس کا بدلہ لے لو"۔

(سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۳۹ طبع بیروت المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱ روایت نمبر ۶۴۹، ص ۲۳۷ طبع بغداد، مجمع الامثال علامہ میدانی ج ۲ ص ۲۲۴ طبع مصر)

اور یاد رہے کہ "المعجم الکبیر للطبرانی کے فاضل محشی حمدی عبدالمجید السلفی نے اس روایت کی صحت پر حکم لگاتے ہوئے لکھتا ہے:

و رجاله رجال الصحیح غیر عبد المؤمن بن علی وهو ثقة کذا فی المجمع ۱۱۵/۹، اس روایت کے سب رواۃ صحیح کے راوی ہیں سوائے عبدالمومن بن علی کے اور یہ ثقہ ہے اسی طرح (علامہ ہیثمی نے) مجمع الزوائد ج ۱۱۵/۹ میں اس روایت کی توثیق کی ہے۔

ایک عجیب لطیفہ:۔

علامہ ذہبی نے اسی کتاب میں اشعث بن قیس کے بارے میں ایک نہایت پر لطف اور نشاط انگیز واقعہ درج کیا ہے کہ ﴿دخل الاشعث علی علی رضی اللّٰہ عنه فی شیئی فتهدو ه بالموت! ما ابالیه، هاتو الی جامعة و قیداً ثم او ما الی اصحابه، قال اقطلبوا الیه فیه، فترکه﴾، اشعث حضرت علی علیہ السلام کے پاس کسی کام کیلئے گیا، لیکن (اپنی کم ظرفی کی بناء پر) حضرت علیؑ کو موت کی دھمکیاں دینے لگا، حضرتؑ نے فرمایا، تم مجھے موت سے ڈراتے ہو، مجھے اس کی پرواہ نہیں طوق اور زنجیر لے آؤ، پھر آپؑ نے اپنے اصحاب کی طرف اشارہ کیا (کہ اسے گرفتار کرلو لیکن وہ آپؑ سے اسکی سفارش کرنے لگے، چنانچہ آپؑ نے اسے چھوڑ دیا"

(سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۴۰، ۴۱)

ارتداد و کفر کے باوجود ان نوازشات و احسانات کا کیا مطلب ہے؟ اسی ابی قحافہ کے داماد کی بیٹی نے امام حسن علیہ السلام کو زہر دے کر شہید کیا، جعدہ کے باپ، حکمرانوں کے اس کے ساتھ اتنے گہرے دوستانہ تعلقات، حضرت علی علیہ السلام سے اس کی غداری اور منافقانہ چالیں کیا ظاہر کرتی ہیں؟

اسی اشعث کا بیٹا محمد جو حضرت ابو بکرؓ کی ہمشیرہ ام فروہ کے بطن سے، نہایت گندمی رنگ کا قوی ہیکل، جسیم اور چالاک شخص تھا جس نے حرص و آز میں پھنس کر اموی سلطنت کے استحکام کی خاطر نواسۂ رسولؐ امام حسین علیہ السلام اور ان کے جان نثاروں کو بڑی بے دردی سے قتل کرنے میں ہر ممکن تعاون کیا تھا۔ ابن زیاد نے جب کوفہ کی گورنری کا چارج سنبھالا تو سب سے پہلے محمد بن اشعث کو موصل سے بلوایا اور اپنا ہم خیال بنا کر جناب مسلم بن عقیل کی قسمت کا فیصلہ اسی کے سپرد کیا۔ حضرت مسلم کی شہادت کے فوراً بعد چار ہزار لشکر کے ساتھ واردِ کربلا ہوا۔ بعد از سانحۂ کربلا ابن زیاد ملعون کی محفل نشاط کو ہر طرح کی زینت اور فروغ دینے میں کوشاں رہا وہ سپاہ جو شام سے آئی تھی کو کئی دن تک اپنے گھر بطور مہمان رکھی، قسم قسم کے لذیذ کھانوں سے خوب خاطر و تواضع محض اس غرض سے کی کہ اس کے اخلاق اور حسن طبع کا شہرہ یزید بن معاویہ تک پہنچ جائے۔

معاویہ کے خلاف امام حسینؑ کے خروج نہ کرنے کی اصل وجہ

مؤلف کہتا ہے کہ عراقی شیعوں نے معاویہ کی زندگی میں امام حسینؑ کو خروج کی دعوت دی تھی، لیکن آپؑ نے معاویہ سے وفا کی اور ان کی پیشکش کو مسترد کر دیا جب کہ معاویہ کے خلاف خروج نہ کرنے کا سبب تو امام حسنؑ نے بیان کر دیا تھا اور معاویہ کے بارے میں اپنی رائے کھلے لفظوں میں لکھ کر بھیج دی تھی، امام حسینؑ نے بھی اس کا بارہا اظہار کیا، معاویہ کو عادل اور خلیفہ برحق نہیں سمجھتے تھے۔ علامہ ذہبی ان معتبر روایات کا خلاصہ اپنے الفاظ میں اس طرح لکھتے ہیں:

﴿بلغنا ان الحسین لم یعجبه ما عمل اخوه الحسن من تسلیم الخلافة الی معاویة بل کان رایه القتال ولکنه کظم و اطاع اخاه و بایع و کان یقبل جوائز معاویة و معاویة یری له، یحترمه و یجله فلما ان فعل معاویة ما فعل بعد وفاة السید الحسن

من العهد بالخلافة الى ولده يزيد تالم الحق له و امتنع هو و ابن ابی بکر و ابن الزبير من المبايعة حتی قهرهم معاويه و اخذبيعتهم مکرهين، وغلبوا و عجزوا عن سلطان الوقت﴾

''ہمیں یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ خلافت معاویہ کے حوالے کرنے کے امام حسنؑ کے عمل سے امام حسینؑ خوش نہ تھے، بلکہ آپ کی رائے یہ تھی کہ معاویہ سے جنگ کی جائے، لیکن آپؑ نے صبر وضبط سے کام لیا اور اپنے بھائی کی اطاعت کی، معاویہ کی بیعت کر لی، آپؑ معاویہ کی طرف سے وظائف قبول کرتے تھے، معاویہ بھی آپؑ کا لحاظ کرتا اور احترام کرتا تھا، جب امام حسن علیہ السلام کی وفات کے بعد معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو خلافت کے لئے ولی عہد بنایا، تو امام حسینؑ کو بہت دکھ ہوا اور یہ ان کے لئے بالکل جائز تھا، چنانچہ امام حسینؑ، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور ابن زبیر نے یزید کی ولی عہدی پر بیعت نہ کی حتیٰ کہ معاویہ نے ان پر زبردستی کی اور جبر و اکراہ سے ان کی بیعت لی، وہ مغلوب ہو گئے اور بادشاہ وقت کی طاقت اور جبر کے سامنے بے بس ہو گئے۔''

(سیر اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۲۹۱، ۲۹۲)

مجبور اور مقہور ہو کر سلطان وقت کے سامنے بے بسی کے ساتھ کس طرح ان حضرات نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کر لی؟ خود علامہ ذہبی نے معاویہ کے حالات میں اس کا ذکر کیا ہے اور دیگر مؤرخین نے بھی معاویہ کے اس ظلم و جبر اور زبردستی کے ساتھ ان سے بیعت لینے کا واقعہ بیان کیا ہے، تاہم اسے ابھی موخر رکھتے ہیں معاویہ کی یزید کے نام حضرت امام حسین علیہ السلام کے بارے میں مکارانہ وصیت کے جواب میں ہم اس سلسلے میں وضاحت کریں گے و للتفصيل موضع آخر۔

امام حسن علیہ السلام کی وفات کے بعد مسیب بن نجبہ اور بہت سے دیگر لوگ امام حسین علیہ السلام کے پاس آئے اور یہ تجویز پیش کی کہ معاویہ کے خلاف قیام کریں۔ ان لوگوں نے آپؑ سے ذکر کیا ہمیں اس بارے میں آپؑ اور آپؑ کے بھائی (امام حسنؑ) کی رائے کا علم ہے، تو آپؑ نے فرمایا

﴿ارجو ان يعطی الله اخی علی نيته و ان يعطينی علی نيتی فی حبی جهاد الظالمين

''مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو ان کی نیت پر اجر عطا کرے گا اور

ظالموں سے جہاد کی محبت میں میری نیت پر اجر عطا کرے گا۔"

(سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۹۴، تہذیب ابن عساکر ج ۴، ص ۲۳۰ طبع بیروت)

مروان بن حکم نے معاویہ کو خط لکھا کہ مجھے خدشہ ہے کہ حسینؑ فتنہ کی آماجگاہ بن کر رہے گا، میرا خیال ہے کہ یہ شخص تمہیں بڑی مشکل میں مبتلا کر دے گا۔"

چنانچہ مروان کا یہ خط پڑھ کر معاویہ نے امام حسین علیہ السلام کی جانب تنبیہی خط لکھا کہ:

"جس شخص نے اللہ کے نام پر ہاتھ دیا ہو اور عہد کیا ہو اسے چاہیے کہ عہد پورا کرے، مجھے بتایا گیا ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگوں نے آپ کو ہمارے خلاف قیام کی دعوت دی ہے، ان کو تم پہلے آزما چکے ہو، انہوں نے تمہارے باپ اور بھائی کا ساتھ نہیں دیا، پس اللہ سے ڈرو اور اپنا عہد یاد رکھتے ہوئے اس کی پاسداری کرو ورنہ ﴿فانك متى تكدني، اكدك﴾ جب تم نے میرے خلاف کوئی منصوبہ بنایا تو میں تمہارے خلاف جنگ کروں گا۔"

﴿**فكتب اليه الحسين اتانى كتابك و انا بغير الذى بلغك جدير وما اردت لك محاربة و لا خلافاً وما اظن لى عذراً عند الله فى ترك جهادك وما اعلم فتنة اعظم من ولايتك**﴾ امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کو جواب لکھا: "تیرا خط میرے پاس آیا ہے جو بات تجھے پہنچی ہے وہ میرے شایان شان نہیں ہے، میں نے تیرے خلاف جنگ یا مخالفت کا کوئی ارادہ نہیں کیا، لیکن تجھ سے جہاد نہ کرنے کی وجہ سے میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا کوئی عذر قبول نہ ہوگا میرے علم میں تیری حکومت سے بڑا کوئی فتنہ نہیں ہے۔"

(سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۹۴، تاریخ الاسلام للذہبی ج ۲، ص ۳۴۱ طبع قاہرہ)

مؤلف کہتا ہے کہ امام حسنؑ اور حسین علیہما السلام معاویہ کو برحق اور عادل خلیفہ سمجھتے تھے، یہ ملاں جاہل اور اس کے فریب خوردہ اسلاف نے جھوٹ باندھا ہے، امام حسن علیہ السلام معاویہ کو سب سے زیادہ واجب القتل والقتال قرار دے رہے ہیں، امام حسین علیہ السلام اسے صراحت کے ساتھ ظالم قرار دے رہے ہیں اور واضح لفظوں میں فرما دیا ہے کہ تیرے ساتھ جہاد نہ کر کے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے آپ کو غیر معذور تصور کر رہا ہوں یعنی تیرے خلاف جہاد واجب ہے لیکن اس واجب

پر بوجوہ عمل نہیں کر سکتا، امام حسین علیہ السلام معاویہ کی حکومت کو تمام فتنوں سے بڑا فتنہ قرار دیتے ہیں، جبکہ قرآن کہتا ہے:

﴿اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾

فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت برا فعل ہے ان (کفار) سے جنگ جاری رکھو حتیٰ کہ فتنہ کا نام ونشان مٹ جائے۔"

چنانچہ آپؑ کے نزدیک معاویہ سب سے بڑا فتنہ یعنی مجسم فتنہ ہے اس لئے کہ اس کی حکومت اسی فتان کی قیادت میں قائم تھی۔ مزید پوچھنا ہے تو علامہ ذہبی سے جا کر پوچھ لیں۔ لیکن اس فتنے کو مٹانے کے لیے امام حسین علیہ السلام کے پاس قابل اعتماد انصار و اعوان کی تعداد بہت کم تھی جس کی بنا پر خروج نہ کیا۔

معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو کیا وصیت کی تھی؟

مؤلف اپنے پانچویں اور چھٹے امام کی بے جا وکالت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"اب جب حضرت امیر معاویہ کا وقت آخر قریب آیا تو انہوں نے امت کو افتراق انتشار سے بچانے کے لیے یزید کو ولی عہد نامزد کر کے تمام مملکت اسلامیہ سے اس کے لیے بیعت لے لی جبکہ حضرت حسینؓ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور چند دیگر صحابہ کرامؓ نے یزید کی بیعت نہیں کی تھی چنانچہ بوقت رحلت آخری وصیت حضرت امیر معاویہ نے یزید کو یہ کی جسے شیعہ کے عظیم مجتہد ملاں باقر مجلسی نے ص ۴۲۱ جلاء العیون میں اس طرح لکھا ہے: ترجمہ: لیکن امام حسینؓ ان کی نسبت و قرابت جناب رسالت مآب علیہ السلام سے تجھے معلوم ہے کہ حضرت کے بدن کے ٹکڑے ہیں اور آپ کے گوشت و خون سے انہوں نے پرورش پائی ہے مجھے علم ہے کہ عراق والے ان کو ا[پنی] طرف بلائیں گے اور ان کی مدد نہ کریں گے انہیں تنہا چھوڑ دیں گے اگر تو ان پر قابو پائے تو ان ۔ حقوق عزت کو پہچاننا اور ان کا مرتبہ اور قرابت جو رسول اللہؐ ہے اس کو یاد رکھنا ان کے افعال کا ا[ن] سے مواخذہ نہ کرنا اور اس مدت میں جو روابط میں نے ان سے مضبوط کئے ہیں ان کو نہ توڑنا خبردار ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ دینا۔" (خطبات جیل صفحہ ۳۳۴، ۳۳۵)

الجواب:۔ یہ وصیت نامہ اہلسنت کی غیر بنیادی کتب سے ماخوذ ہے اور یہ معاویہ کی طرف سے امام حسین علیہ السلام کی خیر خواہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ اس کی سیاست کا ایک پُر فریب حصہ ہے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ ناعاقبت اندیش مؤلف نے حسب عادت عبارت نقل کرنے میں انتہائی دجل و بددیانتی کا مشغلہ اپنایا ہے درج ذیل عبارت حذف کر دی ہے:

﴿مؤلف گوید که غرض آن..... از این نصیحتها حفظ ملك و پادشاهی یـزید پلید بود زیرا که می دانست که بعد از شهید کردن آن بزرگوار ملك دنیا بـر او مستقیم نخواهد ماند و جمیع خلایق از مومن و منافق از او منحرف خواهند گردید..... الخ﴾

"مؤلف (علامہ مجلسیؒ) فرماتے ہیں کہ معاویہ کی غرض اس وصیت سے یزید پلید کی حکومت اور ملک کی حفاظت تھی، اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد حکومت میں تزلزل ہوگا اور تمام لوگ مؤمن و منافق یزید سے منحرف ہوں گے۔"

(جلاء العیون ص ۳۲۴ مطبوعہ جدید ایران)

علاوہ بریں اس سے قبل گزر چکا ہے کہ معاویہ نے خود امام حسین علیہ السلام کو لکھا تھا: **﴿فانك متٰی تکدنی اکدك﴾** "اگر تم نے میرے خلاف کوئی تدبیر کی تو میں تم سے نبٹ لوں گا۔"

معاویہ نے خود ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ امام حسین علیہ السلام سے نبٹ لے گا تو اپنے بیٹے کو کس طرح ان سے حسن سلوک کی مخلصانہ وصیت کر سکتا ہے؟ اس کے برعکس اس کی حقیقی وصیت کے الفاظ علامہ ذہبی نے اس طرح لکھے ہیں:

﴿ولما حضر معاویة دعا یزید فاوصاه و قال! انظر حسیناً فانه احب الناس الی الناس، فصل رحمه، و ارفق، فان یك منه شی فسیکفیك اللّٰه بمن قتل اباه، و اخذل اخاه﴾

جب معاویہ کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے یزید کو بلایا، اسے وصیت کی اور کہا: حسینؑ کی طرف نگاہ رکھنا، وہ سب لوگوں کے لیے محبوب ترین شخصیت ہیں۔ ان سے صلہ رحمی کرنا

اور نرم رویہ رکھنا، اگر انہوں نے کوئی حرکت (تیرے خلاف) کی، تو جن (شامی وکوفی نواصب و غداروں) کے ذریعے اللہ نے اس کے باپ کو قتل کیا اور اس کے بھائی کو رسوا کیا، انہی کے ذریعے سے تیرے لیے بھی کافی ہوگا۔" (سیر اعلام النبلاء، ج۳، ص ۲۹۵)

جو شخص اس نظریئے کا حامل ہو کہ اللہ نے حسینؑ کے باپ علیؑ کو قتل کر کے معاویہ کی مدد کی، (معاذ اللہ) اور حسنؑ کو اللہ نے معاویہ کے مقابلہ پر رسوا کیا (معاذ اللہ) اور بیٹے کو بتا رہا ہو کہ انہی کی مدد سے اللہ تجھے حسینؑ پر غالب کرے گا (معاذ اللہ) اور انہی منافقوں اور غداروں کے ذریعے سے اللہ حسینؑ کو بھی اسی انجام سے دوچار کر دے گا جس سے اس کا باپ اور بھائی دوچار ہو چکے ہیں۔ کیا ایسا شخص حضرت امام حسین علیہ السلام کا احترام کرتا ہے؟ اور ان کے ساتھ بھلائی کی وصیت کر سکتا ہے؟ بلکہ مندرجہ بالا وصیت اس امر پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ وہ خروج کی صورت میں امام حسین علیہ السلام کے قتل کی وصیت کر رہا ہے قتل کرنے کی وصیت تو کجا، معاویہ نے خود اپنی حکومت کے دوران حضرت امام حسین علیہ السلام کے قتل کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ تائید ربانی نہ ہوتی تو ان کی شہادت کربلا کے بجائے مکہ میں اور ۶۱ ہجری کے بجائے ۵۶ ہجری میں ہو جاتی لیکن امام کی دور اندیشی اور مصلحت شناسی نے اس کی چالوں کو ناکام کر دیا وگرنہ معاویہ نے اس طرح فضا تیار کر دی تھی کہ جس میں امام حسین علیہ السلام کا قتل ہو جانا لابد امر تھا۔ یزید کو اس صورت میں یہ سبق دے دیا گیا کہ استحکام خلافت کے لیے مکہ میں بھی حسینؑ کا خون بہانے سے پرہیز نہ کرنا۔ یہی سبق تھا جو یزید نے تخت نشینی کے بعد دہرایا اور تیس آدمیوں کو حاجیوں کے لباس میں مکہ بھیجا کہ حسینؑ کو طواف کی حالت میں بھی پاؤ تو قتل کر دینا۔ اس لیے یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ قتل حسینؑ میں معاویہ کا بھی ہاتھ تھا ورنہ بار بار قتل کی دھمکی دینا چہ معنی دارد؟

بہر کیف اس کی دلی خواہش کو بیٹے یزید نے پورا کر دیا۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

معاویہ نے امام حسین علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی

علامہ ذہبی کے حوالے سے صفحات بالا میں گزر چکا ہے کہ امام حسینؑ، ابن زبیر اور ابن

ابی بکرؓ نے مجبور مقہور اور بے بس ہو کر یزید کی بیعت پر خاموشی اختیار کی تھی، اس کی مزید تفصیل ذہبی بیان کرتے ہیں کہ کس طرح بے بس اور مجبور کر دیئے گئے تھے۔

﴿ثم اعتمر سنة ست و خمسين في رجب و كان بينه و بين الحسين و ابن عمر و ابن الزبير و ابن ابى بكر كلام في بيعة العهد ليزيد، ثم قال! انى متكلم بكلام، فلا ترد و على اقتلكم فخطب و اظهر انهم قد بايعوا و سكتو او لم ينكروا﴾

پھر معاویہ نے ۵۶ ہجری کے ماہ رجب میں عمرے کا ارادہ کیا، چنانچہ حضرت امام حسینؑ، ابن عمر، ابن زبیر اور ابن ابی بکر اور معاویہ کے درمیان یزید کی بیعت کے سلسلے میں مذاکرات ہوئے بالآخر معاویہ نے کہا: میں ایک اعلان کروں گا تم نے اس میں میری تردید نہیں کرنی ورنہ تمہیں قتل کر دوں گا اس کے بعد معاویہ نے خطبہ دیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان حضرات نے یزید کی بیعت کر لی ہے، یہ حضرات خاموش رہے اور معاویہ کی بات پر انکار نہ کیا۔"

(سیر اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۱۳۷، ۱۳۸ طبع بیروت)

جس واقعہ کو علامہ ذہبی نے معاویہ کا کچھ لحاظ کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کو ابن اثیر الجزری نے تاریخ کامل میں اور دیگر مؤرخین نے اپنی تالیفات میں مفصل درج کیا ہے۔ معاویہ نے ان مخالفین بیعت یزید کو الگ بلا کر دھمکی دے دی کہ میں سب لوگوں کے سامنے ایک اعلان کروں گا تم نے میری تصدیق یا تکذیب میں ایک لفظ تک نہیں کہنا اگر تمہارے لبوں پر جنبش پیدا ہوئی تو اسی وقت گردن اڑا دی جائے گی چنانچہ ان کے سامنے اپنے خصوصی مسلح دستے کے کمانڈر کو بلا کر حکم دیا کہ یہ لوگ منبر کے نیچے بیٹھیں گے اور ان میں سے ہر ایک کے دونوں کندھوں کے پاس دائیں اور بائیں ایک ایک شمشیر بردار سپاہی متعین کر دو، جونہی ان میں سے کسی کے ہونٹ حرکت میں آئیں وہ سپاہی اسی وقت تلوار سے ان کا سر تن سے جدا کر دے۔ پس اسی خوف سے یہ چاروں شخصیات خاموش رہیں اور معاویہ نے اعلان کر دیا کہ ان چاروں نے بیعت کر لی ہے جب معاویہ اس کاروائی کے بعد مدینہ سے فی الفور رخصت ہو گیا تو لوگوں نے فرداً فرداً ان حضرات سے پوچھا کہ آپ تو بیعت نہیں کرتے تھے پھر یہ کیا ہوا آپ نے بیعت کیوں کر لی؟ تب

انہوں نے حقیقت حال ظاہر کی اور سارا ماجرا سنایا۔

اسی طرح ابن کثیر دمشقی نے بھی معاویہ کی رعایت سے اس واقعہ کو مختصر بیان کیا ہے لیکن حقیقت کو چھپانے میں ناکام رہا ہے۔اس کے خاص خاص الفاظ یہ ہیں: ﴿**استدعی کل واحد من ھو لاء الخمسة فاوعده و تھدده بانفراده**﴾ ان پانچوں کو الگ الگ بلایا اور ہر ایک کو ڈرایا دھمکایا۔ ﴿......**ثم خطب معاویة و ھؤلاء حضور تحت منبره و بایع الناس لیزید وھم قعود ولم یوافقو او لم یظھرو اخلافاً لما تھددھم و توعدھم**﴾ پھر معاویہ نے خطبہ دیا جبکہ یہ حضرات منبر کے نیچے حاضر تھے لوگوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی حالانکہ یہ بیٹھے دیکھ رہے تھے نہ انہوں نے موافقت کی نہ اختلاف کا اظہار کیا، اس لیے کہ معاویہ نے انہیں پہلے ہی ڈرا دھمکا دیا تھا۔" (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۷۹، ۸۰ طبع دار الفکر بیروت)

جو شخص خود قتل حسینؑ پر آمادہ ہو، وہ اپنے بیٹے کو کس طرح اس کام سے روک سکتا ہے؟ کتب تاریخ میں معاویہ بن ابی سفیان کی بعض وصیتیں محض مکاری اور فریب کاری پر مبنی ہیں، تاکہ لوگ آئندہ یہ نہ کہیں کہ معاویہ دشمن اہل بیتؑ تھا لیکن معاویہ کا کردار چھپانے سے چھپ نہیں سکتا اسے معلوم تھا کہ حسینؑ کی موجودگی میں یزید کی حکومت زیادہ دیر چل نہیں سکے گی اسی لئے اسے ہر طرح کے حیلے اور تدابیر سکھانے کی کوشش میں تھا۔ مگر اس طرح تاریخی حقائق کو چھپایا نہیں جا سکتا کیونکہ ؏

ہر کس نہ شناسندہ راز است وگرنہ
اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

معاویہ کے دور آمریت میں صحابہؓ و تابعینؒ کا وظائف قبول کرنا

احمق ملاں یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ امام حسن و حسین علیہما السلام معاویہ سے وظیفہ لیتے تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ معاویہ برحق خلیفہ تھا اور ان حضرات کے معاویہ کے ساتھ خوشگوار اور باہمی احترام پر مبنی تعلقات تھے لیکن احناف کے مایہ ناز فقیہ مفسر اور محدث امام ابو بکر احمد بن علی جصاص رازی متوفی ۳۷۰ھ نے ان نادانوں کے اس استدلال کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے ہیں

چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿وقد كان الحسن و سعيد بن جبير و الشعبى و سائر التابعين ياخذون ارزاقهم من ايدى هولاء الظلمة لاعلى انهم كانوا يتولونهم ولا يرون امامتهم و انما كانوا ياخذنها على انها حقوق لهم فى ايدى قوم فجرة و كيف يكون ذالك على وجه موالاتهم وقد ضربوا وجه الحجاج بالسيف و خرج عليه من القراء اربعة آلاف رجل هم خيار التابعين و فقهاؤهم فقاتلوه مع عبد الرحمٰن بن محمد بن الاشعث بالاهواز ثم بالبصرة ثم بدير الجماجم من ناحية الفرات بقرب الكوفة وهم خالعون لعبد الملك بن مروان لاعنون لهم متبرؤن منهم و كذالك كان سبيل من قبلهم مع معاوية حين تغلب على الامر بعد قتل على عليه السلام و قد كان الحسن و الحسين ياخذان العطاء و كذالك من كان فى ذالك العصر من الصحابة وهم غير متولين له بل متبرؤن منه على السبيل التى كان عليها على عليه السلام الى ان توفاه الله تعالىٰ الى جنة و رضوانه فليس اذا فى ولاية القضاء من قبلهم ولا اخذ العطاء منهم دلالة على توليتهم و اعتقاد امامتهم﴾

حسن بصری، سعید بن جبیر، شعبی اور تمام تابعین ان ظالم (حکمرانوں) سے وظیفے لیتے تھے لیکن اس بناء پر نہیں کہ وہ ان سے دوستی رکھتے تھے اور ان کی حکومت کو جائز تصور کرتے تھے، بلکہ اس لیے لیتے تھے کہ یہ تو ان کے اپنے حقوق ہیں جو ظالم و فاجر لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ ان سے دوستی کی بنیاد پر یہ کام کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ انہوں نے حجاج سے تلوار کے ذریعے مقابلہ کیا چار ہزار قراء (علماء) نے، جو تابعین میں سے بہترین اور فقہاء تھے، عبد الرحمٰن بن محمد بن اشعث کی قیادت میں حجاج سے اھواز کے مقام پر جنگ کی، پھر بصرہ اور بعد ازاں کوفہ کے قریب فرات کے کنارے دیر جماجم کے مقامات پر حجاج سے جنگ کی ہے۔ انہوں نے عبد الملک بن مروان کی بیعت توڑ دی تھی، ان (اموی حکمرانوں) پر لعنت کرتے اور ان سے تبرا کرتے تھے۔ ان سے پہلے کے لوگوں کا معاویہ کے ساتھ بھی یہی طریقہ تھا، جب وہ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد

زبردستی حکمران بن گیا، امام حسنؑ اور حسینؑ بھی (معاویہ سے) وظائف لیتے تھے، بلکہ اس (معاویہ) سے اسی طرح تبرا کرتے تھے جس طرح حضرت علی علیہ السلام معاویہ سے تبرا کرتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ آپؑ کو وفات کے بعد جنت اور رضوان میں لے گیا۔ چنانچہ (ان ظالم حکمرانوں) کی طرف سے عہدہ قضاء قبول کرنے اور وظائف لینے میں یہ دلیل نہیں ہے کہ یہ حضرات ان ظالموں سے دوستی رکھتے تھے اور ان کی حکومت کو جائز اعتقاد کرتے تھے۔

(احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۷۱، ۷۲ طبع بیروت)

حیرت و استعجاب کی بات ہے کہ اہل سنت کے معتبر اور جید علماء سلف۔ تو اس امر کا ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر رہے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام، حسنین علیہما السلام اور دیگر تمام صحابہ کرامؓ معاویہ سے تبرا کرتے اور اس پر لعنت کرتے تھے پھر یہ نادان طوائے تمام صحابہ و اہل بیت کی سنت ثابتہ سے انحراف کرتے ہوئے معاویہ سے بیزاری کیوں نہیں کرتے؟ بلکہ الٹا اس سے موالات اور حسن عقیدت کا شب و روز دم بھرتے نظر آتے ہیں حالانکہ یہ اپنے آپ کو صحابہؓ کا پیروکار بتاتے تھکتے نہیں ہیں۔ شاید اس موقع پر کسی شاعر نے کہا ہے ؎

مرنے کے بعد آئے ہو میرے مزار پر
پتھر ہوئیں صنم تیرے ایسے پیار پر

معلوم ہوتا ہے کہ یہ حمقاء درحقیقت تمام صحابہؓ اور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن ہیں، اسی لیے ان مقدس حضرات کو جس شخص سے نفرت اور عداوت تھی اسی سے یہ دوستی اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی ملاں اور ان کے پیروکار حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے قاتل اور حقیقی ناصبی ہیں لیکن اپنے مکروہ و منحوس کردار کو چھپانے کیلئے مسلمانوں پر بہتان تراشی کرتے ہیں۔

قاتلان حسینؑ کون؟

نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساتھیوں سمیت کربلا کی تپتی زمین پر تہہ تیغ کرنے والے، خیموں کو لوٹنے اور آگ لگانے اور عصمت و طہارت کی پیکر سید زادیوں کی بے حرمتی کرنے والے اور اس پورے واقعۂ کربلا کے اصل ذمہ دار اور مجرم ناصبی ہیں۔ ہم ان کے مکروہ اور گھناؤنے چہروں سے

منافقت کی چادر تار تار کر کے انہیں بے نقاب کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر اصل حقائق بیان کرنے سے قبل اسی گروہ کے ہم مشرب و ہم نوا ہمارے مخاطب کا دفاعی بیان ملاحظہ فرمالیجئے چنانچہ مؤلف بعنوان ''حضرت حسینؓ کے نام شیعوں کے بارہ ہزار خطوط'' کے تحت یوں لکھتا ہے کہ:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر جب کوفہ پہنچی تو کوفہ کے ایک مشہور شیعہ سلیمان بن صرد کے گھر شیعوں کا عظیم اجتماع ہوا جس میں سلیمان بن صرد نے کہا مجھے معلوم ہے کہ حضرت حسینؓ امیر معاویہ کی وفات کی خبر سن کر یزید کی بیعت سے انکار کر کے مدینہ سے مکہ روانہ ہوگئے ہیں چونکہ ہم سب لوگ حضرت حسینؓ کے والد کے شیعہ ہیں اس لیے میرا مشورہ ہے کہ ہم حضرت حسینؓ کو خط لکھ کر اپنے پاس بلوائیں اگر تم لوگ ان سے وفا کروگے اور فریب نہیں دوگے بلکہ عقیدت کے ساتھ ان کی مدد کروگے تو ہم ان کو بلائیں اس پر سب نے کہا ہم بدل و جان حاضر ہیں اور بہت ہی بلند و بانگ دعوے کئے اور یہ خط حضرت حسینؓ کو لکھا۔ ترجمہ:

.... یہ خط حسین بن علی بن ابی طالب صلوٰۃ اللہ علیہ کے نام ہے سلیمان بن صرد خزاعی، میتب بن نخبہ، شداد، حبیب بن مظاہر اور کوفہ کے تمام شیعوں، مؤمنوں مسلمانوں کی طرف سے آپ پر خدا کا سلام...... (خطبات جیل ص ۳۳۷، ۳۳۸)

الجواب:۔ اب ہم اس امر کی وضاحت تاریخی شواہد کی روشنی میں کریں گے کہ قاتلان حسین علیہ السلام شیعہ نہ تھے بلکہ خالص اور پختہ ناصبی تھے چنانچہ معاویہ نے جس طرح سے یزید کو ولی عہد بنایا اور جن حیلوں سے عوام و خواص سے اس کی ولی عہدی پر بیعت لی اس کا کچھ ذکر تو سطور بالا میں ہو چکا ہے اب معاویہ کی موت کے بعد یزید نے سب سے پہلا جو کام کیا وہ اپنے چچا زاد بھائی، مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے نام تحریر کیا گیا خط ہے جسے ابن کثیر دمشقی نے یوں نقل کیا ہے:

﴿...... و کتب الیه فی صحیفة کانها اذن الفارة اما بعد فخذ حسیناً و عبداللّٰه بن عمر و عبداللّٰه بن الزبیر اخذا شدیداً لیست فیه رخصة حتیٰ یبایعوا والسلام﴾

چوہے کے کان کی طرح کے ایک صحیفہ میں اس نے لکھا.... ''حسینؓ، عبد اللہ بن عمر اور

عبداللہ بن زبیر کے ساتھ بیعت لینے میں سختی کرو، جس میں کسی قسم کی رخصت اور نرمی نہ ہو، حتیٰ کہ وہ بیعت کرلیں۔" (البدایہ والنہایہ ج ۸، ص ۱۴۶، ۱۴۷ طبع بیروت)

ولید نے اس معاملے میں مشورے کے لیے مروان بن حکم ناصبی کو بلایا، تو اس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا: ﴿اریٰ ان تدعوهم قبل ان یعلموا بموت معاویة الی البیعة، فان ابوا ضربت اعناقهم﴾ "میری رائے یہ ہے کہ معاویہ کی موت کا علم ہونے سے قبل ہی انہیں بیعت کی دعوت دو، اگر وہ انکار کریں تو ان کی گردنیں اتار دو۔"

چنانچہ انہوں نے آدمی بھیجا امام حسینؑ اور ابن زبیر مسجد میں تشریف فرما تھے جب انہیں پیغام پہنچا تو انہوں نے کہا: تم جاؤ ہم آتے ہیں اب امام حسینؑ نے ابن زبیر کی طرف متوجہ ہوکر معاویہ کے بارے میں اپنی محترم دوستانہ رائے اس طرح ظاہر فرمائی:

﴿ قال الحسین لابن الزبیر... انی اریٰ طاغیتم قد هلك ﴾ "میرا خیال ہے کہ ان کا طاغیہ (معاویہ) ہلاک ہوگیا ہے۔"

پھر آپؑ نے اپنے ایک موالی کو ساتھ لیا اور گورنر ہاؤس پہنچ گئے، اور اپنے موالی کو دروازے پر بٹھا کر خود اندر چلے گئے ساتھ ہی موالی کو بتا دیا کہ ﴿ان سمعتم امراً یریبکم فادخلوا﴾ کوئی مشکوک امر سنو تو تم بھی اندر آجانا۔ ولید کے ساتھ مروان بھی موجود تھا، بات چیت ہوئی تو امام حسینؑ نے فرمایا..... میرے جیسا آدمی اس طرح تنہائی میں خفیہ طریقے سے بیعت نہیں کرسکتا۔ جب سب لوگوں کا اجتماع ہو تو مجھے بھی بلا لینا پھر اکٹھا ہر کام ہو جائے گا ولید اس بات پر متفق ہوگیا۔

﴿فقال مروان للولید، واللہ لئن فارقك ولم یبایع الساعة لیکثرن القتل بینکم و بینه فاحبسه ولا نخرجه حتی یبایع و الا ضربت عنقه، فنهض الحسین و قال یا ابن الزرقاء انت تقتلنی؟﴾ مروان نے ولید کو کہا: اللہ کی قسم اگر یہ تم سے اس وقت بیعت کیے بغیر جدا ہوگیا، تو تمہارے اور اس کے درمیان بڑی خونریزی ہوگی، اسے روک لیں اور باہر نہ جانے دیں حتیٰ کہ بیعت کرے، ورنہ اس کی گردن اڑا دیں۔ حضرت امام حسینؑ اپنی جگہ سے اٹھے

اور فرمایا: اے ابن زرقاء تو مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے؟'' لیکن ولید نے مروان کے اس مشورے کو گناہ سمجھ کر رد کر دیا۔

بعض صحابہ اور فرزندان صحابہ قتل حسینؑ میں شریک تھے

بعد ازاں امام حسین علیہ السلام مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے وہاں کوفہ کے لوگوں کے خط اور وفد پہنچے تو آپؑ نے حضرت مسلم بن عقیل کو دریافت احوال کے لیے روانہ کیا، وہاں لوگوں نے خفیہ طور پر حضرت مسلم کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اور امام حسین علیہ السلام کی نصرت کے لیے کئی ہزار افراد نے بیعت کر لی، ناصبی جاسوسوں نے گورنر نعمان بن بشیر کو اطلاع دے دی تو اس نے کوئی سخت ردعمل ظاہر نہ کیا۔ لیکن اس سلسلے میں ایک خطبہ دیا اور لوگوں کو اختلاف سے ڈرایا اور یزید کی بیعت پر قائم رہنے کی تلقین کی۔ وہیں سے ایک ناصبی اٹھ کھڑا ہوا اور نعمان کو کہنے لگا: ﴿......ان هذا الامر لا يصلح الا بالغشمة و ان الذى سلكته ايها الأمير مسلك المستضعفين﴾ یہ معاملہ تشدد کے بغیر درست نہیں ہو سکتا اور جو راستہ آپ نے اپنایا ہے وہ تو کمزور لوگوں کا طریقہ ہے۔'' نعمان نے اس کی بات یہ کہہ کر رد کر دی کہ اللہ کی اطاعت میں مستضعف بننا بہتر ہے۔ اس سے کہ اللہ کی معصیت میں زبردست اور شدید بن جاؤں۔ پھر منبر سے اتر آیا۔ ﴿فكتب ذالك الرجل الى يزيد يعلمه بذالك﴾ اس شخص نے اس صورت حال کی خبر یزید کو لکھ بھیجی۔ ﴿و كتب الى يزيد عمارة ابن عقبة و عمرو بن سعد بن ابى وقاص﴾ عمارہ ابن عقبہ اور عمرو بن سعد بن ابی وقاص نے بھی یزید کو اس صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے خط لکھے۔ چنانچہ یزید نے نعمان کو معزول کر کے اپنے خصوصی مشیر سرجون کے مشورہ سے عبید اللہ بن زیاد بن ابی سفیان (زیاد کی نسبت ابوسفیان کی طرف ۴۴ ہجری میں معاویہ کے اس اعلان کے بعد ہوئی کہ زیاد میرا بھائی ہے یہ ابوسفیان کا بیٹا ہے اور اعلان کروا دیا کہ اس کے بعد اس کو زیاد ابن ابی سفیان کہا جائے یہ بڑی طویل داستان ہے جسے کتب تاریخ میں ''استلحاق زیاد'' کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے) کو بصرہ کے ساتھ ساتھ کوفہ کا گورنر بھی بنا دیا، حالانکہ وہ اس سے پہلے اسے (عبید اللہ کو) بصرہ سے بھی معزول کرنے کا سوچ رہا تھا۔ ﴿ثم كتب يزيد الى ابن زياد، اذا قدمت الكوفة فاطلب مسلم بن

عقیل فان قدرت علیه فاقتله او انفه ﴾ پھر یزید نے ابن زیاد کو لکھا، جب تم کوفہ جاؤ تو مسلم بن عقیل کو تلاش کرو، اگر تمہیں مل جائیں تو انہیں قتل کر دو یا جلا وطن کر دو۔ اب عبید اللہ بن زیاد سترہ سواروں کی معیت میں کوفہ شہر میں داخل ہوا۔ حالات سے آگاہی حاصل کی اور پھر شہر کے تمام عرفاء (کونسلروں، ممبروں) اور امراء کو دار الامارۃ میں طلب کیا مسلم بن عقیل کا پتہ دریافت کیا۔ تھوڑا سا ہنگامہ ہوا لیکن عبید اللہ نے تمام امراء و عرفاء کوفہ کو قصرِ امارت میں اغوا کر رکھا تھا انہوں نے مسلم بن عقیل کا ساتھ دینے والے لوگوں کو ان کی مدد سے دست کش ہو جانے کی تلقین کی، حتیٰ کہ مغرب کے وقت تک صرف تین آدمی آپؓ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ رات کو وہ بھی رخصت ہو گئے۔ حضرت مسلم ایک بڑھیا کے گھر میں مخفی ہو گئے لیکن اس کے بیٹے کو پتہ چل گیا، صبح ہوتے ہی اس کا بیٹا عبد الرحمٰن بن محمد بن اشعث کے پاس گیا اور اسے مسلم کی اپنے گھر میں موجود ہونے کی اطلاع دی۔ عبد الرحمٰن نے جا کر سرگوشی سے اپنے باپ کو بتا دیا۔ اس وقت عبد الرحمٰن کا باپ محمد بن اشعث عبید اللہ کے دربار میں اس کے پاس بیٹھا تھا ابن زیاد نے پوچھا: ''یہ سرگوشی کیا ہے؟'' محمد نے ابن زیاد پر راز کھول دیا۔ ابن زیاد نے اسی وقت ستر (۷۰) یا اسی (۸۰) سواروں کو عمرو بن حریث مخزومی کی قیادت میں جو پولیس کا کمانڈر تھا، عبد الرحمٰن اور محمد بن اشعث کے ساتھ بھیجا ان سب نے مل کر حضرت مسلم کو گرفتار کر لیا اور قصرِ امارت کی طرف لے چلے ﴿**ولما انتهی مسلم بن عقیل الی باب القصر اذا علی بابه جماعة من الامراء من ابناء الصحابة ممن یعرفهم و یعرفونه ینتظرون ان یوذن لهم علی ابن زیاد و مسلم مخضب بالدماء فی وجهه و ثیابه وهو مثخن بالجراح و هو فی غایة العطش و اذا قلة من ماء بارد هنالك فاراد ان یتناولها یشرب منها فقال له رجل من اولئك و الله لا تشرب منها حتی تشرب من الحمیم، فقال له ویلك یا ابن ناهلة، انت اولیٰ بالحمیم و الخلود فی نار الجحیم منی**﴾

جب مسلم بن عقیلؒ قصرِ امارت کے دروازے کے پاس لائے گئے تو اس وقت فرزندان صحابہ میں سے امراء کی ایک جماعت دروازے پر موجود تھی، مسلم انہیں پہچانتے تھے، اور وہ مسلم کو پہچانتے تھے وہ اس انتظار میں کھڑے تھے کہ ابن زیاد سے ملاقات کی اجازت مل جائے۔ مسلمؒ کا

چہرہ اور کپڑے خون آلود تھے۔ آپ زخموں سے چور تھے۔ آپ کو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہیں پہ پانی کا ایک بڑا برتن پڑا تھا، آپ نے اس تک جانے کی کوشش کی کہ اس سے کچھ پانی پی لیں، ان (امراء ابنائے صحابہ) میں سے ایک نے جناب مسلمؑ کو کہا: تم اس سے نہ پی سکو گے۔ حتیٰ کہ دوزخ کا گرم پانی پیو، جناب مسلم نے اسے کہا: ہلاکت ہو تجھ پر اے ناہلہ کے بیٹے، تم جہنم کے گرم پانی اور نارِ جحیم میں دائمی طور پر داخل ہونے کے مجھ سے زیادہ لائق ہو۔

(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۶)

مؤرخ ابن کثیر شامی نے اپنے تعصب کی بناء پر تاریخ نگاری میں بد دیانتی کا ارتکاب کرتے ہوئے صحابہ اور ابنائے صحابہ کے نام چھپانے کی مکروہ کوشش کی ہے، اور اس شخص کا نام مخفی رکھنے کی سعی کی ہے جس نے حضرت مسلمؑ کی اس وقت دل آزاری کی جب آپ زخمی اور پیاس کی شدت سے تڑپ رہے تھے لیکن ابن جریر طبری نے عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں پہنچنے کے درخواست گزار اور اجازت کا انتظار کرنے والے صحابہ اور صحابہ زادوں کے بعض نام ظاہر کر دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک عمرو بن حریث مخزومی ہے، (ملاحظہ کیجئے: "تاریخ الامم والملوک لابن جریر الطبری" جلد ششم صفحہ ۲۱۲، الطبعۃ الاولیٰ بالمطبعہ الحسینیۃ المصریۃ قاہرہ) تاہم اس کا شمار بڑے صحابہ کرام میں کیا جاتا ہے اور اس سے حدیثیں بھی نقل کی گئی ہیں جیسا کہ علامہ ذہبی اس عمرو بن حریث المخزومی کے بارے میں لکھتے ہیں:

﴿...... کان عمرو من بقایا اصحاب رسول اللہ علیہ وسلم الذین کانوا نزلوا الکوفۃ ...... لہ صحبۃ و روایۃ﴾

"عمرو (بن حریث) ان بقایا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہے جو کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ ...... یہ صحابی ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔"

(سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۴۱۸)

حافظ ابن کثیر نے اسی عمرو بن حریث مخزومی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

﴿و بعث ابن زیاد عمرو بن حریث المخزومی۔ و کان صاحب شرطتہ﴾

"عبید اللہ بن زیاد نے مسلمؑ کی گرفتاری کے لیے عمرو بن حریث مخزومی کو بھیجا جو اس کی پولیس کا انچارج تھا۔" (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۵، تاریخ الطبری، ج ۶، ص ۱۹۸، طبع مصر)

دربار زیاد میں اجازت لینے والوں میں سے ایک کثیر بن شہاب تھا، طبقات ابن سعد میں اس کے بارے میں لکھا ہے: ﴿وقد روی عن عمر بن الخطاب و ولی الری لمعاویة بن ابی سفیان﴾ اس نے عمر بن خطاب سے روایت کی ہے اور معاویہ بن ابی سفیان کی جانب سے رَے کا گورنر ہوا ہے۔ (طبقات ابن سعد، ج ۶، ص ۱۰۳ طبع لیدن)

جب امام حسین علیہ السلام مکہ مکرمہ سے کوفہ کی جانب روانہ ہوگئے تو مروان بن حکم نے ابن زیاد کو خط لکھا: ﴿اما بعد فان الحسین بن علی قد توجه الیك وهو الحسین بن فاطمة و فاطمة بنت رسول الله صلی الله علیه وسلم و تالله ما احد یسلمه، الله احب الینا من الحسین﴾ "حسین بن علی تیری جانب روانہ ہوا ہے وہ حسین بن فاطمہؑ ہے اور فاطمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہے، اللہ کی قسم! حسین سے بڑھ کر ہمیں کسی شخص کی خواہش نہیں ہے کہ اللہ اسے ہمارے قبضے میں دے دے۔" (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۵)

مزید برآں حافظ ابن کثیر دمشقی اسی صفحہ پر لکھتے ہیں: ﴿کتب یزید الی ابن زیاد انه قد بلغنی ان حسینا قد سار الی الکوفة وقد ابتلی به زمانك من بین الازمان و بلدك من بین البلدان و ابتلیت انت به من بین العمال و عندها تعتق او تعود عبداً کما ترق العبید و تعبد﴾ یزید نے ابن زیاد کو خط لکھا، مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حسین کوفہ کی جانب روانہ ہو چکے ہیں زمانوں میں سے تیرا زمانہ بستیوں میں سے تیری بستی اور گورنروں میں سے تم اس معاملے میں آزمائش میں ڈالے گئے ہو، (اس میں کامیابی یا ناکامی پر) تم آزاد تصور ہوگئے یا دوبارہ غلام بن جاؤ گے جس طرح غلام آزاد ہوتے یا آزاد غلام بنائے جاتے ہیں۔"

قاتلانِ حسینؑ نے ناصبی ہونے کا خود اعتراف کیا

راستے میں امام حسین علیہ السلام کی ملاقات فرزدق سے ہوئی تو آپؑ نے اس سے حالات پوچھے تو اس نے ان جامع اور مختصر لفظوں میں حالات کی تصویر کھینچی کہنے لگے: ﴿مولی' قلوب

الناس معك و سيوفهم مع بني امية ﴾"لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں بنوامیہ کے ساتھ ہیں۔"

جب عوام الناس کی تلواریں بنوامیہ کے ساتھ تھیں تو وہ شیعہ کسی طرح نہیں ہو سکتے ہاں، یقیناً نواصب کی صف میں ان کا شمار اور نواصب کے ساتھ ان کا حشر ضرور ہوگا۔

یزیدی ناصبی فوج میں سے عزرہ بن قیس احمسی نے بطور تمسخر جناب حبیبؓ بن مظاہر سے کہا تم سے جہاں تک ہو سکے اپنی تعریفیں کرتے رہتے ہو چنانچہ زہیر نے کہا: اے عزرہ! اللہ تعالیٰ نے اسے پاک کردار والا بتایا ہے اور اسے ہدایت دی ہے اے عزرہ! اللہ سے ڈرو میں تیرا خیر خواہ ہوں اے عزرہ میں تجھے اللہ سے ڈراتا ہوں کہ تو پاکباز انسانوں کو قتل کرنے میں گمراہوں کے مددگار بنو، عزرہ نے کہا: ﴿**یا زهیر ما كنت عندنا من شيعة اهل هذا البيت انما كنت عثمانيا، قال افلست تستدل بموقفي هذا اني منهم**﴾ اے زہیر! تو ہمارے خیال میں اس خاندان والوں کا شیعہ نہ تھا، تو تو عثمانی تھا، زہیر نے کہا: تم اس وقت میرے ان کے ساتھ ہونے سے استدلال نہیں کر سکتے ہو کہ میں انہی (اس خاندان رسالت) کے شیعوں میں سے ہوں۔

(تاریخ ابن جریر طبری ج ۶ ص ۲۴۷ طبع قدیم مطبعہ حسینیہ مصر)

مشہور مؤرخ امام بلاذری نے بھی میدان کربلا میں ہونے والی اس گفتگو کو اپنی کتاب "انساب الاشراف" جلد ۳، ص ۳۹۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت میں بالاجمال لکھا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں: ﴿**وقال عزرة بن قيس لزهير بن القين كنت عندنا عثمانياً فما بالك؟ الخ**﴾ معنی وہی ہے جو سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔

حضرت زہیر بن قین رضی اللہ عنہ نے اس احمق تابعی ناصبی عزرہ بن قیس کو بالکل درست اور معقول جواب دیا جبکہ اس کے سوالات جاہلانہ تھے اس بات سے جناب زہیر بن قینؓ نے انکار نہیں کیا کہ میں پہلے عثمانی یعنی ناصبی تھا لیکن انہوں نے اس نادان احمق ناصبی پر واضح کیا کہ تمہیں نظر نہیں آرہا کہ اس وقت میرا موقف کیا ہے؟ میں اب حسین علیہ السلام کے ساتھ ان کے جانثار کی حیثیت سے موجود ہوں چنانچہ اب میرا شمار شیعیانِ آل رسول ﷺ میں ہوتا ہے اس مسکت اور

معقول جواب پر وہ احمق ناصبی مبہوت ہو کر خاموش ہو گیا۔ ایک عرب شاعر نے خوب کہا ہے ع

ویلك یا قاتل الحسین لقد نؤت بحمل ینؤ بالحامل

دینکم جفوۃ النبی وما الجافی لآل النبی کالواصل

ہم موجودہ دور کے ناصبی ملاؤں کو بتانا چاہتے ہیں کہ کوفہ کے لوگوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو خط لکھے تھے وہ شاہ عبد العزیز دہلوی کے بیان کردہ شیعہ اولیٰ میں سے تھے یعنی حضرت علی علیہ السلام کی حمایت میں معاویہ سے عداوت مول لے کر برسر پیکار ہوئے۔ ان میں سے بہت سے حضرت عثمانؓ کے بھی مخالف تھے لیکن اس سے اگلے مرتبہ پر وہ شیعہ نہ تھے نہ ہی امامت کی حقیقی معرفت رکھتے تھے اس طرح کے افراد آٹے میں نمک کے برابر ہی تھے شاید اس سے بھی کم تعداد میں۔ لیکن جب ابن زیاد نے ان کے امراء اور عرفاء کو رشوتیں دیں، ڈرایا دھمکایا، تو ان میں سے اکثر اپنے تشیع سے منحرف ہو گئے اور یزید کی فوج کا حصہ بن گئے وہ امام حسین علیہ السلام کے بالمقابل یزیدی فوج میں شامل تھے چنانچہ اب وہ سب کے سب امراء وعوام عثمانی (ناصبی) ہو گئے جس طرح زہیر بن قین پہلے عثمانی تھا لیکن اب اس کی حسینی فوج میں شمولیت نے اسے علوی یعنی شیعۂ آلِ رسول علیہ السلام بنا دیا۔ یہی معاملہ حر بن یزید تمیمی کا ہے وہ بھی چند لمحے قبل تک عثمانی ناصبی تھا لیکن جب توبہ کر کے امام حسین علیہ السلام کی فوج میں شامل ہو گیا اور آپؑ کی حمایت میں لڑتے ہوئے درجۂ شہادت پر فائز ہوا تو وہ شیعیانِ آل محمد ﷺ میں شامل ہو گیا۔ مؤلف کو حماقت ترک کر کے معقول بات سمجھنی چاہیے لیکن جنہوں نے یزید پلید کے ساتھ ہی جہنم میں جانا ہو وہ کب سیدھی راہ پر آ سکتے ہیں۔ **ھداھم اللہ تعالٰی الی سواء الصراط۔**

حضرت امام حسین علیہ السلام کے جانثاروں میں سے ایک شخص نافعؓ بن ہلال قتال کرتے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے:

﴿انا الجملی انا علی دین علی﴾

(میں قبیلہ بنی جمل سے ہوں اور حضرت علیؑ کے دین پر ہوں)

یزیدی فوج میں سے ایک شخص مزاحم بن حریث ان کی طرف مقابلے کے لیے نکلا اور کہا

﴿انا علی دین عثمان فقال له انت علی دین شیطان ثم حمل علیه فقتله فصاح عمرو بن الحجاج بالناس یا حمقی اتدرون من تقاتلون فرسان المصر قوماً مستمیتین ﴾

''میں عثمانؓ کے دین پر ہوں نافع بن ہلال نے اسے کہا: تو شیطان کے دین پر ہے پھر اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا عمرو بن حجاج نے لوگوں کو پکار کر کہا: اے احمقو! تمہیں پتہ ہے تم کن سے جنگ کر رہے ہو یہ وہ مصری شہسوار ہیں جو موت کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔''

(تاریخ ابن جریر طبری، ج ٦، ص ۲۴۹)

اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یزیدی لشکر میں شامل تمام افراد عثمانی یعنی ناصبی تھے خواہ اس سے چند لمحے قبل وہ شیعیان علیؑ ہونے کے دعویدار ہوں اب انہوں نے اپنا موقف تبدیل کر لیا تھا اور ناصبیت اختیار کر لی تھی۔ یزیدی لشکر میں سے یزید بن معقل میدان میں آیا اور کہا: اے بریر بن حضیر! اللہ نے تیرے ساتھ کیا کیا ہے؟ بریرؓ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم اللہ نے میرے ساتھ اچھا کیا ہے اور تیرے ساتھ برا کیا ہے۔ یزید بن معقل ناصبی نے جواب دیتے ہوئے کہا: ﴿... کذبت و قبل الیوم ما کنت کذابا هل تذکر و انا اما شیك فی بنی لوذان و انت تقول ان عثمان بن عفان کان علی نفسه مسرفا و ان معاویة بن ابی سفیان ضال مضل و ان امام الهدی و الحق علی بن ابی طالب، فقال له بریر اشهد ان هذا رایی و قولی فقال له یزید بن معقل فانی اشهد انك من الضالین فقال له بریر بن حضیر هل لك فلا باهلك و لندع الله ان یلعن الکاذب و ان یقتل المبطل ثم اخرج فلا بارزك قال فخرجا فرفعا ایدهما الی الله یدعو انه ان یلعن الکاذب و ان یقتل المحق المبطل ثم برز کل واحد منهما لصاحبه فاختلفا ضربتین فضرب یزید بن معقل بریر بن حضیر ضربة خفیفة لم تضره شیئا و ضربه بریر بن حضیر ضبرة قدت المغفر و بلغت الدماغ فخر کانما هوی من حالق و ان سیف ابن حضیر لثابت فی راسه﴾

''تو نے جھوٹ کہا ہے حالانکہ پہلے تم جھوٹے نہ تھے کیا تمہیں یاد ہے کہ ہم دونوں بنی

لوذان کے علاقے میں جارہے تھے تم نے یہ کہا تھا کہ عثمان بن عفان نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور معاویہ بن ابی سفیان تو خود گمراہ اور گمراہ کن ہے امام ہدیٰ و برحق علی بن ابی طالب ہیں۔ بریرؓ نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میری رائے یہی ہے یزید بن معقل نے انہیں کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تم گمراہ ہو، بریر بن حضیر نے اسے کہا: تم میرے ساتھ مباہلہ کرتے ہوتا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ کاذب پر لعنت کرے اور باطل پرست کو قتل کرے؟ پھر ہم مبارزہ کریں؟ چنانچہ دونوں نکلے دونوں نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے بلند کیے اور کہا کہ اللہ جھوٹے پر لعنت کرے اور جو حق پر ہے وہ باطل والے کو قتل کردے۔ پھر دونوں نے جنگ شروع کی یزید بن معقل نے بریرؓ بن حضیر پر ایک وار کیا جو ہلکا وار تھا انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا۔ پھر بریرؓ بن حضیر نے ضرب لگائی تو اس کے خود کو توڑ کر تلوار اس کے دماغ میں گھس گئی وہ چکرا کر گرا درانحالیکہ ابن حضیرؓ کی تلوار اس کے سر میں اٹکی ہوئی تھی۔" (ابن جریر طبری، ج ۶، ص ۲۴۷)

اس واقعہ سے بھی فریقین کے مسلک کی نشاندہی ہوتی ہے نیز حق و باطل کا واضح فرق معلوم ہوتا ہے، یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یزیدی لشکر میں شیعہ نہ تھے بلکہ ناصبی عثمانی تھے، اور حسینی گروہ شیعیان آل محمد ﷺ تھے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جب امام حسین علیہ السلام شہید ہو گئے اور واقعۂ کربلا کے منتشر ہونے کے فوراً بعد سرکاری طور پر قتل حسینؓ کی خبر حاکم مدینہ عمرو بن سعید بن العاص تک پہنچی تو اس نے کہا کہ مدینہ کے گلی کوچوں میں اس کا اعلان کر دو، جب یہ اعلان بنو ہاشم نے سنا تو سرکاری قاصد کہتا ہے:

﴿فلم اسمع واللّٰه واعية قط مثل واعية نساء بنی هاشم فی دورهن علی الحسين﴾

"میں نے آج تک ایسا کہرام نہیں سنا تھا، جیسا بنو ہاشم کی عورتوں نے اپنے گھروں کے اندر حسینؓ پر کہرام برپا کیا۔" عمرو بن سعید بن عاص نے ہنس کر خوشی میں ایک شعر پڑھا اور کہا

﴿هذا و اعية بو اعية عثمان بن عفان﴾ ''یہ کہرام عثمان بن عفان کے بدلے میں ہے۔''

(تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۶۸، کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۳۰۰، البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۱۹۶)

ان مستند تاریخی حوالہ جات سے آشکارا ہوا کہ ع

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

فیصلہ کن بات

میدان کربلا میں جب یزید افواج نے امام عالی مقام علیہ السلام اور آپ کے اصحاب و انصار کو گھیرے میں لے لیا تھا تو ساتویں محرم کو ایک قاصد آتا ہے جو ابن زیاد کی طرف سے عمر بن سعد بن ابی وقاص یزیدی کمانڈر کو ایک خط دیتا ہے جس کا مضمون یہ تھا:

﴿اما بعد فحل بين الحسين و اصحابه و بين الماء و لا يذوقوا منه قطرة كما صنع بالتقى الزكى المظلوم عثمان بن عفان رضى الله عنه﴾

حسینؑ، ان کے اصحاب اور پانی کے درمیان حائل ہو جاؤ یہ لوگ ایک قطرہ بھی پانی کا نہ چکھیں جیسا کہ تقی، زکی، مظلوم عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا گیا تھا۔

(تاریخ لابن جریر الطبری ج ۶ ص ۲۳۴ طبع مصر)

حافظ ابن کثیر دمشقی نے بھی بعینہ اسی طرح لکھا ہے:

﴿ان حل بينهم و بين الماء كما فعل بالتقى الزكى المظلوم امير المؤمنين عثمان رضى الله عنه﴾ حسینؑ و اصحاب حسینؑ اور دریا کے درمیان حائل ہو جاؤ جیسا کہ تقی، زکی، مظلوم امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ سلوک کیا گیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۷۵ طبع بیروت، الاخبار الطوال ابو حنیفہ دینوری ص ۲۵۲ طبع مصر)

اسی طرح ابن اثیر نے بھی تاریخ کامل جلد ۳ ص ۲۸۳ طبع مصر میں یہی بتلایا ہے کہ اس حکم میں یہ تھا کہ ﴿و ان يمنعه و من معه الماء﴾ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی روک دو۔

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ نواسۂ رسولؐ کے بے گناہ خون میں ہاتھ رنگین کرنے والے صرف اور صرف وہی لوگ ہیں جو حضرت عثمان کو امیر المومنین، تقی و زکی اور مظلوم

مانئے والے انکے پیروکار تھے۔ ان کی مظلومیت اور بندش آب کا جذبہ انتقام ان کے دلوں میں موجزن تھا۔ اب عہد حاضر کے نواصب کو چاہئے کہ اپنے دام تزویر کو تار تار کر کے اس سے باہر آجائیں اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ تسلیم کرلیں کہ واقعی قاتلان حسینؑ ناصبی ہی تھے۔

لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

یہ امر اظہر من الشمس ہو چکا ہے کہ یزیدی لشکر میں شامل تمام لوگ عثمانی یعنی ناصبی تھے، یہ امر ابھی محتاج وضاحت ہے کہ کیا عثمانی اور ناصبی مترادف الفاظ ہیں؟ اگرچہ قدرے شرح ہو چکی ہے، تاہم بنوامیہ کے زبردست حامی حافظ ابن تیمیہ کے حوالے سے اس کی مزید تشریح کر دی جاتی ہے:

﴿طائفة ناصبة من شيعة عثمان...... و كان الحجاج هو المبير و كان هذا يتشيع لعثمان﴾

شیعہ عثمان یعنی ناصبی گروہ ...... اور حجاج مبیر ہے، یہ بھی شیعہ عثمان تھا۔"

(منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۸۱ طبع بولاق مصر)

عمر بن سعد بن ابی وقاص بھی عثمانی یعنی ناصبی تھا۔ کربلا میں یزیدی لشکر کا سالار تھا۔ ابن تیمیہ حرانی اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿..... فلو ان النواصب فعلو بعمر بن سعد مثل ذالك فمدحوه على قتل الحسين لكونه كان من شيعة عثمان و من المنتصرين له﴾

"اگر نواصب عمر بن سعد کے ساتھ اسی طرح کرتے، چنانچہ اس کے عثمانی ہونے اور حضرت عثمان کی طرف سے انتقام لینے والوں میں سے ہونے کی بناء پر اس کی مدح کرتے "

(منہاج السنہ ج ۱، ص ۱۶۴)

مزید برآں ابن تیمیہ حرانی نے منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۷۸ طبع بولاق مصر میں شیعہ عثمان کا تذکرہ کرتے وقت اس حقیقت سے بھی یوں پردہ اٹھایا ہے:

﴿وقد كان من شيعة عثمان من يسب عليا و يجهر بذالك على المنابر وغيرها﴾ ''جناب عثمان کے شیعہ حضرت علی علیہ السلام کو علانیہ ممبروں پر گالیاں دیتے تھے۔''

نتیجۂ بحث

مندرجہ بالا معقول اور منقول دلائل کی روشنی میں یہ امر کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ میدان کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے مد مقابل یزیدی لشکر عثمانی نواصب پر مشتمل تھا، اہل بیتؑ نبیؐ کی توہین وتذلیل کرنے والے اور واقعہ ہائلہ کربلا کے اصل مجرم ناصبی ہیں۔ ابن کثیر دمشقی جو ابن تیمیہ حرانی کا نہ صرف شاگرد بلکہ ہم عقیدہ ہے اور دیگر مؤرخین کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوگیا ہے کہ بہت سے صحابہؓ کے بیٹے بلکہ عمرو بن حریث مخزومی قریشی جیسے صحابہ اور ان کی اولاد بھی کسی نہ کسی طرح یزیدی لشکر میں شامل تھے مشہور صحابی عمرو بن حریث جو عبید اللہ بن زیاد کی جانب سے پولیس کا سربراہ تھا اور اسی نے اپنی قیادت میں حضرت مسلمؑ بن عقیل کو گرفتار کیا اور عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں پیش کر کے انہیں شہید کرایا۔

یہ امر بھی گزشتہ صفحات میں مذکور ہو چکا ہے کہ یزید پلید نے عبید اللہ بن زیاد کو خط لکھا تھا کہ امام حسین علیہ السلام مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہو چکے ہیں اب تمہاری آزمائش ہے دیکھتے ہیں کہ تم کس طرح اس میں سے سرخرو ہو کر نکلتے ہو، گویا ابن زیاد کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے خلاف کاروائی کے لیے ہر طرح کے اختیارات سونپ دیئے گئے تھے اور ہر طرح کے اقدام کے لیے اس کے ہاتھ کھلے رکھے تھے، اگر یزید امام حسین علیہ السلام کے قتل سے روکتا تو خط میں واضح کر دیتا کہ کچھ بھی صورت ہو امام حسینؑ کو قتل نہیں کرنا، لیکن جس طرح یزید لعین کے باپ معاویہ نے کہہ دیا تھا کہ اگر حسینؑ نے تیرے خلاف خروج کیا تو اللہ اسی طرح اسے بھی سنبھال لے گا جس طرح اس کے باپ کو قتل کیا اور اس کے بھائی کو رسوا کیا، معاویہ کی یہ وصیت اس جانب اشارہ ہے کہ امام حسینؑ کو قتل کرا دینا۔ بلکہ معاویہ نے خود امام حسینؑ کے قتل کا منصوبہ بنا لیا تھا جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کر دیا گیا ہے۔

والیٔ مدینہ ولید بن عتبہ کو مروان بن حکم نے مشورہ دیا تھا کہ امام حسین علیہ السلام کو قتل کرا دیا

جائے، چنانچہ ان عینی شہادتوں سے ظاہر ہوگیا کہ قتل کا منصوبہ نواصب کے سرغنوں نے تیار کیا تھا، اور اس منصوبے کو نافذ کرنے والی فوج کا ہر فرد ناصبی تھا، شیعہ آل محمد ﷺ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، اگر پہلے تھا بھی تو اب امام حسین علیہ السلام کی نصرت سے پسپا ہوکر یزیدی فوج میں شمولیت پر وہ تعلق قطعاً ختم ہو چکا تھا۔

یزید کا خصوصی مشیر مروان ناصبی تھا

یزید پلید اور اس کے باپ کا خصوصی مشیر مروان بن حکم پختہ ناصبی بلکہ نواصب کے سرداروں میں سے ایک تھا، چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلوی لکھتے ہیں کہ:

﴿آری در بخاری روایت از مروان آمده است باوجودیکه او نیز از جمله نواصب بلکه رئیس آن گرده شقاوت پژوه بود﴾

"......ہاں بخاری میں مروان سے روایت آئی ہے، باوجودیکہ وہ نواصب میں سے بلکہ اس بدبخت گروہ کا ایک رئیس تھا۔" (تحفۂ اثنا عشریہ، ص ۹۹، مطبوعہ لکھنؤ)

مسلک دیوبند کے معتوی جد امجد شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب جن کی ہر بات پر اعتماد کرتے ہیں۔ اہل جمل اور اہل شام کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "قرۃ العینین" ص ۲۷۰ مطبوعہ دہلی میں واشگاف الفاظ میں لکھتے ہیں:

﴿و وقوع بغی از معاویه و نصب از مروان بن الحکم﴾

معاویہ سے بغاوت اور مروان بن الحکم سے ناصبیت وقوع پذیر ہوئی ہے۔

مزید تفصیل کے خواہش مند حضرات ہماری کتاب "الہدیۃ السنیہ بجواب تحفۂ اثنا عشریہ" کی طرف رجوع فرمائیں۔

یزید بن معاویہ ناصبی تھا

یزید بن معاویہ اس وقت پورے ملک کا بلاشرکت غیرے مطلق العنان حکمران تھا، امام حسین علیہ السلام نے اسی کی ظالمانہ حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا اسی کے حکم اور رضامندی بلکہ منصوبہ بندی سے حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی اولاد و انصار سمیت شہید کئے گئے۔ حافظ ابن حزم

اندلسی نے بھی اپنی مشہور کتاب ''جمھرۃ انساب العرب'' میں یزید بن معاویہ کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ ﴿و قتل الحسین رضی اللہ عنہ و اھل بیتہ فی اول دولتہ.. ﴾ ''اور یزیدی نے اپنے عہد حکومت کے اوائل میں امام حسینؓ اوران کے اہل بیت کو قتل کیا۔ '' (جمہرۃ انساب العرب، ص۱۱۲، طبع مصر)

شاہ عبد العزیز دہلوی نے بھی واقعۂ کربلا کا سب سے پہلا قاتل و مجرم یزید ملعون کو ہی قرار دیا ہے جیسا کہ تحفہ اثناعشریہ کے ابتدائی صفحات میں لکھتے ہیں:

﴿چوں اشقیائی شام و عراق بگفتہ یزید پلید و تحریص رئیس اھل عناد ابن زیاد امام ھمام را در کربلا شھید ساختند .....﴾

''جب شامی و عراقی اشقیاء نے بحکم یزید پلید اوراہل بغض وفساد کے رئیس ابن زیاد کی تحریص سے حضرت امام حسینؑ کو کربلا میں شہید کیا.....'' (تحفۂ اثناعشریہ، ص۹، مطبع ثمر ہند)

اس عبارت سے یہ امر اظہر من الشمس ہوا کہ قاتلان حسینؑ صرف عراقی ہی نہ تھے بلکہ شامی بھی تھے۔ آپؑ کا اصل قاتل یزید بن معاویہ ہے۔ اسی پر آپؑ کے قتل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آپ لوگ خود ہی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا تھا...... ''اگر ملک میں کسی جگہ کوئی کتا بھی بھوکا پیاسا مر گیا تو قیامت کے دن عمر سے اس کے بارے میں سوال ہوگا'' اس لیے کہ اس کی دیکھ بھال بھی حاکم وقت کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ یہاں تو واضح تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ یزید لعین اس قتل پر نہ صرف راضی تھا بلکہ اس نے حکم دیا تھا کہ یہ کام جلد از جلد کر ڈالو، چنانچہ یزید کو بھی مروان کی طرح ناصبی کہا گیا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

﴿ وکان ناصبیا فظا غلیظاً جلفاً یتناول المسکر و یفعل المنکر ﴾

''یزید ناصبی تھا، انتہائی بدخو، تند مزاج اور گنوار قسم کا شخص تھا۔ شراب پیتا اور برے افعال کا مرتکب ہوتا تھا۔'' (سیر اعلام النبلاء، ج۴، ص۳۷)

بلکہ دار العلوم دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی نے یزید بن معاویہ کو نواصب کا سردار قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿چه یزید اندریں صورت یا فاسق معلن بود، تارك صلٰوة وغیره یا مبتدع بود چه از رؤسای نواصب است﴾

''یزید اس صورت میں یا کھلم کھلا فاسق تھا نماز کا ترک کرنے والا وغیرہ یا بدعت کا مرتکب تھا کیونکہ وہ نواصب کے سرداروں میں سے تھا۔'' (قاسم العلوم ص ۲۲۱، مطبوعہ خیابان پریس لاہور)

بنو امیہ کے حامی اپنے چہیتے امام یزید کے دامن سے قتل امام عالی مقام سیدنا امام حسین علیہ السلام کے خون کے دھبے دھونے کے لیے مسلمانوں کو یہ تاثر دینے کی مذموم کوشش کرتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کو تو ان لوگوں نے قتل کیا جو انہی کے ہمراہ آئے تھے اس میں سپاہِ یزید کا ذرہ بھر بھی تعلق نہ ہے مگر تعصب کی پٹی آنکھوں سے اتار کر انابت کی نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قتل کا اصل محرک و بانی رئیس النواصب یزید بن معاویہ تھا اسی کے حکم سے اس کے پیروکار ناصبیوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہید کر دیا نیز قتل امام حسین علیہ السلام میں یزید کی شرکت اور رضا مندی اس امر سے بھی واضح تر ہو جاتی ہے کہ اس نے اپنے چچازاد بھائی عبید اللہ بن زیاد کو کوئی سزا نہیں دی بلکہ معزول تک نہیں کیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکومت ہی نواصب کی تھی جو بغض آل رسول ﷺ کو اپنا دین قرار دیتے ہیں۔ اگر بقول مؤلف قاتل شیعہ تھے اور نواصب کے امراء کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا تو عبید اللہ بن زیاد اور یزید بن معاویہ بن ابی سفیان نے ان شیعوں کی سرکوبی اور امام حسین علیہ السلام کی مدد کے لیے کوئی فوج کیوں روانہ نہیں کی؟ کیا عوام کی جان، مال، عزت کی حفاظت حکومت وقت کی ذمہ داری نہیں ہوتی؟ مؤلف اگر ان تاریخی حقائق کو جھٹلا بھی دیں تب بھی معقول دلائل سے انکار ممکن نہیں ہے، لیکن معقول دلائل وہی لوگ مانتے ہیں جن کے پاس عقل سلیم ہو۔

عبید اللہ کے باپ زیاد بن ابیہ کی ناصبیت

سرچشمۂ ظلم واستبداد سگِ وادی کفر والحاد عبید اللہ کے باپ زیاد کے بارے میں شاہ عبد العزیز دہلوی رقم طراز ہیں:

﴿حالا شوارت ابن زیاد زنا زاد باید دید که بعد از رفاقت معاویه اول

فعلی که از و صادر شد عداوت اولاد حضرت امیر بود﴾

اب زیاد ولد الزنا کی شرارت ملاحظہ کرنی چاہئے کہ معاویہ کی رفاقت اختیار کرنے کے بعد سب سے پہلا کام جو اس سے صادر ہوا وہ حضرت امیرؑ کی اولاد سے دشمنی تھی۔"

(تحفہ اثنا عشریہ، ص ۴۹۱)

معاویہ کی صحبت و ہمنشینی کے ہی "نیک" اثرات کی بناء پر زیاد نے حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد سے دشمنی کا برملا اظہار کر دیا ان حقائق سے معلوم ہوا کہ صرف یزید ہی ناصبی نہ تھا بلکہ جو شخص بھی اس کے والد بزرگوار کی صحبت میں گیا وہی ناصبی بن گیا۔

علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء، جلد ۳، ص ۴۹۶ پر تحریر کیا ہے کہ زیاد بن ابیہ کوفہ کے لوگوں کو جمع کر کے انہیں حضرت علی علیہ السلام کے خلاف اشتعال دلاتا اور ان سے بیزاری پر برانگیختہ کیا کرتا تھا اسی طرح تاریخ دمشق ابن عساکر، ج ۱۹، ص ۲۰۳ طبع بیروت میں ہے۔

زجر بن قیس کندی ثقہ، بڑے تابعین سے تھا (معاذ اللہ)

یہ وہی ملعون ہے جو کربلا میں یزیدی لشکر کا ایک سردار تھا یہ حضرت ابو بکرؓ کے بہنوئی اشعث بن قیس کا بھائی اور محمد بن اشعث (جو ابن زیاد کا بازوں تھا) کا چچا تھا اس نے ظلم و استبداد کے تیر جہاں تک برسا سکا برسائے۔ ابن زیاد لعین نے سرہائے شہداء اور اہل بیت رسولؐ کے ستم زدہ قافلہ کو اس ظالم کی نگرانی میں کوفہ سے دمشق روانہ کیا جب دمشق میں یزید لعین کے سامنے امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک پیش کیا تو اس نے یزید کی رضا جوئی کیلئے کربلا کا واقعہ اس انداز میں بیان کیا کہ جس سے اہل بیت علیہم السلام کی تحقیر و توہین کا پہلو نمایاں ہوتا تھا انعام حاصل کرنے کیلئے خوشامد کرتے ہوئے یزید سے کہا: ﴿ابشروا یا امیر المؤمنین بفتح اللّٰہ و نصرہ﴾ "فتح و نصرت مبارک ہو" (ملاحظہ ہو: کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۴۳ طبع قاہرہ) لیکن ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ اہل سنت کے ایک انتہا پسند طبقہ کے امام احمد بن حنبل نے اسے ثقہ و معتبر اور بڑے درجے کا تابعی قرار دیا ہے۔ محدث ابن عساکر نے زجر بن قیس کے حالات میں لکھا ہے: ﴿قال صالح بن احمد قال ابی زجر کوفی ثقة من کبار التابعین﴾ کہ امام احمد کے بیٹے صالح نے کہا ہے کہ میرے

باپ امام احمد نے فرمایا کہ زجر کوئی ثقہ وقابلِ وثوق ہے اور بڑے تابعین میں سے ہے۔
(تہذیب ابن عساکر ج ۵ ص ۳۷۳ طبع بیروت)

سوال۔

سیدنا حسینؓ کے قاتل شیعہ ہوں گے۔ **﴿الحسین بن محمد عن محمد بن احمد النهدی عن معاویة بن حکیم عن بعض رجاله عن عنبسة بن بجاد عن ابی عبد الله علیه السلام فی قول الله عزوجل فاما ان کان من اصحاب الیمین فسلام لك من اصحاب الیمین فقال قال رسول الله صلی الله علیه و اله لعلی علیه السلام هم شیعتك فسلم ولدك منهم ان یقتلوهم﴾**

''آنحضرت ﷺ نے حضرت علی المرتضیٰؓ سے فرمایا: اے علی اپنے بیٹوں کو اپنے شیعوں سے بچانا وہ انہیں قتل کردیں گے۔'' (شیعہ مذہب کی معتبر کتاب کافی صفحہ ۲۶۰ جلد نمبر ۸)

آنحضرت ﷺ کی اس پیش گوئی کے بعد جو شخص شیعوں کے علاوہ کسی اور کو قتل حسینؓ کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے وہ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تکذیب کررہا ہے۔

جواب:۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورۂ واقعہ کے اندر اصحاب یمین کے جنتی وبہشتی ہونے کی بار بار بشارت دی ہے جیسا کہ ان کے حق میں فرمایا: **﴿وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ﴾** اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہے تو (اس سے کہا جائے گا) تجھ پر اصحاب یمین کی طرف سے سلام ہو، (سورۂ واقعہ، آیت ۹۰، ۹۱) پیش کردہ روایت کا ترجمہ بالکل غلط کیا گیا ہے اور پوری روایت کا ترجمہ بھی نہیں کیا، سلیم ماضی معلوم باب عَلِمَ یَعْلَمُ ثلاثی مجرد سے ہے اور جس کا معنی اپنے فاعل ''وُلْدُكَ'' اور مفعول ''ان یقتلوهم'' اور متعلق ''منهم'' سے مل کر یہ بنتا ہے کہ ''پس تیری اولاد ان کی طرف سے قتل ہونے سے سلامت ہوگئی، لیجیے ہم پوری روایت کا ترجمہ پیش کیے دیتے ہیں:

''حضرت امام ابی عبد اللہ (جعفر صادق) علیہ السلام سے روایت ہے: قول باری تعالیٰ میں اگر مردہ

اصحاب یمین سے ہے پس سلامتی ہے واسطے اصحاب یمین کے (روز قیامت جن کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامے ہوں گے) حضرت رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: وہ تیرے شیعہ ہیں "فَسَلِمَ" پس تیرے واسطے ان کی طرف سے سلامتی ہے کہ وہ تیرے بچوں کے قاتل نہیں۔"

اس حدیث کی شرح میں علامہ محمد باقر مجلسیؒ لکھتے ہیں: ﴿ای ان کان المتوفی من اصحاب الیمین فسلام لك من اصحاب الیمین قال الشیخ الطوسیؒ ای فتری فیهم ما تحب لهم من السلامة ومن المكاره و الخوف و قیل معناه فسلام لك ایها الانسان الذی هو من اصحاب الیمین من عذاب الله و سلمت علیك ملائكة الله عن قتادة قال الفراء فسلام لك انك من اصحاب الیمین فحذف انك و قیل معناه فسلام لك منهم فی الجنة لانهم یكونون معك و یكون لك بمعنی علیك اقول علی تفسیره و یحتمل ان یكون ذكر خصوص القتل علی سبیل المثال فیكون المعنی حینئذ انه كان المتوفی من اصحاب الیمین فحاله ظاهر فی السعادة لانه كان بحیث سلم اهل بیتك من یده و لسانه و كان معاوناً لهم فافهم علة الجزاء مقامه﴾

"اگر وہ مرنے والا شخص اصحاب یمین سے ہے تو ایسے اصحاب یمین کی طرف سے تو آپ کے لیے سلامتی کا پیغام ہے شیخ طوسیؒ نے فرمایا کہ آپ ان سے متعلق ناپسندیدہ امور اور خوف زدہ کرنے والی باتوں سے سلامتی سے متعلق جو کچھ پسند کرتے ہیں وہ دیکھ لیں گے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اے انسان جو اصحاب یمین میں سے ہے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے سلامتی کا پیغام ہے اور تجھ پر اللہ کے فرشتے سلام کرتے ہیں۔ قتادہ سے مروی ہے کہ فراء نے کہا: ﴿فَسَلَامٌ لَّكَ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ﴾ میں سے "اِنَّكَ" محذوف ہے بقول دیگر اس کا معنی یہ ہے کہ جنت میں ان کی طرف سے آپ کو سلام ہوگا اس لیے کہ وہ آپ کے ساتھ ہوں گے لك بمعنی علیك ہوگا، میں (باقر مجلسی) رسول خدا ﷺ کی تفسیر کے مطابق کہتا ہوں کہ احتمال ہے کہ خاص کر قتل کا ذکر، بطور مثال ہو، اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ اگر مرنے والا اصحاب یمین میں سے ہو تب تو اس کا حال سعادت مندی میں ظاہر ہی ہے اس لیے کہ جب آپ کے اہل بیتؑ اس کے ہاتھ اور زبان سے

محفوظ رہے بلکہ وہ ان کا معاون و مددگار رہا چنانچہ جزاء کی علت کو اس (جزاء) کے مقام پر ذکر کیا گیا۔" (مرأۃ العقول ج ۴ ص ۳۶۳ طبع تہران)

مندرجہ بالا تشریح اور وضاحت سے اصل مفہوم و مطلب پوری طرح واضح ہوگیا ہے لیکن کم فہم کو اپنے آئینہ میں مسخ شدہ مفہوم ہی نظر آتا ہے۔

ثانیاً یہ کہ درج بالا روایت محدثین کے نزدیک ضعیف، منقطع اور مرسل ہے چنانچہ علامہ محمد باقر مجلسیؒ نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے: ﴿**الثالث و السبعون و الثالث مائة مرسل بل ضعيف بالنهدی علی المشهور**﴾ "یہ روایت مرسل بلکہ اس کے راوی محمد بن احمد النہدی کی وجہ سے ضعیف ہے یہی مشہور قول ہے۔" (مرأة العقول للمجلسیؒ، ج ۴، ص ۳۶۳) منقطع اس لیے ہے کہ اس کی سند میں "**عن بعض رجاله**" موجود ہے اور انتہائی ستم یہ ہے کہ سَلِمَ فعل ماضی کو امر کا صیغہ قرار دے کر یہ ترجمہ کیا جائے کہ "اپنے بیٹوں کو ان سے بچاؤ" تو اس سے معاذ اللہ یہ لازم آتا ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحاب الیمین کو قاتل اور دشمن قرار دے رہے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ انہیں جنتی قرار دیتا ہے اس سے تو نبی کریم ﷺ کی تکذیب اور توہین کا پہلو نکلتا ہے جو سراسر کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ اور ان کا رسولؐ تو شیعہ کو اصحاب یمین یعنی جنتی قرار دیں تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ جنتیوں کو ہی قاتلان امام حسین علیہ السلام بھی فرمادیں؟

قاتلانِ حسینؑ کے حامی اور پیروکار کون ہیں؟

علامہ ذہبی عمر بن سعد بن ابی وقاص کے حالات کو مختصر درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿**عمر بن سعد امير السرية الذين قاتلوا الحسين رضی الله عنه ثم قتله المختار..... روی له النسائی.....**﴾

"عمر بن سعد اس فوج کا کمانڈر تھا جنہوں نے حسینؑ سے قتال کیا پھر اسے مختار نے قتل کردیا... امام نسائی نے اس سے روایت لی ہے۔" (سیر اعلام النبلاء ج ۴ ص ۳۴۹، ۳۵۰، طبع جدید بیروت)

ابن حجر عسقلانی اسی امر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿عمر بن سعد بن ابی وقاص الزهری ابو حفص المدنی سکن الکوفة روی عن ابیه و ابی سعید الخدری و عنه ابنه ابراهیم و ابن ابنه ابو بکر بن حفص ابن عمرو ابو اسحاق السبیعی و العیزار بن حریث و یزید بن ابی مریم و قتادة و الزهری و یزید بن ابی حبیب و غیرهم قال العجلی، کان یروی عن ابیه احادیث و روی الناس عنه و هو تابعی ثقة وهو الذی قتل الحسین﴾

''عمر بن سعد بن ابی وقاص زهری ابو حفص مدنی نے کوفے میں سکونت اختیار کی، اس نے اپنے باپ اور ابو سعید خدریؓ سے حدیث روایت کی ہے اس سے اس کے بیٹے ابراہیم اور پوتے ابو بکر بن حفص، ابو اسحاق سبیعی، عیزار بن حریث، یزید بن ابی مریم، قتادہ، زہری اور یزید بن حبیب وغیرھم نے احادیث روایت کی ہیں۔ عجلی نے کہا ہے کہ یہ اپنے باپ سے احادیث روایت کرتا ہے اور دیگر لوگوں نے اس سے روایت لی ہیں، یہ تابعی اور ثقہ ہے، اسی نے امام حسین علیہ السلام کو قتل کیا تھا۔'' (تہذیب التہذیب، ج ۷، ص ۴۵۰، ۴۵۱ طبع حیدر آباد دکن)

یہ عمر بن سعد ایک صحابی رسولؐ سعد بن ابی وقاص کا بیٹا تھا اس کے متعلق امام بخاری اپنی کتاب التاریخ الصغیر ص ۷۵ مطبوعہ الہ آباد میں لکھتے ہیں:

﴿ان الحسین لما نزل کربلاء فاول من طعن فی سرادقه عمر بن سعد﴾

امام حسینؑ جب کربلا میں وارد ہوئے تو عمر بن سعد پہلا شخص تھا جس نے خیموں کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔

مندرجہ بالا توثیقات سے مؤلف کو سمجھ لینا چاہئے کہ قاتلان حسینؑ نواصب تھے اور بعد میں آنے والے نواصب نے انہیں قابل اعتماد سمجھ کر ان سے اپنے دین کی اساسی اور بنیادی روایات و احادیث اخذ کی ہیں۔

ابن حجر عسقلانی نے عبید اللہ بن زیاد کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿عبیداللّٰه بن زیاد بن ابی سفیان روی عنه ابو سبرة ـــ و روی عن سعد بن ابی وقاص و معاویة و معقل بن یسار و ابن امیه اخی بنی جعدة و روی عنه الحسن

البصری و ابو الملیح بن اسامه﴾

"عبید اللہ بن زیاد بن ابی سفیان ... اس سے ابو سبرہ نے روایت لی ہے ۔ اس نے سعد بن ابی وقاص، معاویہ، معقل بن یسار اور بنو جعدہ نے ابن امیہ سے روایت لی ہے، اس سے حسن بصری اور ابو الملیح بن اسامہ نے روایت لی ہے۔"

(تعجیل المنفعۃ بزوائد رجال الائمۃ الاربعۃ، ص ۱۸۰ طبع مدینہ منورہ)

اگر ان روایت لینے والوں کو قاتلان حسینؑ سے نفرت ہوتی تو وہ ان سے اپنے دین کی اساسی روایات کیوں اخذ کرتے، معلوم ہوتا ہے کہ ان سے روایت لینے والے بھی قاتلان حسینؑ کے ہم مشرب ہیں ورنہ اتنے گھناؤنے جرم کے مرتکب افراد کو منہ لگانا ہی کسی محبّ آل رسول علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے ناگوار ہوتا ہے۔

امام حسینؑ کو خطوط لکھنے والوں میں شبث بن ربعی تمیمی بھی تھا

مؤلف نے اپنے خطبات کے ص ۳۳۹ پر ناسخ التواریخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "کوفہ کے شیعوں نے امام حسین علیہ السلام کو خط لکھ کر کوفہ آنے کی دعوت دی ان میں سے ایک شبث بن ربعی بھی تھا۔

اس بات پر اتفاق ہے کہ شبث بن ربعی تمیمی بھی ان لوگوں میں سے تھا کہ جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کو دعوتِ کوفہ کے لیے خطوط لکھے جیسا کہ تاریخ طبری جلد ۵ ص ۳۵۳، تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۵۳۴ اور الاخبار الطوال ص ۲۲۹ میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ مگر یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل تشیع نے اس سے نہ کوئی روایت اخذ کی اور نہ ہی اس کی مدح سرائی کی ہے لیکن اس کے برعکس مؤلف کے اکابر نے نہ صرف اس کی مدح و توثیق کی ہے بلکہ اسے معتبر اور قابل وثوق سمجھ کر روایات بھی قبول کر کے اپنے مذہب کی اساس و بنیاد استوار کی ہے چنانچہ شبث بن ربعی کو تمیمی کے مختصر حالات بیان کرتے ہوئے علامہ ذہبی نے لکھا ہے:

﴿کان ممن خرج علی علی و أنکر علیه التحکیم ثم تاب و اناب، و حدث عن علی و حذیفة و عنه محمد بن کعب القرظی و سلیمان التیمی له حدیث واحد فی سنن ابی داؤد ..... قلت کان سید تمیم هو والاحنف﴾

یہ وہی شخص ہے جس نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف خروج کیا، اور تحکیم کا انکار کیا، پھر توبہ کرلی اس نے حضرت علیؑ اور حضرت حذیفہؓ سے حدیث روایت کی ہے، اس سے محمد بن کعب قرظی اور سلیمان تیمی نے روایت لی ہے، سنن ابی داؤد میں اس سے مروی ایک حدیث ہے ذہبی کہتے ہیں کہ "یہ تمیم کا سردار تھا اور احنف بھی تمیم کا سردار تھا۔" (سیر اعلام النبلاء ج ۴ ص ۱۵۰)

ابن حجر عسقلانی نے بھی اس کے تفصیلی حالات بیان کیے ہیں لکھتے ہیں:

﴿ .. و قال الدار قطني يقال انه كان موذن سجاح ثم اسلم بعد ذالك و ذكره ابن حبان في الثقات و قال يخطى اخرجاله سوال فاطمة خادماً قلت و قال العجلى كانَ اول من اعان على قتل الحسين... كان من اصحاب على ثم صار مع الخوارج ثم تاب و رجع ثم حضر قتل الحسين﴾

"دارقطنی نے کہا ہے! کہا جاتا ہے کہ یہ سجاح (مدعیہ نبوت) کا مؤذن تھا پھر اسلام لے آیا، ابن حبان نے اسے ثقات میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ کبھی کبھار یہ خطا بھی کرتا ہے بخاری و مسلم نے اس سے فاطمہؑ کے خادم مانگنے کی حدیث روایت کی ہے، میں کہتا ہوں! عجلی نے کہا ہے کہ یہ ایسا شخص ہے جس نے سب سے پہلے قتل عثمان میں مدد کی پھر حسینؑ کے قتل میں شریک ہوا .. یہ (معاویہ کے مقابلے میں) حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھا، پھر خوارج میں شامل ہوا (بلکہ پہلا حروری تھا) پھر توبہ اور رجوع کیا بعد میں امام حسینؑ کے قتل میں شریک ہوا۔"

(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۰۳ طبع دکن، الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۲ ص ۱۶۳ طبع مصر)

ارباب انصاف غور فرمایئے کہ اس ناصبی اور خارجی کے بارے میں کوئی صاحب عقل انسان باور کرسکتا ہے کہ یہ شیعیان آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے تھا۔ ہاں مؤلف اپنی بے عقلی سے جو چاہیں کریں۔ چونکہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایں کاریست کہ موقوف ہدایت باشد، بقول مولانا حسرت موہانی ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یہ شبث بن ربعی تو آپ کی صحیح ترین کتابوں میں سے ''سنن ابی داؤد'' اور ''سنن نسائی'' کے راویوں میں سے ہے، اسے ثقات میں شمار کیا جاتا ہے، اب کوئی احمق ہی کہہ سکتا ہے کہ یہ شخص شیعہ تھا، یہ تو کسی بھی وقت شیعہ نہ تھا۔ یہ فتنہ جو اور مفسد شخص شروع سے ہی ہر فتنے میں پیش پیش رہا ہے۔ ارباب تاریخ نے لکھا ہے کہ اس نے بھی حضرت امام عالیمقام علیہ السلام کے سفیر جناب مسلم بن عقیلؑ کو بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کیا۔ (تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۱۵) شہادت امامؑ کے بعد اس لعین نے قتل حسینؑ کی خوشی میں کوفہ کے اندر بہت بڑی مسجد بنوائی لیکن ابو داؤد اور نسائی کے نزدیک ثقہ راوی ہے، بتائیں قاتلان حسینؑ کو ثقہ سمجھنے والے قاتلان حسینؑ کے حامی اور پیروکار ہیں یا ان سے نفرت کرنے والے؟ یہی آپ کے اسلاف تھے جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کو دھوکے سے بلا کر قتل کر دیا، پھر اب آپ ان کے روایت کردہ دین کی روشنی میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور حسینیوں کے خلاف زہر کے تیر و سنان چلا رہے ہیں، تمہارے اسلاف نے امام حسین علیہ السلام کو قتل کیا تم حسینیوں کو قتل کر رہے ہو، اس وقت بھی تمہارے اسلاف کے مشیر یہود تھے اب تمہارے ہدایتکار بھی خفیہ طور پر یہود ہی ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ ایک فیصلہ کن اور اٹل حقیقت ہے کہ ع

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسینؑ کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

امام حسینؑ کو کوفہ بلانے والے صحابہؓ اور دیگر اہم شخصیات

مؤلف نے اس باب میں ایک عنوان ''کن کن اہم شیعوں نے امام حسینؓ کو کوفہ بلوا کر بھی پھر ان کے شہید کرنے میں حصہ لیا؟'' کی سرخی سے قائم کیا ہے، اسی ضمن میں مؤلف لکھتا ہے:

''کتب شیعہ کے مطالعہ سے اس لشکر میں اہم اہم جو لوگ نظر آتے ہیں ان میں پہلا شخص سلیمان بن صرد خزاعی ہے جس کے گھر پر حضرت حسینؓ کو کوفہ بلوانے کا مشورہ ہوا تھا اور آپ کو خطوط بھیجے گئے تھے، اس کے ساتھ مسیتب بن نجبہ بھی تھا۔ یہ عمر بن سعد کے ہمراہ کربلا گئے۔''

(خطبات جیل ص ۳۵۲، ۳۵۳)

الجواب:۔ مؤلف نے اپنی روایتی بددیانتی سے کام لیتے ہوئے اس مقام پر صریح جھوٹ او

فریب کے ساتھ یہ ظاہر کرنے کی مکروہ کوشش کی ہے کہ سلیمانؓ بن صرد اور مسیب بن نجبہ نے امام حسین علیہ السلام کو خط لکھ کر بلوایا پھر کربلا میں یزید کی فوج میں شامل ہو کر امام حسین علیہ السلام کے خلاف قتال کیا۔ حالانکہ یہ قطعاً جھوٹ اور بہتان ہے **سبحانك هذا بهتان عظيم۔**

سلیمان بن صرد الخزاعی الکوفی الصحابیؓ کی صحابیت مسلّم ہے

شاید ہمارے مخاطب نے شیعہ یا سنی فریقین کی کتب میں سے کسی بنیادی کتب کا مطالعہ کیا ہی نہیں ہے، بس اپنے بزرگ ملا لکھنوی مراد آبادی اور لدھیانوی وغیرہ کی جھوٹ سے مملو کتابوں کو دیکھا ہے اور ان ہی کو سب کچھ سمجھ کر گہرے مطالعہ کا دعویٰ شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اس فریب خوردہ ملاں کے جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لیے ہم چند اہم مأخذ سے ان اصحاب کے حالات بیان کرتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کو کوفہ سے خطوط لکھنے والوں میں سرفہرست سلیمان بن صرد الخزاعی ہیں جو بالاتفاق صحابی رسولؐ ہیں اور کتب صحاح ستہ میں ان سے احادیث بھی مروی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: **الجمع بين رجال الصحيحين** ، جلد ا، ص ۱۷۶، طبع دکن) ان کے علاوہ المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۷، ص ۹۸، ۹۹، طبع بغداد میں بھی ان سے مروی احادیث پائی جاتی ہیں۔

﴿**سليمان بن صرد الخزاعي ابو مطرف الكوفي له صحبة و رواية عن النبي صلى الله عليه وسلم**﴾ سلیمان بن صرد خزاعی کو صحبت رسول کا شرف حاصل ہے اور انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احادیث بھی روایت کی ہیں۔

(العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین، ج ۴، ص ۶۰۷، طبع قاہرہ)

امام یافعی یمنی مکی نے لکھا ہے: ﴿**وكان لسليمان صحبة و رواية رضي الله عنه**﴾ سلیمانؓ صحابی رسولؐ تھے ان سے احادیث بھی نقل ہیں۔

(مراۃ الجنان، ج ا، ص ۱۴۱، طبع حیدر آباد دکن)

علامہ شمس الدین ذہبی سلیمان بن صرد کے بارے میں لکھتے ہیں:

﴿**سليمان بن صرد الامير ابو مطرف الخزاعي الكوفي الصحابي له رواية يسيرة**﴾ سلیمان بن صرد امیر ابو مطرف خزاعی کوفی صحابی رسولؐ ہیں۔ ان سے روایات بھی مروی ہیں۔

﴿.... قال ابن عبد البر، كان ممن كاتب الحسين ليبايعه فلما عجز عن نصره ندم و حارب، قلت .... كان دينا عابداً خرج في جيش تابوا الى الله من خذلاتهم الحسين الشهيد و ساروا للطلب بدمه و سمو اجيش التوابين﴾

''ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ وہ (سلیمان) امام حسین علیہ السلام کو خط لکھنے والوں میں سے تھے تاکہ ان سے بیعت کریں، جب ان کی نصرت سے بے بس ہو گئے تو پشیمان ہوئے اور پھر جنگ کی، میں (ذہبی) کہتا ہوں کہ آپ دیندار، عابد اور زاہد تھے، اس فوج کے ساتھ نکلے جنہوں نے امام حسینؑ کی مدد نہ کرنے کے گناہ سے توبہ کی چنانچہ آپؑ کے خون کا انتقام لینے کیلئے خروج کیا۔ تو ان کا نام ''لشکر توابین'' پڑ گیا۔'' (سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۳۹۴، ۳۹۵ طبع بیروت)

مسیّب بن نجبہ بھی لشکر توابین میں سلیمان بن صرد خزاعی صحابی کے ہمراہ تھا یہ لشکر یزید میں ہرگز شامل نہیں ہوئے لیکن اپنے وعدے کے مطابق امام حسین علیہ السلام کی مدد نہ کر سکے، اس گناہ پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے توبہ کر لی اور قاتلان حسینؑ کے خلاف قیام کیا، جب یہ عبید اللہ بن زیاد سے جنگ کے لیے نکلے تو سلیمانؓ نے جو بیان دیا وہ اس طرح ہے: ﴿حض سليمان على الجهاد و سار في الوف لحرب عبيد الله بن زياد و قال ان قتلت فاميركم المسيب بن نجبة﴾

''سلیمان نے جہاد کی ترغیب دی ہزاروں کا لشکر لے کر عبید اللہ سے لڑنے کیلئے نکلے اور سلیمان نے کہا: اگر میں قتل ہو جاؤں تو تمہارا امیر مسیب بن نجبہ ہوگا۔'' (سیر اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۳۹۵)

اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ لابن اثیر اور الاصابہ لابن حجر کے علاوہ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب میں بھی سلیمان بن صرد خزاعی کے حالات بیان کئے گئے ہیں، ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

﴿.... و كان رضى الله عنه خيراً فاضلاً له دين و عبادة كان اسمه في الجاهلية يساراً فسماه رسول الله صلى الله عليه وسلم سليمان، .... و كان فيمن كتب الى الحسين بن على رضى الله عنهما ليسئله، القدوم الى الكوفة فلما قدمها ترك القتال معه فلما قتل الحسينؓ ندم هو و المسيب بن نجبة الفزاري و جميع من خذ له اذ لم يقاتل معه. ....﴾

"سلیمان بن صرد بہتر اور برگزیدہ دین دار اور عبادت گزار تھے۔ آپ کا نام زمانہ جاہلیت میں یسار تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلیمان رکھا۔ یہ ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے حسین بن علیؓ کو کوفہ آنے کی درخواست پر مشتمل خطوط لکھے تھے جب آپ ﷺ پہنچے تو انہوں نے آپؓ کے ساتھ ہو کر قتال نہ کیا جب حسین قتل ہو گئے تو سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ فزاری اور وہ سب لوگ نادم ہوئے جنہوں نے امام حسینؓ کی مدد نہ کی تھی اور آپ کے ساتھ ہو کر قتال نہ کیا تھا۔" (استیعاب بر حاشیہ الاصابہ ج ۲ ص ۶۳، ۶۴، مطبوعہ مطبعۃ السعادہ، مصر)

مذکورہ بالا عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ لوگ یزید لعین کے لشکر میں شامل نہیں ہوئے تھے لیکن ان کے خیال میں ان کا یہ جرم بھی بہت بڑا تھا کہ امام حسینؓ کو دعوت دے کر پھر ان کا ساتھ نہیں دے سکے۔

ابن کثیر دمشقی نے سلیمانؓ بن صرد کا متعدد مقامات پر تذکرہ کیا ہے چنانچہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

﴿فاجتمعوا فی دار سلیمان بن صرد وھو صحابی جلیل﴾

"سب لوگ (توابین) سلیمان بن صرد کے گھر جمع ہوئے، آپ جلیل القدر صحابی تھے۔"

(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۴۷)

ابن کثیر نے چند سطور بعد مسیب بن نجبہ کا خطبہ نقل کیا ہے جو اسی اجتماع میں دیا گیا تھا، اس خطبے میں مذکور الفاظ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ان توابین نے یزید پلید کے لشکر میں ہرگز شمولیت نہیں کی، بلکہ ان کی غلطی یہ تھی کہ امام حسینؓ کو بلا کر پھر نصرت نہیں کر سکے، الفاظ یہ ہیں:

﴿و قد ابتلانا اللّٰہ فوجدنا کاذبین فی نصرۃ ابن بنت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعد ان کتبنا الیہ و راسلناہ فاتانا طمعاً فی نصرتنا ایاہ فخذ لناہ و اخلفناہ و اتینا بہ الی من قتلہ و قتل اولادہ و ذریتہ و قرابتہ الاخیار.....﴾

اللہ تعالیٰ نے ہمیں آزمایا، پس ہم رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کے بیٹے کی نصرت کے سلسلے میں جھوٹے ثابت ہوئے۔ بعد اس کے کہ ہم نے انہیں لکھا اور ان سے مراسلت کی، وہ ہماری

نصرت پر امید کر کے تشریف لائے لیکن ہم نے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا، ان سے وعدہ خلافی کی، جنہوں نے انہیں اور ان کی اولاد کو قتل کیا، ہم نے انہیں ان قاتلوں کے سپرد کر دیا۔

اسی کتاب کے صفحہ ۲۵۵ پر اس سے بڑھ کر تحریر کرتے ہیں:

﴿وقد كان سليمان بن صرد الخزاعي صحابياً جليلاً نبيلاً عابداً زاهداً روى عن النبي صلى الله عليه وسلم احاديث في الصحيحين وغيرهما و شهد مع على الصفين﴾ ''حضرت سلیمان بن صرد خزاعیؓ ایک جلیل القدر، صاحب فضل و کمال اور عابد و زاہد صحابی تھے انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں نقل کی ہیں جو بخاری و مسلم وغیرہ کتب میں مذکور ہیں انہوں نے حضرت علیؓ کی معیت میں جنگ صفین لڑی ہے۔''

درج بالا کتب کے علاوہ حسب ذیل محدثین اور مؤرخین نے بھی سلیمان بن صردؓ کو صحابہؓ کی فہرست میں شمار کیا ہے:

(۱) کتاب المحبر، ص ۲۹۱، از شیخ محمد بن حبیب البغدادی، طبع حیدر آباد دکن۔

(۲) تاریخ بغداد، ج ۱، ص ۲۰۰، ۲۰۱، از ابوبکر خطیب البغدادی، طبع مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ۔

(۳) تقریب التہذیب، ص ۱۵۷، از ابن حجر عسقلانی، طبع فاروقی واقع دہلی۔

(۴) تجرید اسماء الصحابہ، ج ۱، ص ۲۵۵، از شمس الدین الذہبی، طبع حیدر آباد دکن۔

(۵) جمھرۃ انساب العرب، ص ۲۳۸، از ابن حزم اندلسی، طبع دار المعارف، مصر۔

(۶) الطبقات الکبریٰ، ج ۴، قسم ثانی، ص ۳۰، از محمد بن سعد طبع لیدن۔

(۷) الکاشف، ج ۱، ص ۳۱۶، نمبر ۲۱۲۲، شمس الدین الذہبی، طبع دار الباز مکہ المکرمہ۔

(۸) کتاب الجرح و التعدیل، ج ۴، ص ۱۲۳، نمبر ۵۳۶، از امام ابو حاتم رازی، طبع حیدر آباد دکن۔

(۹) خلاصہ تذھیب الکمال، ج ۱، ص ۴۱۴، نمبر ۲۷۰۷، از حافظ صفی الدین الخزرجی، طبع مکتبہ القاہرہ مصر۔

(۱۰) العبر فی خبر، ج ۱، ص ۵۳، از شمس الدین الذہبی، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت۔

(۱۱) الجمع بین رجال الصحیحین، ج ۱، ص ۱۷۶، نمبر ۶۷۳، از حافظ محمد بن طاہر المقدسی، طبع حیدر آباد دکن۔

(۱۲) تقعیب التقریب بر حاشیہ تقریب، ص ۱۵۷، از امیر علی بلہوری، مترجم الذرر المختار، طبع نولکشور۔

(۱۳) صحیح بخاری، جلد اول، ص ۸۶/۳۹، بر حاشیہ از مولانا احمد علی محدث سہارنپوری میں لکھا ہے ﴿تکلم سلیمان بن صرد الصحابی فی اذانه﴾ کہ "حضرت سلیمانؓ بن صرد صحابی نے اذان میں کلام کیا۔"

وغیرهم من الکتب الکثیره۔

شبث بن ربعی اور چند ایک دیگر ایسے بھی تھے جنہوں نے خطوط لکھے لیکن اب اپنے خبث باطن کو ظاہر کر کے مکمل طور پر ناصبی بن گئے، اس سے قبل بھی ان کا کردار متزلزل رہا، اور فتنہ پردازی میں پیش پیش رہے۔

بے شک کوفہ جیسے بڑے شہر میں گنتی کے چند شیعہ بھی تھے لیکن ان شیعیان کوفہ نے تو سر فروشی کا جو مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی خاص کوفہ میں ہانی بن عروہؓ، محمد بن کثیرؓ، قیس بن مصرؓ، عبد الاعلی الکلبیؓ، عمارۃ بن صلخبؓ ازدی نے جانیں قربان کر دیں۔ اسی طرح رشید ہجریؓ اور میثم تمارؓ کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے داخلہ عراق سے دس دن پہلے کوفہ میں بڑی بے دردی سے شہید کیا گیا۔ جناب مختار ثقفیؓ اور عبد اللہؓ بن حارث کو پابند سلاسل کر کے مقید کر دیا گیا۔ مگر باوجود اس ظلم و تشدد کے چند نفوس قدسیہ راستوں کی ناکہ بندی کو توڑ کر نہ معلوم کس طرح ایک ایک کر کے امام حسین علیہ السلام سے جا ملے اور حسب وعدہ اپنی جانیں فرزند رسولؐ پر نچھاور کر دیں۔ ان گنتی کے شیعیان کوفہ میں سے جو امام عالی مقام علیہ السلام کے ہمراہ عاشورہ کے دن درجۂ شہادت پر فائز ہوئے یہ حضرات تھے: حبیب ابن مظاہر اسدیؓ، عابس بن ابی شبیبؓ، سعید بن عبد اللہؓ، عبد الرحمٰن بن عبد اللہؓ، ابو ثمامہ صیداویؓ، مسلم بن عوسجہؓ، بریر ہمدانیؓ، نافع بن ہلالؓ، عبد اللہ عمیر بن کلبیؓ، طرماح بن عدی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، یہی کوفہ کے وہ شیعہ تھے جن کی وفاداری پر امام

حسین علیہ السلام نے فخر فرمایا ہے۔

ہاں سلیمانؓ بن صرد صحابی رسولؐ، میتب بن نجبہ اور رفاعہ بن شداد خود کو کسی طرح بھی امام عالی مقام کی خدمت میں نہ پہنچا سکے اور نہ معلوم کیونکر پوشیدہ رہ کر ابن زیاد ملعون کے ظلم سے محفوظ رہے مگر تاریخی حیثیت سے ان محبان اہل بیتؑ کا بچ جانا بہت زیادہ مفید ہوا۔ آج بھی جناب مختار ثقفیؒ کے کارنامے اور مقام ''عین الوردۃ'' کی جنگ ان کے خلوص اور نیتوں کا پتہ دے رہی ہے۔

درحقیقت یہی شیعیان کوفہ تھے جن کا تذکرہ کیا گیا اور جن کی وفاداریاں تاریخ اسلام کے صفحات میں جلی حروف میں رقم ہیں۔ وہ کوفی اور ہیں جو اپنی بے وفائی میں ضرب المثل ہیں۔

خلاصۂ کلام:۔

مندرجہ بالا ناقابل تردید حقائق وتحقیقات سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے قاتل تمام تر نواصب تھے اور آج تک نواصب ان قاتلوں کے دین اور ان کی دینی روایات پر اعتماد کرتے چلے آرہے ہیں انہی میں سے ہمارا مخاطب مؤلف اور اس کی جماعت ہے، یہی لوگ شہداء کربلا پر آنسو بہانے اور ان کی یاد تازہ کرنے سے منع کرتے ہیں بلکہ شہداءِ کربلا سے ہمدردی رکھنے والوں کو بے دردی سے قتل کرتے ہیں۔ یہ روسیاہ نواصب ہیں جن کے چہروں کی طرح دل بھی کالے ہیں۔ نام صحابہؓ کا لیتے ہیں لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام کے حامی صحابیوں کی مذمت کرتے ہیں جبکہ یزید لعین اور ابن زیاد ملعون کے حامی عمرو بن حریث مخزومی جیسے صحابیوں کی مدح کرتے ہیں یہی نواصب ہیں جو آج بھی انصار حسینؑ کے دشمن ہیں ؎

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اللّٰهم العن قتلة الحسين و اصحابه رضوان الله تعالى عليهم

و الحمد لله على وضوح الحق و بطلان الباطل و زهوقه

باب ۱۳

فتنۂ تکفیر اور اُس کا مدلل جواب

مؤلف نے ''شیعہ کے بارے میں پہلے اکابرین اسلام کے فتاویٰ جات'' کے عنوان کے ذیل میں چند عبارات نقل کی ہیں جن کا ہم بالترتیب جواب رقم کر رہے ہیں ؏

تکفیر کی بدبو سے تعفن ہے فضا میں
سنڈاس سے بدتر ہے خرافات کا دھارا

﴿۱﴾

مؤلف یوں رقم طراز ہیں کہ:

''رسول اللہ ﷺ کا فتویٰ: جب تم دیکھو کہ لوگ میرے اصحاب کو برا کہہ رہے ہیں تو تم فوراً کہو کہ اللہ کی لعنت ہو تمہارے اس شر پر۔ (رواہ الترمذی) (بینات بنوری ٹاؤن کراچی)

الجواب:۔ اس سلسلہ میں چند حقائق پیش کیے جاتے ہیں تا کہ مؤلف کی دجل و فریب کا پردہ چاک اور اصل حقیقت بے نقاب ہو جائے سب سے پہلے جو ترمذی کے حوالے سے حدیث درج کی گئی ہے اس کے نقل کرنے میں مؤلف نے حسب عادت یہاں بھی خیانت مجرمانہ کا ارتکاب کیا ہے اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں یا تو اس نے اصل ترمذی کو دیکھنے کی تکلیف گوارا کرنا مناسب نہیں سمجھا یہی وجہ ہے کہ اس کا حوالہ دیتے وقت صفحہ نمبر نہیں لکھا گیا یا اگر کتاب کو دیکھا ہے تو بد دیانتی کا مظاہرہ کیا ہے حالانکہ ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں اپنی رائے کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ:

﴿ھذا حدیث منکر﴾

''یہ حدیث منکر ہے۔''

(دیکھئے: سنن ترمذی، ج ۲، صفحہ ۲۲۹، مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند)

ارباب انصاف بتایئے! کیا یہ کھلم کھلا دھوکہ دہی اور فریب کاری نہیں ہے؟ مزید برآں اس حدیث کا ایک راوی ''سیف بن عمر ہے'' علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اس کے بارے میں گزشتہ علماء جرح وتعدیل کی آراء اس طرح نقل کی ہیں:

﴿قال ابو داؤد لیس بشی۔ قال ابن حبان اتهم بالزندقة و قال ابن عدی عامة حدیثه منكر...... و كان سیف یضع الحدیث...... ﴾

ابو داؤد نے کہا کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے ابن حبان نے کہا: اسے زندیق کہا گیا ہے ابن عدی نے کہا اس کی عام حدیثیں منکر ہوتی ہیں سیف بن عمر حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال، ج ۲، صفحہ ۲۵۵ تا ۲۵۶ طبع مصر۔

ثانیاً: یہ ہے کہ اس روایت میں لفظ ''اصحاب'' سے مراد اہل بیت ﷺ ہیں نہ کہ عام مسلمان اس لیے کہ سب سے پہلے حضرت علی علیہ السلام اور دیگر اہل بیت علیہم السلام کو برسر منابر برا کہیں اور سب وشتم کی قبیح رسم معاویہ بن ابی سفیان نے جاری کی تھی۔

﴿ ۲ ﴾

حضرت علیؓ کا فتویٰ: اگر میں اپنے شیعوں کو جانچوں تو یہ زبانی دعویٰ کرنے والے اور باتیں بنانے والے نکلیں گے اور اگر ان کا امتحان لوں تو یہ سب مرتد نکلیں گے۔

(روضہ کلینی ۱۰۷ بحوالہ احسن الفتاوی جلد اول صفحہ ۸۴)

<u>الجواب</u>:۔ مؤلف اور اس کے مقتداء رشید احمد لدھیانوی کی انتہائی خیانت ہے کہ شیخ کلینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الروضہ کی روایت انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کی طرف منسوب کر دی ہے جو سراسر غلط ہے جبکہ محولہ بالا روایت ساتویں تاجدار ولایت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے علاوہ بریں مؤلف نے روایت نقل کرنے میں خیانت کی ہے بعد والی مندرجہ ذیل عبارت کو حذف کر دیا ہے کہ:

﴿فقالوا نحن شیعة علی انما شیعة من صدق قوله فعله ﴾

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم علیؑ کے شیعہ ہیں علیؑ کا شیعہ تو وہ ہے جس کا عمل اس کے قول کی

تصدیق کرے۔

اس روایت میں حقیقی شیعہ کی مدح وثنا فرمائی گئی ہے اور ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو دراصل شیعہ نہ تھے بلکہ شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتے اور اپنے آپ کو شیعوں کی طرف منسوب کرتے تھے یہ آدھے تیتر آدھے بٹیر تھے مخلص شیعہ کی تعداد اقل قلیل تھی اور اللہ تعالیٰ نے بھی بعض صحابہ کو یہی فرمایا تھا: ﴿لم تقولون مالا تفعلون﴾ اس کی تفسیر شبیر احمد عثانی کے حوالے سے پہلے گزر چکی ہے وہاں مراجعت کرلیں تاکہ مزید تسلی ہوجائے۔

﴿ ۳ ﴾

شعبی (تابعی) کا فتویٰ: میں تمہیں خواہشات کے غلام اور گمراہ رافضیوں سے اور ان کے شر سے بچنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ یہ مسلمانوں سے نفرت وبغض رکھتے ہیں۔

الجواب:۔ اموی حکومت میں شعبی (عامر بن شراحیل) اعلیٰ عہدوں پر مامور ہوتا رہا مشہور سفاک زمانہ اور بدترین دشمن اہل بیتؑ حجاج بن یوسف اس کو بہت چاہتا تھا اس لیے اپنے دور حکومت میں اس کو بہت آگے بڑھایا اور اس کے وظیفہ میں مزید اضافہ کردیا حجاج کی طرف سے جو سرکاری وفد اموی حکمران عبد الملک کے پاس بھیجا جاتا اس کی سربراہی شعبی ہی کیا کرتا تھا۔ اموی و عباسی حکمران، اہل بیتؑ اور ان کے شیعوں کے شدید مخالف تھے ظاہر ہے ان حکمران اور ان کے حامی شیعہ کے خلاف فتوے دیا کرتے تھے تاکہ لوگ ان کے نزدیک نہ آئیں اور ان سے متنفر ہوجائیں بنو امیہ کی جزوی حکومت کے سبب ناصبیت کا مرض عام تھا شعبی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا محقق شیخ محمد حسین کاشف الغطا اس کے متعلق اپنی رائے کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

﴿ان الشعبی کان ممن یتهم ببغض علی علیه السلام﴾

شعبی حضرت علی علیہ السلام کے دشمن کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔

(اصل الشیعہ واصولہا ص ۵۷ طبع عراق)

شعبی میں بغض علیؑ اس قدر انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ ایک تابعی حارث بن عبد اللہ الہمدانی کی تکذیب محض اس وجہ سے کرتا کہ وہ علیؑ کی محبت میں انتہا پسند ہے اور دوسروں سے علیؑ کو افضل قرار

دیتا ہے۔

(جامع بیان العلم وفضلہ ج ۲ ص ۱۸۹ طبع بیروت، تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۴۷ طبع دکن)

البتہ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شعبی بسا اوقات تقیہ کر لیا کرتا تھا چنانچہ تیسرا قول جو شعبی کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ تقیہ پر مبنی ہے کیونکہ یہ بنی امیہ اور عباسی حکمرانوں کے ظلم و بربریت کے شدید ادوار سے گزرے ہیں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تقیہ میں ہی گزرا ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے شعبی کے بارے میں لکھا ہے: ﴿**کان الشعبی یری التقیة**﴾

شعبی تقیہ کیا کرتا تھا۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۴ صفحہ ۳۳۸ طبع بیروت)

اگر شعبی شیعہ کی مذمت میں یہ بات نہ کہتا تو حجاج بن یوسف جو مشہور ناصبی تھا اسے قتل کروا دیتا چونکہ ان کی اکثر زندگی حجاج کے عہد میں گزری ہے لہٰذا اپنی جان و مال کی حفاظت کے پیش نظر اسے تقیہ ہی کرنا پڑتا تھا شعبی تابعی کے اس عمل سے عیاں ہوا کہ ان حالات میں تقیہ کرنا عین شریعت کے مطابق ہے **وما ذا بعد الحق الا الضلال**۔

شیخ الفرقۃ المحققہ حضرت علامہ شیخ مفید اعلی اللہ مقامہ نے شعبی کے متعلق واشگاف الفاظ میں لکھا ہے: ﴿**ان الشعبی کان مشهوراً بالنصب لعلی ولشیعته و ذریته و کان معروفاً بالکذب سکیراً خمیراً مقامراً عیاراً و کان معلماً لولد عبد الملك بن مروان و سمراً للحجاج.....**﴾ ''شعبی جو حضرت علی، ان کی اولاد اطہار اور ان کے شیعوں کی دشمنی میں شہرت یافتہ تھا جھوٹ بولنے میں مشہور، نشہ کرنے والا، شراب پینے والا اور قمار باز تھا اور بنی امیہ کے حکمران عبد الملک بن مروان اموی کے بچوں کا استاد اور حجاج بن یوسف کا ہمراز تھا.....''

(الفصول المختارہ ص ۷۰ طبع بغداد)

اس نے ائمہ اہل بیت ﷺ کا زمانہ پایا ہے لیکن یہ اتنا پختہ ناصبی تھا کہ تاریخ شاہد ہے اس نے کسی امام سے حدیث یا کوئی واقعہ نقل نہیں کیا بلکہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان ائمہ میں سے ان کے کسی شاگرد سے بھی حدیث لینا گوارا تک نہ کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ان کو قابل اعتبار ہی نہ سمجھتا تھا، چنانچہ علم رجال کی شہرۂ آفاق کتاب رجال مامقانی جلد ۲ ص ۱۱۵ مطبوعہ نجف

میں عامر بن شراحیل الشعبی کے تفصیلی حالات میں اس پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ﴿**هو الفقيه الناصبي المروى عنه اشياء ردية من جملتها تفضيل ابی بكر علی علی و ان ابابكر اول من اسلم و رميه الحارث بن عبد الله الاعور بالكذب في الحديث لا فراطه في حب علی و تفضيله علی غيره .... ولم يرو عنه (علی) ولا عن الحسنين ولا السجاد ولا الباقرين وقد ادركهم جميعاً سلام الله عليهم ....**﴾ "شعبی ناصبی فقیہ تھا اس سے خراب اور ردی چیزیں مروی ہیں ان میں سے حضرت علیؑ پر ابوبکر کی فضیلت، ابوبکر ہی سب سے پہلے اسلام لایا، اور (حضرت علیؑ کے خاص صحابی) جناب حارث بن عبد اللہ اعور کو محض محبت علیؑ کی وجہ سے کذب فی الحدیث سے متہم کرنا، اور معاویہ وغیرہ کو حضرت علیؑ سے افضل قرار دینا ہے .... اور اس نے حضرت علیؑ سے روایت بھی نہ لی اور نہ ہی امام حسنؑ، امام حسینؑ، امام سجادؑ اور امام باقرین علیہم السلام سے کوئی حدیث نقل کی ہے جبکہ اس نے ان ائمہ اہل بیت ﷺ کا زمانہ بھی پایا ہے ...."

مذکورہ بالا ناقابل تردید تاریخی شواہد سے شعبی ناصبیت اور عداوت اہل بیتؑ روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتی ہے تو دشمن اہل بیتؑ ہونے کی بنا پر شیعہ کے بارے میں اس کا کوئی قول یا غلیظ فتویٰ ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

﴿ ۴ ﴾

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ: امام صاحب نے سورہ فتح کے آخری رکوع کی آیت ﴿**ليغيظ بهم الكفار**﴾ کو رافضیوں کے کفر کی قرآنی دلیل قرار دیا اور یہ اصول بیان فرمایا کہ جو صحابہ سے جلے وہ کافر ہے اور اس سلسلہ میں علماء کی کثیر تعداد نے امام صاحب کی تائید کی ہے۔"

(خطبات جیل صفحہ ۴۷۸ تا ۴۷۹)

اس کے بعد متعدد گزشتہ مولویوں کے حوالے سے شیعہ کے خلاف ان کی آراء نقل کی ہیں جن میں امام مالک، ابو زرعہ، ابن حزم ظاہری، قاضی عیاض مالکی، شیخ عبد القادر جیلانی، فخر الدین رازی، کمال الدین ابن ہمام، ابن تیمیہ حنبلی اور برصغیر کے دیگر دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے

والوں کے نام شامل ہیں۔

الجواب:۔ باقی رہا مالک بن انس کے فتویٰ کے بارے تو ستم ظریفی دیکھئے کہ:

امام مالک نے قرآن کریم کی معنوی تحریف ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کرنے سے بھی جھجک محسوس نہ کی اور دوسرا جرم یہ کہ مسلمانوں کے ایک عظیم طبقہ پر خلاف شریعت فتویٰ داغ کر ابدی ہلاکت کو مول لے لیا مزید یہ کہ مالک میں ناصبیت کا عنصر بھی غالب تھا چنانچہ قاضی عیاض مالکی نے ان کے عقائد ونظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

مالک کی مجلس درس میں کسی علوی نے ان سے سوال کیا کہ نبی کریم ﷺ کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ انہوں نے کہا: ابو بکرؓ۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ مالک نے کہا: عمرؓ۔ اس نے پوچھا: پھر؟ انہوں نے کہا: مظلوم ومقتول خلیفہ عثمان بن عفان۔

مالک کا شاگرد مصعب سے مروی ہے کہ مالک سے پوچھا گیا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد لوگوں میں سے کون شخص افضل ہے؟ مالک نے جواب دیا: ابو بکر، سائل نے کہا: پھر؟ مالک نے کہا: عمر، اس شخص نے کہا: پھر کون؟ مالک نے کہا: پھر عثمان بن عفان۔

﴿قیل ثم من قال هنا وقف الناس هؤلاء خیرة اصحاب رسول ﷺ و سلم امر ابا بکر علی الصلوٰة و اختار عمر و جعلها عمر الی ستة فاختار وا عثمان فوقف الناس هنا زاد فی روایة و لیس من طلب الامر کمن لم یطلبه و فی روایة ابن وهب افضل الناس ابو بکر و عمر قلت ثم من؟ فامسك قلت انی امرؤ اقتدی بك فی دینی فقال عثمان﴾

کہا گیا: پھر کون؟ مالک نے کہا: یہاں پر لوگوں کی رائے موقوف ہوگئی ہے یہ رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ ابو بکر کو آپ نے نماز میں امام بنایا ابو بکر نے عمر کو منتخب کیا عمر نے چھ اشخاص میں شوریٰ قرار دی تو لوگوں نے عثمان کو پسند کیا اس کے بعد لوگ ٹھہر گئے ایک روایت میں ہے کہ مالک نے کہا جس شخص (علیؑ) نے حکومت طلب کی وہ اس کی مانند نہیں ہوسکتا جس نے طلب نہیں کی ابن وھب کی روایت میں ہے تمام لوگوں میں افضل ابو بکر وعمر ہیں ابن وھب کہتے

ہیں کہ میں نے کہا پھر کون ہے؟ مالک رک گئے اور جواب نہ دیا میں نے کہا میں وہ شخص ہوں جو اپنے دین میں آپ کی رائے پر عمل کرتا ہوں تب مالک نے کہا پھر عثمان افضل ہے۔

(ترتیب المدارک وتقریب المسالک ج ۲ صفحہ ۴۵، ۴۶ طبع مراکش)

معروف مصری عالم محمد ابوزہرہ (جو فواد یونیورسٹی قاہرہ میں لاء کالج کے متخصصین فقہ کے طلبائے درجہ عالیہ کو اسلامی قانون پڑھاتے ہیں) امام مالک کی مندرجہ بالا روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

﴿وقد جاء ت الاشارة الی ذلک فی احدی الروایات السابقة وھو فی ھذا القول یضرب علی نغمة معاویة والامویین﴾

گزشتہ روایات میں کسی ایک میں اس طرف اشارہ موجود ہے اس قول میں امام مالک معاویہ اور امویوں کا ہمنوا ہے۔ (مالک حیاتہ وعصرہ ۸۵ مطبوعہ مصر)

﴿و مھما تکن المبرات التی تدفع الی ذلک الحکم علی سیف الاسلام اخی رسول اللّٰہ و زوج ابنته و من کانت منه العترة علیھا السلام فان ذلک الحکم یدل علی نزعة امویة وان لم یرض عن اعمالھم و عدم تقدیر کامل لعلی رضی اللّٰہ عنه﴾

"امام مالک کی رائے کے جو بھی جواز تلاش کئے جائیں جن کی بنا پر انہوں نے سیف اسلام، رسول اللہ ﷺ کے بھائی اور ان کے داماد پر یہ حکم لگایا ایسا شخص جس سے نبی ﷺ کی اولاد چلی ہو ایسی شخصیت پر اس طرح کا حکم "اموی فکر" پر دلالت کرتا ہے خواہ امام مالک ان (امویوں) کے اعمال کو پسند نہ کرتے ہوں، نیز اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ امام مالک نے حضرت علیؑ کی پوری قدر و منزلت پہچانی نہیں"

اس کے بعد مزید صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿ولقد لاحظ بعض المعاصرین له انه لم یرو احادیث کثیرة عن علیؑ و ابن عباسؓ حتی لقد اتھم بان الدافع لذلک نزعة امویة..... و خلاصة القول ان مالک ممن

لا یجوضون فی السیاسة و کانْ لا یحرض علی الثورات ولا یرضی عن الفتن ولا یالو نصحا للولاۃ و الخلفاء وما خذ عطایا الخلفاء و کان لا یخلو من نزعة تقربه من الامویین ولا تدفعه الی عمل او قول و ان کان من اثارها ان کان رایة فی علی متفقا فی الجملة مع رائیهم﴾

بعض معاصرین کا خیال ہے کہ مالک نے حضرت علیؑ اور ابن عباسؓ سے زیادہ احادیث روایات نہیں کی ہیں حتیٰ کہ مالک پر یہ اتہام ہے کہ اس کا سبب اموی فکر ہی ہے اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مالک ان لوگوں میں سے تھا جو سیاست سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور انقلابات پر نہ اکساتے تھے نہ ہی فتنوں پر رضامند ہوتے تھے حکمرانوں اور خلفاء کی خیر خواہی میں کوتاہی نہ کرتے تھے اور حکمرانوں سے وظیفے لیتے تھے بہرحال مالک اس نقطۂ نظر کے حامل تھے جو انہیں امویوں کے قریب کرتا ہے یہ اموی نقطۂ نظر انہیں کسی عمل یا قول (جو امویوں کے خلاف ہو) کی طرف نہ لے جاتا تھا باوجودیکہ امام مالک کے آثار میں یہ بات ہے کہ ان کی حضرت علیؑ کے بارے میں رائے فی الجملہ بنوامیہ کی رائے سے متفق تھی۔ (مالک حیاتہ وعصرہ ص ۵۹ طبع قاہرہ)

مذکورہ بالا تحقیقات وتوضیحات سے عیاں ہوا کہ امام مالک اموی حکمرانوں کا ہمنوا تھا جو بنو امیہ کا طرفدار اور ان کے گن گاتا ہو تو اس سے شیعۂ علیؑ کے حق میں ہمدردی اور خیر خواہی کی توقع ہرگز نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا لامحالہ ماننا پڑے گا کہ حضرت علی علیہ السلام اور انکی اولاد اطہار اور ان کے ماننے والوں کے بارے میں ان کا نظریہ وہی تھا جو بنو امیہ کے جابر و ظالم حکمرانوں کا تھا اس لیے اہل حق کے خلاف امام مالک کا فتویٰ پیش کرنا کسی حیثیت اور اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

ایک فریق کی دوسرے کے خلاف گواہی اور فیصلہ معتبر نہیں ہے

محولہ بالا تمام حضرات، شیعہ کے مقابلے میں ایک فریق ہیں لہٰذا شیعہ کے خلاف ان کی گواہی اور فیصلہ معتبر نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام افراد جنہوں نے شیعہ کے خلاف زہر افشانی کی ہے یہ درحقیقت ان لوگوں کی باطنی یا ظاہری ناصبیت کا مظہر ہے کہ وہ محمد وآل محمد ﷺ کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈے میں مشغول رہتے ہیں۔ دوسری بات کہ یہ تمام مولوی

صاحبان خواہ باہم مختلف ہوں لیکن شیعہ اثنا عشریہ کے مقابل ایک فریق کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ان کی رائے اور فیصلہ شیعہ کے خلاف معتبر نہیں ہے فریقین کے بیانات سن کر انہیں فریق مخالف پر جرح کرنے کا موقع دینا اور پھر دلائل کی روشنی میں منصفانہ فیصلہ کرنا تقاضائے عدل ہے لیکن ظالم نواصب کو عدل سے کیا نسبت یہ تو عدل وعدالت کے قاتل ہیں۔ اسی طرح کسی ناصبی کی شیعہ کے خلاف کوئی رائے قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ مولوی ظفر احمد عثمانی دیوبندی صاحب ایک مشہور ناصبی جو زجانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

﴿قلت الجوزجانی جان ناصبیا منحرفا عن علی فھو ضد الشیعی المنحرف عن عثمان والصواب موالاتھما جمیعا ولا ینبغی ان یسمع قول مبتدع فی مبتدع﴾

"میں کہتا ہوں کہ جوزجانی ناصبی، حضرت علی سے منحرف تھا سو یہ شیعی کی ضد ہے جو عثمان سے منحرف ہوتا ہے، صحیح یہ ہے کہ دونوں سے دوستی کی جائے چنانچہ کسی مبتدع کی رائے کسی دوسرے مبتدع کے بارے میں قبول نہیں کی جاسکتی۔"

(قواعد فی علوم الحدیث ص ۴۰۰ مطبوعہ کراچی، ہدایۃ السائل الی ادلۃ المسائل ص ۴۰۰ طبع بھوپال)

مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ متقابل فریقین کی ایک دوسرے کے بارے میں رائے قابل قبول نہیں ہوسکتی باقی ظفر احمد عثمانی صاحب خود شیعہ کے مقابلے میں ایک فریق ہے اس لئے اس کی طرف سے شیعی کو مبتدع قرار دینا بھی نامقبول ہے تو ان ناصبی ملاؤں کے اہل حق کے خلاف فتوے ہرگز درست نہیں ہوسکتے ہیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

ابوحنیفہ کے بارے میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی رائے

مؤلف اور اس کے پیروکاروں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اگر مذکورہ بالا حضرات کی آرائے وفتاویٰ قابل اعتماد ہیں تو ان کی آپس میں ایک دوسرے کے بارے میں آراء وفتاوی پر بھی اعتماد

کریں اس طرح شاید دنیا میں کوئی ایک بھی مسلمان باقی نہیں رہے گا جب ایک دوسرے کے فتویٰ تکفیر کی زد میں آ کر کافر و مرتد قرار پائیں گے سب سے پہلے ابو حنیفہ کے بارے میں شیخ عبد القادر جیلانی کا فتویٰ پیش خدمت ہے:

﴿و اما المرجئة ففرقها اثنتا عشرة فرقة: الجهمية..... و الحنفية ..... و اما الحنفية فهم بعض اصحاب ابی حنيفة النعما بن ثابت زعموا ان الايمان هو المعرفة و الاقرار بالله و رسوله وبما جاء من عنده جملة ..... الخ﴾

''مرجئہ کے بارہ فرقے ہیں ان میں سے جہمیہ، صالحیہ، شمریہ، یونسیہ، یونانیہ، بخاریہ، غیلانیہ، شبیبیہ، حنفیہ معاذیہ مریسیہ، کرامیہ ہیں ان سب کا نام مرجئہ اس لئے ہے کہ کسی بھی مکلّف نے جب کلمۂ طیبہ پڑھ لیا تو اس کے بعد جتنے بھی گناہ کرے دوزخ میں نہ جائے گا یہ کہ ایمان قول کا نام ہے نہ کہ عمل کا، اعمال تو شرائع ہیں ایمان قول مجرد ہے لوگ ایمان میں ایک دوسرے سے فضیلت نہیں رکھتے، ایمان میں عام مؤمن، فرشتے اور انبیاء برابر ہیں ایمان نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے نہ اس میں استثناء ہوتی ہے جو زبان سے اقرار کرے اور عمل نہ بھی کرے تب بھی مؤمن ہے۔۔۔ حنفیہ ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کے بعض اصحاب ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ ایمان، اللہ، رسول اور شریعت کے اقرار اور معرفت کا نام ہے۔'' (غنیۃ الطالبین، ج ۱، ص ۶۲، ۶۳، طبع مصر)

احناف کا یہی مذہب معروف ہے چنانچہ حنفی عقائد کی مستند کتاب شرح العقائد میں درج عبارت یہ ہے:

﴿الثانی ان حقيقة الايمان و لا تنقص لما مر انه التصديق القلبی الذی بلغ حد الجزم و الاذعان و هذا لا يتصور زيادة و لا نقصان﴾

''دوسرا یہ کہ ایمان کی حقیقت میں کمی بیشی نہیں ہوتی جیسا کہ گزرا ہے اس لیے کہ یہ قلبی تصدیق کا نام ہے جو جزم و یقین کے حد کو پہنچ چکی ہوتی ہے اس میں کمی بیشی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔'' (شرح العقائد مع النبراس ص ۴۰۲ طبع میرٹھ)

امام ابو حنیفہ خود اپنے عقیدے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

﴿و الایمان ھو الاقرار و التصدیق و ایمان اھل السماء و الارض لا یزید ولا ینقص و المؤمنون مستوون فی الایمان و التوحید﴾

زبان سے اقرار کرنا اور جی میں مان لینا ایمان ہے آسمان اور زمین والوں کا ایمان نہ بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے اصل ایمان اور وحدانیت میں مسلمان سب برابر ہیں۔"

ملا علی قاری الحنفی امام ابوحنیفہ کے مذکورہ فرمان کی تشریح میں بایں الفاظ رقمطراز ہیں:

﴿و ایمان اھل السماء ای من الملائکۃ و اھل الجنۃ و الارض ای من الانبیاء و الاولیاء و سائر المؤمنین من الابرار و الفجار لا یزید و لا ینقص﴾

اہل آسمان سے مراد فرشتے اور اہل جنت ہیں اور اہل زمین سے مراد انبیاء کرام ﷺ، اولیاء اور سارے مسلمان خواہ وہ نیک ہوں یا بد سب ایمان اور توحید میں برابر ہیں ان کا ایمان نہ بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے۔" (فقہ اکبر مع الشرح، ص ۱۰۱ تا ۱۰۵، مطبوعہ کانپور)

اور ان کا یہ عقیدہ قرآن وسنت کے صریح اصولوں کے سراسر خلاف ہے حالانکہ قرآن مجید میں ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کی وضاحت فرمائی گئی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ﴾ اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنے پر بھروسہ کرتے ہیں۔"

(سورۃ انفال، آیت ۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی نے بارہ جہنمی فرقوں میں فرقہ حنفیہ کو نمبر ۹ پر مرجیہ میں شمار کیا ہے یہ ان پر کوئی زیادتی نہیں بلکہ حقیقت ہے کیونکہ مرجیہ کی جو وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے اس کا امام ابوحنیفہ اور ان کے پیروکاروں نے خود اعتراف کیا ہے۔

امام بخاری نے ابوحنیفہ پر سخت جرح کی ہے بلکہ دوسرے اہل علم کی آراء بھی ان کی مذمت میں نقل کی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری ان سے سخت ناراض ہیں چنانچہ امام بخاری ان کے متعلق اپنا فیصلہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ﴿نعمان بن ثابت ابو حنیفۃ الکوفی..... کان مرجئا سکتوا (عنه و ۱)﴾ "ابوحنیفہ مرجیہ تھے محدثین نے ان کی رائے

اور ان کی حدیث سے سکوت اختیار کیا ہے۔" (التاریخ الکبیر، ج ۴، ق ۲، ص ۸۱، طبع دکن)

لیجئے جناب کہ امام بخاری نے واضح الفاظ میں امام ابوحنیفہ کو مرجئیہ قرار دے دیا ہے۔ امام بخاری کے بارے میں بھی اظہار خیال فرمایئے؟

اب اگر شیعہ کے خلاف عبدالقادر جیلانی کا فتویٰ ملاں کے نزدیک درست ہے تو ابوحنیفہ اور ان کے پیروکار تمام احناف کے بارے میں پیراں دے پیر دستگیر غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کا قول بھی قبول کریں اس کے بعد منہ دکھانے کے قابل ہوئے تو سامنے آئیں۔

ابن حزم ظاہری کی تکفیر سازی

ملاں کا یہ کہنا کہ ابن حزم ظاہری نے شیعہ کے خلاف فتویٰ دیا ہے تو اس کے بارے میں چند صفحات پہلے علامہ ذہبی کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے کہ ابن حزم ظاہری اموی حکمرانوں کا آلۂ کار ناصبی تھا۔ ایک بات جو عام طور سے ابن حزم اموی کے متعلق مشہور ہے اس کی طرف بھی اشارہ ناگزیر ہے اور وہ اختلافی مسائل میں اس کی تلخ بیانی ہے بلاشبہ دوسرے مکاتب فکر کے افکار بیان کرنے میں اس کا لہجہ تند و تیز ہے یا اس کے الفاظ میں سبک سری اور خفت کا مظہر ہے مثلاً جہاں تکفیر کا موقع نہیں ہوتا وہ وہاں دوسروں کی تکفیر سے گریز نہیں کرتا جو سبک سر نہیں ہوتا اسے وہ عیب سے داغدار کرتا ہے۔

علامہ زاہد الکوثری الحنفی اپنے ایک ممدوح سے نقل کرتے ہیں: ﴿والذی یغلب علی الظن ان ما یصدر من ابن حزم من هذا الکفر العظیم و ما یقوله من الهذیان و التخرص و البهتان لا یکون صدورها منه فی حال السلامة من عقله و الصحة من ذهنه..... ﴾ ظن غالب یہ ہے کہ ابن حزم سے یہ کفر عظیم کی جو باتیں صادر ہوئی ہیں اور اس نے بکواس، اٹکل پچو اور الزام تراشی کی ہے وہ عقل کی سلامتی اور ذہن کی تندرستی کی صورت میں صادر نہیں ہو سکتی۔ (الاشفاق علی احکام الطلاق ص ۷۱ مطبعہ مجلۃ الاسلام قاہرہ)

ناصبیت اس انتہا تک پہنچی ہوئی تھی کہ معاویہ کی تمام غلطیوں کا ذمہ دار حضرت علیؑ کو ہی ٹھہراتا تھا۔ مزید برآں علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ ج ۳ صفحہ ۱۵۲ طبع دکن میں ابن حزم کے

حالات میں لکھا ہے: ﴿**وکان مما یزید فی سبابه تشیعه لامراء بنی امیة ماضیهم و باقیهم و اعتقاده بصحة امامتهم حتیٰ نسب الی النصب**﴾

ابن حزم اموی سے (لوگوں کی) عداوت اور دشمنی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بنو امیہ کے گزشتہ اور موجودہ خلفاء کے حامی تھا اور ان کی امامت کو برحق سمجھتا تھا اس وجہ سے اس کو ناصبی کہا گیا ہے" مزید یہ کہ ابن حزم نے اپنی کتاب "**الفصل فی الملل و النحل**" میں لکھا ہے کہ علیؑ کی امامت نہ نص سے ثابت ہے نہ اجماع سے، صرف برہان عقلی سے ثابت ہے ابن حزم کا یہ قول بھی اس کے ناصبی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

ابن حزم کی اس مذکورہ بالا کتاب کے رد میں ماضی قریب کے ایک شیعہ عالم آیۃ اللہ استاد شیخ محمد کاظم الحلی الکاظمیؒ نے ایک بلند پایہ علمی کتاب "**الجزم فی الرد علیٰ ابن حزم**" کے نام سے دو بڑی جلدوں میں لکھی جو آج سے کم و بیش پچیس سال قبل نجف اشرف سے شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے ابن حزم کی کذب بیانیوں کی خوب قلعی کھولی ہے ہمیں طوالت ملحوظ خاطر ہے ورنہ ہم اس کتاب سے کچھ اقتباسات پیش کر دیتے۔ اہل علم حضرات اصل کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔

ان واضح تصریحات کے بعد عالی قدر قارئین کو یہ حقیقت سمجھ لینے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں کہ ابن حزم ظاہری اموی اپنے ہم مسلک علماء و عوام کی نظر میں بھی مانا ہوا ناصبی تھا اپنی حیات مستعار کے اکثر لمحات میں ناصبیوں کے ہی افکار و نظریات کی تقویت کا سامان مہیا کرتا رہا۔ تو ایسے کھلم کھلا ناصبی نظریات کے حامل کی اہل حق کے خلاف دریدہ دہنی اور ہرزہ سرائی چہ معنی دارد۔

واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں

ابن تیمیہ کے بارے میں علماء کی آراء

مؤلف نے اہل حق کے خلاف اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے جس شخص کے فتوے کا سہارا لیا وہ ابن تیمیہ ہے جو اہل بیت علیہم السلام کا بدترین دشمن تھا لہٰذا اس کا قول مثل بول ہے۔ ابن

تیمیہ حرانی کے بارے میں خود اس کے ہم مسلک علماء کی آراء پیش کی جاتی ہیں۔ چنانچہ احناف کے مشہور محقق علامہ محمد زاھد الکوثری المصری ابن تیمیہ حرانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

﴿فتراه يحكم عليه هذا الحكم القاسي لانه صحيح حديث رد الشمس لعلي كرم الله وجهه فيكون الاعتراف بصحة هذا الحديث ينافي انحرافه (ابن تيميه) عن علي رضي الله عنه و تبدو على كلامه آثار بغضه لعلي عليه السلام في كل خطوة من خطوات تحدثه عنه﴾

آپ ابن تیمیہ کو دیکھتے ہیں کہ اس نے طحاوی پر یہ سنگین فتویٰ صادر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ طحاوی نے علی کرم اللہ وجہ کیلئے حدیث ردشمس کی تصحیح کی ہے چنانچہ اس حدیث کی صحت کا اعتراف ابن تیمیہ کے علی رضی اللہ عنہ سے انحراف کے منافی ہے جہاں جہاں ابن تیمیہ نے علی علیہ السلام کے بارے میں بات کی ہے اس کے کلام پر حضرت علی علیہ السلام سے بغض کے آثار قدم قدم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ (الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی صفحہ ۲۶ طبع مصر، مقالات الکوثری صفحہ ۴۰۷ حاشیہ نمبر ۱، طبع کراچی)

ابن حجر عسقلانی نے ابن تیمیہ حرانی کی کتاب منہاج السنۃ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿وكم من مبالغة لتوهين كلام الرافضي ادته احيانا الى تنقيص علي رضي الله عنه﴾

''رافضی کے کلام کی تردید میں مبالغہ نے اسے احیانا علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص تک پہنچا دیا ہے۔'' (لسان المیزان، ج ۶، ص ۳۱۹ و ۳۲۰، طبع حیدرآباد دکن)

مولانا سید احمد رضا بجنوری نے اپنے استاد الحدیث انور شاہ محدث کشمیری کے افادات کو ''انوار الباری'' شرح صحیح بخاری کے عنوان سے ترتیب دیا ہے جسے ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان نے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے یہ اس کتاب کی جلد ۶ ص ۲۲۰ و ۲۲۱ پر بعنوان ''امام طحاوی کی تصحیح حدیث ردشمس پر حافظ ابن تیمیہ کا نقد'' کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

''ابن تیمیہ کا نقطۂ نظر خارجی رجحانات کا اثر پذیر ہے۔''

شاہ عبدالعزیز دہلوی ابن تیمیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

﴿کلام ابن تیمیه فی منهاج السنة وغیره من الکتب موحش جدافی بعض المواضع لا سیما فی تفریط حق اهل البیت و منع زیارة النبی علیه السلام و فی انکار الغوث و القطب و الابدال و تحقیر الصوفیه..... و اذا کان کلامه مردودا عند علماء اهل السنة فای طعن یلحقهم فی ذالك فقط﴾

ابن تیمیہ کا کلام منہاج السنہ وغیرہ کتب میں بعض مقامات پر انتہائی وحشت ناک ہے۔ بالخصوص اہل بیتؑ کے حق میں انتہائی تنقیص شان کرتا ہے۔ زیارت نبی ﷺ سے روکتا ہے، غوث، قطب اور ابدال کا انکار کرتا ہے اور صوفیہ کی تحقیر کرتا ہے... علماءِ اہل سنت کے نزدیک اس کا کلام مردود ہے چنانچہ اس کے کلام کی بنیاد پر اہل سنت پر کوئی طعن نہیں ہوسکتا۔"

(فتاویٰ عزیزی، ج ۲، ص ۷۹، مطبوعہ دیوبند)

ابن تیمیہ پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے

شام کے چالیس اکابر علمائے اہلسنت جن میں محمد بن ابراہیم شافعی، محمد بن ابوبکر مالکی، محمد بن جریر انصاری حنفی اور احمد بن عمر مقدسی حنبلی بھی شامل تھے نے ابن تیمیہ پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے اور دمشق میں اہلسنت علماء نے باضابطہ اعلان کرایا کہ:

﴿من اعتقد عقیدة ابن تیمیة حل دمه و ماله﴾

"جو شخص بھی ابن تیمیہ جیسا عقیدہ رکھے گا اس کا خون اور مال حلال ہے۔"

(النبراس شرح شرح العقائد ص ۱۱۴ حاشیہ نمبر ۴، طبع میرٹھ، حل المعاقد فی شرح العقائد ص ۴۸، مطبع علویہ لکھنؤ، الدرر الکامنہ لابن حجر عسقلانی ج ۱، صفحہ ۱۴۷ طبع دکن)

اور ابن تیمیہ پر فتویٰ کفر کی بنا پر شام کے حاکم نے ابن تیمیہ کو جیل میں بند کر دیا تھا تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں: (**تکمله للسیف الصقیل فی الرد علی ابن زفیل**، از علامہ زاہد الکوثری صفحہ ۱۱۵ مطبوعہ مکتبہ زہران قاہرہ)۔

شیخ زین الدین بن رجب حنبلی جو کبار حنابلہ میں سے تھے اور ابن تیمیہ پر خرابی عقائد کی

وجہ سے کفر کا اعتقاد رکھتے تھے اور اس کا رد بھی لکھا ہے وہ بعض مجالس میں بلند آواز سے کہتے تھے کہ میں سبکی کو معذور سمجھتا ہوں یعنی تکفیر ابن تیمیہ کے بارے میں۔ (انوار الباری شرح بخاری ج ۱۱، صفحہ ۱۹۰، طبع ملتان)

احمد ابن حجر المکی نے ''الجوہر المنظم'' میں اور علامہ تقی الدین الحصنی نے ''دفع الشبہ'' میں ابن تیمیہ کو گمراہ تک کہا ہے۔ (معارف السنن ج ۳ ص ۳۳۱)، ابن تیمیہ حنبلی کے شاگرد اور ان کے خیالات ونظریات کے پر جوش حامی (جو پہلے ان کے شدید مخالف تھے) شہاب الدین احمد بن محمد مری الحنبلی نے قاہرہ میں سنہ ۷۲۵ ہجری کو محض اپنے استاد کی حمایت کرنے کی وجہ سے اس دور کے بڑے فقہاء نے ان کی سخت مخالف کی، ان کو مارا پیٹا گیا اور قاضی القضاۃ تقی الدین احنائی المالکی نے ان کو اس بدعقیدگی کے جرم میں قید کی سزا دی، کچھ دن قید رہے پھر جلاوطن کر دیے گئے، (ذیل العبر للذہبی ص ۷۳، مطبعہ حکومت الکویت)

مصر کے اٹھارہ فقہاءِ وقت نے ابن تیمیہ کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا ان فقہا کے سرکردہ قاضی تقی الدین محمد بن ابی بکر اخنائی مالکی تھے اور سب نے تکفیر کی وجہ یہ قائم کی تھی کہ انبیاء کرامؑ خاص کر رسول ﷺ کی قبر مکرم کی زیارت کے سفر سے۔۔۔ درحقیقت ان کی تنقیص وتوہین کے مترادف ہے جو صریحی کفر ہے اور کفر کی۔۔۔ ہے۔ (انوار الباری شرح بخاری ج ۱۱ ص ۱۱۹)

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر شیخ علاء الدین بخاری حنفی التوفی ۸۴۱ ھ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ جو شخص ابن تیمیہ کو ''شیخ الاسلام'' لکھے وہ کافر ہے انہوں نے ابن تیمیہ کی کتابوں کا مطالعہ پورے غور وفکر کے ساتھ کر کے سخت نقد کیا تھا (ذیل تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۳۱۶ طبع دمشق، انوار الباری ج ۱۱ ص ۹۲ مطبوعہ ملتان)

اسی طرح بعینہا علامہ زاہد الکوثری الحنفی نے الاشفاق علی احکام الطلاق ص ۸۹ طبع قاہر میں ابن تیمیہ حرانی کے قبائح وفضائح نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ﴿و مع هذا كله ان كان هو لا يزال يعد شيخ الاسلام فعلى الاسلام السلام﴾ ان کے باوجود اگر ابن تیمیہ کو شیخ الاسلا تصور کیا جائے تو ایسے اسلام سے ہم باز آئے،

ارباب انصاف!! خود ہی تجزیہ کر لیں کہ ایسے متشدد اور متعصب کہ جس نے خانوادۂ رسولؐ کی توہین و اہانت کرنے سے بھی دریغ نہ کیا ایسے شخص کے فتویٰ کو پیش کرنا اہل اسلام کے نزدیک ہرگز ہرگز حجت قرار نہیں پا سکتا لہٰذا ہم ابن حزم ہی کی طرح اس کی خرافات کو بھی باطل قرار دیتے ہیں۔

امام غزالی اور امام الحرمین پر کفر کا فتویٰ

مولانا احمد رضا بجنوری نے اپنے استاد علامہ انور شاہ محدث کشمیری کے مجموعہ افادات میں لکھا ہے کہ:

''ابن تیمیہ نے امام غزالی اور امام الحرمین کو یہود و نصاریٰ سے بھی بڑھ کر کافر قرار دیا ہے ملاحظہ ہو: موافقہ المعقول لابن تیمیہ'' (انوار الباری شرح بخاری ج ۱۱ صفحہ ۲۴۹ طبع ملتان)

ان تمام تصریحات و عبارات سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کے بہت سے علماء ابن تیمیہ کے کفر پر متفق ہیں جو خود اپنے ہی علماء کے نزدیک کافر ہو اس کا کسی مسلمان کو کافر کہنا چہ معنی دارد؟

حنفی، شافعی، حنبلی کی باہمی خونریزی اور ان کا ایک دوسرے کو کافر کہنا

ساتویں صدی کے مشہور حنفی عالم اور شام کے حاکم شرف الدین عیسیٰ ابی بکر جنہوں نے امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب ''الجامع الکبیر'' کی ضخیم شرح تحریر کی اور خطیب بغدادی کے رد میں ''السھم المصیب فی کید الخطیب'' کے نام سے کتاب لکھی ہے کے آباء واجداد شافعی المذاہب تھے لیکن شرف الدین متوفی ۶۲۴ ھ نے شافعی مسلک ترک کر کے حنفی مذہب اختیار کر لیا تھا ایک دن اس کے باپ نے اس سے پوچھا کہ جب تمہارا سارا خاندان شافعی کا مقلد ہے تو تم حنفی کیوں ہو گئے؟ تو انہوں نے فوراً جواب دیا: ﴿اترغبون عن ان تکون فیکم رجل واحد مسلم﴾ کیا تمہیں یہ بات ناپسند ہے کہ تم میں ایک آدمی مسلمان ہو جائے''۔

(الفوائد البھیہ، ص ۱۲، طبع لکھنؤ)

اس حنفی فقیہ کے فتویٰ کے مطابق شافعی سمیت اس کے تمام مقلدین غیر مسلم ہیں۔ حنفیوں میں سے ہی منصب قضاء پر فائز ایک عالم دین فقیہ وقت قاضی محمد بن موسیٰ متوفی ۵۰۶ ھ نے شافعی

مذہب کے لوگوں سے متعلق جس رائے کا اظہار کیا تھا وہ درج ذیل ہے:

﴿لو كان لي امر اخذت الجزية من الشافعية﴾

''اگر میری حکومت ہوتی تو میں شافعی کے پیروکاروں سے جزیہ وصول کرتا''

(میزان الاعتدال ج ۴ص ۵۲، الجواہر المضیہ للقرشی ج ۲ص ۱۳۶، سیر اعلام النبلاء ج ۱۹ص ۲۴۹ حاشیہ نمبر ۳ طبع بیروت)

جزیہ تو صرف غیر مسلموں سے لیا جا سکتا ہے چنانچہ قاضی صاحب کے اس ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام شافعی اپنے مقلدین سمیت دائرہ اسلام سے خارج تھے بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ شافعی سنیوں سے رشتہ مناکحت جائز نہیں ہے چنانچہ فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

﴿لا ينبغي للحنفي ان يزوج بنته من شافعي المذهب ولكن يتزوج منهم﴾

''کسی حنفی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح کسی شافعی مرد سے کرے لیکن شافعی لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے۔'' (بزازیہ بر حاشیہ الفتاویٰ الھندیہ ج ۴ص ۱۱۲ طبع کوئٹہ)

مطلب یہ ہوا کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح تو کر سکتے ہیں مگر مسلمان عورت کا نکاح ان سے حرام اور ممنوع قرار دے دیا گیا ہے لہٰذا شافعی مذہب سے تعلق رکھنے والے اہل سنت بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔

۷۱۶ ہجری میں حنبلیوں اور شافعیوں کے درمیان عقائد میں اختلاف کی بنیاد پر شدید فتنہ برپا ہوا ابن کثیر دمشقی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿وفيه وقعت فتنة بين الحنابلة و الشافعية بسبب العقائد و ترافعوا الى دمشق فحضر وا بدار السعادة عند نائب السلطنة تنكز فاصلح بينهم﴾

اسی سال حنبلیوں اور شافعیوں کے مابین عقائد کی بناء پر فتنہ برپا ہوا یہ لوگ مسئلہ لے کر دمشق گئے چنانچہ نائب سلطنت تنکو کے پاس دار السعادت میں پیش ہوئے تو اس نے ان کے درمیان صلح کرا دی۔'' (البدایہ والنہایہ ج ۱۴ص ۷۵، ۷۶ مطبوعہ مصر)

علامہ ذہبی نے شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبد اللہ انصاری کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا

ہے کہ جب وہ ہرات سے بصرہ کی طرف جارہے تھے تو راستے میں رے شہر وارد ہوئے وہاں پر ان سے پوچھا گیا کہ آپ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ حنبلی ہوں ایک شخص انہیں پکڑ کر شیخ ابو حاتم کے پاس لے گیا اس دن شیخ کے گھر پر بڑا اجتماع تھا، اس شخص نے بتایا کہ یہ شخص کہتا ہے کہ میں حنبلی ہوں شیخ ابو حاتم نے کہا

﴿دعه فکل من لم یکن حنبلیا فلیس بمسلم﴾

''اسے چھوڑ دو، جو شخص حنبلی نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے۔'' (سیر اعلام النبلاء ج ۱۸ صفحہ ۵۰۸، ذیل طبقات الحنابلہ ج ۱ صفحہ ۵۲ طبع قاہرہ، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۱۸۶، ۱۱۸۷ طبع دکن)

حنبلیوں نے شہر مرو میں شافعیوں کی مسجد جلا ڈالی اور وہ فتنہ برپا ہوا کہ بے شمار جانیں تلف ہو کر نیشاپور میں حنفیوں، شافعیوں کا تصادم ہوا، بازار جلا دیئے گئے، مدرسوں کو نذر آتش کر دیا گیا، اور شافعی سنی کثرت سے مارے گئے پھر شافعیوں نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کا انتقام لیا، (مراۃ الجنان ج ۳، ص ۳۰۷ طبع حیدر آباد دکن، البدایہ والنھایہ ج ۱۱، ص ۱۶۲ کامل ابن اثیر ج ۸ ص ۳۱۳ طبع مصر)

تمام مذاہب والے ابن تیمیہ کے عقائد کی وجہ سے حنبلیوں کے خلاف متحد ہو گئے ﴿ثم نودی بدمشق و غیرھا من کان علی عقیدۃ ابن تیمیہ حل مالہ و دمہ﴾ پھر دمشق اور دوسرے شہروں میں یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص بھی ابن تیمیہ کے دین پر ہے اس کی جان مال مباح ہے مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ کافر ہیں ان کے ساتھ کافروں جیسا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔

(مراۃ الجنان ج ۴ صفحہ ۲۴۰ طبع حیدر آباد دکن)

﴿الامام العلامۃ الفقیہ الاصولی الشیخ علی بن ابی علی ... الملقب سیف الدین الآمدی ... کان فی اول اشغالہ حنبلی المذھب ثم انتقل الی المذھب الامام الشافعی ...﴾ امام شیخ علی بن ابی علی مقلب سیف الدین آمدی جن کا انتقال ۶۳۱ ہجری میں ہوا پہلے حنبلی تھے پھر شافعی مذہب اختیار کیا جس پر ان کے شہر کے فقہاء ان کے خلاف ہو گئے اور انہیں کافر و زندیق کہا اور ان کا خون مباح قرار دیا گیا۔ (مراۃ الجنان ج ۴ صفحہ ۷۳، ۷۴، طبع دکن،

وفیات الاعیان ج ا صفحہ ۴۱۵ طبع بولاق مصر)

علامہ شیخ ابو بکر المقری الواعظ جو ۴۷۶ ہجری میں فوت ہوئے بغداد شہر کی مسجدوں میں اعلان کیا کرتے تھے کہ تمام حنبلی مذہب والے کافر ہیں۔

(شذرات الذھب ج ۳ ص ۳۵۳ طبع بیروت)

محب الدین بن محمد الحنفی کے حالات بیان کرتے ہوئے عماد الحنبلی لکھتے ہیں کہ

﴿محب الدین بن محمد الهندی الحنفی . كان شديد العصبية يقع في الشافعي﴾

محب الدین بن محمد ہندی حنفی (کی وفات ۷۸۹ ہجری میں ہوئی ہے اور یہ) شافعیوں سے سخت تعصب رکھتے تھے (اور اسے عین دینداری سمجھتے تھے)۔

(شذرات الذہب ج ۶ صفحہ ۳۱۰ طبع بیروت)

شیخ ابو اسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف فیروز آبادی جن کی رحلت ۴۷۹ ہجری میں ہوئی ہے جو شافعیوں کے محترم بزرگ اور نامور عالم تھے حنبلیوں کے سخت مخالف تھے اس پر انہیں بہت اذیتیں پہنچائی گئیں **﴿بعد ما ثارت بينهم في ذلك فتنة هائلة قتل فيها نحو من عشرين قتيلاً﴾** جسکے نتیجہ میں شافعی اہل سنت اور حنبلی اہل سنت کے مابین بہت بڑا فساد ہوا اور بہت سارے لوگ قتل ہو گئے۔ (طبقات الشافعیہ از امام سبکی ج ۴ صفحہ ۲۳۴، ۲۳۵ طبع دار احیاء الکتب العربیہ قاہرہ)

محمد بن محمد ابو منصور الفقیہ البروی المتوفی ۵۶۷ ھ کو حنبلیوں نے محض تعصب کی وجہ سے زہر دے کر مار ڈالا چنانچہ علامہ سبکی شافعی نے ان کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: **﴿ان الحنابلة دسوا عليه امراة جاته في الليل بصحن حلوا مسموم، فاكل منها فمات هو وكل من اكل منها﴾** حنبلیوں نے رات کے وقت ایک عورت کو ان کے پاس بھیجا وہ ایک برتن میں زہر آلود حلوا لے کر آئی، ابو منصور نے خود بھی کھایا اور جس نے بھی حلوا کھایا سب مر گئے، (طبقات الشافعیہ ج ۶ صفحہ ۳۹۰ طبع قاہرہ، کامل ابن اثیر ج ۱۱ ص ۳۷۶، مراۃ الجنان ج ۳ ص ۳۸۲ طبع دکن)

سب سے بڑا فتنہ بغداد میں حنبلی اور شافعی سنیوں کے درمیان ہوا دونوں طرف سے لوگ مارے گئے اس وقت کے حکمران کو اس قتل و غارت کو روکنے کی کوشش کرنا پڑی، وزیر نے صلح کے لیے دونوں مذہب والوں کو بلایا تو اس وقت شافعی مذہب کے رہنما نے چلا کر کہا۔

﴿ای صلح یکون بیننا؟ انما یکون الصلح بین مختصمین علی ولایته او دنیا او تنازع فی ملك فاما هولاء القوم فانهم یزعمون انا کفار و نحن نزعم ان من لا یعتقد ما نعتقده کان کافر افای صلح بیننا؟﴾

صلح کس بات کی؟ اور کس سے صلح؟ صلح کا سوال وہاں اٹھتا ہے جہاں دو فریق حکومت کے لیے برسر پیکار ہوں یا بادشاہت میں جھگڑا ہو۔ یہ لوگ یعنی حنبلی جماعت والے ہمیں کافر قرار دیتے ہیں اور ہم اس شخص کو کافر سمجھتے ہیں جو ہمارے جیسا عقیدہ نہ رکھتا ہو لہٰذا ہم دونوں میں صلح ممکن نہیں ہے۔ (ذیل طبقات حنابلہ لابن رجب ج ۱ ص ۲۰، ۲۱ طبع قاہرہ، وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۰۸، سیر اعلام النبلاء ج ۱۸، ص ۳۱۹، طبع بیروت)

قاضی حارث بن مسکین مالکی نے مصر میں حکم جاری کیا تھا کہ حنفیوں اور شافعیوں کو مسجد سے نکال دیا جائے، اور ان کے مصلے چھین لئے جائیں،

بیت اللہ الحرام میں چاروں مذاہب کے الگ الگ مصلے ہونا اور چاروں مسالک کی الگ الگ نمازیں ہونا تو ابھی کل کی بات ہے ۸۰۱ ہجری سے مکہ مکرمہ میں چار مصلے بچھائے گئے اور تقریباً ۱۳۶۲ھ تک یہ چار مصلے رہے، جسے سعودی وہابیوں نے آ کر ختم کیا، اگر یہ لوگ ایک دوسرے کو مسلمان سمجھ کر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تو الگ الگ مصلے بچھانے کی کیا ضرورت تھی؟ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: **خبیئة الاکوان فی افتراق الامم علی المذاهب و الادیان**'' مطبوعہ بولاق مصر)

محمد بن عبد الوہاب کے ماننے والے دیگر مسلمانوں کے نزدیک خارجی نظریہ کے حامل ہیں، علامہ ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۴ھ خوارج کے بارے میں حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿کما وقع فی زماننا فی اتباع (محمد بن) عبد الوهاب الذین خرجوا من

نجد و تغلبوا علی الحرمین و کانوا ینتحلون مذهب الحنابلة لکنهم اعتقدوا انهم هم المسلمون و ان من خالف اعقادهم مشرکون و استباحوا بذالك قتل اهل السنة و قتل علماء هم﴾

اسی طرح ہمارے زمانے میں ابن عبد الوہاب کے پیروکاروں میں واقع ہوا ہے جنہوں نے نجد سے خروج کیا اور حرمین شریفین پر قابض ہوگئے یہ بظاہر اپنے آپ کو حنبلی مذہب کی طرف منسوب کرتے تھے لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ صرف وہی مسلمان ہیں جو بھی ان کے عقیدہ کا مخالف ہے وہ مشرک ہے، اور اسی عقیدہ کی بناء پر انہوں نے اہل سنت اور ان کے علماء کا قتل مباح قرار دیا... " (ردالمختار معروف فتاویٰ شامی ج ۳ ص ۴۲۷ مطبوعہ بولاق مصر)

چھٹی صدی کے حنفی فقہاء نے حنبلی مذہب کے بڑے عالم حافظ عبد الغنی مقدسی الدمشقی کو کافر قرار دے کر اس کا خون مباح کر دیا تھا پھر بعض صاحب اثر کی کوشش سے ان کے قتل کا حکم منسوخ ہوا لیکن دمشق سے ان کو نکال دیا گیا آخر میں گمنامی کی حالت میں اپنی زندگی پوری کی۔ (سیر اعلام النبلاء، جلد ۲۱، صفحہ ۴۶۳، ۴۶۴ طبع بیروت)

امام شافعی پر مالکی مذہب کے ایک پیروکار ابن ابی السمح مصری نے شب کی تاریکی میں لوہے کی ایک سلاخ سے حملہ کر کے ان کا سر توڑ دیا جس کے باعث آپ کی موت واقع ہوگئی (توالی التاسیس) امام بخاری کو ایک متعصب حنفی ابو حفص کبیر نے پہلے تو بخارا میں فتویٰ دینے سے رکوایا بعد ازاں فوراً امام بخاری کو شہر بدر کر دیا۔ (الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ جلد ا صفحہ ۶۷، طبع دکن)

"دیوبندیوں کے نزدیک تمام بریلوی سنی گمراہ اور مشرک ہیں"

سپاہ صحابہ کا سابق سرپرست ضیاء الرحمن فاروقی اپنے کتابچے میں مولانا احمد رضا خان کے ترجمہ قرآن پر سعودی پابندی سے متعلق رائے ظاہر کرتے ہوئے ہرزہ سرائی کرتا ہے کہ:

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس فرقہ ضالہ کے بعض افراد نے آنجناب کی خدمت میں ایک خط کے ذریعے مذکورہ ترجمہ و تفسیر پر پابندی ہٹانے کا مطالبہ کیا ہے اس کے ساتھ ہی نہایت شاطرانہ طریقے سے اپنے مبتدع اعظم کے غلط نظریات پر پردہ ڈالنے کی مسموم کوشش کی گئی

ہے..." (کنز الایمان پر پابندی کیوں؟ص ۳ طبع ادارہ اشاعت المعارف فیصل آباد)

اس کے بعد ضیاء الرحمٰن فاروقی لکھتا ہے کہ:

"مذکورہ ترجمہ و تفسیر اسی فرقہ ضالہ کے پیشوا احمد رضا خان بریلوی اور اس کے خلیفہ مفتی نعیم الدین مراد آبادی کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہے۔ اندریں حالات ہمارا مطالبہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ "کنز الایمان" پر سعودی عرب اور دیگر عالم عرب میں پابندی لگائی جائے بلکہ آئندہ رضا خانی فرقہ کے لوگوں کو حج پر جانے سے سختی سے روکا جائے...." (کنز الایمان پر پابندی کیوں؟ص ۴)

ضیاء الرحمٰن فاروقی نے اپنی ایک دوسری تصنیف "فیصل اک روشن ستارہ" میں بھی بریلوی اہل سنت کے خلاف بہت زہر اگلا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات سے معلوم ہوا کہ بریلوی سنی، دیوبندیوں کے نزدیک عام گمراہ ہی نہیں بلکہ مرزائیوں کی طرح کافر ہیں اسی لیے تو انہیں حج پر جانے سے اور شعائر اسلامی اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ روکنے کا مطالبہ سعودی حکومت سے کیا جا رہا ہے۔

"بریلوی سنیوں کے نزدیک دیوبندی بدترین کافر اور مرتد ہیں"

مولانا احمد رضا خان بریلوی دیوبندیوں کے بارے میں اپنا فتویٰ ان الفاظ میں جاری کرتے ہیں:

"مرتدوں میں سب سے بدتر مرتد منافق ہے یہی ہے وہ کہ اس کی صحبت ہزار کافر کی صحبت سے زیادہ مضر ہے کہ یہ مسلمان بن کر کفر سکھاتا ہے خصوصاً وہابیہ دیوبندیہ کہ اپنے آپ کو خاص اہل سنت و جماعت کہتے ہیں حنفی بنتے، چشتی نقشبندی بنتے، نماز روزہ ہمارا سا کرتے، ہماری کتابیں پڑھتے پڑھاتے اور اللہ و رسول ﷺ کو گالیاں دیتے ہیں یہ سب سے بدتر زہر قاتل ہیں......" (احکام شریعت حصہ اول ص ۷۷ طبع ابو العلی پریس آگرہ)

دیوبندی وغیرہ کہ نہ ان کی نماز نماز ہے، نہ ان کے پیچھے نماز نماز، بالفرض وہی جمعہ یا عیدین کا امام ہو اور کوئی مسلمان امامت کے لیے نہ مل سکے تو جمعہ و عیدین کا ترک فرض ہے جمعہ کے بدلے ظہر پڑھے۔" (ایضاً ص ۹۲، فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۱۹۱، ص ۳۶۷ مطبوعہ دہلی)

مولانا موصوف اپنے ملفوضات میں کہتے ہیں کہ

''وہابیوں کی بنوائی ہوئی مسجد مسجد ہے یا نہیں؟''

ارشاد:۔ کفار کی مسجد مثل گھر کے ہے، خلیل احمد، رشید احمد، اشرف علی کے کفر میں جو شک کرے وہ خود کافر من شک فی کفرہ وعذابہ فقد کفر'' (ملفوضات حصہ اول ص ۹۵ طبع حسنی پریس دہلی)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں:

''... وہابی دیوبندی، وہابی غیر مقلد، قادیانی، چکڑالوی نیچری ان سب کے ذبیحے محض نجس و مردار حرام قطعی ہیں اگرچہ لاکھ بار نام الٰہی لیں اور کیسے ہی متقی پرہیزگار بنتے ہوں کہ یہ سب مرتدین ہیں۔'' (احکام شریعت، حصہ اول ص ۸۶)

''غلام احمد قادیانی اور رشید احمد اور اشرف علی اور خلیل احمد وغیرہ ہیں جو کھلے کفر و گمراہی والے ہیں۔'' (حسام الحرمین علی منحر الکفر والمین صفحہ ۴۳ طبع لاہور)

''رشید احمد گنگوہی اور خلیل احمد انبیٹھی اور اشرف علی تھانوی تو ان لوگوں سے جب کہ وہ باتیں ثابت ہوں جو فاضل مذکور نے ذکر کیں قادیانی کا دعویٰ نبوت کرنا اور رشید احمد اور خلیل احمد اور اشرف علی کا شان نبی ﷺ کی تنقیص کرنا تو کچھ شک نہیں کہ وہ کفار ہیں اور جو قتل کا اختیار رکھتے ہیں ان پر واجب ہے کہ ان کو سزائے موت دیں۔'' (حسام الحرمین صفحہ ۶۷)

مزید تفصیل کے لیے مولانا احمد رضا خان بریلوی کی کتاب ''**الکوکب الشہابیہ فی کفریات ابی الوہابیہ**'' ملاحظہ فرمائی جائے۔

دیوبندیوں نے اس بات کا خود اعتراف کیا ہے کہ بریلوی اہل سنت انہیں کافر قرار دیتے ہیں چنانچہ سپاہ صحابہ کا سابق رہنما مولوی ضیاء الرحمٰن فاروقی، اعلیٰ حضرت کی تفسیر ''کنز الایمان'' پر پابندی لگوانے کے سلسلے میں شاہ فہد کو تحریر کردہ ایک خط میں اسکا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:

''براہ کرم آنجناب کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ وہی رضا خانی فرقہ ہے جس کے بانی مولوی احمد رضا خان نے اسلامی تاریخ کی عظیم المرتبت شخصیت اور آپ کے والد گرامی سلطان عبد العزیز ابن سعود کی حکومت کے قیام کے وقت موصوف پر کافر اور مرتد ہونے کا فتویٰ صادر کیا تھا ...''

(کنز الایمان پر پابندی کیوں؟ ص ۳،۴)

شواہد ہمارے پاس موجود ہیں۔" (ایضاً ص ۴)

محترم قارئین:۔

دیکھا آپ نے، کہ جہاں اہل سنت کے خلاف زہرافشانی کر رہا ہے کہ بریلوی اہل سنت بدعتی، گمراہ، مشرک اور باطل پرست ہیں اور ان کے امام احمد رضا خان صاحب کو "مبتدع اعظم" کہہ رہا ہے اور ساتھ یہ بات بھی تسلیم کر رہا ہے کہ بریلوی اہل سنت حضرات کے نزدیک سعودی نجدی اور دیوبندی کافر و مرتد ہیں اس لیے دائرۂ اسلام سے خارج ہیں مگر اپنے کو اہل سنت کہہ کر مسلمانوں دھوکہ دیتے ہیں مرحوم آغا عبدالکریم شورش کاشمیری ایسے ہمدرد ملت نے ان فتویٰ باز ملاؤں کے مذموم وکردار کی یوں نقاب کشائی کی ہے۔

کیا یہی اسلام ہے؟

بیج بو کر فتنہ تکفیر کا اسلام میں
رات دن جلسے کراؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

مار کر ڈاکہ مریدان ارادت کیش پر
خلوتوں میں مسکراؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

یہ ہی سوچا ہے کہ تعلیم پیمبرؐ کے خلاف
مؤمنوں کا دل دکھاؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

عاقبت کے نرخ پر ہنگامہ تکفیر ہے
آگ ہر گھر میں لگاؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

خیرہ چشمی سے رسولؐ اللہ کی اولاد پر
جھوٹ کا طوفان اٹھاؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

کل خدا کے سامنے ہر بات کا ہوگا حساب
آج بچھڑے اڑاؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

نواصب کے بارے میں شریعت کا حکم

ناصبی کی تعریف

سب سے پہلے ناصبی کی تعریف پیش کی جاتی ہے۔ علامہ شمس الدین ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں یزید بن معاویہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ﴿وکان ناصبیا فظا غلیظاً﴾ یزید ناصبی تھا۔ چنانچہ اس کے حاشیے پر محقق اور محشی شعیب الارنوؤط اور مامون الصاغرجی نے ناصبی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿من الناصبية وهم المنافقون المتدينون ببغضة على رضى الله عنه سموا بذلك لانهم نصبوا له و عادوه﴾

یہ ناصبیت سے ماخوذ ہے، ناصبی منافق ہوتے ہیں جو علی رضی اللہ عنہ سے بغض کو اپنا دین سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ انہوں نے علیؓ سے دشمنی اور عداوت کی۔''

(سیر اعلام النبلاء، ج ۴ ص ۳۷ حاشیہ نمبر ۲ طبع بیروت)

ابن حزم ظاہری کے سوانح لکھتے ہوئے علامہ ذہبی نے متقدمین علماء میں ابو مروان بن حیان سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿و کان مما یدفی شنآنه تشیعه لامراء بنی امیه ماضیهم و باقیهم و اعتقاده لصحیة امامتهم حتیٰ لنسب الی النصب﴾

ابن حزم کی برائی میں اس سبب سے بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ بنو امیہ کے گزشتہ اور اس وقت کے حکمرانوں کی حمایت کرتا اور ان کی حکومت کو درست تسلیم کرتا تھا حتیٰ کہ اسے (ابن حزم کو) ناصبی کہا گیا۔''

اسی عبارت کے حاشیے پر فاضل محشی استاد شیخ شعیب الارنوؤط اور استاد محقق محمد نعیم العرقسوسی نے ''النصب'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿و النصب هو بغض علی رضی الله و موالاۃ معاویۃ﴾ ناصبیت علی رضی اللہ عنہ سے بغض اور معاویہ سے دوستی کہا جاتا ہے۔" (سیر اعلام النبلاء، ج ۱۸، ص ۲۰۱، حاشیہ نمبر ۷)

ناصبی کی تعریف کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ نواصب منافق ہوتے ہیں۔

رسول اللہؐ کا نواصب کے بارے میں قطعی حکم!

﴿قال علی و الذی فلق الحبۃ و براء النسمۃ انہ لعھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی ان لا یحبنی الا مومن و لا یبغضنی الا منافق﴾

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے دانہ پھاڑا اور جان کو پیدا کیا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بتایا کہ مجھ (علیؑ) سے محبت وہی کرے گا جو مؤمن ہوگا اور مجھ سے بغض وہی رکھے گا جو منافق ہوگا۔" (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۶۰، طبع لکھنؤ)

اس کے علاوہ یہی حدیث جامع ترمذی جلد ۲ ص ۲۱۵ طبع دیوبند، سنن نسائی جلد ۲ ص ۲۷۰ طبع دہلی، سنن ابن ماجہ ص ۱۲، طبع دہلی، مسند الحمیدی جلد ۱ ص ۳۱، طبع مدینہ منورہ، مسند البزار جلد ۲ ص ۱۸۲ طبع بیروت اور دیگر کتب معتبرہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

متذکرہ بالا حدیثِ پیغمبرؐ سے نہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت واضح ہوتی ہے بلکہ ان کی محبت ایمان کا جزو لاینفک قرار پاتی ہے۔

رسول اللہؐ حضرت علیؑ اور ابن عباسؓ کا نواصب کے بارے میں حتمی فیصلہ

ابن حجر مکی روایت نقل کرتے ہیں: ﴿عن ابن عباس رضی اللہ عنھما ان ھذہ الایۃ لما نزلت قال صلی اللہ علیہ وسلم لعلی! ھو انت و شیعتك تاتی انت و شیعتك یوم القیامۃ راضین مرضیین و یاتی عدوك غضابا مقمحین قال و من عدوی؟ قال من تبراء منك و لعنك﴾

ابن عباس رضی اللہ عنھما سے مروی ہے کہ جب یہ آیت ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو فرمایا کہ اس سے مراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں تم اور تمہارے شیعہ قیامت کے دن

کر دیا اور ہر مکتبِ فکر کا مولوی دوسرے مکتب فکر کو کافر و مرتد کہہ رہا ہے جیسا کہ صفحاتِ بالا پر آپ نے بالتفصیل ملاحظہ فرمالیا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جو لوگ شیعیان حیدر کرارؑ کو کافر قرار دینے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں وہ خود بھی کسی نہ کسی مولوی کے کفریہ فتوؤں کی زد میں ہیں لہٰذا جو شخص خود کافر ہو وہ دوسرے کو کافر کہنے سے پہلے خود اپنی پوزیشن کم از کم واضح کر لے۔ تمام بریلوی اہل سنت کے نزدیک بالاتفاق تمام دیوبندی کافر و مرتد ہیں بلکہ ان سے بھی بدترین مخلوق ہیں۔ بنابریں دیوبندی مولویوں کو کسی دوسرے مسلک کے خلاف فتویٰ دینے سے پہلے خود کو مسلمان ثابت کرنا لازم ہے کیونکہ علمائے حرمین (علمائے مکہ و مدینہ منورہ) دیوبندیوں پر کفر کا فتویٰ جاری کر چکے ہیں اور ''حسام الحرمین'' اب بھی دیوبندیوں کے کفر پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے۔

عصر حاضر میں جب عالمی استعمار پوری دنیا کے مسلمانوں کے خلاف نت نئے سازشی حربے آزما رہا ہے اور عالم اسلام کو زیر کرنے کی ہر سازش پر عمل پیرا ہے ایسے میں ہمارا فریضہ ہے کہ باہم مل کر اپنے مشترکہ دشمن کی فریب کاریوں کا مقابلہ کریں اور اتحاد و یگانگت کے ساتھ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ آج کا ہولناک دور باہم شکر رنجیوں اور فروعی اختلافات کے اظہار کا نہیں ہے بلکہ تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اسلام کے ارتقاء کے لیے متحدہ کاوشوں کا دور ہے۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ مذہبِ اہل بیتؑ کے پیروکار روزِ اول سے اتحاد و وحدت اور باہمی رواداری و اخوت کے فروغ کے لیے کوشاں چلے آ رہے ہیں۔ یہ درسِ وحدت انہوں نے اپنے ہادیانِ برحق سے لیا ہے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کو ''اسلام دشمن اور دین دشمن'' طبقات سے بھی روشناس کرانے اور ان کے قبیح جرائم سے نقاب اتارنے کا فریضہ بھی ہمارے ہی اسلاف نے انجام دیا ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قرآنی حکم کی تعمیل اب بھی جاری ہے۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

یہ بات بھی مسلّم ہے کہ اسلام کے لیے کافر سے زیادہ خطرناک منافق ہوتا ہے جو اسلام کا

لبادہ اوڑھ کر اسلامی اقدار کو مٹانے کے درپے ہوتا ہے لہٰذا منافق اور آستین کے سانپ کا مصداق اندرونی دشمن کی نشاندہی اہل حق کی ذمہ داری ہوتی ہے اس لئے میں نے اس کتاب میں قرآن و سنت کے متعین کردہ اصولوں سے دشمن کا محاسبہ کر کے اصل حقائق کو بالوضاحت پیش کر دیا ہے تا کہ اہل علم حضرات آسانی سے حق و باطل میں امتیاز کر کے صحیح طور سے بصیرت حاصل کر سکیں۔ تمام حوالہ جات وعبارات کو ہم نے بذات خود اصل کتب میں دیکھ کر پوری تحقیق اور سیاق و سباق کو مدنظر رکھتے ہوئے نقل کیا ہے۔ صرف مطبع اور صفحہ کا قدرے اختلاف ہو سکتا ہے۔ تمام علمی مباحث میں شائستگی اور متانت کے دائرے میں رہتے ہوئے گفتگو کی کوشش کی گئی ہے تاہم اگر حق کے بیان میں کوئی ایسی تلخی واقع ہوگئی ہو تو ہماری مجبوری متصور کریں کیونکہ ہمارا مخاطب اخلاقیات اور جہل کی پست ترین گہرائیوں میں غوطہ زن ہے اور ہمیں اسی مقام پر جا کر اسے حق سے روشناس کرانا پڑا۔ جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

امید ہے کہ قارئین فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کاوش کو صرف کتابوں میں رہ کر ایک نئی کتاب کا اضافہ نہیں سمجھیں گے بلکہ حق اور باطل کے درمیان کسوٹی اور ترازو کی حیثیت سے دیکھیں گے۔

اللھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعہ و ارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابہ

امین یا رب العالمین

یاداشت